www.Paksociety.com
ایک رات کی بات
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com
سعدیہ غزل
www.Paksociety.c
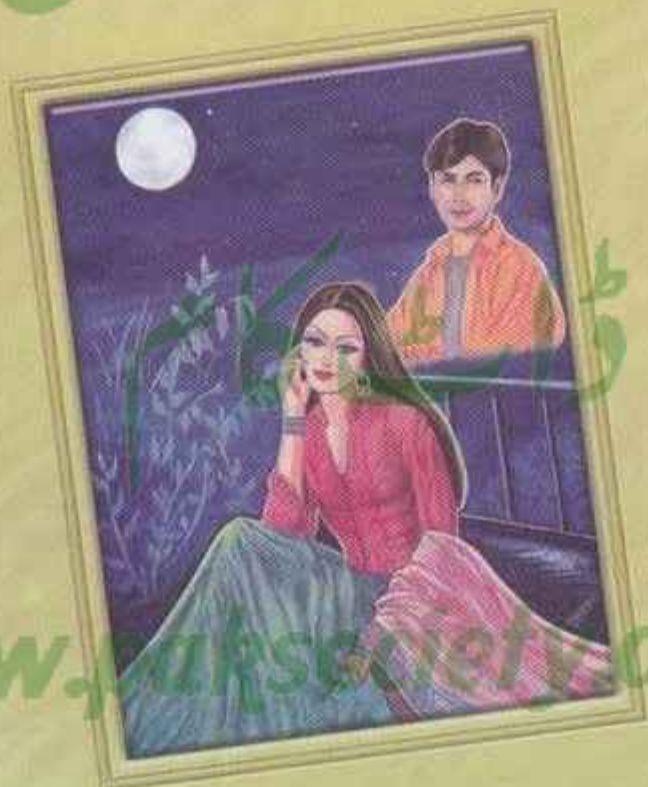
ان دنوں میں "افنان عادل" تازہ تازہ میٹرک کلاس میں آیا تھا۔

جی ہاں میٹرک کلاس......

اور کوئی کیا جانے کہ میٹرک کلاس میں پہنچنے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آدمی نے ایک نئی دنیا فتح کر لی ہو۔ آدمی خود کو بہت بڑا بڑا Feel کرتا ہے۔ Grown up پرائمری کلاسز کے بچوں کو کھیلتا کودتا دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ہمارے سامنے تو یہ ابھی بچے ہیں۔ بے چارے! بڑا ہوتے ہوتے بھی ابھی انہیں کئی سال لگیں گے۔ ہم تو بھی میچور ہوتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ نویں کلاس تک کے اسٹوڈنٹ ہمیں اپنے آگے زیرو نظر آتے ہیں۔ اصل ہیرو تو ہم ہیں۔

یہ خیال بڑا خوش کن ہوتا ہے کہ اس سال ہمیں سکول کو خیر باد کہہ دینا ہے اور سکول بوائز کے لقب سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ Men's College میں داخلہ لینا ہے۔

And how great it is to be called a man!

Boy سے نکل کر Man بننے کا خیال ہی بڑا! Fascinating ہوتا ہے۔

میٹرک کلاس میں آ کر ٹیچرز کی سختیاں اور پابندیاں بھی ذرا کچھ کم ہو جاتی ہیں۔ بہت سی چھوٹی موٹی غلطیاں کو ٹیچرز درگزر کر دیتے ہیں۔ شاید یہ سوچ کر کہ مہمان کلاس ہے، اب تو جانے ہی والی ہے اس پر کیا سختی کی جائے۔ ٹیچرز میٹرک کلاس کو ہر معاملے میں اہمیت بھی بڑی دیتے ہیں۔ چاہے اسٹوڈنٹس ویک منایا جا رہا ہو یا اسپورٹس ویک، چاہے ہیڈ پریفیکٹ چننے کا مرحلہ ہو یا سکول کو ری پریزنٹ کرنے کا معاملہ ہو، میٹرک کلاس آگے آگے ہوتی ہے۔

میٹرک کلاس میں آ کر آدمی خود کو بہت آزاد آزاد سا محسوس کرتا ہے۔ خاص طور سے سکول جب "کو ایجوکیشن" ہو تو اکثر آزادی کے کچھ انوکھے مظاہرے بھی سامنے آتے

ہیں۔

میں نے میٹرک کلاس میں آنے کے بعد خود کو معتبر اور بڑا بڑا تو Feel کیا تھا مگر آزادی کے ان اعلیٰ مظاہروں سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ کچھ فضول چیزوں سے مجھے اس وقت تک دلچسپی تھی نہیں کیونکہ میں ایک شریف لڑکا تھا، کم از کم اس وقت تک۔ میں نے دنیا اتنی زیادہ دیکھی ہی نہیں تھی نہ حقیقتوں کا ادراک ہی تھا مجھے۔ کچھ حقیقتوں کو جاننے کا مجھے شوق بھی نہ تھا۔ کیونکہ میرے دن بھر کا شیڈول ہوتا ہی اتنا سخت تھا کہ مجھے اِدھر اُدھر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ فجر کی نماز کے وقت مجھے اٹھنا ہوتا تھا۔ ہمارا گھرانا مذہبی اور صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے اور ہمارے گھر میں اس پر خاصی سختی سے عمل درآمد بھی ہوتا ہے، سو فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مجھے سکول جانے کی تیاری کرنی ہوتی تھی، پونے سات بجے سکول کے لیے بھاگنا ہوتا تھا۔ ڈھائی بجے سکول سے آ کر کھانا کھاتے ہی کوچنگ کے لیے بھاگنا پڑ جاتا۔ کوچنگ سے فارغ ہوتا تو کراٹے کلب چلا جاتا، گھر آتا سکول سے ملنے والا کام کرتا۔ کوچنگ کے لیکچر دہراتا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹہلتا اور نماز پڑھ کر سو جاتا۔

یہ میرا اپنا مرتب کردہ روٹین تھا جس سے میں ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہوتا جب کہ ہم تین بھائیوں کے لیے زندگی کو طریقے سے، ایک طے شدہ طریقے کے مطابق گزارنے کے سنہری اصول ابو اور امی پہلے ہی مرتب کر چکے تھے۔

میں ان دنوں چار سال کا ہوں گا جب بڑے بھائی فرسٹ ایئر اور چھوٹے بھائی نائنتھ میں آئے تھے۔ امی مجھے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں اور دوسری ذمہ داریوں کو اٹھاتے اٹھاتے آدھی ہو جاتیں حالانکہ ابو ایک غیر ملکی فرم میں مارکیٹنگ ڈائریکٹر تھے اور سال میں دو تین مہینے تو ان کے ملک سے باہر گزرتے تھے۔ ملازم افورڈ کر لینا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر امی ملازموں پر شروع سے بھروسہ نہیں کرتی تھیں۔ پھر جب ابو نے یہ دیکھا کہ ان پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے تو انہوں نے اپنے احکامات جاری کر دیے۔

"بچے نائنتھ میں آجانے کے بعد امی کو اپنے کسی کام کے لیے تنگ نہیں کریں گے۔ بچے اپنا ہر کام خود کریں گے۔ اپنے کپڑوں پر خود استری کریں گے۔ اپنے کپڑے خود دھوئیں گے۔ اپنے جوتے خود پالش کریں گے۔ اپنا کمرہ خود صاف کریں گے اور باقی گھر بھی امی گھر کا کوئی کام نہیں کریں گی، صرف کھانا پکائیں گی۔"

اگر ابو نے یہ احکامات جاری کیے تھے تو ٹھیک تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی ایسی ہی [illegible] اور خود ہمارے سامنے مثال تھے۔ ابو کے احکامات جاری ہونے کے باوجود [illegible] لینے کی عادت نہ تھی۔ وہ تب بھی گھر کے بیشتر کام خود کرلیا کرتی تھیں۔ ابو [illegible] بھی تھے۔

[illegible] میں نائنتھ میں آیا تو امی نے مجھے بلا کر کہا۔ "افنان بیٹے! اب آپ نائنتھ [illegible] ہو گئے ہیں۔ تمہارا اپنے بڑے بھائیوں کو Follow کیجیے۔"

اس کے بعد انہیں مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔

[illegible] Calculated بھی۔ میری دوستیاں محدود تھیں۔

شہباز میرا اکلوتا دوست تھا اور وہ بھی میری ہی طرح کا تھا۔ ہم میں بھی دوستی بھی بے حد تھی۔ البتہ اس کی ایک عادت سے مجھے بے حد چڑ تھی۔ اسے فلمیں دیکھنے کا بڑا کریز تھا۔ اس بات سے بالکل قطع نظر کہ وہ چاہے سرحد پار کی فلمیں ہوں یا سات سمندر پار کی۔ فلموں کے بارے میں اس کی معلومات بڑی اپ ٹو ڈیٹ ہوتی تھیں۔ ہر Latest ریلیز کا اسے پتا ہوتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود بھی اس کی [illegible] اور دیگر مصروفیات وغیرہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ نائنتھ میں اگر میری پرسنٹیج کلاس میں سب سے زیادہ تھی تو شہباز کی دوسرے نمبر پر تھی۔

مجھے فلموں کا نہ شوق تھا نہ دلچسپی، میں تو ٹی وی دیکھنے سے بھی زیادہ بہتر سو جانا سمجھتا تھا۔ البتہ شہباز کے بے حد اصرار پر میں وی سی آر پر کوئی ایسی فلم بھی دیکھ لیا کرتا تھا جس کی میں نے شہباز کے منہ سے بے حد تعریف سنی ہوتی تھی۔ اس میں سرحد پار کی یا سات سمندر پار کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ویسے شہباز ہر مووی کی تعریف کرتا بھی نہیں تھا۔ اسے کوئی کوئی فلم ہی اچھی لگتی تھی۔ اس معاملے میں اس کا Taste بڑا اچھا تھا۔ ان میں زیادہ تر فلمیں عموماً صاف ستھری ہوتی تھیں۔ اب اتنی تھوڑی بہت بکواس تو چل ہی جاتی ہے۔ ویسے سرحد پار کی فلمیں مجھے زیادہ اپیل نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کی زیادہ تر فلمیں تو ماخوذ ہوتی ہیں۔ میں ماخوذ ٹائپ فلموں کے بجائے اوریجنل دیکھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

میری زندگی میں سب بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور سب کچھ اسی طرح ٹھیک ٹھاک چلتا رہتا بس ایک "اس" کے آجانے سے سب تلپٹ ہو کر رہ گیا۔

☆======☆======☆

میں ابھی آٹھویں جماعت میں آئی ہی تھی کہ یکا یک پابندیوں کی زد میں آ گئی۔
''الماس ٹھیک طرح سے چلو۔''
''الماس دوپٹہ تمیز سے اوڑھو۔''
''الماس کتنی ٹائٹ شرٹ پہن رکھی ہے، جاؤ چینج کرو۔''
''الماس لڑکیوں کو اتنی زور سے نہیں ہنسنا چاہیے۔''
''الماس اب سائیکل چلانا اور لڑکوں والے کھیل کھیلنا بند کر دو۔''
''الماس گھر کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹایا کرو۔''
اور خاص طور سے امی کے جس جملے سے مجھے نفرت کی حد تک چڑ ہو گئی تھی وہ یہ تھا۔
''الماس اب تم بچی نہیں رہ گئیں، بڑی ہو گئی ہو۔''
مجھے ان دنوں لگتا تھا کہ جیسے ساری ''حدیں'' مجھ پر ہی لگنے کے لیے رہ گئی ہیں۔ الماس لڑکی نہیں، کوئی مصیبت ہے، کوئی مشکل ہے۔ ویسے میرا اصل نام الماس ہے بھی نہیں۔ یہ تو نانی کا دیا ہوا نام ہے جس کے سب اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ مجھے اب اسی نام سے پکارنے لگے ہیں اور ''جواہر ہشام'' اب صرف ڈاکیومنٹس تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے یا پھر میرے سکول میں اور میری فرینڈز مجھ کو جواہر کہتی تھیں۔
''جواہر ہشام'' یعنی کہ مجھے...... پورے دس برس تک اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کا شرف حاصل رہا۔ دس برس بعد ہمارے دو بھائی صاحبان اچانک زمین پر ٹپکنے والے بارش کے قطرے کی طرح میری دنیا میں آ گئے۔ اس سے میری اکلوتی حیثیت میں زبردست شگاف پڑ گئے۔ پھر بھی بڑی آپی ہونے کی وجہ سے میرا اپنے دونوں بھائیوں پر خاصا رعب تھا مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ اگر امی کی ڈانٹ پھٹکار کا یہی عالم رہا تو رہا سہا رعب بھی جاتا رہے گا۔ لہٰذا بادلِ نخواستہ اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ان حدوں کی پابندی کرنی پڑی۔
بچپن سے نکل کر لڑکپن کی کیفیت کچھ اس قدر لطیف نہیں تھی۔ مجھے تبدیلیاں پسند نہیں آتیں اور اپنا آپ تو مجھے زہر لگنے لگا تھا۔ میں شکل سے بے شکل ہوتی جا رہی تھی مگر جب کوئی چیز سر پر مسلط ہو ہی گئی تھی تو چیلنج کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں خود بخود راہِ راست پر آنے لگی۔ امی کے کہنے سننے میں بھی کمی آنے لگی، جب انہوں نے مجھے لائن پر آتا دیکھا۔ البتہ ان دنوں میں بے زار بہت رہا کرتی تھی۔

خود سے بے زار، گھر سے بے زار، لوگوں سے بے زار...... ہاں۔ سکول میں گزرنے والا وقت مجھے کسی نعمت سے کم نہیں لگتا تھا۔ میرا دھیان کافی حد تک بٹ جایا کرتا تھا۔ گھر میں آتے ہی چڑچڑاہٹ مجھ پر مسلط ہو جاتی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ باقی تمام وقت بھی سکول میں رہا کروں۔ گھر میں چڑچڑاہٹ مجھے اس لیے بھی ہوتی تھی کہ امی اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ ابو آفس سے آٹھ بجے آتے۔ دونوں بھائی چھوٹے تھے جن سے نہ بات کی جا سکتی تھی اور نہ ہی ان سے کھیلنے کو دل چاہتا تھا۔ وہ دونوں تو آپس میں ہی اس قدر مگن رہتے تھے کہ انہیں کسی تیسرے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔
اپنے گھر کے برعکس مجھے نانی کے گھر زیادہ مزا آتا تھا یا شاید میں شروع ہی سے زیادہ تر وہیں رہی تھی۔ اس لیے میں زیادہ خوش وہاں رہتی تھی۔ نانی کے ہاں سب لوگ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہاں پر مجھ پر کسی قسم کی کوئی پابندی اور روک ٹوک نہیں تھی۔ نانی اور مہر خالہ مجھے ڈانٹتی بھی تب ہی تھیں جب بہت حد ہو جاتی تھی۔ نانا تو بے چارے کچھ کہتے ہی نہیں تھے اور میرے ایک ہی ماما تھے، سب سے اچھے مجھے وہی لگتے تھے لیکن وہ اپنی جاب کی وجہ سے اکثر دیر سے گھر آتے پھر بھی اگر میں سو نہیں گئی ہوتی تو ان سے خوب لاڈ اٹھواتی۔ سب کہتے تھے کہ ماما بہت غصے والے ہیں مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میری ساری فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ مجھے ان کے بغیر چین نہیں پڑتا تھا اور انہیں بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ جب نانی کے گھر گئے مجھے بہت دن ہو جاتے تھے تو ماما خود ہی مجھے لینے کے لیے پہنچ جاتے۔
اوہ...... بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ میں سکول کا ذکر کر رہی تھی۔ سکول میں ہمارا اچھے دوستوں پر مشتمل گروپ تھا۔ ہم ساری فرینڈز آپس میں بہت کلوز تھیں۔ ہم میں تقریباً ہر بات ڈسکس ہو جاتی تھی اور بہت زیادہ پرسنل بھی...... میں سن تو سب کی لیتی تھی مگر خود اپنی پرسنلز ڈسکس کرنے سے Avoid ہی کرتی تھی۔ میری ساری فرینڈز بے حد شارپ تھیں اور اس کی زیادہ تر وجہ سرحد پار کی فلمیں تھیں، کافی حد تک آزاد اور بے باک! اور میری فرینڈز متاثرین میں سے تھیں۔ وقت سے پہلے بہت میچور اور بڑی بڑی۔
ہمارا سکول ''کوایجوکیشن'' تھا، لڑکیوں لڑکوں کے افیئرز تو وہاں بہت عام سی بات تھی۔ اس ضمن میں میٹرک کلاس سب سے آگے تھی۔ کیونکہ سینئر کلاس تھی لہٰذا آئے دن کوئی نہ کوئی سنسنی خیز واقعہ آن ایئر جا ہی رہا ہوتا تھا۔ طرح طرح کی خبریں سننے کو ملتیں۔ ہم ہر خبر بڑے مزے لے لے کر ڈسکس کرتے۔ ایک مرتبہ ہم نے سنا کہ میٹرک کلاس

کی فلاں لڑکی اور فلاں لڑکا واش روم میں ایک ساتھ پائے گئے اب اللہ جانے کیا کرتے پائے گئے۔ بہر حال تب یہ خبر سن کر میں اور میری فرینڈز بڑا ہنسی تھیں۔ کہ وہ ساتھ پائے جانے کے لیے بھی صرف سکول کا واش روم ہی رہ گیا تھا، پورے سکول میں کوئی اور ڈھنگ کی جگہ نہیں تھی؟ ویسے سکول کا واش روم بھی ایک کلاسیکل جگہ ہوتی ہے۔ جو واش روم کم اور اشتہار گھر زیادہ لگتا ہے۔ وہاں کیا کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ ہر دن ایک نئی تحریر کا اضافہ نظر آتا ہے۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ ایک لڑکے کو کسی کو یہ بتانے کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ہوتی ہی نہیں کہ .... I love

اور یہ تو خیر بڑا معصوم سا بے ضرر سا جملہ ہے۔ وہاں کی دیواروں پر تو مستقبل کے سارے نقشے کھینچے ہوتے ہیں۔ خاندان بھر کی منصوبہ بندی موجود ہوتی ہے۔ بچوں تک کے تذکرے پائے جاتے ہیں۔ پلس اور از یکول ٹو کا استعمال میتھس کی کتابوں میں تو کم اور واش روم کی دیواروں پر زیادہ ہوتا ہے۔

میٹرک کلاس جتنی سینئر ہوتی ہے اتنی ہی "چالو" ہوتی ہے اور 9th کلاس میٹرک کلاس کو Follow کرتی ہے۔ پھر 8th کلاس کیوں کسی سے پیچھے رہے خاص طور پر وہ جس پر سرحد پار کی فلموں کا گہرا اثر ہو۔

اس کی تازہ مثال رابعہ تھی۔ جو میرے ہی گروپ کی تھی۔ پورے گروپ میں میری سب سے زیادہ دوستی اسی سے تھی۔ حال ہی میں اس کی 9th کلاس کے لڑکے فیضان سے دوستی ہوئی تھی۔ اس کے بعد تو بس ساری دنیا پر فیضان ہی محیط تھا۔ رابعہ کی ہر بات فیضان سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ مجھے لگتا کہ دونوں کے درمیان دوستی تو نہیں، کوئی دوسرا ہی افیئر ہے۔ فیضان، رابعہ کو خاصے قیمتی گفٹ دیتا تھا اور ہر اہم Occassion پر کارڈز کا تبادلہ ہوتا۔ موقع بے موقع گلاب دیے جاتے۔ فیضان رابعہ کو خاصے بامعنی اور Attractive کارڈز دیا کرتا تھا اور رابعہ نہایت فخر سے مجھے دکھایا کرتی تھی۔

وہ بھی کوئی Occassion تھا جب فیضان نے رابعہ کو کارڈ دیا تھا اور سرخ گلاب بھی...... میری تو آنکھیں اس کارڈ کو دیکھ کر ہی پھٹ گئی تھیں۔ کارڈ کے تین فولڈز تھے۔ سب سے اوپری فولڈ پر ادھ کھلا سرخ گلاب تھا۔ دوسرے پر ایک بچہ ایک بچی کو گلاب دے رہا تھا اور تیسرے فولڈ پر جو کچھ تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے تو سن دماغ کے ساتھ اسے کارڈ واپس کر دیا اور رابعہ کے پوچھنے پر کہ "کیسا ہے؟" میں نے منہ بنا کر

کہا۔ "نہایت بے ہودہ!"

جواباً رابعہ کھل کھلا کر ہنسی تھی اور مجھے اس کی ہنسی زہر لگی تھی۔ رابعہ نے مجھ سے کہا۔ "پچھ...... بے وقوف، کارڈ میں جو اشارہ دیا جا رہا ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اس کی اس بات پر میں نے غور سے اسے دیکھا۔ رابعہ مسکرا رہی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں تھا کہ رابعہ اچھی لگ رہی تھی، اس وقت۔ وہ خود پر پہلے سے زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ اس میں کافی اسٹائل آتا جا رہا تھا۔ اس کی ادائیں دیکھ کر مجھے کچھ کچھ کیا، بلکہ بہت کچھ ہوتا تھا۔

چال میں کشش، آواز میں خمار...... باتوں میں نشہ...... ہنسی میں ترنم...... آنکھوں میں ستارے...... ہونٹوں پر تبسم ختم ہو کر نہیں دیتا تھا۔

رابعہ کے علاوہ باقی فرینڈز کی دلچسپیاں پہلے تو صرف فلموں تک ہی محدود تھیں۔ مگر بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ باقی بھی رابعہ سے متاثر نہ ہوتیں اور اس کے نقش قدم پہ نہ چلتیں۔ آخر خربوزہ ہی خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ رانی اور فاخرہ نے بھی اپنے دوست ڈھونڈ لیے تھے۔ شمع اور نرگس کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی منگنی شدہ تھیں۔ ان کے پاس سنانے کے لیے اپنے منگیتروں کے قصے کچھ کم نہیں تھے۔ رہ گئی میں تو ان سب کے چاہنے والوں کے قصے سن سن کر مجھے تو بوریت ہونے لگی تھی۔ جب رابعہ تمتماتے ہوئے چہرے اور جوشیلے انداز میں اپنے تجربات مجھ سے شیئر کر رہی ہوتی تو میں گال پر ہاتھ جمائے بس اس کی شکل دیکھا کرتی تھی۔

فیضان مجھے زہر لگا کرتا تھا۔ مگر میرے زہر لگنے سے رابعہ کی صحت پر بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ ایسا بالکل نہیں تھا کہ میں رابعہ کی باتوں میں دلچسپی لیا کرتی تھی بلکہ میں تو ان دنوں صرف اپنی بے زاری سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔

انہی دنوں مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہماری کلاس کے رازی صاحب مجھ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کی طرف دھیان دلانے والی بھی رابعہ ہی تھی۔ مرگھلا سا رازی، اس کے بعد سے مجھے زہر لگنے لگا تھا لیکن یہ سچ تھا کہ وہ مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر بار جب وہ مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کرتا تو میرا لہجہ بالکل پتھر مار ہو جاتا۔ "کیا ہے؟" اور وہ جواباً ہکلا کر رہ جاتا۔

رابعہ کو جب میری حرکت کا پتا چلا تو اس نے مجھے خوب لتاڑا لیکن یہاں پروا کس کو تھی۔ نتیجتاً یہ ہوا کہ رازی صاحب پر چڑھا بھوت خود بخود اتر گیا۔ وہ خود ہی ٹھیک ہو گیا۔

آہستہ آہستہ مجھے رابعہ کی باتوں سے بھی الجھن ہونے لگی۔ جب وہ فیضان کا ذکر کر رہی ہوتی تو میرا دل چاہتا کہ اس کے منہ پر زپ لگا دوں اور اس کے سرے پر بڑا سا، نہ کھلنے والا تالا بھی ڈال دوں۔ اکثر اوقات میں چڑ کر اس کو بس کرنے کو بھی کہہ دیتی تھی مگر تب مجھ پر نئے سرے سے بے زاری طاری ہو جاتی اور اب کی مرتبہ یہ صرف بے زاری نہیں تھی۔ بلکہ میں خود ترسی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

جب میرا مزاج بہت برا ہو گیا تو اس دن نہ جانے کیا سوچ کر میں ابو کے پاس گئی اور ان سے نانی کے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ حالانکہ میں ہفتہ بھر ادھر رہ کر دو دن پہلے ہی واپس آئی تھی۔ ابو نے چند لمحے کو سوچا پھر اجازت دے دی۔ میں نے نانی کے گھر فون کیا تو ماما مجھے لینے کے لیے آ گئے۔ ابو سے کہہ کر تو میں دو دن کے لیے آئی تھی لیکن تیسرے دن نانی نے ابو کو فون کر دیا کہ ہم الماس کو ابھی نہیں بھیج رہے۔ یہ کچھ دن مزید ادھر ہی رہے گی۔ میری تو گویا عید ہو گئی۔ شام میں ماما آئے تو ان کے ساتھ مل کر خوب مزے کیے۔

اگلے دن جب میں سکول سے واپس آئی تو عجیب واقعہ ہوا۔ ہماری نانی فلیٹ میں رہتی ہیں...... جونہی میں مین گیٹ سے کمپاؤنڈ کے اندر داخل ہوئی تو اسی دم ایک لڑکا باہر نکل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ میں بھی نانی کے گھر آ گئی اور بھول بھال بھی گئی کہ واقعہ کیا ہوا تھا مگر اگلے ہی دن پھر ایسا ہوا۔ میں آ رہی تھی اور وہ جا رہا تھا۔ میں نے اس کو بھی اتفاقیہ واقعے کے طور پر لیا مگر ہوا یوں کہ لگاتار ہفتے بھر تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ بیچ میں چھٹی کے دو دن آ گئے۔ ہفتہ اور اتوار۔ پیر کو پھر وہ اسی وقت نکل رہا تھا جب میں اندر آ رہی تھی۔ اب کی بار اس نے مجھے دیکھا تو مسکرا دیا۔

میں نے اسے مسکراتے دیکھا تو ہونق ہو گئی اور غڑاپ سے نانی کے گھر چلی آئی۔

اسی دن ابو مجھے لینے کے لیے آ گئے۔

''الماس بھئی۔ امی، ابو، بھائی یاد نہیں آتے کیا؟'' ابو نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ میں چپ سی ہو گئی۔ ''گھر نہیں چلنا کیا؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔

''چلیے۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''ارے بھئی اگر بچی نہیں جانا چاہتی تو اسے مت لے کے جاؤ، ہشام۔''

نانا نے فوراً کہا تھا۔ ابو ایک دم مجھے دیکھنے لگے۔

''میں پھر آ جاؤں گی نانا۔'' میں نے انہیں تسلی دی اور ابو کے ساتھ چلی آئی۔

اگلے دن جب میں سکول سے گھر واپس آئی تو نہ جانے کیوں مجھے کل کا واقعہ یاد آ گیا۔ ٹائم وہی تھا۔ مجھے ایک دم خیال آیا، آج بھی وہ آیا ہو گا۔ یقیناً!

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اپنی یہ کیفیت میری سمجھ سے باہر تھی۔

☆======☆======☆

وہ اچانک میری زندگی میں آئی اور اچانک غائب بھی ہو گئی۔

میں نے پہلی مرتبہ اسے تب دیکھا جب میں اپنے دوست شہباز کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ اصل میں شہباز وغیرہ نئے نئے ان فلیٹس میں شفٹ ہوئے تھے اور شہباز کا کافی دن سے اصرار تھا کہ کسی دن واپسی پر میں اس کے ساتھ چلوں۔ حالانکہ شہباز کے فلیٹس میرے گھر کے راستے میں پڑتے تھے پھر بھی کئی بار میں اس کو ٹال دیتا تھا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا۔ مجھے پندرہ منٹ کی بھی دیر ہو جائے گی تو کوچنگ سے لیٹ ہو جاؤں گا لیکن اس دن شہباز نے اس قدر اصرار کیا کہ مجھے اسے ٹالتے ہوئے شرمندگی ہونے لگی۔ شرمندگی مجھے اور زیادہ یوں بھی ہو رہی تھی کہ جب سے وہ یہاں شفٹ ہوا تھا، صبح کو وہ میرے گھر آتا تھا حالانکہ اسے الٹا پڑتا تھا۔ ہم دونوں پھر ساتھ ہی سکول جاتے تھے۔

میں نے اس دن اس کے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لی۔ اس نے سکول سے واپسی پر مجھے اپنا گھر دکھایا۔ میں اس کے ساتھ وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگا مگر دیر محسوس کرنے پر اپنے گھر آ گیا۔ پھر یہ میرا معمول بن گیا۔ اس دن بھی شہباز کے گھر کے باہر کھڑے کھڑے ہم لوگ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب جو میں نے گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو خیال آیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس سے اجازت لے کر میں مین گیٹ سے باہر نکلنے لگا تو اسی وقت ''وہ'' اندر آ رہی تھی۔ میں اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ پھر مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ کسی لڑکی کو دیکھا تھا۔

اگلے دن واپسی پر میں پھر شہباز کے ساتھ تھا۔ اس سے باتیں واتیں کر کے آرام سے میں جب گھر روانہ ہوا تو وہ پھر مجھے مل گئی۔ میں اسے ایک نظر دیکھ کر گزر گیا۔ یہ سوچ کر کہ اتفاق کی بات ہے۔ اتفاقات تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن ہفتے بھر تک ہونے والے اس واقعے کو میں اتفاق سمجھنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اسی لیے جب وہ مجھ کو پیر کو نظر آئی تو میں اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ بس میری اس مسکراہٹ کی عمر تھوڑی ہی تھی۔ کیونکہ اگلے دن ''وہ'' غائب ہو گئی تھی۔ اگلے دن کیا۔ پھر تو وہ مجھے ایک ہفتے بلکہ دو

وقت تک نظر نہیں آئی۔

اور میرے مزاج پر نہ جانے کیوں نامعلوم سی بے چینی مسلط ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ میری سولہ سالہ زندگی میں بیسیوں لڑکیاں میری نظر سے گزری تھیں۔ خود میری کلاس میں بتیس دانتوں کی طرح بتیس لڑکیاں موجود تھیں مگر میں نے کبھی کسی لڑکی کو قابلِ اعتناء جانا ہی نہیں تھا۔ پھر پتا نہیں کیوں میں اس لڑکی کے پیچھے مر رہا تھا جس کا نام پتا تک مجھ کو معلوم نہ تھا۔

مجھ پر بے کلی طاری تھی۔ ان دنوں میرا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ طبیعت عجیب سست سست سی رہتی تھی۔ میرا کوچنگ جانے کو نہیں دل چاہتا تھا اور نہ ہی کراٹے کلب۔ جسے میں نے بہت خوشی سے جوائن کیا تھا۔ میرا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

عین انہی دنوں ڈش انٹینا بھی ہمارے شہر میں اچانک حملہ آور ہو گیا تھا۔ ایسے ہی جیسے کوئی Viral Fever جو اچانک ہی شہر بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور لوگ بلا تخصیص اس کے متاثرین میں سے ہو جاتے ہیں۔ شہباز بہت پہلے ہی مجھ سے اس کا تذکرہ کر چکا تھا۔

"اب تو تمہارے مزے آ گئے یعنی بالکل کام سے گئے اور اب تو اوقات کار بھی مقرر نہیں ہوں گے۔"

میں نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے ڈش کے پروگرامز کا تذکرہ سن کر کہا تھا۔ وہ بڑی زور سے ہنسا تھا۔

"ارے نہیں! تفریح کی چیز ہے، تفریح کی حد تک ٹھیک ہے۔ میں کسی چیز کو بھی خود پر سوار نہیں کیا کرتا اور نہ ہونے دیتا ہوں۔"

میرے بڑے بھائی کاشان عادل اور چھوٹے بھائی سمعان عادل نے بھی ابو سے فرمائشیں کر کر کے ڈش انٹینا لگوا لیا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ دونوں ہی خاصی مصروف شخصیات تھیں۔ میرے بڑے بھائی نے ایم بی اے کر رکھا تھا اور ملٹی نیشنل کمپنی میں ایگزیکٹو پوسٹ پر تھے۔ شام سات بجے سے پہلے ان کی آفس سے واپسی نہیں ہوتی تھی۔

چھوٹے بھائی سی اے کر رہے تھے، شام میں کوچنگ سینٹر میں کامرس کی کلاسز لیتے تھے۔ وہ بھی آٹھ نو بجے سے پہلے گھر واپس نہیں آتے تھے۔ رہ گیا میں، تو میں ٹی وی دیکھنے کو وقت کا زیاں ہی سمجھتا تھا۔ پھر ان دنوں تو میری دلچسپیاں صفر ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔ مجھے

[illegible] ہوئی تھی۔ شہباز کی کمپنی میں بھی مزا نہیں آتا تھا۔ کئی بار [illegible] تھا اور میں صرف ہوں ہاں کر کے رہ گیا تھا۔ میں ان دنوں چڑچڑا [illegible] تھا۔ ایک دم چڑچڑا۔

[illegible] گھر والوں نے میرے رویے کی اس تبدیلی کو بہت جلدی محسوس کر لیا۔ [illegible] میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور بہت لاڈلا بھی۔ شوخی، شرارتیں، [illegible] میرے مزاج کا حصہ تھی۔ سب کو قدرتی طور سے بے حد تشویش ہوئی تھی۔ سب نے بے حد پوچھا بھی تھا۔ اب کوئی ڈھنگ کی بات ہوتی تو میں کسی کو بتاتا بھی... [illegible] بے حد کریدنے پر بھی میرے پاس ٹالنے کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا۔ گھر والے بھی ایک حد تک پوچھ سکتے تھے۔ بالآخر وہ بھی پوچھ پوچھ کر تھک گئے اور پھر پوچھنا بند کر دیا۔ میں نے بھی بڑی کوشش کی تھی کہ خود کو سنبھال سکوں اور میں اپنی اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر تب مجھے چپ لگ گئی تھی۔

"کوئی بات ہے تو ضرور۔"

[illegible] بھائی جن سے میں بے حد قریب تھا۔ مجھے سب سے اچھے لگتے تھے۔ میں ان کی بات بھی بے حد [illegible] تھا۔ انہوں نے اس دن مجھ سے یقین سے کہا تھا۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو دوسری بات ہے۔"

میں نے ان کی اس بات پر اعتراف تو کیا تھا کہ ہاں ایسا ہی ہے مگر پھر بھی ان [illegible] نہیں تھا اور اسی رات جب کہ میں ٹی وی لاؤنج سے گزر کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا تو بڑے بھائی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک نظر سکرین پر ڈالی۔ سمندری حیات سے متعلق اس منظر نے میرے قدم روک لیے۔ میں رک کر دیکھنے کھڑا ہو گیا۔

[illegible] اور سمندری حیات کے متعلق جاننے کا مجھے بڑا تجسس [illegible] کی اقسام، ان کی خوراک، دشمنوں سے بچاؤ کے طریقے۔ یہ سب مجھے بہت Fascinate کرتے ہیں۔ اسی ڈاکیومنٹری میں، میں نے پہلی بار Hammer head fish بھی دیکھی جس کا Head واقعی Hammer کی طرح تھا۔

"یہ کیا آ رہا ہے، بڑے بھائی؟"

مجھے ایک دم تھوڑی دلچسپی ہو گئی اور میں بڑے بھائی سے پوچھے بغیر رہ نہیں سکا [illegible]

"یہ میرین لائف" کے نام سے ڈاکیومینٹری آرہی ہے۔"

"اچھا..... میں دیکھ لوں؟" میں نے بڑے بھائی سے گویا اجازت لی تھی۔

"ہاں ضرور..... آؤ ناں..... بیٹھو" بڑے بھائی نے صوفے کی دوسری طرف ہوتے ہوئے مجھے بیٹھنے کی جگہ دی۔ میں ان کے برابر جا بیٹھا۔

"تم کہاں سے آرہے ہو..... اور کہاں جارہے تھے؟" انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھ کر دوبارہ اسکرین پر نظر جمائے ہوئے پوچھا۔ جس پر اب بلائنڈ ڈولفن کو دکھایا جارہا تھا۔

"میں نماز پڑھ کے آرہا تھا اور اب یونیفارم استری کرنے جارہا تھا۔" میں نے اسکرین پر نظر جمائے ہوئے جواب دیا۔

اس لمحے میں بالکل یہ بات بھول گیا تھا کہ میں کسی وجہ سے چڑچڑا اور بے زار بھی تھا۔ ایک موقعے پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ "انٹرسٹنگ!"

بڑے بھائی بے اختیار مسکرائے، وہ مجھے ان بلائنڈ ڈولفنز کے بارے میں کچھ مزید معلومات بھی دیتے جارہے تھے۔ میں متاثر ہوگیا تھا۔

"بڑے بھائی۔ یہ پروگرام کب آتا ہے؟" میں نے فوراً پوچھا تھا۔

"آتا ہی رہتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر بتایا۔

"یہ تو بڑے کام کی چیز ہے بڑے بھائی" میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ہاں ہے تو مگر تم جانتے ہو ناں، زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔" بڑے بھائی نے کہا تھا۔

تبھی چینل پر اشتہار آنے لگے تو انہوں نے قومی چینل لگا دیا۔ ایک گھنٹے کی ڈاکیومنٹری میں تین چار بار انہوں نے ایسا ہی کیا مگر میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں ساتھ ہی ساتھ ڈاکیومنٹری پر تبصرے بھی کرتے جارہے تھے۔

"اتنے دن سے موڈ آف کیوں تھا تمہارا؟"

بڑے بھائی نے بیچ میں اچانک پوچھ لیا تھا اور مجھے ایک دم چپ لگ گئی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے بمشکل کہا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔" انہوں نے مجھے اٹھتا دیکھ کر کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔ "پھر کبھی دیکھ لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔

[illegible] جانے والوں میں سے تھا۔ اس رات پہلی بار گیارہ بجے میں نے [illegible] یونیفارم پر استری کیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے سونے لیٹا تو صبح فجر پر نہ اٹھ سکا۔

[illegible] مضطرب ہو گیا تھا میرا.....

اور اس کی [illegible] "وہ" تھی۔

میں اس کی وجہ سے مضطرب تھا۔

اس دن میرا اسکول جانے کو بھی قطعاً دل نہ چاہا۔ بادل نخواستہ سکول گیا تھا اور سکول سے واپسی پر میں شہباز کے ساتھ چلا تو آیا تھا اگرچہ دل بالکل نہ چاہتا تھا۔

اور اسی دن واپسی پر "وہ" مجھے نظر آگئی تھی۔ اس دن اسے دیکھ کر مجھے اپنی تمام [illegible]..... سب بھول گئی تھی۔

"تم اتنے دنوں سے کدھر تھیں؟ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔"

جب وہ میرے قریب سے گزری تو میں کہے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے بڑے [illegible] پوچھا تھا۔

"کیوں بھلا؟"

اور اس "کیوں بھلا" کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ہاں..... میں یہ ضرور سوچ [illegible] عجیب ہے یہ کس لڑکی ہے، میں ایک اتنی اچھی سی بات کہہ رہا ہوں اور یہ مجھ سے [illegible] سوال کر رہی ہے۔

پھر..... اس دن اس کو دیکھ لینے کے بعد میں بڑا سرشار سا گھر واپس آیا۔ معمول کے مطابق [illegible] سارے کام کیے۔ سارے کام ہو جانے کے باوجود وقت گزرتے نہیں گزر رہا تھا۔ مجھے شدت سے کل کا انتظار تھا۔

اگلے دن میں نے پھر اسے دیکھا تو پوچھا۔ "کیوں بھلا، سے تمہاری کیا مراد تھی [illegible]"

"[illegible]" اس نے رکھائی سے کہہ کر قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔

"میں تم کو کہاں تنگ کر رہا ہوں۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تنگ تو تم نے مجھ کو کر رکھا ہے۔"

میرا لہجہ [illegible] سا ہو گیا اور مجھے یہ کہتے ہوئے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ [illegible] الفاظ ذہن کے کس گوشے اور زبان کے کس حصے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ میں تو [illegible] گھر سے [illegible] کہیں دیکھا کرتا تھا۔

''چوکیدار دیکھ رہا ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور سامنے والے بلاک میں گھس گئی۔

میں حسرت زدہ سا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک مجھے احساس ہوا کہ چوکیدار صرف مجھے دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ بری طرح سے گھور رہا تھا۔ میں اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر گیٹ سے باہر نکل آیا۔

اگلے دن میں نے شہباز سے معذرت کر لی کہ واپسی پر آج میں اس کے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ شہباز نے وجہ پوچھی تو میرے پاس آئیں بائیں شائیں کرنے کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا۔ شہباز نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور اکیلا چل دیا۔

اس کے روانہ ہونے کے دس منٹ بعد میں سکول سے نکلا تھا۔ جب شہباز کے فلیٹس آ گئے تو میں گیٹ سے خاص فاصلے پر رک گیا۔ اس جگہ درخت بکثرت ہونے کی وجہ سے چوکیدار کی پہنچ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ بعد بالآخر وہ مجھے آتی دکھائی دی۔ مجھے باہر کھڑا دیکھ کر یقیناً وہ حیران ہی ہوئی ہوگی۔ پھر بھی وہ مجھے نظر انداز کر کے آگے جانے لگی تو میں نے جلدی سے اس کا راستہ روکا۔

''ارے پچھلے دس منٹوں سے تمہارے لیے کھڑا خوار ہو رہا ہوں۔ تم ہو کہ چلے چلی جا رہی ہو۔ رکے بغیر!''

میں جلدی جلدی کہتا رہا۔ وہ رکے بغیر چلتی رہی۔

''ہاں..... تو میں نے کہا تھا؟'' اس نے تلخی سے پوچھا تھا۔

''نہیں کہا تو کہہ دو۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اس نے رک کر بری طرح مجھے گھورا۔ ''چاہتے کیا ہو؟''

''تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے گھورنے کی رتی برابر بھی پروا کیے بغیر کہا۔ ''تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''مزاج درست کر دیا کرتی ہوں۔'' اس نے کڑک لہجے میں کہا۔

''میں بھی تیز مزاج کا لڑکا ہوں۔ اتنی آسانی سے مزاج درست نہیں ہوں گے میرے۔'' میں نے اس کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر لاپرواہی سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چلنے لگی۔

''اچھا..... نام تو بتاتی جاؤ۔'' میں نے گیٹ آتا دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

''الماس!'' خلاف توقع بڑا مختصر سا جواب آیا۔

''میں..... افنان۔''

میرے بتانے پر اس نے سر ہلایا۔ جب تک گیٹ آ چکا تھا۔ وہ اندر چلی گئی۔ میں رکے بغیر سیدھا چلتا رہا۔

☆=======☆=======☆

وہ عجیب ہی لڑکا تھا۔ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ میں یہ سمجھ رہی تھی کہ جس طرح رازی کو ٹھیک کیا تھا، اسے بھی ٹھیک کر دوں گی مگر وہ رازی کی طرح نہ تھا کہ میرے ذرا سے کڑک لہجے پر ہکلانے لگتا یا میرے گھورنے پر دبک کر بیٹھ جاتا۔ اس پر نہ تو میرے گھورنے کا اثر ہوا تھا نہ کڑک کر بولنے کا۔ حاضر جواب بھی بلا کا تھا۔ بالآخر مجھے ہی چپ ہوتے بنی تھی۔ الٹا میں اس سے متاثر ہو گئی تھی۔ وہ رازی کی طرح مرا ہوا چوہا نہ تھا بلکہ قد اور صحت میں اس سے کئی گنا زیادہ تھا۔ شاندار لگتا تھا۔

اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی۔ اس کی باتیں مجھے یاد آتی رہیں۔ کیسے مزے سے میرا نام پوچھا تھا اور کتنے آرام سے اپنا بتایا تھا۔

''افنان.....'' میں سوچتی رہی اور مسکراتی رہی۔

اگلے دن وہ پھر مجھے راستے میں کھڑا مل گیا۔ میں جو رات بھر اسے سوچتی رہی تھی اور سکول میں بھی میرا دل نہیں لگ سکا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر گھبراہٹ سوار ہو گئی۔ میں تیز تیز چلنے لگی۔

''ارے۔ یہ تم ہر وقت اتنی جلدی میں کیوں رہتی ہو۔'' اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''م..... مجھے ڈر لگتا ہے۔'' آج میں جواب دیتے ہوئے ہکلا رہی تھی۔

اس نے رک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ میں ''ہو بابا'' ہوں کیا؟''

اس نے جس انداز سے کہا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''اور کیا بچپن میں امی ڈرایا کرتی تھیں۔ شرارتیں کرو گے تو ''ہو بابا'' لے جائے گا۔''

میری رفتار بے اختیار ہلکی ہو گئی۔ وہ باتیں ہی ایسی کیا کرتا تھا، مزے دار اور عجیب انداز۔ اس کی باتوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس سے ہر روز ملنے لگی تھی۔ میں

خود اس سے نہیں ملتی تھی۔ وہ خود راستے میں مجھے ملتا تھا۔ راستے بھر ہونے والی باتوں کی وجہ سے راستے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

حالانکہ وہ جس جگہ کھڑا ہوتا تھا اس جگہ سے نانی کے گھر تک کا فاصلہ دس منٹ تک کا تھا لیکن اب وہ باوجود میرے آہستہ چلنے کے دو منٹ میں طے ہو جاتا تھا۔

ہر بار جب وہ مجھے گیٹ پر چھوڑ کر آگے بڑھتا تو رک کر کہتا ضرور تھا۔ ''یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ تم مجھے اتنی تھوڑی دیر کے لیے کیوں ملتی ہو۔''

ہر بار میں مسکرا دیتی۔

نانی کے گھر رہتے ہوئے مجھے ہفتہ بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ ابو مجھے لینے کے لیے آ گئے۔ میں انہیں دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ میں بھول ہی گئی کہ یہ میری مستقل رہائش گاہ نہیں۔ ابو مجھے کبھی بھی لینے کے لیے آ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے یہ پریشانی بھی کھائے جا رہی تھی کہ کل افنان جب مجھے لینے آئے گا اور مجھے نہ پائے گا تو کتنا پریشان ہو گا۔ میری اس مشکل کو نانی نے آسان کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ کل ہم خود ہی الماس کو بھجوا دیں گے۔ اس لمحے میں نے سکون کا سانس لیا۔

اگلے دن میں چپ چپ سی تھی۔ میری اسی خاموشی کو اس نے محسوس کر لیا، اس نے وجہ پوچھی تو میں نے ساری بات بتا دی۔ وہ بھی ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔ بعد میں اگرچہ اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا گیا تھا لیکن پھر بھی ایک قباحت تھی۔ وہ میرے سکول آنے کو کہہ رہا تھا۔

''لیکن میری فرینڈز میں سے کسی نے دیکھ لیا تو میرا بڑا ریکارڈ لگے گا۔'' میں نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔

''بتا نہیں رکھا تم نے اپنی فرینڈز کو میرے متعلق؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہ...... نہیں......'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔

''میرا نہیں دل چاہتا کہ میں تمہاری باتیں کسی اور سے کروں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اپنی فرینڈز سے بھی نہیں۔''

وہ بڑی زور سے ہنسا پھر کہا۔ ''میرا بھی کچھ ایسا ہی دل چاہتا ہے۔ میں نے بھی تمہارا ذکر کبھی اپنے اکلوتے دوست شہباز سے بھی نہیں کیا۔''

''اچھا...... تم سکول کی بیک سائیڈ پر آنا۔ ہاں وہاں ٹھیک رہے گا۔'' میں نے

اسے بتایا۔ ''بیک سائیڈ پر ریزیڈینشل ایریا ہے۔ وہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔''

''بیٹھ سکیں گے آرام سے؟'' اس نے پوچھا۔

''اور کیا کرنا ہے۔ باتیں ہی تو کرنی ہیں۔'' میں نے آرام سے کہا۔

''چلو کھڑے ہو کر سہی۔ پھر بیٹھنے کی جگہ ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔''

''اچھا...... تو بس پھر...... صرف پندرہ منٹ!''

یوں اس سے میرے ملنے میں کسی طرح کا بھی فرق نہیں آتا تھا۔ اگرچہ یہ سب باتیں مجھے زہر لگا کرتی تھیں لیکن میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان بے ہودگیوں میں انوالوڈ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس وقت اس بات کا بھی ڈر نہیں لگتا تھا کہ کسی نے اگر دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔

ہوتا رہے جو ہونا ہے۔ کچھ کام چوری کر کے کرنے میں ہی مزا آتا ہے اور گناہ میں تو یوں بھی بڑی لذت ہوتی ہے۔

اس سے ملنا اور باتیں کرنا مجھے اچھا لگتا تھا، میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ باتیں کرنا چاہتی تھی، اس کو دیکھنا چاہتی تھی، میں نہیں جانتی تھی کہ کیوں...... مگر بس، ویسے ہی...... بارہا میں نے سوچا اور بالآخر ایک دن اس سے پوچھ بھی لیا۔

''افنان...... ہم کیوں ملتے ہیں؟''

''اس لیے کہ ملنا اچھا لگتا ہے۔'' اس نے بغیر کوئی دیر کیے فوراً کہا تھا۔

''ملنا کیوں اچھا لگتا ہے؟'' میں نے ضد کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''اس لیے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''میں تم کو کیوں اچھی لگتی ہوں؟''

''اس لیے کہ تم اچھی ہو۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''اچھا، تم کو مجھ میں کیا اچھا لگتا ہے؟'' میں نے اب کی مرتبہ الفاظ بدل کر سوال پوچھنے کی کوشش کی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا تو پھر آہستگی سے کہا۔ ''تم تو مجھے پوری اچھی لگتی ہو۔''

''کیوں بھلا؟''

''کیوں کا کیا سوال...... تتلی کو پھول کیوں اچھا لگتا ہے۔ مچھلی کو سمندر کیوں اچھا لگتا ہے۔ چاند کا چمکنا کیوں اچھا لگتا ہے۔ پھول کا کھلنا کیوں اچھا لگتا ہے۔ اگر ان سب سوالوں کا جواب تم مجھے دے دو۔ تو میں تم کو بتا دوں گا کہ کوئی کسی کو کیوں اچھا لگتا

ہے۔'' اس نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ لاجواب ہو گئی۔

''اچھا...... تم کو میرے چہرے پر کیا چیز اچھی لگتی ہے۔'' میں نے سوال بدل کر پوچھا۔

وہ مجھ کو دیکھتا رہا۔ پھر شرارت سے مسکرایا۔

''کیا بتا دوں؟'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

''بتاؤ ناں۔'' میں نے بہت رعب سے پوچھا۔

''تو سن لو گی ناں؟'' اس نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''ارے افنان۔'' میں نے اسے گھورا۔

''اچھا تو دل مضبوط کر کے سننا۔۔۔ آہم...... تمہارے Pimples'' اس نے نہایت شرارتی انداز میں کہا۔

میں نے اس کے کندھے پر کئی مکے جڑ دیے۔

''ارے تم نے میری پوری بات تو سنی ہی نہیں۔'' اس نے خود کو بچاتے ہوئے کہا۔

''ایک تمہارے Pimples دوسرے تمہارے ڈمپلز۔''

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اور کافی دن تک مجھے یہ بات سوچ کر ہنسی آتی رہی۔

☆=======☆=======☆

میرے پوچھنے پر جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ 8th کلاس میں ہے تو میں حیرت میں پڑ گیا تھا، کیونکہ وہ اپنی عمر سے بہت بڑی دکھائی دیا کرتی تھی۔ اس کا قد تاڑ جیسا تھا لیکن اس کے تاڑ جیسے قد میں بھی بے حد کشش تھی۔ اس کی گوری رنگت پر سرخ Pimles برے نہیں لگتے تھے بلکہ قابل توجہ ہی لگتے تھے۔ جب وہ ہنستی تو اس کے گالوں میں گہرے بھنور پڑتے اور جب وہ ہنستی تو مجھے لگتا میرے اردگرد کی دنیا بھی ہنس رہی ہو اور جو وہ چپ ہوتی تو لگتا میرے آس پاس کی دنیا بھی چپ ہو گئی ہو۔

میں اس سے ہر روز ملتا۔ ہر روز باتیں کرتا پھر بھی اگلے دن کے کرنے کے لیے بھی میرے پاس بہت ساری باتیں جمع ہوتیں اور چھٹی والے دن جب میں اس سے نہ ملتا تو مجھ سے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔ اسی لیے جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے گی تو میں پریشان سا ہو گیا۔

''تو میں تم سے نہیں ملوں گا تو کیا کروں گا؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

وہ چپ سی ہو گئی تھی۔

میں چلتے چلتے رک گیا۔ ایک نظر اسے غور سے دیکھا۔ ''ملنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟''

''ملنا بہت ضروری ہے کیا؟'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''مجھ سے پوچھ رہی ہو؟ اپنے آپ سے تم نے کبھی نہیں پوچھا؟'' میں نے خفگی سے کہا تھا۔

''میں خود سے کیا پوچھوں۔ جواب مجھے پتا ہے کہ ہاں ضروری ہے۔'' اس نے ہلکے سے کہا۔

''تو مجھ سے کیوں پوچھا؟'' میں نے روٹھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''بس...... ویسے ہی۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''تمہارا جواب سننا تھا۔''

میں بھی جواباً مسکرایا۔

''تو چلو کوئی راستہ نکالتے ہیں۔'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے یونیفارم کو غور سے دیکھنے لگا۔

''الماس! تم Sarcina گرامر سکول میں پڑھتی ہو ناں؟'' میرے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تو میرے سکول سے تمہارے سکول تک کا فاصلہ ذرا سا ہی تو ہے۔ صرف پندرہ منٹ کا۔ میں تمہارے سکول آ جایا کروں گا۔''

''نہ صبح آنے کا فائدہ ہے نہ دوپہر کو۔ ابو مجھے چھوڑنے اور لینے آتے ہیں۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

''اتنی بڑی ہو گئی ہو تم۔ اکیلی سکول آ جا تک نہیں سکتیں۔'' میں نے قدرے چڑ کر کہا۔ ''نانی کے گھر سے بھی تو اکیلی آتی جاتی ہو۔''

''نانی کا گھر سکول سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے اور میں بالکل آتی جاتی نہیں ہوں۔ ابو یا مجھے سکول چھوڑتے ہیں۔ سکول سے واپسی پر میری فرینڈز میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ میری فرینڈز میں سے دو کے گھر راستے میں پڑتے ہیں۔ میں تھوڑا سا فاصلہ طے کرتی ہوں کہ نانی کا گھر آ جاتا ہے اور اب تو وہ بھی اکیلے مجھے طے نہیں کرنا پڑتا۔ تم مجھے مل جاتے ہو۔''

''تمہارا سکول لگتا کتنے بجے ہے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''آٹھ بجے۔''

"ابو کتنے بجے تم کو چھوڑتے ہیں؟"

"سات پچپن پر۔ مجھے چھوڑ کر آفس جاتے ہیں۔"

"اب ابو سے کہنا کہ پونے آٹھ بجے تم کو چھوڑ دیا کریں۔"

"ابو تب تک جاتے نہیں، جب تک مجھے گیٹ کے اندر جاتا نہ دیکھ لیں اور ایک مرتبہ کوئی گیٹ سے اندر چلا گیا تو اسے واپس چھٹی کے ٹائم ہی نکلنے دیا جاتا ہے۔"

"مسائل سو ہزار ہیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اور واپسی کا کیا حساب ہے، چھٹی کب ہوتی ہے؟"

"دو بجے!"

"میری پونے دو بجے۔ تمہارے ابو کب تم کو لینے کے لیے آتے ہیں؟"

"ڈھائی بجے۔"

"اچھا۔ بس میں دو بجے تک تمہارے سکول آ جایا کروں گا۔ تم چھٹی کے بعد جتنی جلدی نکل سکو نکلا کرنا۔"

"ارے..... پانچ منٹ تو لگیں گے۔" اس نے گویا احتجاج کیا۔

"نہیں لگنے چاہئیں۔" میں نے نہیں پر بطور خاص زور دے کر رعب سے کہا۔

وہ مسکرائی پھر ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ جواباً اس نے مجھ کو جو وجہ بتائی اسے سن کر مجھے بہت ہنسی آئی لیکن ہر مسئلے کا حل ہوا کرتا ہے، اس کا بھی تھا۔

اور صرف پندرہ منٹ کی دوڑ میرے لیے تو دن بھر کے لیے کافی تھی بلکہ اگلے دن کے دو بجے تک کے لیے بھی......

سکول کی چھٹی ہوتے ہی مجھے بھاگنے کی پڑ جاتی تھی۔ اب تو شہباز کے ساتھ جانا بھی میں نے چھوڑ دیا تھا۔ کئی بار اس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا۔ میں نے ٹال دیا تھا۔ مگر اس دن شہباز نے مجھ کو پکڑ لیا تھا۔

"افنان کیا مسئلہ ہے۔ چھٹی ہوتے ہی تم ایسے بھاگتے ہو جیسے کسی کو ٹائم دے رکھا ہو۔" اس نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تو میں ٹپٹا سا گیا۔

"نہیں..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آج میرے ساتھ چلو پھر!" اس نے حکمیہ انداز میں کہا۔

"کیوں بھلا؟" میں نے منہ بنا کر پوچھا۔ "اور پھر امی سے کیا کہوں گا؟"

شہباز ہنسا۔

"ارے بھئی۔ راستے میں آنٹی سے کہتے جانا۔ کل میں مووی لایا تھا "محبت سے مصیبت تک" دونوں مل کر دیکھیں گے۔"

"کیا؟" میں چیخ پڑا۔

"ارے یار تیرے ساتھ مصیبت کیا ہے؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"اب یار تو تیرے ساتھ کیا مصیبت ہے۔" میں نے بھی چڑ کر کہا۔ گھڑی دیکھی تو ایک پچاس ہو رہے تھے۔

میں دل ہی دل میں سخت جز بز ہو رہا تھا۔ شہباز کسی طور مجھے ساتھ لیے بغیر ٹلتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

"کتنی مرتبہ دیکھے گا تو یہ مووی؟" میں نے بےزاری سے کہا۔

شہباز ہنسنے لگا۔ "اور تو نے تو دیکھی ہی نہیں ہوگی۔"

"جی نہیں..... دوستوں کے بے حد اصرار پر وہ بے کار مووی میں نے بھی دیکھ لی۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ اس سے ایک دن پہلے الماس بھی مجھ سے اس مووی کا تذکرہ کر چکی تھی اور میں نے اس کا بڑا مذاق بنایا تھا۔ "مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگی۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"مجھے تو بڑی اچھی لگی یار....." شہباز نے مسکرا کر بتایا۔

"اچھائی کیا ہے اس میں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے فلم کے ٹائٹل سے ہی اختلاف ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "اینڈ تو اس کا اور بھی واہیات ہے۔ لو بھلا بتاؤ۔ یہ کوئی تک ہے۔ تین گھنٹے کی فلم دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہیرو ہیروئن مر جاتے ہیں۔"

شہباز ہنسنے لگا۔ "میرے بھائی محبت مر کر ہی امر ہوتی ہے۔" شہباز نے گہرے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" میں نے سختی سے تردید کی۔ "محبت میں ملنا ضروری ہوتا ہے۔"

اور ملنے سے مجھے ایک دم الماس یاد آ گئی کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ دو تو ادھر ہی بج گئے تھے۔

"اب آپ کی اجازت ہو تو میں جاؤں؟" جل بھن کر میں نے شہباز سے پوچھا۔

"جائیے سرکار..... آپ رکنے والوں میں سے کہاں ہیں۔" شہباز کی مسکراہٹ

مجھے چڑچڑاہٹ میں مبتلا کر دینے والی تھی۔

میں بھاگم بھاگ الماس کے سکول پہنچا۔

"مجھے تو اس دن کہہ رہے تھے۔" سکون سے بیٹھ جانے کے بعد الماس نے شکایتی انداز میں کہا۔

"سوری یار۔ وہ شہباز ہے ناں۔ "محبت سے مصیبت تک" کو لے کر بیٹھ گیا تھا۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ الماس مجھے چپ چاپ دیکھے گئی۔ "ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔" میں نے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں کچھ؟" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کیا بھلا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"محبت کیا ہوتی ہے افنان؟" چند لمحے بعد اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اب یہ محبت بیچ میں کہاں سے آ گئی۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو افنان۔ میرے اور تمہارے درمیان کیا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"اچھا سوال ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "جس دن جواب مجھے مل گیا۔ تمہیں بتا دوں گا۔"

اس رات میں نے بہت سوچا تھا اور اگلے دن اس سے کہا تھا۔

"الماس..... تم زمین ہو اور میں تمہارے اوپر گرنے والا سیب ہوں۔ الماس تم میگنٹ ہو اور میں لوہے کا ٹکڑا ہوں۔ ہمارے درمیان اٹریکٹیو (Attractive) فورس ہے۔ جیسے زمین کی فورس آف گریویٹی سیب کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے میگنٹ کی میگنٹک فورس، جو لوہے کے ٹکڑے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

میں کہتا رہا۔ الماس چپ چاپ مجھے دیکھے گئی۔

"الماس! مجھ سے شادی کرو گی۔" بنا سوچے سمجھے میں نے بے اختیار کہہ دیا تھا۔

"تم مجھ سے شادی کرو گے تو میں بھی تم سے شادی کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے الماس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔

میں اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تمہارے گھر والے تمہاری شادی مجھ سے کر دیں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے۔ میں ماما سے کہوں گی، وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔"

اس نے ..... سے ..... کہا۔

"تمہارے ماما کچھ نہ کر سکے تو؟" میں نے خدشے سے پوچھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہو گیا تو؟" میرے لہجے میں ابھی بھی خدشہ تھا۔

"تو پھر ہم گھر سے بھاگ جائیں گے۔ بالکل ویسے ہی جیسے "محبت سے مصیبت تک" میں ہیرو ہیروئن بھاگ جاتے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"دھت..... بھاگ جائیں گے، کہاں؟ میں تو کسی پہاڑی علاقے سے بھی واقف نہیں ہوں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "جہاں پر جا کر ہم اپنا گھر بنا سکیں۔" پھر ایک دم الماس سے پوچھا۔ "اچھا، یہ بتاؤ تمہیں روٹی پکانی آتی ہے؟"

"نہ..... نہیں تو۔ مجھے تو آٹا بھی گوندھنا نہیں آتا۔" اس نے قدرے شرمندگی سے بتایا

"ہا..... ! تو تم مجھ کو کھلاؤ گی کیا؟" میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"تو میں سیکھ لوں گی ناں!" اس نے روہانسی ہو کر کہا تو مجھے ہنسی آ گئی

"میرا حال بھی یعنی فلم کے ہیرو کی طرح ہوگا۔ میں تم کو روٹی پکانا بتاؤں گا اور تمہاری بنائی ہوئی جلی ہوئی روٹی کھاؤں گا"

"افنان! تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" الماس نے روہانسی ہو کر کہا۔

"نہیں بھئی میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ روٹی پکانی تو تم کو آنی چاہیے تاکہ میں بھوکا تو نہ مروں ناں!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے میرے بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کو بڑی اچھی روٹی پکانی آتی ہے۔"

"ت..... تم..... ہارے..... بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی روٹی پکاتے ہیں؟" اس کے لہجے میں بہت استعجاب تھا۔

"کیوں، تمہیں حیرت کیوں ہو رہی ہے؟" میں نے اس سے کہیں زیادہ حیرت سے پوچھا تھا۔

"میں نے آج تک کسی حضرت کے بارے میں سنا نہیں ناں کہ وہ روٹی پکاتے ہیں۔" اس نے تسلیم کر لینے کے سے انداز میں کہا تھا۔

"لو تو پھر ہوٹلز، ریسٹورنٹس میں کیا ہوتا ہے۔ وہاں خواتین تو نہیں پکایا کرتیں۔" میں نے گویا اس کی معلومات پر افسوس ظاہر کیا تھا۔

"وہ اور بات ہے۔ وہ پروفیشنلز ہوتے ہیں۔" الماس نے بے پرواہی سے کہا۔

"میرے بڑے بھائی بھی کسی پروفیشنل سے کم نہیں ہیں۔ ایسی کلاسیکل روٹی بناتے

ہیں کہ کوئی خاتون بھی کیا بناتی ہوں گی بلکہ اب تو مجھے امی کے ہاتھ کی روٹی کا ذائقہ بھولتا جا رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں، لاسٹ ٹائم امی نے روٹی کب بنائی تھی؟" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے عجیب سا لگ رہا ہے، یہ سنتا۔ تمہاری امی روٹی کیوں نہیں پکاتیں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"اصل میں زیادہ دیر امی سے بیٹھا نہیں جاتا اور وہ زیادہ دیر تک کھڑی بھی نہیں رہ سکتی ہیں۔ ان کے پیروں میں ورم آ جاتا ہے لیکن تم پہلے ہی سن لو، میں تم کو بتا دوں کہ میں بڑے بھائی کی طرح بالکل نہیں ہوں۔ مجھے کچھ نہیں آتا۔ میرے بڑے بھائی اور امی نے مجھے کبھی ایسا کچھ کرنے کو نہیں کہا۔ میں اپنے ذاتی کام تو کر لیتا ہوں، لیکن کچن سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور نہ میرا کوئی ایسا ارادہ ہے...... اور پھر تمہارے ہوتے ہوئے بڑے بھائی سے روٹی پکوانا اچھا تو نہ لگے گا مجھے۔"

"تو کیا صرف روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھاؤ گے؟ صاف کیوں نہیں کہتے، تم کو پورا کھانا پکانا آنا چاہیے۔" الماس نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ "پھر کہنا، میرے کپڑے پھٹ جائیں تو تم کو سینا سلانا بھی آنا چاہیے۔ پھر اگر میں نے تم سے کہہ دیا کہ مجھے تو سوئی تک پکڑنی نہیں آتی تو تم پھر کچھ کہو گے...... اور اگر اب میں تم سے پوچھوں کہ تم خود کیا کرو گے؟ تو کیا کہو گے؟ تمہیں پیسا کمانا آنا چاہیے ناں۔"

"ہاں تو کماؤں گا ناں۔" میں نے دعوے سے کہا۔

"اوہو، تم کماؤ گے؟" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "تمہاری تو ابھی تک شیو بھی پوری نہیں آئی ہے۔"

"ہاں تو اس وقت تک آ جائے گی ناں۔"

"اچھا، تو تم مجھ کو پہلی چیز کیا خرید کر دو گے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تم بتاؤ، تم کیا لو گی؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے دلچسپی سے سوال کیا۔

اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر مجھ سے کہا۔ "کچھ نہیں، تم چاہیے ہو بس!"

اس کا جواب مجھے غرور میں مبتلا کر گیا۔ اس دن میں بے حد خوش تھا بلکہ اب تو ہر آنے والا دن خوشی سے بھرپور تھا۔

اس دن بھی الماس سے ملنے کے بعد میں سرشار سا گھر پہنچا تھا۔ گھنٹی بجانے کے لیے میں نے جونہی ہاتھ بڑھایا، تو پڑوس والی آنٹی نے اپنا دروازہ کھول کر جھانکا۔

"افنان، تمہاری امی ذرا مارکیٹ تک گئی ہیں۔ یہ چابی دے گئی ہیں۔"

انہوں نے چابی میری طرف بڑھائی تو میں نے شکریے کے ساتھ ان سے لے لی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ امی اکثر مارکیٹ جاتی تھیں تو پڑوس والی آنٹی کو چابی دے جایا کرتی تھیں۔ میں دروازہ کھول کر اندر آیا اور ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں الماس کو سوچ رہا تھا۔ آج پہلی بار میں الماس کے بہت قریب بیٹھا تھا ورنہ عام طور سے میں خود ہی اس سے فاصلہ رکھنے کا عادی تھا۔ مجھے چھچھوری حرکتوں سے چڑ تھی، بہت نفرت تھی۔ ہم اکیلے میں ملتے ضرور تھے مگر میں نے کبھی کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس آج ہی میں پہلی بار اس کے اتنے قریب بیٹھا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں پر جھولتی لٹ کو پکڑ سکتا تھا جو اکثر ہیئر بینڈ کی قید سے آزاد ہی رہا کرتی تھی اور جسے وہ بار بار کانوں کے پیچھے کرتی رہتی تھی۔ میں اس کے وجود سے اٹھتی اس مہک کو بھی محسوس کر سکتا تھا جو عجیب بچی بچی سی، بھینی اور سوندھی تھی اور میرے خیال کے مطابق کسی پرفیوم، عطر یا سینٹ کی تو نہیں تھی۔

"الماس، تم کیا پرفیوم استعمال کرتی ہو؟" میں نے بے اختیار اس سے پوچھا تھا۔

"پرفیوم......!" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "وہ تو میں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ بچپن سے ایک ہی ٹالکم پاؤڈر استعمال کرتی چلی آ رہی ہوں۔ اس وقت بھی وہی لگا رکھا ہے۔"

"کمال ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔ "ٹالکم پاؤڈر استعمال کرنے کے باوجود تمہارے اندر سے ایسی خوشبو کیوں آتی ہے؟ جیسے...... جیسے......" میں سوچ میں پڑ گیا۔ تشبیہ دینے کے چکر میں ذہن پر زور ڈالنے لگا۔

"جیسے کیا؟" الماس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔

"جیسے کچے امرودوں، کچے آموں، کچے لیموؤں میں سے آتی ہے۔" مجھے بالآخر جواب سوجھ ہی گیا تھا۔

الماس بہت ہنسی۔ "افنان، مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کچی چیزیں بہت پسند ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "پسند تو ہیں کیونکہ جب تک چیز کچی نہیں ہو گی، پکے گی کیسے؟"

"کچے امرود بھی تم نے کھائے ہیں؟" الماس نے پوچھا۔

''ہوں...... کچے امرودوں کا ذائقہ مجھے پسند ہے۔'' میں نے کچے امرودوں کا ذائقہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

الماس ہنسنے لگی۔ ''پاگل، کچے امرود کھا کر پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔''

میں بھی ہنسنے لگا پھر پوچھا۔ ''اور کچے آم کھا کر؟''

''گلا!'' اس نے فوراً کہا اور ہنسنے لگی۔ میں بھی ہنس پڑا۔

کافی دیر تک ہم دونوں پاگلوں کی طرح ہنستے رہے پھر میں نے ہنسی روک کر پوچھا۔

''اچھا، یہ بتاؤ، کچے آموں کا ایک مخصوص نام ہوتا ہے ناں...... کیا بھلا؟''

''کیری!......'' اس نے معصومیت سے بتایا۔ ''میری سب فرینڈز بڑے شوق سے کھاتی ہیں کیری، کنارے، املی وغیرہ۔''

''اور تم نہیں کھاتیں؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مجھے کھٹاس زیادہ پسند نہیں ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔ ''مجھے نمکین چیزیں زیادہ اچھی لگتی ہیں مثلاً؟ نمکین بادام، نمکین پستے، کرارے چپس، کرکرے فرنچ فرائز۔''

''اچھا، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟'' میں نے فوراً مطلب کا سوال کیا۔

''یہ کیا سوال ہوا؟ کھانے پینے کے بیچ میں تم کہاں سے آ گئے؟'' اس نے اعتراض کرنے والے انداز میں کہا۔

''اونہوں! میری بات کا جواب دو ناں!'' میں نے اصرار کیا۔

''تم......!'' وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ ''تم بھی نمکین نمکین سے لگتے ہو۔''

''آہا...... ہا! مجھے چکھے بغیر تم نے کہہ دیا کہ نمکین نمکین سا لگتا ہوں۔'' میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''اب تم کوئی کبابوں کا مصالحہ ہو جو میں تم کو چکھوں۔'' اس نے برا ماننے والے انداز میں کہا۔

میں اس کے اس انداز پہ بے حد ہنسا اور وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں نے تو آج تک تم سے نہیں پوچھا کہ میں تم کیسی لگتی ہوں؟''

''تم نہ بھی پوچھتیں تو میں تم سے کہتا کہ میٹھی میٹھی سی لگتی ہو۔'' میں نے اطمینان سے کندھے اچکا کر کہا۔

''ارے واہ، میں کوئی رس گلہ ہوں جو میٹھی میٹھی سی لگتی ہوں۔'' اس نے اسی انداز میں کہا۔ میں اس کی بات پہ کافی دیر تک ہنستا رہا تھا۔

''تم تو ہی خود ہنسنے والے پاگل ہوتے ہیں۔'' بالآخر اس نے چڑ کر کہا تھا۔

''نہیں، میں یوں ہنس رہا ہوں کہ تم رس گلہ ہو بھی نہیں سکتیں۔ ہو گی تو ''رس گلی'' ہو گی۔''

اس نے مجھے دیکھا، مجھ سے ہنسی روکے نہیں رک رہی تھی حالانکہ یہ کوئی ایسی ہنسنے والی تو بات بھی نہ تھی مگر شاید مزاج سے بچپنا پوری طرح رخصت تھوڑا ہی ہوا تھا۔ الماس بھی ایک دم ہنس پڑی تھی۔

میں نے تبھی ایک دم اسے دیکھا۔ اس کے گالوں پر پڑنے والے ڈمپلز نے میری توجہ کھینچ لی۔

یہ پہلی بار تھا جو میں نے ہنستے ہوئے اس کو یوں غور سے دیکھا تھا۔ میرا ایک دم دل چاہا کہ اس کے گال پر انگلی رکھ کر دیکھوں۔ اس کے گال کے عمیق بھنور کی گہرائی محسوس کروں۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں...... ابھی نہیں......'' مجھے فوراً خیال آیا تھا۔ میں نے ایک دم ہاتھ پیچھے کر لیا۔

الماس ابھی بھی آنکھیں بند کیے ہنس رہی تھی اور میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ تبھی اس نے ایک دم چونک کر گھڑی دیکھی۔

''ارے، دو بجیں ہونے والے ہیں۔ ابو آتے ہی ہوں گے۔'' کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا مشکل ہے، تمہارے ابو کبھی لیٹ نہیں ہو سکتے۔'' میں نے جل بھن کر پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ ''افنان......! تم تو بس......''

''دو بجے اتنی جلدی کیوں بج جاتے ہیں؟'' میں نے گویا شکوہ کیا تھا۔

''ابھی بجے نہیں ہیں۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''جاتے جاتے بج جائیں گے۔''

''ارے سنو تو۔'' میں نے جو اسے جاتے دیکھا تو وہیں سے آواز لگائی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''کیا ہونا تھا؟'' اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جب ہونا ہو گا، تب تم کو بتا دوں گا...... ابھی تو مجھے کچھ کہنا تھا۔''

''کہہ بھی چکو۔'' اس نے سر پیٹ کر کہا اور آگے چل دی۔

''تم مجھ کو اچھی لگتی ہو۔'' میں نے وہیں سے چیخ کر کہا۔ اس نے پلٹ کر مجھے گھورا۔ ''لاؤڈ اسپیکر دے دوں تم کو۔ ساری دنیا میں نشر کر دینا۔''

''میں ایسا کر بھی دوں گا۔'' میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''ڈرتا ورتا نہیں میں کسی سے۔''

وہ بھاگ کر میرے پاس آئی۔ ''افنان، تم پاگل ہو۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''تم بالکل پاگل ہو۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا۔

وہ مجھے دیکھتی رہی پھر کہا۔ ''ویسے ایک بات ہے۔''

''کیا بھلا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''تم بھی مجھ کو اچھے لگتے ہو۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''ڈرپوک، کہہ تو تم اتنی آہستہ ایسے ہی رہی ہو جیسے چوری کر رہی ہو۔'' میں نے اسے جوش دلانے کی کوشش کی۔

اس نے مجھے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں۔

میں بہت دیر تک یاد کرتا رہا اور مسکراتا رہا، پھر ایک دم ہی میری نظر گھڑی پر پڑی جو سوا تین بجا رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد کوچنگ میں کلاس شروع ہونے والی تھی اور میں نہ نہایا تھا۔ نہ کپڑے بدلے تھے اور نہ ہی کھانا کھایا تھا۔ اگر میں جلدی جلدی سارے کام کر کے بھی ساڑھے تین بجے تک نکلتا تو پانچ منٹ میں کوچنگ پہنچ جاتا لیکن میرا تو صوفے پر سے اٹھنے تک کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھوک مجھے بالکل نہیں لگ رہی تھی حالانکہ کل ہی امی نے مجھے ٹوکا تھا۔

''افنان، میں دیکھ رہی ہوں، تم اپنی صحت کے معاملے میں دن بہ دن لاپروا ہوتے چلے جا رہے ہو۔''

اور میں نے ہنس کر امی سے کہا تھا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہیں امی! صحت دیکھیے میری۔ لگتا ہوں کہیں سے سولہ سال کا، انیس، بیس سے کم کا نہیں لگتا۔''

''ماشاء اللہ...... اللہ نظر بد سے بچائے مگر بیٹا اپنا خیال کرو گے، اپنی صحت کی حفاظت کرو گے تو فائدہ تم ہی کو ہو گا۔''

میں نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ پھر مجھے ایک دم یاد آیا۔ آج فزکس کی کلاس بھی تو ہے۔ چھوڑو، ایک آدھ کلاس چھوٹ جائے گی تو کیا فرق پڑے گا...... میں نے

لاپرواہی سے سوچا۔

اور مجھے یاد آیا۔ پچھلے ہی دنوں شہباز نے مجھ سے کہا تھا۔ ''افنان، تم کوچنگ سے بہت Irregular ہوتے جا رہے ہو۔''

میں ٹھٹکا ضرور تھا مگر اس کی بات اڑا دی تھی۔ میں نے یاد آنے پر لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

وقت کیسے گزرے کہ کل آ جائے...... میں نے بوریت کے عالم میں سوچا پھر بادل نخواستہ اٹھ کر کپڑے بدلے۔ کوچنگ گیا۔ کراٹے کلب بھی چلا گیا۔ واپس آیا تو صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ اس دن اتفاق تھا کہ ابو جلدی آ گئے تھے اور بڑے بھائی تو آ ہی چکے تھے۔

اس رات جب بڑے بھائی سپورٹس چینل دیکھنے کے لیے بیٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا اور ان کا بہت دماغ چاٹا تھا۔ بڑے بھائی فٹ بال کا میچ بھی دیکھ رہے تھے اور مجھ سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں نے بھی اس دن خوب ڈھیر ساری باتیں کی تھیں اور اس وقت ٹی وی لاؤنج کے پاس سے گزرتے ہوئے ابو مجھے اتنے اچھے موڈ میں بڑے بھائی کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر قدرے حیران ہوئے۔

''اس لڑکے کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا، کب کیا ہو جائے۔'' سر جھٹک کر کہتے ہوئے ابو آگے بڑھ گئے تھے۔

''ہوں! آج تو میں دیکھ رہا ہوں، تمہارا موڈ خاصا خوشگوار ہے۔'' بڑے بھائی نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

میں کھلکھلا کر ہنسا۔ ''یہ بات تو ٹھیک ہے۔''

''ہوں بات کیا ہے آخر؟'' اب وہ مجھے چھیڑ رہے تھے۔

''بات تو کوئی ایسی خاص نہیں ہے۔'' میں انہیں بتانا چاہتے ہوئے بھی کچھ بتا نہیں پا رہا تھا۔

''چلو، تو تم عام ہی بتا دو۔'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں ایک دم چپ ہو گیا۔ ''اچھا چھوڑیں اس بات کو۔ آپ یہ بتائیں آج بھی میرین لائف آ رہا ہو گا یا نہیں؟'' میں نے ایک دم موضوع بدل دیا تھا۔

''بالکل آ رہا ہو گا۔'' انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ''بس یہ آخری منٹوں کا کھیل اور رہ گیا ہے۔ وہ دیکھ لوں، پھر تم میرین لائف دیکھ لینا بلکہ تم بھی میچ دیکھو ناں، کتنا مزے

دار چل رہا ہے۔'' انہوں نے اسکرین پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

''مجھے فٹ بال سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں، کرکٹ ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اس کا بھی جنون نہیں ہے مجھے۔'' میں نے گویا صاف انکار کر دیا تھا۔

''اوہ، گول ہو گیا!'' بڑے بھائی کی جوشیلی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کا دھیان میری بات پر نہیں تھا بلکہ پوری طرح سے میچ پر تھا۔

بالآخر میچ ختم ہو گیا۔

''یار، بڑا انٹرسٹنگ میچ تھا۔'' بڑے بھائی کے لہجے میں متاثر ہو جانے کی سی کیفیت تھی۔ ''ٹیم کی کارکردگی لاجواب تھی بے حد شاندار، دیکھو یہ میچز بھی تو ہوتے ہیں، دیکھ کر مزا آتا ہے۔ ایک تمہارے کرکٹ میچز ہوتے ہیں۔ صبح سے شام تک بیٹھے رہو رزلٹ کے انتظار میں۔ پتا چلا، میچ ڈرا ہو گیا۔''

''اچھا، اب سمجھ میں آیا۔ تو آج آپ اسی خوشی اور Excitement کے مارے جلدی آئے ہیں۔''

''ارے نہیں۔'' بڑے بھائی ایک دم ہنسے۔ ''جلدی تو آنا تھا مجھے البتہ یہ گھر پہنچ کر یاد آیا تھا کہ آج میچ بھی آنا تھا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ریموٹ میرے ہاتھوں میں دے کر کہا۔

''اور تم یہ ریموٹ پکڑو اب۔ میرین لائف دیکھو۔ میں ذرا کچن دیکھ آؤں۔''

''روٹی پکائیں گے آپ؟'' میں نے ریموٹ پکڑتے ہوئے انہیں گویا چھیڑا تھا۔

''ہاں تو؟'' وہ رک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''بچی بھائی! آفیسر لیول کے آدمی ہیں آپ۔ آپ کے ماتحت آپ کو گھر میں اس طرح کے کام کرتے دیکھ لیں تو کیا مزے آئیں۔'' میں نے ہنس کر کہا تھا۔

''تو دیکھ لیں، اس میں کیا بڑی بات ہے۔ آدمی اپنے گھر میں کام نہیں کرے گا تو پھر اور کہاں کرے گا۔'' بڑے بھائی نے مسکرا کر کہا، پھر یک بیک سنجیدہ سے ہو گئے۔

''اصل میں افنان، ہم مڈل کلاس کو ری پریزنٹ (Represent) کرتے ہیں۔ چاہے جتنے بڑے آفیسر بھی بن جائیں، ہماری کلاس ہماری رگوں سے جا نہیں سکتی اور یہاں بات صرف کلاس کی نہیں ہے بلکہ تربیت کی بھی ہے۔'' بڑے بھائی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ ''میں آفیسر اپنے آفس میں ہوں، یہاں اس گھر میں گھر کا ایک فرد ہوں۔ بحیثیت گھر کے فرد، میری کچھ ذمے داری ہے اور مجھے اپنی ذمے داری کا احساس بھی ہے۔ امی

کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ اب تک انہیں جتنا کرنا تھا، کر لیا۔ اب واقعی انہیں آرام کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں تو یہ ان کی ہمت ہے۔ ہماری کوئی بہن نہیں ہے، یہ ہماری مجبوری ہے ورنہ یہ وقت آج ہم پر کبھی بھی نہ آتا۔ امی ملازموں پر بھروسہ نہیں کرتیں، یہ امی کی نیچر ہے۔ اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہم بازار کی روٹی کھا نہیں سکتے تو یہ ہمارا نخریلا پن ہے۔ اب نخرے تو اٹھانے پڑتے ہیں ناں۔ آدمی اپنے نخرے نہیں اٹھائے گا تو پھر اور کس کے اٹھائے گا۔'' انہوں نے تو گویا مجھے لیکچر ہی دے دیا تھا۔

''تو بڑے بھائی اس کا حل بڑا سیدھا سا ہے۔ آپ شادی کر لیجیے۔'' میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''ہائیں.....''

انہوں نے بہت حیرانی سے مجھے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی کوئی بھی بات میں نے پہلی مرتبہ ان سے کی تھی۔ انہیں تو حیران ہونا ہی تھا۔

''سچ بڑے بھائی، آپ آفس سے پہلے ہی اتنا تھک کر آتے ہیں۔ تب آپ کو دہری مشقت نہیں کرنی پڑے گی۔'' میں نے اطمینان سے کہا تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ۔ یہ آئیڈیا تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟'' وہ مسکرائے تھے۔

''بس یونہی آ گیا۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔

''بھئی یہ تو سراسر امی کا کام ہے۔'' بڑے بھائی نے لاپرواہی سے کندھے اچکا کر کہا۔

''اور جو میں امی کو Activate کر دوں؟'' میں نے شرارت سے پوچھا تھا۔

بڑے بھائی نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ ''تم کچھ زیادہ ہی بولنے نہیں لگے؟''

''آپ ہی کے فائدے کی بات بول رہا تھا۔'' میں نے بڑے بھائی کے جملے کا اثر لیے بغیر کہا تھا۔

''اچھا جی، اب آپ ہی تو مجھے بتائیں گے ناں کہ میرا فائدہ کس چیز میں ہے اور نقصان کس چیز میں۔'' بڑے بھائی نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے اس بات پر کچھ کہا تو نہیں البتہ کھلکھلا کر ہنسا ضرور تھا۔ بڑے بھائی سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں میرین لائف میں منہمک ہو گیا۔

☆=======☆=======☆

جب میں نے امی سے ڈش انٹینا لگوانے کی فرمائش کی تو انہوں نے مجھے صاف منع

کر دیا۔ میں نے لاکھ دلیلیں دیں۔ بڑی بحثیں کیں۔ ماما تیار نہ ہوئے کسی طور۔ ابو تو پہلے ہی تیار نہ تھے اور اب تو ماما بھی ہم خیال ہو گئے۔ میں چڑ گئی، جلی بھنی مگر ظاہر ہے کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ انہی دنوں میوزک ویڈیوز کا نیا ٹرینڈ چلا تھا ہمارے یہاں اور ہمارے ٹی وی نے وہ ویڈیوز دکھا دکھا کر دماغ خراب کر دیا تھا اور دل بھی...... زیادہ تر ویڈیوز میں ایک ہیروئن ہوتی اور ایک ہیرو۔ مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ خوبصورت سی ہیروئن آگے آگے جاتی ہوئی اور اس کے پیچھے پیچھے خوار ہوتا ہیرو......

اور صرف میوزیکل ویڈیوز پر ہی کیا موقوف، فلموں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ہمارے تو ٹی وی سے نشر ہونے والے ڈراموں میں بھی وہی ایک قصہ ہوتا ہے۔ دھت! سارے ڈرامے، کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ایک ہیروئن ہوتی ہے اور ایک ہیرو، ساری کہانی ان کے گرد گھومتی ہے۔

اکثر مجھے اپنا آپ کسی ہیروئن اور افنان کسی ہیرو کی طرح لگتا۔ ویسے ایک بات ہے، افنان کسی ہیرو سے کم تھوڑا ہی تھا۔ اس کا اونچا لمبا قد تھا۔ شاندار Built تھی۔ سیاہ سلکی بال، گہری سیاہ آنکھیں، لمبی گھنی پلکیں تھیں۔ صاف سانولا رنگ تھا۔ اپنے یونیفارم میرون پینٹ، اسکائی بلیو شرٹ میں وہ شاندار لگتا تھا۔ میرون زمین اور اسکائی بلیو اسٹرپس والی ٹائی ڈھیلی ہو کر اس کے گلے میں جھولتی رہتی تھی۔ کالر بٹن میں نے اس کا کبھی بند نہیں دیکھا تھا اور اس لاپروا انداز کے ساتھ وہ اور بھی اچھا لگتا تھا۔ افنان جب بولتا تھا تو میرا رواں رواں کان بن جاتا تھا اور جب ہنستا تھا تو لگتا تھا، کائنات تھم گئی ہے۔

افوہ، یہ میوزیکل ویڈیوز کے بیچ میں افنان کہاں سے آ گیا۔ میں تو اپنے ٹی وی کا ذکر کر رہی تھی۔ خیر سے ہمارے ٹی وی سے بھی بڑے اچھے اچھے رومانٹک ڈرامے نشر ہوتے ہیں اور ہمارے ٹی وی کے ڈراموں کا لوہا ایک دنیا مانتی ہے۔ ''روپ ہمارے'' ''گہرائیاں'' اور ''میں چپ رہی'' جیسے ڈراموں میں سوائے لو اسٹوری کے اور رکھا کیا تھا۔ خیر سے یہ ڈرامے مجھے پسند بھی بے حد تھے۔ پتا نہیں کیوں لو اسٹوری Based ڈرامے، کہانیاں، فلمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ فلمیں تو میں بہت کم دیکھا کرتی تھی کیونکہ میری زیادہ تر فرمائشیں ماما سے ہوا کرتی تھیں اور وہ جس طرح فلمیں دکھاتے تھے، وہ طریقہ بالکل مجھے پسند نہ تھا۔ ہر بار میں جل بھن کر سوچتی، اب کسی موی کی فرمائش نہیں کروں گی۔ کم از کم ماما سے مگر ان دنوں سرحد پار سے آنے والی ایک نئی موی کا بڑا چرچا تھا۔ میں نے اپنی فرینڈز سے اس کا بڑا ذکر سنا تھا۔ ''محبت سے معصیت تک'' دیکھی

ہے؟ ان دنوں یہ سوال بہت عام ہو کر رہ گیا تھا اور جو اس سوال کا جواب ''نہیں'' میں دیا کرتا، اس پر آفت نازل ہو جاتی۔ ''ارے، کیوں نہیں دیکھی؟'' ایسے جیسے موی نہ دیکھنے پر آدمی کئی گنا ثواب سے محروم رہ گیا ہو۔ ''بڑی کلاسیکل موی ہے۔'' میں نے جس سے سنا، یہی سنا تھا۔

''کیا ہے اس موی میں ایسا؟'' میں نے خاصی بے زاری سے رابعہ سے پوچھا تھا۔

''آہاں، ایسے نہیں۔ دیکھو گی تو مزا آئے گا۔''

مجھے بڑا تجسس ہوا۔ میں نے اسی دن نہ چاہتے ہوئے بھی ماما سے مطلوبہ موی لانے کی فرمائش کر دی۔ پہلے تو نام سن کر ہی ماما بے حد ہنسے۔

''محبت سے معصیت تک'' یہ بھلا کیا نام ہوا؟''

''ماما، مجھے دیکھنی ہے ناں بس۔'' میں نے ضد کرنے والے انداز میں کہا۔

''بھائی، موی واقعی اچھی ہے۔ میں نے بھی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ لیٹسٹ ریلیز ہے۔'' مہر خالہ نے بھی میری حمایت کی۔

''ایکشن موی ہے کیا؟'' ماما نے پوچھا۔

''نہیں بنیادی طور سے لو اسٹوری ہے۔'' مہر خالہ نے بتایا۔

''مہر، اگر لو اسٹوری ہے تو دیکھنے والی تو بالکل نہ ہو گی۔'' ماما مانتے ہوئے بالکل نہ لگ رہے تھے۔

''بھائی، یہی تو ساری بات ہے، بالکل صاف ستھری ہے۔''

مہر خالہ کے کہنے پر ماما نیم رضامند سے لگنے لگے لیکن بہر حال انہوں نے وہ موی لا کر مجھے دے دی تھی۔ یہ اور بات کہ خود بھی انہوں نے بیٹھ کر دیکھی تھی۔ ایک آدھ سین اگر ایسا ویسا تھا بھی تو ریموٹ ماما کے ہاتھ میں ہی تھا، نکالتے جا رہے تھے۔ گانوں سے تو ان کی خاص طور سے دشمنی تھی۔ ہر بار جب وہ کچھ فارورڈ کرتے تو مہر خالہ سے کہتے ضرور تھے۔

''مہر، تم تو کہہ رہی تھیں کہ بالکل صاف ستھری ہے۔''

''بھائی، کچھ دیکھنے دو تو پتا چلے گا ناں۔'' مہر خالہ جھنجھلائیں تو ماما کہتے۔

''ارے مہر، اردگرد کا بھی لحاظ کر لیا کرو۔''

اور میں بچی نہ تھی جو یہ نہ سمجھتی کہ ''اردگرد'' سے ماما کی کیا مراد تھی۔

ماما نے اگرچہ آدھی ادھوری موی دکھائی تھی لیکن موی واقعی اچھی تھی۔ یہ اور بات

کر اینڈ دیکھ کر مجھے بے حد رونا آیا تھا۔ اینڈ ٹریجک تھا۔ آخر میں ہیروئن کے گھر والوں نے اسے مار دیا تھا اور ہیرو خود ہی مر گیا تھا۔

مجھے مووی بے حد پسند آئی تھی۔ میرا دل چاہا تھا کہ ایک بار پھر دیکھوں۔ میں نے ماما سے فرمائش کر بھی دی تھی۔

''بھانجی کیا ہوا؟ خیریت ہے؟ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ کل سکول نہیں جانا کیا؟'' نرمی سے انہوں نے پوچھا تھا۔

''ماما، سکول بھی چلی جاؤں گی۔'' میں منمنائی۔

''نہیں، پھر کسی اور وقت دیکھنا۔ ابھی سو جاؤ بیٹا! چلو، اٹھ جاؤ، اچھی بھانجی۔''

ماما کے کہنے پر میں بادل نخواستہ اٹھ گئی۔

رات بھر فلم کے مختلف مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے۔ ہیرو کے مکالمے، ہیروئن کی مسکراہٹ اور دل برا کر دینے والا اینڈ۔ میں رات بھر ٹھیک سے سو نہ سکی۔

اگلے دن میں نے راستے میں افنان سے بھی مووی کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ ہنسا تھا۔

''ہاں لڑکیوں کو پسند آنے والی مووی ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا تھا۔

''لڑکوں کو کیوں نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اس لیے کہ اس میں ایکشن نہیں ہے؟''

''ایکشن کی بات نہیں۔ اسٹوری ہے، اینڈ بے کار ہے۔ اینڈ کی وجہ سے مجھے مووی اچھی نہیں لگی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''مجھے تو اینڈ دیکھ کر بہت رونا آیا۔'' میری آنکھوں میں آخر کا منظر یاد کر کے خود بخود آنسو آ گئے۔

''تو ایسی مووی دیکھنے کا فائدہ جس کا اینڈ دیکھ کر رونا آئے۔''

''مگر مجھے مووی اچھی لگی ناں۔ میرا تو دوبارہ اسے دیکھنے کا دل چاہ رہا تھا۔''

''کیا فائدہ ...... اینڈ دیکھ کر تو روؤ گی۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ ''ویسے ایک بات ہے۔'' وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔

''وہ کیا؟'' میں ڈر گئی۔

''میں سوچ رہا ہوں، تم روتی ہوئی کیسی لگو گی؟'' نہایت سنجیدگی سے اس نے پوچھا اور میں نے بے اختیار اس کو ایک مکا مارا کندھے پر۔

''تم ہنستے ہوئے کیسے لگو گے مجھ سے؟'' وہ ہنسنے لگا، پھر کہا۔

''تم ...... مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''مگر مجھے مووی دیکھنی ہے ناں۔'' میں نے مچل کر کہا۔

''اوہو، تو میں نے کب منع کیا، ضرور دیکھو بلکہ دیکھ لیتیں۔''

''وہی تو ...... رات بہت ہو گئی تھی ناں۔ ماما نے منع کر دیا۔ اب میں نے سوچا ہے کہ گھر جاتے ہی یہ مووی ضرور دیکھوں گی۔ ماما اسے واپس تو شام میں ہی کروائیں گے ناں!''

''اچھا ...... مگر دیکھو رونا مت۔'' اس نے بڑے خیال سے کہا۔

میں مسکرائی اور سر جھٹک کر گیٹ سے اندر آ گئی۔

جب میں گھر پہنچی تو پتا چلا اتفاق سے خالہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔ انہیں آج یونیورسٹی سے واپسی پر دیر ہو جائے گی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور مووی دیکھنے بیٹھ گئی۔ نہ مجھے کپڑے بدلنے کا ہوش تھا، نہ کھانا کھانے کا۔ نانی کہتی ہی رہ گئیں۔ میں مگن ہی دیکھتی رہی۔ میں نے پوری مووی دیکھی۔ سارے گانے دیکھے اور وہ کچھ بھی دیکھا جو ماما نے نکال دیا تھا۔ پوری آنکھیں کھول کر بہت غور غور سے دیکھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ جب پوری مووی ختم ہو گئی تو خالہ آ گئی تھیں ورنہ میں تو اسے ریوائنڈ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ درحقیقت وہ تھی ہی اتنی اچھی کہ دوبارہ کیا، چوبارہ تک دیکھی جا سکتی تھی مگر اینڈ دیکھ کر مجھے پہلے کی طرح رونا آیا تھا۔

مووی کے کافی سے زیادہ مکالمات مجھے ازبر ہو گئے تھے۔ نہ ہیروئن کی ادائیں مجھے بھولتی تھیں نہ ہیرو کا والہانہ انداز ...... کافی دن تک میں فلم کے زیر اثر رہی۔

''افنان، ہیروئن پیاری تھی ناں!'' ایک دن افنان سے میں نے پوچھا بھی تھا۔

''پیاری تو تم بھی ہو۔'' افنان ہنسا تھا۔

''سچ کہو۔'' میں نے یقین نہ آنے والے انداز میں کہا۔

''جھوٹ میں کہتا نہیں ہوں۔'' افنان نے فوراً کہا۔

اور اس دن میں نے ہزار زاویے سے خود کو دیکھا تھا۔ ''کیا واقعی میں پیاری ہوں؟'' اور آئینے نے مجھے بتایا تھا۔ ''ہاں، ہو تو۔''

میں مسکرانے لگی۔ ''اور میں قیمتی بھی ہوں۔'' میں نے سوچا تھا۔ مجھے یاد آیا تھا کہ ابھی کل ہی تو افنان نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''الماس، تم اپنے نام کے معنی جانتی ہو؟''

''میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا تھا۔

''الماس قیمتی پتھر کو کہتے ہیں۔ تم بہت قیمتی ہو الماس!''

اس کی اس بات نے مجھے غرور میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے تب سوچا تھا کہ بچپنے سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہونے کی کیفیت بڑی شاندار ہے۔ تبدیلیاں خوشگوار ہیں۔

مجھے قدرت پر پیار آنے لگا۔ کس صناعی، کاری گری، ہنر اور خوبصورتی سے قدرت ایک پیکر تراشتی ہے۔

میرا آپ بہت خوبصورت ہے۔ مجھے اپنا آپ اچھا لگنے لگا تھا۔

مجھ میں ادائیں آتی جا رہی تھیں۔ اسٹائل آ گیا تھا۔ مجھے دوپٹا لہرا کر چلنا آ گیا تھا۔ بل کھا کر سنلنا آ گیا تھا۔ شرما کر مسکرانا آ گیا تھا۔ آنا ہی تھا، جب ادائیں دیکھنے والا موجود تھا تو مجھے ادائیں دکھانے میں بھلا اعتراض ہو سکتا تھا اور یہ کوئی مشکل تو نہیں تھا۔

افنان پر اداؤں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کردار کا کھرا تھا۔ ہیرو تو ہیروئن کا ہاتھ پکڑ بھی لیتا تھا بلکہ ہاتھ پکڑنا تو بہت چھوٹی سی بات تھی، ہیرو تو اور بھی بہت کچھ...... خیر جانے دیجیے۔ افنان نے تو کبھی میرا ہاتھ بھی نہیں پکڑا تھا۔ مجھے حسرت ہی رہی حالانکہ ہم ساتھ بیٹھتے تھے۔ قریب...... مگر پھر بھی۔

اور ایک وہ تھا، رابعہ کا منظور نظر، فیضان، رابعہ کے ساتھ تو جو کرے، سو کرے، دوسروں کے لیے بھی اس کی نظر "ایکس رے" تھی۔ ڈھانچہ تک آدمی کا دکھ جائے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کارٹون میں دکھایا کرتے ہیں۔

افوہ، کس منحوس کا ذکر بیچ میں آ گیا۔ لاحول ولاقوۃ! ہاں، تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ افنان بھی ایک بڑے ہی مزے کی چیز تھا۔ سکول میں تو مجھ سے مل کر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے مجھ کو دیکھے بغیر چین ہی نہیں پڑتا تھا۔

ان دنوں میں نانی کے یہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ شام کی چائے کے برتن دھونے کی ذمے داری خالہ نے میری لگا دی تھی اور میں بھی آج کل بڑی فرماں بردار ہوتی جا رہی تھی۔ گھر کے کام کاج خاصی دلچسپی سے کرنے لگی تھی۔ برتن دھونے جو میں کچن میں آئی تو یوں لگا کسی نے مجھے آواز دی ہو میں نے کھڑکی سے جھانکا تو افنان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ افنان مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"تم اس وقت یہاں......" میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"کوچنگ آیا تھا ناں، کلاس لے کر آ رہا ہوں۔ سوچا، چانس لے لوں۔ شاید تم کو دیکھ ہی لوں۔" وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

"تمہارا کوچنگ ادھر ہی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ناں، تمہارے اپارٹمنٹس کے سامنے ہی تو ہے۔" اس نے مزے سے بتایا۔

"اچھا، تم نے بتایا تو نہیں کبھی۔" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"بتاتا کیسے؟ تم نانی کے گھر رہنے ہی اتنے عرصے بعد آئی ہو۔" اس نے شکایت کرنے والے انداز میں کہا۔

ابھی اس کے الفاظ ہونٹوں میں ہی تھے کہ خالہ نے مجھے آواز دی۔ مجھے خوف نے آ لیا کہ کہیں وہ خود نہ ادھر چلی آئیں۔

"تم جاؤ افنان، کسی نے تم کو دیکھ لیا تو......" میں نے خوف زدہ لہجے میں سرگوشی میں کہا۔

"تو دیکھ لے کوئی، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"میں تو ڈرتی ہوں ناں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔

"تم بھی مت ڈرا کرو۔" اس نے آرام سے مشورہ دیا۔

"جاؤ، میں کہتی ہوں۔" میں نے کھڑکی سے اسے دھکا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس تک ہاتھ پہنچ نہ سکا۔

"نہیں جاؤں گا تو کیا ہو گا؟" اس نے بے خوفی سے پوچھا۔

"اچھا، تم مت جاؤ، میں جاتی ہوں۔"

کہہ کر میں جلدی سے کچن سے باہر نکل آئی۔ وہ ابھی اور بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن میں نے سنا نہیں۔

باہر نکل کر میں ہانپنے لگی۔ میری سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ دل کی دھڑکن اعتدال پر نہ تھی۔ ابھی میں نارمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سامنے ہی سے خالہ آ گئیں۔ ان کو دیکھ کر اور میرے حواس جواب دینے لگے۔

"الماس، برتن دھل گئے؟" آتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"جی خالہ!" میں بمشکل اسی قدر کہہ سکی۔ خالہ غور سے دیکھنے لگیں۔ میں ایک دم گڑبڑا سی گئی۔

"کیا ہوا خالہ؟ کیا دیکھ رہی ہیں؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"کچن میں بہت گرمی تھی کیا؟" انہوں نے مسکرا کر سوال کیا۔

میں ڈر سی گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا جواب دوں اور اگر جواب دوں تو ہاں میں دوں یا نہ میں؟ بالآخر میں نے جواباً سوال کیا۔

''آپ نے کیوں پوچھا خالہ؟''

''اتنا پسینہ کیوں آرہا ہے؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔

میں ڈری ڈری ہنسی ہنسنے لگی۔ ''جی خالہ، کچن میں بہت گرمی تھی۔'' میں نے بمشکل کہا۔ مجھ سے ان کے سامنے زیادہ دیر ٹھہرا نہیں جا سکا۔ کمرے میں آ کر میں نے سکون کا بلکہ شکر کا سانس لیا تھا۔

اب سانس تو میرا بحال ہو گیا تھا لیکن درحقیقت اس دن مجھے ڈر بڑا لگا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک دم مجھے خیال آیا جیسے یہ کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ میں کچھ غلط کر رہی ہوں۔ مجھے لگا جیسے میں چوری کر رہی ہوں۔ میں دھوکا دے رہی ہوں خود کو، اپنے گھر والوں کو اور شاید افنان کو بھی......

میرا دل گھبرا گیا۔ ضمیر بھی ایک دم بیدار ہو گیا۔ پشیمانی، شرمندگی، افسوس، ڈر، خوف ساری کیفیتیں ایک دم ہی مجھ پر طاری ہو گئیں۔

''نہیں، نہیں، میں کل افنان کو منع کر دوں گی کہ مجھ سے نہ ملا کرے۔ میں خود آئندہ اس سے نہیں ملوں گی......''

بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا۔

اگلے دن افنان راستے میں ملا تو ناراض سا لگ رہا تھا۔ میں جانتی تھی، وہ ناراض ہو گا ہی کیونکہ کل میں اس کی پوری بات سنے بغیر کچن سے باہر نکل آئی تھی۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ اب وہ مجھ سے کچھ بولے گا نہیں اور خاموشی سے چلتا رہے گا، پھر بھی میں نے کوئی پروا نہ کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''افنان، میں آئندہ تم سے نہیں مل سکتی۔''

وہ رک کر میری شکل دیکھنے لگا۔ ''کیوں، کیا ہوا؟''

''افنان، تمہیں نہیں لگتا کہ ہم یہ ٹھیک نہیں کر رہے؟'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''کیوں، ہم کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے سکون سے پوچھا۔

''ہم جو کر رہے ہیں، غلط ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اس میں غلط کیا ہے؟ ہم مل کر باتیں ہی تو کرتے ہیں۔ باتیں تو تم اپنی فرینڈز سے بھی کرتی ہو گی۔ امی، خالہ، نانی، نانا، ابو بھائیوں اور ماما سے بھی۔'' اس نے قائل کرنے والے انداز میں کہا۔

میں چپ سا [illegible] دیکھنے لگی۔ کتنا بتاتا تھا [illegible] وہ میرے بارے میں [illegible]

[illegible] رشتے کتنی اچھی طرح یاد تھے اسے۔ اس اتنے اچھے آدمی سے میں کیسے...... جب اچانک کل کی کیفیت عود آئی مجھ پر۔ میں نے خوف کے مارے جھرجھری لی۔

''افنان، ان سے باتیں کر کے مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔ کل پہلی مرتبہ تم سے بات کر کے مجھے ڈر لگا۔ بہت ڈر لگا افنان!''

میں نے اسے اپنی کل کی تمام Feelings بتا دیں۔ وہ چپ سا ہو کر میری شکل دیکھنے لگا، پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، آج کے بعد سے میں تم سے نہیں ملوں گا۔ تمہیں دیکھوں گا بھی نہیں۔'' وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا مجھے اکیلا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میں نے بہت چاہنے کے باوجود اسے روکا نہیں اور گھر آ گئی۔

گھر آ کر میں بہت روئی۔ ہچکیوں، سسکیوں اور آہوں کے ساتھ روئی۔ میرے آنسو تھمتے نہ تھے۔ مجھے لگتا تھا، جیسے میں اپنی کسی بہت قیمتی چیز کو جان بوجھ کر سمندر میں پھینک آئی ہوں۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں ایک دم خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔ میرے پاس کچھ بچا نہیں ہے......

میں بہت روئی تھی اس دن۔ نانی، نانا، خالہ پریشان ہو گئے۔ بار بار رونے کی وجہ [illegible] اور میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ صرف یہ جواب تھا۔ ''امی کے پاس جانا ہے۔ امی کے پاس لے چلیں۔''

شام میں جب ابو امی آ گئے تو میرا یہ جملہ تھا کہ مجھے گھر جانا ہے۔

''ارے، تو کیا ہوا ہے؟'' امی ابو پریشان ہو کر پوچھتے رہے تھے اور بہت پوچھنے پر میں نے بتایا۔ ''آپ لوگ بہت یاد آ رہے تھے۔ بھائی بہت یاد آ رہے تھے۔''

مجھے نہیں پتا کہ ابو اور امی نے میری بات کا یقین کیا یا نہیں۔ بہر حال مزید کوئی سوال انہوں نے نہیں کیا۔ بالآخر میں گھر چلی آئی۔

☆=======☆=======☆

پھر ایک دن گزرا، دو دن گزرے۔ تین دن، چوتھا دن بھی گزر گیا۔ میری حالت ابتر تھی۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ نہ کھانا، نہ پینا، نہ شہباز سے ملنا۔ سونے لیٹتا تو نیند غائب ہو جاتی۔ طبیعت میں پہلے بےزاری، چڑچڑاپن آ گیا تھا اور اب اداسی اور مایوسی طاری تھی۔ میرا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا تھا۔ امی پوچھ پوچھ کر تھک گئی [illegible] بہت [illegible] بھائی دونوں پریشان ہوئے تھے اور میرے پاس

سوائے چپ کے کوئی اور جواب نہ تھا۔ نہ میری طبیعت سنبھلتی تھی۔ نہ حالت سدھرتی تھی۔

بالآخر پانچویں دن میں نے سارے عہد توڑ ڈالے اور مقررہ وقت پر میں الماس کے سکول پہنچ گیا۔

وہ باہر کھڑی تھی جیسے میری ہی منتظر ہو۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھی۔ نہ میں نے کچھ کہا نہ اس نے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ بالآخر ہم خاموشی سے اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا جیسے ہم کسی کی تعزیت کے لیے آئے ہوں۔ ہم دونوں بس خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بالآخر میں نے خاموشی توڑی۔

''تم نے تو کہا تھا کہ......'' اس نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔

''میں نے غلط کہا تھا۔'' وہ کہہ کر خاموشی سے رونے لگی۔

''میں بھی روک نہیں سکا خود کو۔'' کہتے ہوئے میرا لہجہ بھی بھیگ گیا۔ ''نہیں رہا جاتا مجھ سے تم کو دیکھے بغیر۔ تم سے ملے بغیر، باتیں کیے بغیر۔'' میرے آنسو خود بخود میری شرٹ کا گریبان بھگونے لگے۔

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں بے بس سا ہو گیا۔

''الماس، مت رو۔'' میں نے نہایت لاچاری سے کہا تھا۔

وہ اسی طرح روتی رہی۔ آنسوؤں سے، ہچکیوں سے، سسکیوں سے۔

''دیکھو، میں تم کو روتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا۔'' بے بسی سے کہہ کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

''تم چاہتے ہو کہ میں نہ روؤں۔''

اس نے آنسو بھری نگاہ سے مجھ کو دیکھا اور مجھے لگا، دنیا اس کے آنسوؤں میں ڈوبنے لگی ہے اور میرا دل بھی......

اس کے کندھے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

''ہاں، ہاں، ہاں۔'' میں پاگلوں کی طرح کہتا گیا۔

''تو پھر...... مل لیا کرو ناں افنان!''

وہ آنسوؤں کے درمیان کہتی ایک دم مجھ سے آن لگی۔

مجھے ایک دم کرنٹ سا لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پازیٹو نیگیٹو وائرز مل گئے ہوں۔ سرکٹ کمپلیٹ ہو گیا ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو جم گئے۔ شرٹ جو پہلے آنسوؤں سے بھیگ

رہی تھی، اب پسینے سے تر تھی۔ لمحے بھر کے اندر اندر گنی چنی دیکھی ہوئی انگلش موویز کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور میں اس کرنٹ کے Flow سے خود کو بچا نہیں پا رہا تھا۔

الماس کے آنسو تھم چکے تھے لہٰذا اس نے مجھے چونک کر دیکھا۔ سنبھلنے کی کوشش کی۔

''افنان......!''

میں اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

''افنان......!''

اب کی دفعہ الماس کی آواز میں خوف تھا۔ اس نے پوری قوت سے خود کو چھڑانا چاہا۔ تابڑ توڑ مجھ پر مکوں کی بارش کر دی اور مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے غرا کر پوچھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اور میں نے جھلا کر اس کو دھکا دے دیا تھا۔

''آئندہ ایسا مت کرنا۔ میرا دماغ بہت خراب ہے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا اور اس کی پروا کیے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

میں وہاں سے اٹھ کر تو آ گیا تھا لیکن بے چینی ایسی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ میں نے الماس سے کہا تھا کہ اس میں سے کچے امرودوں، کچے آموں، کچے جامنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔ مجھ کو یہ اندازہ نہ تھا، میں اس کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس میں سے بھی مٹی جیسی سوندھی، بے خود اور پاگل کر دینے والی ہوش ربا سی مہک بھی آتی ہے جو سامنے والے کا دماغ خراب کر دینے کے لیے کافی ہے۔

میں اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اپنے جذبات پر مجھے اختیار نہیں تھا حالانکہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ الماس میرے کتنے قریب آیا کرتی تھی۔ کبھی کندھے پر، کبھی کمر پر، مگر آج...... سے پہلے ایسی کیفیت نہیں ہوئی تھی کبھی۔

امی نے مجھے کھانے کے لیے آواز دی لیکن مجھے نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ میں نے بے دلی سے چند لقمے حلق سے اتارے۔ چاہا کہ اپنا دھیان کسی دوسری طرف لگا لوں۔ میں ناکام رہا۔ میں نے چاہا کہ کچھ پڑھ لینے کی کوشش کروں۔ پڑھا نہ جا سکا۔ سونے کی کوشش کی تو سویا نہ جا سکا۔ بالآخر مجھے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا مگر میرا دھیان ٹی وی پر بھی نہ تھا۔ امی دو تین مرتبہ سامنے سے گزریں۔

''افنان، کوچنگ نہیں جاؤ گے؟''

میں نے ایک نظر سامنے لگی وال کلاک پر ڈالی پھر بے دلی سے ''نہیں امی!'' کہہ کر سکرین کی طرف نظر جما دی۔ عصر کی اذان ہو گئی۔ مجھے یاد آیا، آج ظہر کی نماز بھی میں نے نہیں پڑھی ہے۔ امی مجھے نماز کے لیے کہہ کر گئیں مگر میں غائب دماغی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ عصر کے بعد مغرب کی اذانوں کی آواز آئی۔ میں سن سب رہا تھا مگر مجھ سے عاری ہو گیا تھا۔ پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''ارے افنان، دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ نہ پڑھنے کا ہوش ہے نہ کھانے کا۔ ارے، نمازیں آئیں، آ کر چلی گئیں نہ ٹی وی بند کر رہے ہو نہ اس کے سامنے سے ہٹ رہے ہو۔ آخر ایسی کیا چیز آ رہی ہے؟''

امی جھنجلا کر میرے پاس آئی تھیں۔ اینیمل ورلڈ پر ڈاکیومنٹری آ رہی تھی۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے ریموٹ لے کر ٹی وی بند کر دیا۔

''اٹھو، نماز پڑھ کر آؤ۔''

میں بڑی تابع داری سے اٹھا اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلا گیا۔ نماز میں میرا دل نہ لگ سکا۔ مجھے اپنی کیفیت پر رونا آ رہا تھا۔

میں گھر آیا۔ امی نے مجھ سے کہا۔ ''کچھ کھا لو۔ دوپہر بھی ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تم نے۔''

میں نے منع کر دیا۔

''اس لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پھر ٹی وی کھول کر بیٹھ جائے گا۔'' امی نے جھنجلا کر کہا۔ ''ہر وقت میرین لائف، ہی ورلڈ دیکھتا رہتا ہے۔ اچھی یہ ڈش ہے۔ آنے دو بابا کو کہوں گی ان سے۔''

میں چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر میں نے ٹی وی نہ کھولا۔ بستر پر لیٹ گیا حتیٰ کہ گھر میں ہونے والی گہما گہمی سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابو اور بھائی آ چکے ہیں مگر میں غائب دماغ سا چپ چاپ پڑا رہا۔ ابو، بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی جب مجھے دیکھنے کے لیے آئے تو میں سوتا بن گیا۔ قدرتی طور سے گھر بھر مجھے اتنے Odd Time پر سوتا دیکھ کر حیران ہوا تھا مگر مجھے نیند نہ جانے کس لمحے آ گئی تھی۔

صبح جب اٹھا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ طبیعت میں کسلمندی تھی اور ذہنی کیفیت اعتدال پر نہ تھی۔ امی مجھے سکول کے لیے اٹھانے آئیں تو میں شرافت سے اٹھ تو گیا مگر

سکول جانے کا ایک انچ بھی ارادہ نہ تھا میرا۔

ناشتے کی ٹیبل پر ابو اور دونوں بھائی پہلے ہی سے موجود تھے۔

''اوہو بھئی، بڑے لوگ اٹھ گئے۔'' چھوٹے بھائی نے مجھے آتا دیکھ کر کہا۔

ابو نے اخبار پر سے نظر ہٹا کر اور بڑے بھائی نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ جواباً مجھ سے مسکرایا بھی نہ جا سکا۔ میں چپ چاپ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

''پھر موسم سوار ہو گیا صاحب زادے پر۔'' ابو نے اخبار ایک طرف رکھ کر کہا۔ میرے اس قسم کے موڈ کو اب وہ موسم سے ہی تشبیہ دیا کرتے تھے۔

''نہیں تو۔'' میں نے لاچاری سے کہا۔

''تو لائٹ کیوں فیوز ہے؟'' چھوٹے بھائی نے مجھے چھیڑا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سر میں بہت درد ہے۔'' میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''پورے وقت ٹی وی دیکھو گے تو یہی ہو گا۔'' امی نے مجھے سلائس پر مکھن لگا کر دیتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ کیا دیکھتے رہے ٹی وی پر؟'' ابو نے مجھ سے براہ راست پوچھا تھا۔

''ارے نحوست کی ماری اینیمل ورلڈ پر سی ورلڈ میرین لائف وغیرہ آتی رہتی ہیں۔'' میرے بجائے امی نے جواب دیا۔ ''آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا نہیں۔

''تمہارے پاس بڑا ٹائم آتا جا رہا ہے افنان!'' بڑے بھائی نے کہا۔ ''یاد ہے ناں، میں نے اس دن تم سے کیا کہا تھا؟ میں بتا رہا ہوں تم کو ناکھٹ میں اے ون لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میٹرک میں محنت نہیں کی تو اچھے کالج میں ایڈمیشن نہیں ملے گا۔''

میں چپ رہا۔ بڑے بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔

''افنان ٹی وی دیکھنے سے تم کو کوئی منع نہیں کر رہا۔ ٹی وی دیکھو مگر اس سے دوسری Activities پر فرق نہیں پڑنا چاہیے اور نہ پڑھائی پر۔''

میں ایک بار پھر خاموش رہا۔ پھر امی، ابو، بڑے بھائی، چھوٹے بھائی سبھی مجھے نصیحتیں کرتے رہے۔ میں سر جھکائے سنتا رہا۔ بالآخر ابو آفس جانے کے لیے اور چھوٹے بھائی یونیورسٹی جانے کے لیے اٹھ گئے۔ امی انہیں چھوڑنے کے لیے اٹھ گئیں۔ بڑے بھائی ذرا دیر میں جاتے تھے، اخبار پڑھنے لگے۔ میں انہیں دیکھنے لگا۔ وہ میری طرف

متوجہ نہیں تھے بلکہ ان کی ساری توجہ اخبار کی طرف تھی۔

بس اس لمحے میں بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ میں اپنی کیفیت سے عاجز آ چکا تھا۔ میں شیئر کرنا چاہتا تھا کسی سے۔ امی سے کہتے مجھے حجاب آتا تھا۔ ابو کے سامنے مجھے کبھی بھی بولنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی اس موضوع پر۔ چھوٹے بھائی کے غصے سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ بڑے بھائی البتہ ایسی شخصیت تھے جن سے میں کچھ کہہ سکتا تھا۔

''بڑے بھائی، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ایک دم بلا ارادہ اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا تھا اور کہہ دینے کے بعد مجھے اپنی جلد بازی پر پچھتاوا بھی ہوا۔ میں سوچ رہا تھا، غلطی ہو گئی، غلطی ہو گئی۔ تھوڑا اور غور کر لینا چاہیے تھا۔ تھوڑا اور سوچ لینا چاہیے تھا۔

''ہاں، کہو۔'' وہ اخبار ایک طرف رکھ کر میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

میں نے ان سے کہہ تو دیا تھا لیکن اب مجھے ان سے بھی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔ مجھے لحاظ آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کیا کہوں، کیسے کہوں؟

''کیا بات ہے افنان؟'' بالآخر بڑے بھائی نے مجھ سے پوچھ لیا تھا اور میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''افنان......!'' انہوں نے مجھے پکارا۔ میں نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟''

میں دو لمحے کو خاموش سا ہو گیا، پھر کہا۔ ''جی......!''

''کہو، پھر۔''

اس بار میں نے سر جھکا لیا۔ پھر ان کو میں ساری بات بتاتے ہوئے کئی بار جھجکا تھا۔ بہت مرتبہ اٹکا تھا لیکن میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ کل کی بات میں بتا نہ سکا۔ کل کی بات بتانے والی تھی بھی نہیں...... سو وہ میں نے سنسر کر دی تھی۔

میں نے سب کچھ بتا کر سر اٹھا کر بڑے بھائی کو دیکھا تو وہ دم بخود مجھے دیکھ رہے تھے۔ اگر میں پوری بات بتانے کے دوران بھی سر اٹھا کر ایک نظر انہیں دیکھ لیتا تو انہیں یونہی دم بخود خود کو دیکھتا پاتا۔

''کب...... کتنے دن پرانا واقعہ ہے یہ؟'' بڑے بھائی نے بہت دیر بعد جب پوچھا تھا تو ان کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی لگی تھی مجھے۔

حساب تو مجھے ازبر تھا۔ ''چار مہینے اکیس دن۔''

''چار...... ماہ...... ہے۔'' بڑے بھائی جیسے گرتے گرتے بچے تھے۔

انہیں چار مہینے کا ہی سن کر شاک لگا تھا البتہ اکیس دنوں پر انہوں نے غور نہیں کیا تھا۔

''تمہارے لمحے لمحے بدلتے موڈ کی وجہ یہ تھی؟'' وہ گال پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہے تھے۔ ''کبھی بہت خوشی، کبھی بہت ٹینس...... تم اس وجہ سے رہے تھے؟'' وہ پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ''چار...... چار مہینے ہو گئے اس بات کو...... اور...... اور تم اب مجھے بتا رہے ہو؟'' انہوں نے کہہ کر سر پکڑ لیا تھا۔

میرا سر جو جھکا ہوا تھا، کچھ اور جھک گیا تھا، پھر میں نے بڑے بھائی کو کہتے سنا۔

''اچھا خیر، چلو جو ہوا، سو ہوا۔ دیکھو، اب میری بات غور سے سنو۔'' وہ یہ کہہ کر چند لمحے رکے۔ ''ابھی تم سکول جا رہے تھے؟''

بڑے بھائی کے سوال پر میں کہنا تو چاہتا تھا کہ نہیں...... منہ سے مگر نکلا تھا۔ ''جی!''

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ''مگر واپسی پر اس لڑکی کے سکول مت جانا بالکل۔''

''اس کے سکول تو میں آج جاتا بھی نہ۔ کل وہ نانی کے گھر چلی گئی ہو گی۔ مجھے آج اسے راستے میں ملنا تھا۔'' میں نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بتایا۔

''تمہیں کہیں اس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بڑے بھائی نے بطور خاص کہیں اور نہیں پر زور دیا تھا۔ ''سن لیا تم نے میں نے کیا کہا؟''

''جی......!'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آج میں آفس سے جلدی آ جاؤں گا تو تم سے تفصیلی بات ہو گی۔ ابھی تو میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ تم بھی سکول سے لیٹ ہو رہے ہو گے اور تم سمجھ گئے ناں میں کیا کہہ رہا ہوں؟ سکول سے سیدھے گھر آنا۔ راستے میں کہیں رکنا مت۔ گھر آنے کے بعد کہیں اور جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کوچنگ نہیں، کراٹے کلب بھی نہیں۔ جب میں گھر آؤں تو تم مجھے گھر پر موجود ملو۔'' بڑے بھائی نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جی اچھا!'' میں نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔ بڑے بھائی مسکرانے لگے۔

''اب یار، ایسی تو شکل بنا کر مت بیٹھو۔ اس میں پریشان ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ایسا ہو جاتا ہے اکثر...... اور کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' ان کے کہنے پر میں کچھ دیر ان کو دیکھتا رہا۔ ''ہاں، میں [illegible] رہا ہوں۔'' انہوں نے گویا مجھے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ ''اٹھ جاؤ اب۔

تیار ہو کر آؤ۔ میں تم کو سکول تک چھوڑ دوں گا۔'' انہوں نے کہہ کر مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

میں چلنے لگا تو ایک دم کسی خیال کے تحت پلٹ کر ان سے پوچھا تھا۔ ''بڑے بھائی! آپ کسی کو کچھ بتائیے گا نہیں۔''

''نہیں یار، بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔'' انہوں نے مسکرا کر مجھے یقین دلایا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں؟'' میں نے پھر بھی تصدیق ضروری سمجھی۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بے فکر ہو کر جاؤ۔'' انہوں نے مجھے ایک بار پھر یقین دلایا تھا۔

میں مرے مرے قدموں سے تیار ہونے کے لیے چل دیا۔

پھر بڑے بھائی نے مجھے سکول تک چھوڑا تھا۔

''میں فون کروں گا بیچ میں۔ گھر پہ ملنا.....اچھا؟'' جب میں اترنے لگا تو انہوں نے کہا تھا۔ میں نے سر ہلا دیا۔

سکول میں بھی وقت ایسا ہی گزرا۔ چھٹی ہوتے ہی ایک لمحے کو مجھے خیال آیا تھا کہ الماس یقیناً منتظر ہوگی لیکن دوسرے ہی لمحے بڑے بھائی کی سختی سے دی ہوئی ہدایت مجھے یاد آ گئی۔

''نہیں، مجھے اس سے کہیں نہیں ملنا۔'' میں نے خود سے کہا تھا اور ان کی ہدایت پر پوری طرح سے عمل کرتے ہوئے میں ایک عرصے بعد شہباز کے ساتھ ہی گھر واپسی کے لیے نکل پڑا تھا۔

''آج تم کتنے ہی عرصے بعد میرے ساتھ جا رہے ہو فنان!''

راستے بھر شہباز حیران ہوتا رہا تھا حتیٰ کہ مجھے اس کی حیرت سے چڑ ہونے لگی تھی لیکن میں خود پر ضبط کیے ہوئے چلتا رہا تھا۔ کچھ کہا نہیں۔ پھر جب راستے میں اس کے فلیٹس پڑے تو اس نے مجھ کو ساتھ ہی آنے کی دعوت دی۔

''نہیں، پھر کبھی۔'' میں نے ایک دم بوکھلا کر کہا تھا۔

''بس صرف دس منٹ۔'' اس نے یقین دلایا تھا۔

''نہیں، دس منٹ بھی نہیں۔'' میں نے خوف زدہ ہو کر یہ کہہ کر گھڑی دیکھی اور اس سے اللہ حافظ کہہ کر تیز تیز قدموں سے آگے چل دیا تھا۔

''کوچنگ تو آؤ گے ناں؟'' اس کے سوال کرنے پر میں مڑے بغیر وہیں سے ''نہیں'' کہا تھا اور تقریباً ادھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے گھر پہنچ کر شکر کی طویل سانس لی تھی اور اس کے بعد میں نے ہر کام معمول کے مطابق کیا تھا۔ بڑے بھائی کی ہدایت کے مطابق میں نہ کوچنگ گیا تھا نہ کراٹے کلب۔ پھر میں بڑے بھائی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ چار بجے دن ان کا فون آیا۔ میں نے ہی اٹھایا۔

''کب آئے سکول سے؟'' چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا۔

''سوا دو بجے آیا تھا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر بتایا۔ ''آپ آئے نہیں؟''

''ہاں، میں بس آتا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' انہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''جی، بڑے بھائی!'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا، میں آیا، دیکھو، پریشان مت ہونا۔'' بڑے بھائی نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

امی کی کوئی ملنے والی آ گئیں۔ وہ ان کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔ مجھ سے تواضع کا کچھ سامان منگوایا۔ میں نے لا کر دے دیا۔ بڑے بھائی ابھی تک نہ آئے تھے۔

کیا بوریت ہے..... میں نے جھنجلا کر سوچا تھا۔ کوچنگ نہ جاؤ۔ کراٹے کلب نہ جاؤ۔ الماس سے ملنے بھی مت جاؤ۔ خود ابھی تک آئے نہیں ہیں۔ میں کیا کروں پھر؟

اسی بوریت کے عالم میں، میں نے ٹی وی کھولا تھا۔ شاید کہیں میرین لائف یا سی ورلڈ آ رہا ہو۔ میں نے اپنا ہر پسندیدہ چینل دیکھ لیا لیکن وہاں میری پسند کا کچھ نہ تھا۔ کہیں پودوں کے متعلق تفاصیل بتائی جا رہی تھیں۔ کہیں بندروں کی نسل سے انسانی ارتقاء تک کے مراحل کو دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں چھپکلیاں زیر بحث تھیں۔ مجھے مزید بوریت نے آ لیا۔

''اونہہ، ٹی وی پر بھی بکواس کے سوا کچھ نہیں آتا۔''

میں جھنجلا کر ٹی وی بند کرنے لگا تو ''آف'' کے بٹن پر انگلی پڑنے کی بجائے کسی چینل پر پڑ گئی۔ نتیجے میں اسکرین پر سامنے آنے والا منظر دیکھ کر میں پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ ہوش و حواس سب اڑ گئے۔ دماغ کی ساری کھڑکیاں کھل گئیں۔ چودہ کیا، اٹھائیس طبق روشن ہو گئے۔ آنکھیں پوری کھل گئیں۔ دو منٹ کے اس منظر میں کیا کچھ نہیں تھا اور میں تھا کہ ایک دم شاک میں..... مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ ٹی وی آف ہی کر دیتا۔ میرے تو ہاتھ پیر سب ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ گال تمتمانے لگے۔ کان گرم ہو گئے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے آج کے بعد کبھی دھڑکے گا ہی نہیں۔ معتدل موسم کے

باوجود جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ میں تو بس دم بخود اسکرین دیکھے جا رہا تھا......

تبھی ڈور بیل بجنے پر میں ہڑبڑا سا گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے چینل چینج کرنا چاہا تو وہ بھی گھبراہٹ میں بمشکل ہو سکا۔ میں نے ٹی وی جیسے تیسے بند کیا۔

اپنے کمرے میں آتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان نہیں رہ گئی ہے۔ اپنے جسم کی لرزش کو میں محسوس کر سکتا تھا لیکن قابو نہیں کر سکتا تھا۔ میں بستر پر جا کر آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

اسی دم بڑے بھائی آ گئے۔ مجھے آ کر ہلایا۔ ''افنان، سو رہے ہو؟''

میں نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔

''نہیں تو۔'' کہہ کر میں بمشکل اٹھ کر بیٹھا تھا۔ دل کی دھڑکن ابھی تک اعتدال پر نہیں تھی اور نہ ہی ذہنی ابتری میں کوئی کمی واقع ہوئی تھی۔

''رو رہے تھے؟'' انہوں نے پوچھا۔

مجھ سے کچھ کہا نہیں جا سکا۔

بڑے بھائی مسکرائے۔ ''بالکل پاگل ہو۔''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ مجھے یاد آیا، الماس نے بھی ایک دن مجھ سے یہی کہا تھا۔ الماس جو مجھے یاد آئی تو کل کا واقعہ بھی یاد آ گیا۔ ابھی ٹی وی پر دیکھا جانے والا ''تازہ منظر'' بھی یاد آ گیا۔ کل کے منظر میں اور موویز کے مناظر میں تھوڑی بہت مماثلت تو اتفاقیہ ہو سکتی ہے مگر آج تو پردے اٹھے تھے آنکھوں کے سامنے سے..... اُف..... کائنات کے کیا کیا اسرار کھلے تھے آج۔ دنیا کے کن کن رازوں کا پتا چلا تھا۔ کیا کیا حقیقتیں روشن ہوئی تھیں۔ اُف..... دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔

بڑے بھائی مجھے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ میں ان کے ہلتے ہونٹ تو دیکھ رہا تھا لیکن میرا ذہن اس وقت کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ میرے اندر تو الاؤ دہک رہے تھے۔ آتش فشاں ابل رہے تھے۔ آگ بھڑک رہی تھی جو پورے وجود میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی عالم میں، میں نے بڑی کوشش کی کہ اس پر concentrate کر سکوں جو بڑے بھائی کہہ رہے تھے اور بالآخر میں ان کے آخری جملے بمشکل سمجھنے کے قابل ہو سکا۔ بڑے بھائی کہہ رہے تھے۔

''افنان، دیکھو، اب بڑے ہو گئے ہو۔ ابھی دنیا میں بہت سارے کام کرنے ہیں۔ خوب

پڑھنا ہے۔ کچھ بننا ہے۔ اپنا مستقبل بنانا ہے۔ ان چکروں میں پڑنے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔ ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ابھی سے ان چکروں میں پڑ گئے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

بڑے بھائی مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں چپ تھا۔

''ٹھیک ہے، تم نے ایک لڑکی کو دیکھا، اس کی طرف اٹریکٹ ہو گئے۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ آدمی ہو ہی جاتا ہے کسی نہ کسی کی طرف اٹریکٹ۔ مگر دیکھو، ان سب باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔''

بڑے بھائی کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کو پتا چل جائے کہ آج کا واقعہ کیا ہوا ہے تو وہ یقیناً مان لیتے کہ بات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے یا نہیں...... جبکہ بڑے بھائی مزید کہہ رہے تھے۔

''آدمی کو ان سب باتوں کو خود پہ سوار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سب باتیں وقتی انجوائے منٹ کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ایسے دھواں دھار اخیز فلموں میں ہیرو، ہیروئن کے ساتھ ہی چلانا اچھا لگتا ہے اور ہم تفریح میں انہیں دیکھ کر مزے بھی کر لیتے ہیں۔ اصل زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ تم خود سوچو، کیا ہوتا ہے؟ کیونکہ نہ تم ہیرو ہو اور نہ وہ لڑکی ہیروئن ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

اب بڑے بھائی مجھ سے تصدیق چاہ رہے تھے اور مجھ سے اثبات میں بھی سر ہلایا نہ جا سکا۔

''افنان......!'' بڑے بھائی نے ایک دم کندھے سے پکڑ کر مجھے ہلا دیا تھا اور میں نے بے طرح چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

''کن سوچوں میں ہو؟'' انہوں نے بہت فکرمندی سے پوچھا تھا۔

''کسی سوچ میں نہیں۔'' میں نے پھیکے سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔

''کسی سوچ میں نہ ہوتے تو یوں چونکتے نہیں۔'' انہوں نے فوراً کہا اور میں بالکل خاموش ہو گیا۔

''کہہ دو مجھ سے وہ سب کچھ جو تمہیں تنگ کر رہا ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ کیا کہوں ان سے؟ کہنے والی بات بھی تو ہو۔ وہاں تو صرف احساسات تھے۔ عجیب و غریب احساسات کیا احساسات بیان کیے جا سکتے ہیں؟

میں سوچے جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے کہا۔ ''کچھ تنگ نہیں کر رہا۔''

"اچھا......!" بڑے بھائی کو یقین نہیں آیا ہوگا تبھی ان کی اس "اچھا!" میں بے یقینی تھی۔ "چلو ایسا کرتے ہیں، آج کا دن ہم ساتھ گزارتے ہیں۔ یہاں نہیں، کہیں باہر۔ ایسا کرتے ہیں کہ سی سائیڈ چلتے ہیں۔ تمہیں سمندر اچھا بھی لگتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

بڑے بھائی نے اپنا خیال بتاتے ہوئے ایک دم میرا خیال پوچھا تھا اور میرا تو کوئی خیال سرے سے تھا ہی نہیں لہٰذا انہی پر ڈال دیا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں، عصر کی اذان ہو گئی ہے۔ ابھی نماز پڑھنے چلتے ہیں۔ مغرب، عشاء وہیں پڑھیں گے۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کریں گے، پھر میں واپسی پر تم کو برگر پوائنٹ سے برگر کھلاؤں گا اور آئس کریم پارلر سے آئس کریم۔" انہوں نے بیٹھے بٹھائے سارا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ "اور اب اٹھ جاؤ، تیار تو تم ہو، بس امی سے کہہ کر آتا ہوں۔"

بڑے بھائی چلے گئے۔ میں غائب دماغی سے بیٹھا رہا ایسے جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری حسیں ختم ہو گئی ہوں۔ پھر وہ آئے تو میں ان کے ساتھ ہو لیا مگر کیفیت میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ راستے میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں چپ تھا۔ درحقیقت میرا ان کی کسی بات کا جواب دینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں تو مستقل حالتِ جنگ میں تھا۔ لڑ رہا تھا اپنی کیفیت سے۔ آگ پر پانی کے چھینٹے دینے کی کوشش کر رہا تھا، ناکام رہ رہا تھا۔

ہم ساحل پر پہنچ چکے تھے۔ ساحل کے کنارے پڑے پتھروں پر بیٹھے ہوئے بڑے بھائی غور سے مجھے دیکھتے رہے۔ میں ان سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ان کی نظریں مجھے خود کو چھیدتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ مجھے درحقیقت ان کا اس طرح دیکھنا اچھا لگ نہیں رہا تھا۔ وہ مستقل مجھے سمجھا رہے تھے۔

"یہ محبت وحبت، یہ عشق، پیار ویار سب فضولیات ہیں۔ ان باتوں میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہوتا یوں ہے کہ وقتی کشش کو بس ایک نام دے دیا جاتا ہے۔ پسند کا، محبت کا، پیار کا...... اور بس......"

میں بڑے بھائی کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا، اس لمحے...... مگر مجھے خیال آ رہا تھا۔ وہ بار بار محبت کا، پیار کا، کیوں کہہ رہے ہیں۔ "I never said that i love almas."

"افنان، میں نہیں جانتا کہ کچھ دیر پہلے میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے، تمہیں کس حد

سمجھ میں آیا ہے؟" وہ مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ "مگر یہ تو طے شدہ سی بات ہے کہ تم بہت الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔ کیا بات ہے آخر؟"

اور میرے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی جواب نہ تھا۔

"وہ لڑکی تم کو پریشان کر رہی ہے؟" بڑے بھائی کو لازماً یہی سمجھنا تھا۔

میں اس پر بھی چپ رہا تھا۔ انہوں نے بہت گہری سانس لی۔

"تم واقعی اس لڑکی میں اتنا انٹرسٹڈ ہو تو افنان، پہلے کچھ بن جاؤ، اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ، پھر تم جو چاہو گے، جیسا چاہو گے، ویسا ہی ہوگا۔ یقین کرو افنان اس لڑکی کا پتا مجھے دینا۔ میں خود اس کی شادی تم سے کرواؤں گا۔"

بڑے بھائی سمجھ نہیں رہے تھے۔ وہ میری کیفیت کو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس آگ کو بجھا ہی نہیں سکتے تھے جو مجھے جلائے دے رہی تھی۔ اس الاؤ کو کم کر ہی نہیں سکتے تھے جو میرے اندر روشن تھا۔

"مگر دیکھو، ابھی تو کچھ نہیں ہو سکتا ناں۔" ان کا لہجہ بے چارگی لیے ہوئے تھا۔

"ابھی تو تم نے میٹرک بھی نہیں کیا ہے۔ وہ لڑکی بھی یقیناً چھوٹی ہی ہوگی۔ میں نہیں جانتا، تم اس لڑکی میں کس حد تک انوالو ہو۔ تمہاری کیفیت بتاتی ہے کہ سیریسلی ہی ہوئے۔ اب صرف انوالو ہونے سے ہی تو کچھ نہیں ہوتا ناں! لڑکی کے ماں باپ کو گارنٹی بھی تو چاہیے ہوتی ہے کہ جس لڑکے سے ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہو، اس میں کچھ اہلیت بھی ہے کہ نہیں۔ تم میں ابھی کوئی اہلیت نہیں ہے افنان......! اہلیت تم میں تب آئے گی جب تم خوب سارا پڑھ لو گے۔ کچھ بن جاؤ گے، اپنا مستقبل بنا لو گے مگر افنان، ابھی سے کسی میں اتنا انوالو ہو جاؤ گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

بڑے بھائی مستقل مجھے سمجھا رہے تھے اور میں سمندر کی لہروں کو ساحل سے ٹکراتا دیکھ رہا تھا۔ لہروں کا شور باہر تھا اور ایک شور میرے اندر تھا۔ یہ شور لہروں کا نہ تھا اور کسی کا تھا، میری خود مجھ سے باہر تھا۔

"افنان، اگر تم کسی میں انوالو ہو تو کوئی بات نہیں۔ اس انوالومنٹ کو ایک دم سے ختم نہیں کیا جا سکتا مگر تم یہ بھی تو دیکھو ناں، اس وقت تمہارے لیے اہم کیا چیز ہے۔ وقت کی ضرورت کیا ہے۔ تم نے کبھی سوچا ہے؟ گھر میں کتنے لوگوں کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ امی کی، ابو کی، میری، سمعان کی۔ تم کو ایک بار بھی ابو، میں اور سمعان نہیں نظر آئے؟ ہماری صورت، مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ تمہیں ہمارے جیسا بننا ہے افنان!

کسی میں تم ابھی سے اتنا انوالو ہو جاؤ گے تو ہمارے جیسا کیسے بن سکو گے۔ افنان، تم جانتے ہو، تم جس ایج میں ہو، آدمی اس ایج میں یا تو بن جاتا ہے یا برباد ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی involvements بربادی کے راستے پر بھی لے جایا کرتی ہیں۔ تم...... تم افنان، کوئی غلط حرکت مت کر بیٹھنا۔ افنان، تم اتنے سارے لوگوں کو کسی شرمندگی سے دوچار مت کرنا۔"

بڑے بھائی کے لہجے میں بہت التجا تھی۔

"افنان، تم بس اتنا سوچ لینا کہ تمہارا ایک غلط اٹھایا جانے والا قدم ہم سب کو کسی گہری کھائی میں دھکیل دے گا...... اور تم خود جہنم میں جا گرو گے۔" بڑے بھائی نہ جانے کس خیال کے تحت مجھے سمجھا رہے تھے۔ "تم...... تم...... تم اتنے سارے لوگوں کو مایوس تو نہیں کرو گے ناں؟"

بڑے بھائی کا لہجہ بہت آس لیے ہوئے تھا۔ بہت امید تھی اس میں۔ ان کے لہجے نے مجھے ہلکا سا دھکا دے دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ میری ذہنی ابتری اور بدترین کیفیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی مگر میرا سر بے اختیار نفی میں ضرور ہل گیا تھا اور بڑے بھائی نے شاید اسی کو بہت سمجھا تھا۔ ان کا ہاتھ بے اختیار میرے سر پہ ٹھہر گیا تھا۔

"خوش رہو تم افنان! اللہ ہر مشکل، ہر پریشانی سے تم کو دور رکھے۔ اللہ تمہیں بہت ساری عزت دے اور ذلت کبھی نہ دے۔ اللہ کرے، تمہیں کہیں ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اللہ کرے، زندگی کے ہر محاذ پر تمہیں کامیابی ہو۔ اللہ کرے، تم جو دعا مانگو، وہ قبول ہو۔ اللہ کرے، تم جو چاہو، وہ تم کو ملے۔ تمہیں کسی چیز کے لیے رونا نہ پڑے۔ ترسنا نہ پڑے۔"

بڑے بھائی میرے لیے دعا کر رہے تھے۔ میں غائب دماغی سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ سن سب کچھ رہا تھا، سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اسی عالم میں، میں نے مغرب، عشاء کی نمازیں پڑھی تھیں۔ بڑے بھائی نے حسب وعدہ مجھے برگر پوائنٹ سے برگر اور آئس کریم پارلر سے آئس کریم کھلائی تھی مگر سچ بات ہے، اس وقت مجھے کسی چیز کی خواہش نہ تھی۔ برگر کے بمشکل دو بائٹ لے کر باقی میں نے بڑے بھائی کی طرف بڑھا دیا تھا اور آئس کریم میں نے پگھلا دی تھی۔ آئس کریم باہر تو کچھ دیر بعد پگھلی تھی، میرے اندر جاتی تو ایک سیکنڈ میں پگھل جاتی، پھر بھی میرا وجود ٹھنڈا نہ ہوتا۔

بڑے بھائی مستقل مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں ہوں ہاں میں ان کو جواب بھی دے رہا تھا مگر میرا دھیان بٹ نہیں پا رہا تھا۔ بالآخر رات ساڑھے دس بجے تک ہم گھر پہنچ گئے تھے۔

"افنان، تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

بڑے بھائی نے راستے میں کئی بار یہ سوال مجھ سے پوچھا تھا اور اب بھی وہ مجھ سے یہی پوچھ رہے تھے۔ ہر مرتبہ میں انہیں کسی طرح کا جواب نہیں دے سکا تھا اور اس بار بھی میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تم پریشان مت ہو۔ دیکھو، یہ مشکل تو ہے، ناممکن نہیں ہے۔ ان شاء اللہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے میرے کندھے کو ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا اور میں بڑے بھائی کو بس دیکھتا کسی معمول کی طرح ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ انہوں نے مجھے میرے کمرے تک چھوڑا تھا۔

"سب بھول جاؤ۔ ساری سوچیں ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرو۔ صبح جب اٹھو گے تو بالکل فریش ہو گے۔" انہوں نے ایک بار پھر مجھے تسلی دی تھی اور اس لمحے میرا بے اختیار دل چاہا تھا کہ ان کو روک لوں۔ بڑے بھائی آج مجھے اکیلا مت چھوڑیں...... مگر میں انہیں ایک نظر دیکھ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ مجھے باہر ہی سے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

میں بڑے بھائی کی ہدایت پر پوری طرح عمل کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ سونے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا۔ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ امی مجھے دیکھنے کے لیے آئیں تو میں نے انہیں دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مجھے سوتا سمجھ کر پیار کر کے چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ آنکھیں بند رکھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

نیند تھی کہ میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

آگ تھی کہ بدستور جل رہی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتے شعلے...... اور جھلستا ہوا، جلتا ہوا میں...... بالآخر جب جلن برداشت سے باہر ہو گئی، میں اٹھ گیا۔

اس وقت گیارہ بجے تھے۔ میرے گھر والے سونے کے لیے لیٹ چکے تھے، سو گھر میں خاموشی تھی۔ میں نے کچن میں جا کر فریج سے ٹھنڈا پانی نکالا۔ گلاس میں انڈیلا

اور چڑھا گیا۔ ایک گلاس، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ تیسری بار میں مجھے پانی کی ٹھنڈک بھی کچھ کم ہوتی لگی، تب پھر فریزر سے آئس کیوب نکالے۔ میں نے چھ سات کیوبز گلاس کے اندر ڈال کر پھر پانی ڈالا اور برف سا پانی معدے میں انڈیل لیا۔

اس وقت درحقیقت مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تو بس اس آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھے راکھ کیے دے رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا، فائر بریگیڈ کو طلب کرلوں، کسی دریا میں ڈبکیاں لگاؤں۔ سمندر میں چھلانگ مار دوں۔ اس ذرا سے پانی سے تو کام نہیں چلنے والا...... لہٰذا آخری قطرہ بھی حلق میں ٹپکا دینے کے باوجود کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو خاصی جھنجلاہٹ سے دیکھا تھا۔ ایک دم دل چاہا کہ گلاس کو اٹھا کر دیوار پر دے ماروں۔

میں نے خاصا مشتعل ہو کر گلاس ٹیبل پر پٹخ دیا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا، میں ایک دنیا کو پٹخ دوں، پھینک دوں، سب کو الٹا کر رکھ دوں۔ میں خاصا جھنجلا کر اٹھا تھا اور اپنے کمرے میں جانے کی بجائے گیٹ کھول کر باہر نکل گیا تھا، پھر بے اختیار میرے قدم شہباز کے فلیٹس کی طرف اٹھتے چلے گئے تھے۔

میں نے اپارٹمنٹس کے احاطے میں قدم رکھا تھا اور الماس کی نانی کے فلیٹ کے پاس جا کر رک گیا۔ اندر کمروں کی لائٹ جل رہی تھی۔ روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ابھی سوئے نہیں ہیں۔ میں نانی کے فلیٹ کی کچن والی طرف آگیا۔ کچن کی لائٹ بھی جل رہی تھی۔ میں کافی دیر تک کھڑا رہا۔ تبھی میں نے الماس کو آتے دیکھا تو اسے ہلکی سی آواز دی۔

☆======☆======☆

میں اتفاق سے اس وقت پانی پینے کے لیے آئی تھی۔ افنان کی آواز سن کر بے اختیار میں کھڑکی کے پاس آئی تھی اور اسے اس وقت وہاں دیکھ کر خوف زدہ اور تھوڑی حیران بھی ہو گئی تھی حالانکہ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نانی کے ہاں آکر مجھ سے ملنے کی کوشش مت کیا کرے۔ وہ بھی ایک نمبر کا پاگل تھا۔ میری سنتا ہی نہیں تھا' سو اس وقت بھی میں نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

"تم...... افنان' اس وقت کیوں آئے ہو؟"

"باہر آسکتی ہو؟" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا تھا۔

"نہیں......" میں نے خوف زدہ ہو کر جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں' آؤ......!" وہ جھنجلا سا گیا تھا۔

"ماما گھر پر ہیں۔" میں منمنانے لگی تھی۔

"بس کچھ کرو' میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ ناراض ہونے لگا۔

میں اس کی ناراضگی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہ دن میں مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اب اس وقت آیا تھا تو میرا بھی اس کو ایسے ہی لوٹا دینے کا دل نہیں تھا۔

کیسی بات ہوتی ہے ناں' بس صرف ایک آدمی کی ناراضگی کے ڈر سے' برسوں کے پیارے رشتوں کی ناراضگی کا ڈر دل سے نکل جاتا ہے۔

"اچھا' پچھلی طرف سے آؤ۔" کہہ کر میں ڈرائنگ روم میں آگئی۔

مہر خالہ اپنی یونیورسٹی کا کام کر رہی تھیں۔ ماما اپنے کمرے میں اپنا کام کر رہے تھے۔ میں جانتی تھی' دونوں ایک ڈیڑھ بجے سے تو پہلے سونے والے نہیں ہیں' سو میں نے خالہ سے کہا۔ "خالہ' میں سونے جا رہی ہوں۔" کیونکہ میں خالہ کے ساتھ ہی سوتی تھی۔

خالہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ "ہاں' تو میں کتنی مرتبہ تم سے کہتی ہوں' جلدی سو جایا کرو۔ صبح اسکول بھی جانا ہوتا ہے۔ جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں' میرا انتظار کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"اللہ حافظ! خالہ......!" کہہ کر میں نے نانا نانی کے کمرے میں جھانکا۔ نانا نانی کا کمرہ میرے اور خالہ کے کمرے کے برابر میں ہی تھا۔ نانا جلدی سو جانے کے عادی تھے۔ نانی' خالہ اور ماما کے سونے کے بعد سوتی تھیں۔ اس وقت بھی نانا حسب معمول سو چکے تھے۔ نانی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

"اللہ حافظ! نانی......!" میں نے آہستگی سے ان کے پاس جا کر کہا۔

"اللہ حافظ!" کہتے ہوئے انہوں نے میری پیشانی چومی۔

میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کمرے کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ میں نے دو تین گاؤ تکیوں کو بستر پر رکھ کر چادر ڈھک دی اور باہر کی طرف والا دروازہ کھول کر باہر چلی آئی۔ یہاں افنان میرا انتظار کر رہا تھا۔

"اتنی دیر کیوں لگی؟" اس نے ناراضگی سے پوچھا۔

"تم اتنے غلط وقت پر کیوں آئے؟"

"یہاں کھڑے ہو کر بات کریں گے؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔

"نہیں ناں' پیچھے کو چلو' وہاں صرف پانی کی موٹریں لگی ہوئی ہیں اور کاٹھ کباڑ ہوتا

ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

پھر ہم دونوں اسی طرف چلے آئے۔ افنان کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے ایک دم اپنی کل کی حرکت یاد آ گئی تھی جو بالکل غیر شعوری تھی۔ مجھے افنان سے حجاب آنے لگا اور کل اس نے بھی تو مجھے کیسا دھکا دے دیا تھا اور اب کتنے مزے سے آ گیا تھا اور مجھ پر خفا بھی ہو رہا تھا۔

ہم ادھر پہنچے تو وہ جگہ نیم تاریک تھی۔ عام حالات میں یہاں لوگوں کی آمد و رفت کے بہت کم امکانات ہوتے تھے پھر اس وقت تو پونے بارہ ہو رہے تھے۔ خاموشی میں صرف موٹر کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔

☆======☆======☆

''تم اتنے غصے میں کیوں ہو افنان؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''میں غصے میں نہیں ہوں۔'' میرا لہجہ خود بخود دھیما ہو گیا۔

''پھر خفا ہو؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں...... خفا ہوں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں دنیا بھر سے خفا ہوں۔''

''صبح اسی لیے نہیں آئے؟''

''ہاں......!''

''اچھا' کل تم نے مجھے دھکا کیوں دیا تھا؟ اور آج اس وقت کیوں آئے ہو؟''

''شش......! چپ......!'' میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر خود سے قریب کیا۔ ''تم سوالات بہت کرتی ہو۔'' میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

پھر الماس کچھ نہ بولی اور میں بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ ایک بار پھر سرکٹ کمپلیٹ تھا اور بھیگی مٹی کی خوشبو نے میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ الماس کے حالات کیا تھے مگر میں تو ایسا تھا جیسے ایک دم نشے میں......! اور ابھی نشہ پوری طرح سے چڑھا نہیں تھا کہ ہرن ہو گیا۔

''کون ہے بھئی؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

آواز تھی کہ شاہی نقارہ...... میں بوکھلا کر الماس سے الگ ہٹ گیا۔

''ماما......'' الماس کی سرگوشی نما چیخ خاصی بلند تھی۔

☆======☆======☆

اور ماما نے اس وقت سیدھا سیدھا میرا نام لے لیا تھا حالانکہ عام حالات میں وہ

مجھ کو بھانجی کہتے تھے مگر اس دن...... ان کی آواز میں کئی کیفیات تھیں اور میں ایسی تھی گویا جسم سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

پھر ماما پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ انہوں نے افنان کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ اسے لاتوں گھونسوں پر رکھ لیا۔ اسے مارتے مارتے گھسیٹتے ہوئے کمپاؤنڈ سے باہر لا کر زمین پر پٹخ دیا۔ افنان نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا اور میں چیخ رہی تھی۔ ''ماما......! بس کریں......'' میں کوئی افنان کی ہمدردی میں نہیں چیخ رہی تھی بلکہ خوف کے مارے چیخ رہی تھی کیونکہ میں نے فلموں میں تو بہت بار ہیرو کو پٹتے دیکھا لیکن اس طرح Live زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو یوں بری طرح پٹتے دیکھا تھا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ بہت خوف آ رہا تھا۔

''بس کروں...... ہاں...... بس کروں۔'' ماما میری طرف مڑے تھے اور اتنی زور سے میرے بال پکڑے تھے کہ میری چیخیں نکل گئیں۔

''ماما......! چھوڑ دیں۔'' میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''آواز بند کرو اپنی۔'' ماما اس سے کہیں زیادہ بلند آواز میں دھاڑے تھے۔ ''بے غیرت...... بے حیا...... بے شرم......''

پھر ماما نے بہت مارا تھا مجھے۔ ایک تھپڑ' دوسرا' پھر تیسرا' پھر انہوں نے بس نہیں کیا۔ ہر تھپڑ کے ساتھ میری آہیں' سسکیاں اور چیخیں بلند ہوتی تھیں۔ میری چیخیں سن کر محلے بھر کی کھڑکیاں' دروازے کھل گئے تھے۔ اکثر گھروں سے تو لوگ بھی نکل نکل کر باہر آنے لگے تھے۔ ماما کو اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ شور کی آوازیں خالہ' نانا اور نانی نے بھی سن لی تھیں۔ وہ باہر آ گئے تھے۔ ماما کو مجھے مارتے دیکھا تو نانی نے آ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ارے یہ کیا تماشا بنایا ہوا ہے؟''

''میں نے تماشا بنایا ہوا ہے؟'' وہ ہانپنے لگے تھے۔ ''اس بے غیرت کو دیکھیں' اس سے پوچھیں۔ کیا کر رہی تھی یہ کمپاؤنڈ کے پچھلی طرف اس لڑکے کے ساتھ؟''

''آہستہ بول۔ خدارا!'' نانی نے لرز کر کہا۔ ''کچھ تو عزت کا خیال کر۔''

''عزت کا خیال میں کروں' ابھی عزت رہ کیا گئی ہے۔ اس نے عزت مٹی میں ملانے میں کوئی کسر چھوڑی ہے؟ ارے دن کا بیشتر وقت یہ آپ کے ساتھ گزارتی تھی۔ ...... دن سے اس کا دھیان بھی نہیں رکھا گیا؟'' ماما چیخ رہے تھے۔

اور میں آنکھیں بند کیے لرز رہی تھی۔ اتنی ذلت تھی کہ دل چاہتا تھا' زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

"مہر...... الماس کو اندر لے جاؤ۔" نانا نے خالہ سے کہا تو انہوں نے مجھے گھر میں لا کر بند کر دیا۔ شاید ماما' افنان کو ایک بار پھر مارنے لگے تھے کیونکہ میں "بس کرو۔" کی آوازیں بخوبی سن سکتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ماما تیزی سے گھر کے اندر آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر ڈائننگ ٹیبل کے نیچے چھپ گئی تھی۔ وہ شاید بہت تیزی میں تھے اسی لیے مجھے دیکھ نہیں سکے تھے۔ خوف کے مارے میرا برا حال تھا۔ ماما کی آواز میں بخوبی سن سکتی تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں کہہ رہے تھے۔ "نہیں' چھوڑوں گا۔ آج تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دونوں کو مار دوں گا۔" میں نے جب یہ سنا تو بے اختیار اپنی سسکیوں کو منہ پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا۔ ماما جس تیزی سے اندر آئے تھے' اسی تیزی سے باہر بھی نکل گئے تھے' پھر میں نے دو فائر ہونے کی آواز سنی۔ میرا دم نکل گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ماما اندر ریوالور ہی لینے آئے ہوں گے۔ افنان کا اتنا بھیانک انجام سوچ کر میں نے اپنی چیخوں کو منہ پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا اور اپنا انجام سوچ کر میں لرزتی کانپتی رہی تھی۔ آنسوؤں' ہچکیوں اور سسکیوں سے روتی رہی تھی۔ مجھے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ ماما کتنے غصے والے ہیں۔

پھر مجھے نہیں پتا' کتنی دیر بعد نانا' نانی' خالہ اور ماما اندر آئے...... افنان کا کیا ہوا...... اندر آ کر نانا' نانی' خالہ کسی نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ ماما کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں شرمندگی' پشیمانی' افسوس' ندامت اور ذلت کے مارے کٹی جاتی تھی۔ زمین میں گڑی جاتی تھی۔ وہ رات میرے اوپر بہت بھاری تھی۔ پلک تک جھپک نہیں سکی میری اس رات حالانکہ کہا جاتا ہے' نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

اگلے دن فجر کی نماز ہوتے ہی سورج نکلنے کا انتظار بھی کیے بغیر ماما نے بے دردی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی میں دھکا دیا اور مجھے گھر پھینک دیا' بالکل ویسے ہی جیسے قتل کے مجرم کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔

☆======☆======☆

الماس کا "ماما" کہہ دینا ایسا ہی تھا جیسے صور اسرافیل پھونکا جا چکا ہو اور قیامت قائم ہو گئی ہو۔ یہ قیامت نہیں تھی تو اور کیا تھی کہ میرے ذہن اور دل سے باقی ہر خیال مٹ گیا تھا۔ قیامت والے دن بھی تو یہی ہوگا کہ اس دن بھی آدمی کو صرف اپنی عاقبت کی فکر

ہوگی اپنے اعمال کی فکر ہوگی' بڑا نفسانفسی کا وقت ہوگا۔ یہ بھی نفسانفسی کا وقت تھا۔ الماس مجھے یاد نہیں رہ گئی تھی' نہ کچھ اور ہی...... مجھے اس وقت صرف اپنی فکر تھی۔ اس لمحے تو مجھے یہ تک بھول گیا تھا کہ میں نے کراٹے میں براؤن بیلٹ لے رکھی ہے اور بلیک بیلٹ میں لے ہی لیتا اگر الماس میری زندگی میں نہ آتی اور یہ کہ براؤن بیلٹ میں نے اسی لیے لی تھی کہ اپنا دفاع کر سکوں لیکن اس لمحے تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا تھا اور چلو اکیلے میں پٹ جاتا آدمی تو خیر تھی' وہاں تو ایک دنیا میرا تماشا دیکھنے کے لیے موجود تھی۔ اتنی بے بسی' اتنی ذلت' اتنی شرمندگی' توہین اور بے آبرو ہونے کا احساس تھا کہ میں دعا کر رہا تھا کہ کاش' آسمان مجھے کھا لے...... کاش' زمین مجھے نگل لے...... الماس کے ماما بھی تو ہاتھوں' پیروں' اور زبان تینوں کا استعمال کر رہے تھے۔ اس رات میں نے ایسی ایسی گالیاں سنی تھیں جو اپنی سولہ سالہ زندگی میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ میں نیم تاریک ٹھنڈی سڑک پر پڑا۔ دونوں بازوؤں سے سر کو چھپائے' گھونسوں' تھپڑوں اور لاتوں کی زد میں تھا۔ ہر تھپڑ' ہر گھونسے اور ہر لات پر مجھے صرف توبہ اور استغفار یاد آ رہی تھی اور کچھ نہیں۔ تبھی میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ "ارے' یہ تو افنان ہے۔" اور یہ آواز شہباز کے علاوہ کسی اور کی نہیں تھی۔

"یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ شیطان ہے۔ ملعون ہے۔ ذلیل ہے۔"

الماس کے ماما چیخ رہے تھے اور جتنی بھاری ان کی آواز تھی' اس سے کہیں زیادہ بھاری ان کے ہاتھ پیر تھے۔ اگرچہ میں...... "بس کرو...... بس کرو...... بس کرو......" کی آوازیں سن رہا تھا لیکن الماس کے ماما "بس" نہیں کر رہے تھے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ کس جگہ مجھے کتنی زور کی لگی ہے کیونکہ ہر جگہ یکساں طور سے دکھ رہی تھی۔ پھر میں اس احساس سے بھی عاری ہو گیا تھا۔ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو' اپنے سرتاپا دکھتے وجود کو ڈرپ اور خون کی بوتل کے ساتھ اسپتال کے صاف ستھرے بستر پر پایا تھا حالانکہ خیال تو میرا ایسا تھا کہ اب اگلی دنیا میں ہی آنکھ کھلے گی جب دوسری بار قیامت قائم ہوگی مگر ابھی مجھے دنیا کے پل صراط سے بھی تو گزرنا تھا۔ واقعی خود کو زندہ جان کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

میرے گھر والے میرے ہوش میں آنے کا انتظار ضرور کر رہے تھے لیکن مجھ سے خوش بالکل نہیں لگتے تھے۔ ظاہری بات ہے' میں نے ایسا کوئی قابلِ فخر کارنامہ تو نہیں کیا تھا کہ میرے گھر والے مجھ سے خوش ہوتے۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے دیکھا تو امی رو رہی تھیں۔ ابو پریشان بھی تھے' سخت غصے میں بھی۔ دونوں بھائی پریشان بھی

تھے اور سخت خفا بھی مگر کوئی نہ اپنی خفگی کا اظہار کرتا تھا نہ غصے کا۔ کوئی مجھ سے کچھ بولتا ہی نہیں تھا۔ پشیمانی‘ شرمندگی‘ افسوس‘ دکھ‘ پچھتاوا کون سی کیفیت نہیں تھی جو مجھ پر طاری نہیں تھی۔ سات دن...... پورے سات دن میرے گھر والوں نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

سات دنوں میں ایک سو اڑسٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔ دس ہزار اسی منٹ ہوتے ہیں۔ ساٹھ ہزار اڑتالیس سو سیکنڈ ہوتے ہیں۔

ان سات دنوں کے ہر گھنٹے‘ ہر منٹ‘ ہر سیکنڈ میں‘ میں کئی بار مرا تھا۔

ان سات دنوں کے ہر گھنٹے‘ ہر منٹ‘ ہر سیکنڈ میں کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ مجھے بڑے بھائی کا اس دن کا کہا ہوا ہر ہر جملہ یاد نہ آیا ہو‘ تب میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور اب مجھے ایک ایک لفظ سمجھ میں بھی آ رہا تھا اور اس کی تشریح بھی میں بخوبی کر سکتا تھا۔

ان سات دنوں کی ہر رات میرے لیے عذاب تھی‘ سزا تھی‘ جہنم تھی۔

”ہاں‘ بڑے بھائی نے مجھ پہ پہلے ہی جتا دیا تھا‘ مجھے پہلے ہی اس بات کا خیال آ جانا چاہیے تھا۔ میں اب اس بات کو مان رہا تھا۔

ان سات دنوں میں کسی ایک رات میں ڈھنگ سے سو نہیں سکا تھا اور جو کبھی اتفاقاً سو بھی جاتا تو خوف زدہ ہو کر اٹھ جاتا۔ مجھے ہر رات سے ڈر لگنے لگا تھا۔ ہر رات مجھے خوف زدہ کرنے لگی تھی۔ ان سات دنوں میں میرے گھر والوں کا سلوک مجھے کسی تازیانے کی طرح لگتا تھا۔ میرے گھر والے ناراضگی‘ غصے اور افسوس کے باوجود میری خدمتوں پر مجبور تھے۔ میری خود داری کو دھکا لگتا۔ میری بے بسی‘ تکلیف اور اذیت میں اضافہ ہو جاتا۔ شرمندگی کے احساس سے دفن ہو جانے کو دل چاہتا میرا......

ان سات دنوں میں‘ ان سات راتوں میں میرے پاس بہانے کے لیے صرف آنسو تھے اور بہت زیادہ آنسو تھے۔ پچھتانے کے لیے بہت وقت تھا اور خود کو کوسنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ظاہری بات ہے‘ لاچاری سے اسپتال کے اس بستر پہ ٹوٹا پھوٹا‘ جوڑ جوڑ دکھتا وجود لیے‘ ہلنے جلنے سے بھی قاصر آدمی کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہاں البتہ‘ سوچ ضرور سکتا تھا۔

میں سوچتا تھا کہ اس دن بڑے بھائی کی‘ کی ہوئی ایک دعا بھی میرے حق میں قبول نہیں ہوئی تھی اور دعا قبول نہیں ہوئی تھی تو اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ بڑے بھائی نے دل سے دعا نہیں کی تھی یا پھر میری ہی نیت صاف نہیں تھی اور ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ بڑے بھائی نے میرے لیے دل سے دعا نہ کی ہو۔ پھر یقیناً کہ میری ہی نیت

[illegible] نہیں تھی۔ ان سات دنوں میں‘ ان سات راتوں میں کون سی ایسی دعا تھی جو مجھے [illegible] اور میں نے نہ کی ہو‘ چھوڑ دی ہو‘ کون سی استغفار تھی جو مجھے یاد ہو اور میں نے نہ [illegible] کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا کہ میں نے توبہ نہ کی ہو۔

میں اپنے گھر والوں سے معافی مانگنا چاہ رہا تھا مگر مجھے اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ [illegible] رہا تھا‘ ترس رہا تھا‘ مر رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے اب میری زندگی جتنی تھوڑی [illegible] اسی طرح گزرے گی بلکہ شاید اس وجہ سے اور بھی کم ہو جائے گی یا ختم ہی ہو جائے گی۔

آٹھویں دن...... بالآخر آٹھویں دن‘ مجھ پر رحم کر دیا گیا تھا۔ بڑے بھائی اس دن میرے پاس آئے اور خاموشی سے آ کر بستر پر بیٹھ گئے۔

”مجھے تم پر غصہ نہیں آ رہا افنان‘ بلکہ بہت ترس آ رہا ہے۔“

بہت دیر بعد بالآخر انہوں نے ترس ہی کھانے والے لہجے میں کہا تھا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”مجھے بہت دکھ ہے۔ بہت افسوس ہے کہ اتنا سمجھانے کا بھی تم پر اثر نہیں ہوا تھا۔ تم نے میری کسی بات پہ غور نہیں کیا تھا حالانکہ اسی دن‘ اسی شام نہ صرف میں نے تم کو اتنا سمجھایا تھا بلکہ ہر بات کے فائدے اور نقصانات بھی گنوائے تھے۔“

بڑے بھائی بہت خفگی سے کہہ رہے تھے۔ انہیں واقعی خفا ہونے کا حق تھا اور میرے پاس سن لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا بلکہ اب تو یہ شاید ساری زندگی کے لیے [illegible] کیا تھا اور ساری زندگی مجھے سننا ہی تھا۔

”اور ایک بات بتاؤ‘ تم وہاں کیا کرنے گئے تھے افنان؟“

بڑے بھائی پوچھ رہے تھے اور میرے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا۔ [illegible] کیا تھا۔ میں تو خود نہیں جانتا تھا کہ میں وہاں کیوں گیا تھا؟ کون سی ایسی فورس (Force) تھی جو مجھے وہاں کھینچ کر لے گئی تھی۔ میں تو بس چل پڑا تھا اور بڑے بھائی [illegible] رہے تھے۔

”[illegible] رات گئے آدمی اگر کہیں کسی سے اس طرح ملنے جاتا ہے اور وہ بھی ایک لڑکی [illegible] ارادے‘ اچھی نیت سے تو نہیں جاتا۔“

بڑے بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ یہ نیت کا ہی تو قصور تھا کہ جب تک جذبہ معصوم [illegible] کہیں نہیں ہوئی تھی۔ کسی کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ اللہ کی اور نہ اس کے

بندوں کی حالانکہ ملنا ملانا دن میں تھا۔ آنا جانا' ساتھ بیٹھنا' باتیں کرنا' دن میں تھا مگر جیسے ہی نیت میں کھوٹ آیا' ارادے میں غرض شامل ہوگئی۔ عزائم میں برائی آگئی' وہیں پکڑ ہوگئی۔ دھر لیا گیا آدمی.....!

"تمہاری چپ اس بات کی دلیل ہے کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" بڑے بھائی مزید کہہ رہے تھے۔

اور مجھے رونا آ رہا تھا۔ میں سسکیوں سے رونے لگا۔ "مجھ سے قصور ہوا تھا۔ مجھے تسلیم ہے۔"

"نہیں تو قصور ہوا کیوں؟" بڑے بھائی نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی اور فوراً کہا تھا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس دن تمہارا میری کسی بات پر دھیان ہی نہیں تھا۔ اگر تمہارا میری بات پر دھیان نہیں تھا تو تمہارا دھیان کدھر تھا؟" بڑے بھائی پوچھ رہے تھے اور میں انہیں کچھ بتانے کے قابل نہیں تھا۔

"مجھے معاف کر دیجیے بڑے بھائی!" میں ہچکیوں کے درمیان اسی قدر کہہ سکا تھا۔

"مجھ سے معافی مانگنے سے کیا ہوگا؟" بڑے بھائی نے بڑی بے رخی سے کہا تھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تمہارا ایک اٹھا ہوا غلط قدم ہمیں کسی گہری کھائی میں دھکیل دے گا۔ تم نے اس رات ہمیں کھائی میں دھکیل دیا تھا افنان! تم جانتے ہو اس رات ہمیں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہے تمہاری وجہ سے؟ بلکہ شرمندگی تو خاصا چھوٹا لفظ ہے' اس رات ہمیں اور بھی بہت کچھ اٹھانا پڑا تھا۔ تم پر تو آج ہم انا للہ پڑھ رہے ہوتے اگر ساڑھے بارہ بجے کے قریب شہباز ہمیں آ کر نہ بتاتا کہ تمہارا حشر کیا ہو رہا ہے۔ ہم یہ سن کر ہی اتنا پریشان ہوئے کہ جس حال میں تھے' گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ تو شکر ہے ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے' ورنہ تو لڑکی کا ماما تمہیں شوٹ کر چکا ہوتا۔ وہ تو اس قدر بپھرا ہوا تھا کہ ہماری کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ وہ تمہیں پولیس میں دینے کے درپے تھا۔ تم پر کیس کروانا چاہتا تھا۔ وہ تو ہمیں تم کو اٹھا کر لے جانے بھی نہیں دے رہا تھا۔ پھر ہم نے کئی مرتبہ اس سے معافی مانگی۔ لوگوں نے بہت کہا' اس کے گھر والوں نے بہت سمجھایا' تب کہیں جا کے اس نے تمہیں اٹھانے دیا۔ تم اتنی بری طرح زخمی تھے کہ پتا نہیں چل رہا تھا' کس جگہ سے خون نہیں بہہ رہا ہے۔ ہم تمہیں اسپتال لے کر گئے ایمرجنسی وارڈ میں۔ کئی جگہ تو تم کو اسٹچز (Stitches) لگے ہیں۔ پانچ چھ جگہ سے فریکچر ہوا ہے۔ دو بوتل خون چڑھا ہے۔ ڈرپس لگی ہیں۔ پورے ڈیڑھ دن بعد تم کو ہوش آیا

اس رات کے بعد مسلسل اتنی ذہنی اذیت' کوفت' دکھ' پریشانی' تھکن' شرمندگی جو ہم نے اٹھائی ہے' اس کے لیے کون ذمے دار ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ سراسر تم ہو۔ تمہارے معافی مانگ لینے سے اس ذہنی اذیت کا خاتمہ ہو جائے گا یا کوفت کم ہو جائے گی' دکھ کی دوا ہو جائے گی' پریشانی کا ازالہ ہو جائے گا' تھکن اتر جائے گی' شرمندگی کا احساس مر جائے گا؟"

بڑے بھائی پوچھ رہے تھے اور میں آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

"تم اب رو رہے ہو؟ تمہارا رونا بے کار ہے اب۔ اس رات کے بعد ان ڈیڑھ دنوں میں امی نے کتنے آنسو بہائے ہیں' وہ کتنا روئی ہیں' اس کا اندازہ ہے تمہیں کچھ؟ امی کے آنسو بہت قیمتی تھے جو تمہارے لیے ضائع کیے ہیں انہوں نے۔ اس رات کے بعد ان ڈیڑھ دنوں میں ہم نے کتنی دعائیں کی ہیں کہ تمہیں کچھ نہ ہو۔ تم کیا جانو افنان کہ کن کن احساسات کا سامنا ہم نے کیا ہے۔ جب تمہارے لیے ہم لڑکی کے ماما سے معافی تلافی کر رہے تھے تو اس دن صبح تمہارے اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو کا حوالہ امی نے دے دیا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے ابو نے ٹھیک ٹھاک عزت کی تھی میری۔ ابو مجھ پر خفا ہونے لگے کہ مجھے انہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ وہ تمہارا مزاج درست کر دیتے۔ وہ تو تم سے اس قدر ناراض تھے کہ تمہاری صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ وہ تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ تم کو گھر سے نکال دیں گے۔ میں نے' امی نے بڑی مشکلوں سے ان کو بار بار سمجھایا کہ چھوٹا ہے' لغزش کر بیٹھا' معاف کر دیجیے اسے۔ گھر سے نکال دیں گے تو کہاں جائے گا وہ؟ کہیں غلط ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔ مزید برباد نہ ہو جائے۔ تب پھر جا کے بڑی مشکلوں سے وہ مانے مگر غصہ ابھی بھی ختم نہیں ہوا ہے ان کا۔"

بڑے بھائی کہہ رہے تھے اور میں دم بخود سن رہا تھا۔ بڑے بھائی کا آخری جملہ سن کر آنسو آنکھوں میں جم گئے تھے۔ اگر ابو مجھ سے اس درجے خفا تھے تو یہ ان کا حق تھا۔

"تو کیا ابو مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے؟" میں نے بہت اٹک اٹک کر بڑے بھائی سے پوچھا تھا۔

"میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" بڑے بھائی کا لہجہ بالکل کسی آسرے سے خالی تھا۔ "لیکن والدین معاف کر ہی دیا کرتے ہیں اپنے بچوں کو۔ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا اس کے سوا۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو۔" انہوں نے جیسے مجھے دعوت دی تھی۔

میں کوشش ہی کر سکتا تھا جبکہ ابو بس دور ہی دور سے مجھے دیکھ کر چلے جایا کرتے تھے۔ امی اور چھوٹے بھائی سے تو میں نے کسی نہ کسی طرح سے معافی مانگ لی تھی۔ بڑے بھائی کی طرف سے بھی مجھے اطمینان تھا۔ ابو کے سلسلے میں ایک بار پھر میں تھا' دعائیں تھیں۔ رونا تھا کہ مستقل تھا..... درخواست تھی کہ جاری تھی..... دن تھے کہ گزر رہے تھے..... اور جیسے جیسے دن گزر رہے تھے میرا دم حلق میں آ رہا تھا۔

پھر اس دن ابو میرے بستر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اب وجہ چاہے جو رہی ہو۔ چاہے گھر والوں نے ان سے کہا ہو یا پھر انہیں خود ہی مجھ پہ ترس آیا ہو۔ مجھے تو بس موقع دیا جا رہا تھا کوشش کا۔ اس وقت مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا تھا۔ میں نے بے اختیار ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ ''ابو مجھے معاف کر دیجیے۔''

ابو نے بڑی بے دردی سے اپنے ہاتھ چھڑائے تھے اور میں نے بڑی بے بسی سے ابو کو دیکھا تھا۔

''سارہ اس سے کہو یہ مجھ سے ابھی بات نہ کرے۔'' ابو نے برابر میں کھڑی امی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ ''اور نہ میں اس سے ابھی کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے تو گھر پہنچ کر ہی بات ہو گی۔ یہاں اسپتال کے اس کمرے میں' میں نہیں چاہتا کہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہو۔''

ابو کے دو ٹوک لہجے پر میں نے امی کو' بڑے بھائی کو' چھوٹے بھائی کو مدد طلب نظروں سے دیکھا تھا۔

''سن تو لیجیے.....''

امی نے کہنا چاہا تھا۔ ابو نے ایک دم ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''جب ایک مرتبہ کہہ دیا نہیں تو اس کا مطلب ہے نہیں۔''

ابو نے اس قدر حتمی لہجے میں کہا کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش رہ نہیں گئی تھی۔

ابو ابھی اگر مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے تو یہ ان کا حق تھا.....

ابو اگر کبھی بھی مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے تو یہ بھی ان کا حق تھا.....

اور یہ میرا فرض تھا کہ چپ چاپ' صبر کے ساتھ کسی مناسب وقت کا انتظار کروں اور فی الحال تو میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

میرے پاس دعاؤں کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

انتظار کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایسے میں ایک دن شہباز مجھ سے ملنے آیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ میں اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ عجیب وقت مجھ پر آن پڑا تھا۔ اپنے دوستوں کے سامنے میری نگاہیں شرمندگی کے مارے جھکی ہوئی تھیں۔

''اب تم بہتر محسوس کر رہے ہو؟'' بالآخر اسی نے خاموشی توڑی۔

''نہیں.....!'' خاصی دیر چپ رہنے کے بعد میں نے ایک لفظ میں جواب دیا تھا۔

شہباز ایک دم چپ سا ہو گیا' پھر جیسے آہ بھر کر بولا۔ ''یہ لڑکیوں کا چکر ہوتا ہی برا ہے۔ لڑکیاں..... آدمی کو پھنسا دیتی ہیں۔''

میں نے اس کے اس تجزیے پر ٹھنڈی سانس لی۔

میں اس سے کہہ نہ سکا کہ اصل میں ہم لڑکے الو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ ان چکروں میں آ جاتے ہیں' بھٹک جاتے ہیں۔

ایک بار پھر ہمارے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آ گیا۔ بالآخر شہباز تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اٹھ گیا۔ جاتے جاتے وہ مجھے تسلیاں دینا نہیں بھولا تھا۔ فی الحال تو کوئی بھی تسلی میرے لیے بے کار ہی تھی۔

سترہ دن بعد بالآخر اسپتال کے اس کمرے سے مجھے نجات مل گئی تھی۔ میں گھر واپس آ گیا تھا' پھر ایک دن گزرا' دو دن گزر گئے' تین دن گزر گئے۔ مجھے ابو سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میری اذیت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ بے بسی بڑھ گئی تھی۔ ایک ہفتہ سوا ہو گئی اور تب اسی دن ابو مجھے دیکھنے آئے تھے۔

''مجھے معاف کر دیجیے ابو.....! میری وجہ سے آپ کو اتنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔'' میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا تھا۔

''اذیت.....؟'' انہوں نے بہت تلخی سے دہرایا تھا۔ ''تمہاری وجہ سے صرف ہم کو اذیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ تم نے تو ہمیں بدنام اور رسوا کر دینے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ وہ اولاد جو اپنے ماں باپ کو ایسی ذلت سے دوچار کرے' اس کا تو نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ میرا بس نہیں چلتا کہ اپنے ہاتھ سے تمہارا گلا گھونٹ دوں۔''

ابو کی آواز مارے غصے کے کانپ رہی تھی اور میں ابو کے غصے سے کانپ رہا تھا۔

''بے شک میرا گلا گھونٹ دیں' مگر مجھے معاف کر دیں۔''

میں دھاڑیں مار مار کے روتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ میری آواز سن کر امی

بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بھی کمرے میں آ گئے تھے۔

''میری مجبوری ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہارا گلا نہیں گھونٹ سکتا اور تم کو معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا میرا۔'' ابو اتنا کہہ کر باہر چلے گئے تھے۔

''یہ کیا کیا آپ نے؟ اتنی عاجزی سے وہ معافی مانگ رہا تھا' معاف کر دیا ہوتا اسے آپ نے۔'' میں نے سنا تھا' امی ابو کے ساتھ ہی باہر نکلتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''معافی......؟'' ابو نے تلخی سے دہرایا تھا۔ ''اس نے جو کچھ کیا ہے' وہ قابل معافی ہے؟ سارہ' کیسے لگ رہے تھے اس رات ہم بھی۔ اس آدمی سے عاجزی انکساری سے معافی مانگ رہے تھے۔ یہ میرے سفید بال دیکھو' اس عمر میں یہ ذلت بھی قسمت میں لکھی تھی۔ ارے' بیٹے تو ماں باپ کا فخر ہوتے ہیں۔ ان کا سر اونچا کرتے ہیں۔ اس نے ہمیں ذلیل کروا کے رکھ دیا تھا اس رات۔''

ابو کے تیز تیز بولنے کی آوازیں کمرے کے اندر تک آ رہی تھیں۔ میں سن رہا تھا اور آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

''ارے' اس نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو نہیں دیکھا۔ اس نے کاشان کو نہیں دیکھا۔ اس نے سمعان کو نہیں دیکھا۔ کیا اس نے کبھی ان دونوں کے کردار میں جھول پایا تھا؟ کیا اس نے کاشان کو بگڑا ہوا پایا تھا کبھی؟ کیا اس نے سمعان کو بہکا ہوا دیکھا تھا؟ ارے' کردار کے کھرے ہیں دونوں۔ کیا یہ دونوں اس کے سامنے شرافت کی مثال نہیں تھے۔ چھوٹے بھائی تو بڑے بھائیوں سے سیکھتے ہیں۔ اس نے ان سے کچھ نہیں سیکھا۔ اسے تو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے تھا۔ یہ کس کے نقش قدم پر چل رہا تھا پھر؟ اس نے یقیناً کوئی بہت اوچھی قسم کی حرکت کی ہوگی ورنہ سامنے والے کا دماغ تو خراب نہیں ہے جو یونہی طیش میں آ جائے...... اور...... اتنی بڑی حرکت...... اللہ وغنی!''

ابو کے الفاظ میں اور ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میرا شرمندگی سے بے اختیار زمین میں گڑ جانے کو دل چاہا تھا۔

''سارہ...... ! مجھے شک ہو رہا ہے خود پر۔ میرا خون اتنا ہلکا تو نہ تھا۔''

ابو کے لہجے میں تاسف تھا' ملال تھا' حزن تھا' میں نے تکلیف سے' اذیت سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''سارہ' ایسی حرکت ہمارے خاندان میں سے کبھی کسی نے نہیں کی۔ اس کے اوپر آخری ایسی کیا آفت آن پڑی تھی پھر یہ خود کو سنبھال بھی نہ پایا۔ ثابت کر دیا اس نے کہ

...بد کردار کا ہے یہ۔''

''اُف...... ! اور اس بار مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے قبر میں دھکا دے دیا ہو۔ اتنی ...ی وہاں اتنا حبس تھا۔ اتنی گھٹن تھی کہ مجھ سے سانس لینی دشوار ہو رہی تھی۔ ابو کہہ ...ے تھے۔

''سارہ' کردار ہی تو کسی بھی لڑکے یا لڑکی کا غرور ہوتا ہے۔ کردار نہیں تو کچھ بھی ...یں۔ اس کے پاس رہ کیا گیا ہے اب غرور کرنے کے لیے۔ ہمارے پاس کیا رہ گیا ہے ...س پر فخر کرنے کے لیے۔ میں کیا بتاؤں اس رات میری کیا کیفیت تھی سارہ...... ! جب ...یں تمہارے بیٹے کی طرف سے اس لڑکے کے سامنے صفائیاں دیتا پھر رہا تھا۔ وہ لڑکا غلط ...ہیں کہہ رہا تھا۔ جب اپنا کھوٹا ہی کمزور ہو تو آدمی کسی اور کو الزام دے بھی کیسے سکتا ...ہے۔ اس لڑکے کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا اور اس رات چالیس پچاس لوگوں نے ...کھڑے ہو کر اس کے پٹنے کا تماشا دیکھا ہوگا۔ ستر' اسی لوگوں نے ہم کو معافیاں تلافیاں ...کرتے دیکھا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ رات کا وقت تھا۔ اس جگہ نیم تاریکی تھی۔ کہیں دن کی ...روشنی ہوتی تو عادل محمود کس کس سے منہ چھپاتا پھرتا۔ یہ دوسرا شکر ہے کہ ہمارے قریبی ...رشتے دار نہیں ہیں ورنہ کس کس کو کیا کیا وضاحتیں دیتا پھرتا میں۔ سارہ' اس رات کون سا ...احساس تھا جو مجھے نہیں تھا۔ پریشانی' صدمہ' دکھ' تکلیف' شرمندگی' بے اعتباری' بے ...سب سے بڑھ کر ذلت اور بے آبرو ہونے کا احساس...... اب اس کے آگے بچ کیا ...گیا ہے؟''

ابو کہے جا رہے تھے' اور میں گہرائی...... مزید گہرائی میں دفن ہوتا جا رہا تھا۔

''لوگ بیٹوں کی آرزو میں مرے جاتے ہیں۔ بیٹوں کے لیے دعائیں کرتے نہیں ...۔ میں کہتا ہوں' اللہ بیٹے دے تو مطیع' صالح اور سعد دے ورنہ نہ دے۔'' ابو کا لہجہ ...تھا۔

''اچھا' اب جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ آپ تھوڑی تو نرمی اختیار کیجیے۔ اس نے بھگت بھی ...لیا ہے۔'' میں نے سنا' امی کہہ رہی تھیں۔

''سارہ' تم کو یہ خیال نہیں آ رہا کہ اس کے ساتھ مستقل ہم بھی بھگت رہے ہیں۔ ...ہم سے کیا گناہ ہوا ہے' ہم نے کیا قصور کیا ہے' ہماری کیا غلطی ہے' اس کے ماں باپ ...ہیں ہم' کیا یہ سزا ہے ہماری؟ اس رات کے بعد سے اسے دیکھ دیکھ کر مستقل خون جل رہا ...ہے اور اس پر افسوس سے کہیں زیادہ غصہ آ رہا ہے مجھے۔ ذرہ برابر بھی ہمدردی یا دلچسپی

نہیں محسوس ہو رہی مجھے اس سے۔ انسان پر تباہی اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔ اس نے خود کو تباہ کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے۔ سب داؤ پر لگا دیا۔ عاقبت' عزت' آبرو' کیریکٹر' کیریئر' اور رہ کیا گیا ہے؟ وہ اگر بھگت رہا ہے تو اچھی بات ہے' بھگتنا چاہیے بھی۔ اس کی حرکت تو اس سے بھی زیادہ کی متقاضی تھی۔" ابو نے بہت سفاکی سے کہا تھا۔

"تو پڑے رہنے دیا ہوتا ناں اسے وہاں۔ مر جانے دیا ہوتا۔ کیوں اسے اٹھا کر لے کر گئے اسپتال؟ ابھی بھی فکرمند کیوں ہو اس کے لیے؟" امی نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

"فکرمند ہونا میری بے اختیاری ہے۔ باپ ہوں بدقسمتی سے میں اس کا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ اور تم خدارا' ان پڑھ جاہل ماؤں کی طرح دوبارہ شروع مت ہو جانا۔" ابو کا لہجہ حتمی تھا۔

"ابو' کچھ تو consider کیجیے۔" میں نے سنا' بڑے بھائی کہہ رہے تھے۔

"کاشان' فی الحال اس معاملے پر مجھ سے بات مت کرو۔" اس بار ابو کا لہجہ بے لچک تھا۔

پھر اس کے بعد کوئی آواز نہیں آئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد بڑے بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرائے اور میرے بستر پر میرے برابر آ کر بیٹھ گئے۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" انہوں نے میرا پٹیاں چڑھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا تھا اور میرے آنسو جو خشک ہو چکے تھے۔ ایک دم دوبارہ رواں ہو گئے۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے بمشکل سسکیوں کے درمیان نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا افنان ...... ! اللہ نے چاہا تو؟" انہوں نے میرا ہاتھ ہلکے سے تھپکا۔

میں نے تکلیف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ ہاں' اسی امر سے تو مشروط ہے۔ اللہ نے چاہا تو...... اور...... نہ چاہا تو......

"ابو مان جائیں گے۔" بڑے بھائی نے مجھے تسلی دی تھی۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو جم سے گئے تھے۔ میرا یقین

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

مجھے بڑے بھائی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس کے کچھ دن بعد مجھے یقین آ گیا تھا۔

اس دن ابو نے میرے پاس آ کر مجھ سے صرف ایک سوال کیا تھا بلکہ سوال کیا تھا' طنز تھا اور اگر انہوں نے طنز کیا بھی تھا تو ان کا حق تھا اور میں راضی تھا۔ سوال ہی سہی' طنز ہی سہی' ابو نے مجھ سے کچھ کہا تو تھا ورنہ وہ تو مجھ سے یہ تک کہنے کے روادار نہیں تھے۔

"اب تو سب ٹھیک ہو گیا ناں؟ یا ابھی بھی کوئی حسرت باقی رہ گئی ہو تو بتا دو۔"

☆=======☆=======☆

اس دن ماما کے چلے جانے کے بعد میری گویا شامت آ گئی تھی۔ امی ابو مجھ سے ایک ہی سوال کر رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے الماس؟"

"کیا کیا ہے تم نے؟"

بالکل ویسے ہی جس طرح ایک جج عدالت میں مجرم سے پوچھتا ہے۔ "تم نے جرم کیا ہے یا نہیں؟ تم پر الزام ہے۔ تم نے جرم کیا ہے۔ گلٹی ... گلٹی Proved to be guilty اور مجرم چپ رہتا ہے۔ اس نے جرم کیا ہوتا ہے اس لیے اپنی صفائی میں کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ میرے پاس بھی اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں بھی اسی لیے کسی مجرم کی طرح چپ چاپ امی کو دیکھتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیا بتاؤں۔ میں خود سمجھنے سے قاصر تھی اور میری سوچ سے باہر تھا کہ اس رات مجھے کیا ہو گیا تھا جو میں افنان کے کہنے پر گھر سے باہر آ گئی تھی اور گھر سے نکل پڑی تھی تو خیر تھا' اتنی دیوانی اور بے خود ہو گئی کہ اس کے ساتھ تک نہ جان پائی بلکہ میرے اپنے ارادے بھی پانی ہو گئے۔ یہ کون سا اسٹیج ہوتا ہے' کون سا برا لمحہ ہوتا ہے' یہ کون سا بدترین وقت ہوتا ہے آدمی کی زندگی کا' جس میں ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔

میں چپ رہتی تو ابو امی کا اشتعال بڑھتا تھا۔ امی نے مجھ سے سختی سے پوچھ لیا۔ پوچھ پوچھ کر تھک گئیں تو مارنے لگیں۔ میں نے بھی جیسے ہونٹ سی لیے تھے۔ ہونٹ سینے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں نے کچھ نہیں کیا... میں نے کچھ نہ کچھ تو کیا ہی تھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں بے قصور

ہوں۔ میں بے قصور بھی نہ تھی۔ اگر انسان پچاس فیصد گناہ گار تھا تو میں بھی پچاس فیصد قصوروار تھی۔

اس دن پہلی مرتبہ ابو نے بھی مجھے بری طرح سے مارا تھا ورنہ ابو نے کبھی مجھ پہ ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ابو نے مجھے اس دن اتنا مارا تھا کہ میرے چہرے پر' جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ چہرہ سوج گیا تھا۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔ ابو کے ہر تھپڑ پر میری چیخیں نکل جاتی تھیں۔ ہر تھپڑ نئی چوٹ دیتا تھا۔ نیا زخم دیتا تھا اور ہر چوٹ' ہر زخم تکلیف دیتا تھا حتیٰ کہ مارتے مارتے ابو خود تھک کر کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگے تھے اور میں نے سوچا تھا' کچھ نہ بتانے پر یہ عالم ہے' اگر میں کچھ بتا دیتی تو...... میرے دونوں بھائی ایک کونے میں سہمے کھڑے سارا منظر دیکھ رہے تھے اور میں دعا کر رہی تھی۔ کاش! میں پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی...... میرے آنسو تھمتے نہ تھے' سسکیاں رکتی نہ تھیں پھر ابو نے بے رحمی سے میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے کمرے میں دھکا دے کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

مجھے نہیں یاد کہ میں کتنی دیر روتی رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب تو یہ زندگی بھر کے لیے میری قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ نہ جانے کون سے وقت امی دروازہ کھول کر اندر آئیں اور کھانے کی ٹرے میرے سامنے پٹخ دی اور جس نظر سے انہوں نے مجھے دیکھا تھا' وہ مجھے اندر تک کاٹتی چلی گئی تھی۔

کھانا تو مجھے کیا ہی کھانا تھا' بس رونا ہی تھا۔ ٹرے یونہی چلی گئی۔ امی نے بھی اصرار نہیں کیا۔ ایک بار' دو بار' تین بار' نہ بھوک کا احساس تھا نہ پیاس کا۔ میرا دل چاہتا کہ کہیں سے تھوڑا سا زہر مل جائے' میں کھا لوں اور مر جاؤں۔ مگر میں اتنی بہادر نہ تھی کہ اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ نہ امی مجھ سے بات کر رہی تھیں نہ ابو ہی کچھ بولتے تھے۔

کسی کو اگر اذیت دینی ہو' سزا دینی ہو' دکھ دینا ہو' جلانا ہو تو سب سے بدترین سزا یہ ہے کہ اس کے پیارے اس سے قطع کلامی کر لیں۔ سامنے والا اگر احساس رکھتا ہے تو خود اذیت سے' تکلیف سے مر جاتا ہے۔ میں بھی اذیت سے مر جاتی۔ یہ مرنا الیکٹرک چیئر پر مرنے سے بھی زیادہ عبرت ناک اور اذیت ناک ہے۔ الیکٹرک چیئر پر تو بیٹھ کر ایک ہی جھٹکے میں آدمی کا کام تمام ہو جاتا ہے لیکن اس طرح تو آدمی قطرہ قطرہ مرتا ہے' لمحہ لمحہ مرتا ہے' اس صورت میں اور بھی جبکہ سامنے والا معاف کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو اور سامنے والا آپ کے پیاروں میں سے ہو۔

میں نے بہت مرتبہ ابو اور امی سے معافی مانگی تھی۔ رو رو کر' گڑگڑا کر' عاجزی سے' ابو اور امی میری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو میری آواز تک کے روادار نہیں تھے۔

امتحانوں میں جبکہ صرف تین مہینے رہ گئے تھے' ابو نے مجھے اسکول سے اٹھا لیا تھا۔ میری فرینڈز کا فون آتا یہ پوچھنے کے لیے کہ جواہر کیوں اسکول نہیں آ رہی تو ابو اور امی مختلف بہانے بنا کر فون رکھ دیتے۔ بالآخر میری فرینڈز کے فون آنا بند ہو گئے تھے۔ ابو کے کہنے پر گھر کے سارے کام میرے سپرد ہو گئے تھے' جھاڑو پونچھے سے لے کر برتن کپڑے دھونے تک۔ میں جانتی تھی' یہ میری سزا تھی اور چلو سزا بھی برداشت کر لیتا آدمی...... مگر امی ابو کی ناراضگی سے میں آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا تو درکنار' میرے سلام کا جواب تک نہ دیتے تھے۔ ان دونوں کی ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ امی کوئی بھی کام مجھ سے کہتیں تو میرا نام لیے بغیر' پہلے ابو کے چھوٹے چھوٹے سارے کام میں ہی کرتی تھی۔ ابو آتے تو ان کو پانی پلانا' ان کے لیے جوتے کپڑے رکھنا' جوتوں پہ پالش کرنا' نہانے جانے پر تولیہ وغیرہ دینا' اب ابو بھی آفس سے آتے اور پانی کے لیے آواز بھی دیتے تو عاقب اور ثاقب کو۔ کپڑے' جوتے' تولیہ رکھنے کے لیے امی سے کہتے۔ جوتے خود پالش کرتے۔ میں جو کبھی ان کے لیے پانی لے کر جاتی تو وہ گلاس ایک طرف [illegible] کے بیٹھے ہوتے تو کھڑے ہو جاتے۔ کھڑے ہوتے تو ادھر سے ہٹ جاتے۔ میں جو [illegible] ان کے جوتے لینا چاہتی کہ میں پالش کر دوں تو وہ مجھے ہاتھ سے پرے [illegible]۔ یہ تو صرف دو تین چھوٹی چھوٹی مثالیں تھیں اور بھی کئی ایسی باتیں تھیں جن [illegible] میں لمحہ لمحہ مرا کرتی تھی۔

[illegible] بے کار اور منحوس دنوں میں سے ایک دن ماما گھر آئے۔ میں ماما کا سامنا [illegible] رہی تھی۔ میں ماما سے اتنی شرمندہ تھی کہ میرا دل چاہتا تھا کہ انہیں کبھی اپنی [illegible] نہ دکھاؤں مگر میں جتنا ان سے بچنا چاہ رہی تھی' اتنا ہی مجھے ان کا سامنا کرنا پڑ [illegible]۔ اس دن صفائی کرنے میں مجھے دیر ہو گئی تھی اور بقیہ آدھی صفائی طوعاً کرہاً دل کڑا [illegible] نے ان کے سامنے ہی کی تھی حالانکہ میرا دل چاہا تھا کہ میں کہیں بھاگ [illegible] کہیں چھپ جاؤں' میں مر جاؤں۔ ماما گم صم سے بیٹھے تھے اور جتنا وقت میں ان [illegible] رہی' میرا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا رہا۔ بالآخر جلدی جلدی صفائی [illegible] لوٹی۔ امی نے مجھ سے بھائیوں کے کپڑے استری کرنے کو کہا۔ میں

نے بھائیوں کے کپڑے استری کیے پھر میں کچن میں چلی گئی۔ امی نے ماما کے لیے چائے اور دوسرے لوازمات تیار کر کے رکھے ہوئے تھے۔

"یہ لے جاؤ......"

امی نے میرا نام لیے بغیر کہا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آنسو جو آنکھوں میں رکے ہوئے تھے بہہ پڑے۔

ماما کے سامنے ٹرے رکھتے ہوئے میری حالت عجیب سی ہوگئی۔ ماما میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ ان کا رویہ میرے لیے اور بھی تکلیف دہ تھا۔ میرا دل چاہا' میں ماما کے گھٹنے پر سر رکھ کر خوب سارا روؤں۔ میرا دل چاہا رو رو کر ان سے کہوں' مجھے ہاتھ سے مار لیں ماما...... مگر اپنے رویے سے مت ماریں۔ مجھ پہ رحم کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ مگر میری ایسا کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہوسکی۔ پیر جیسے منوں وزنی ہوگئے تھے۔ آنسو تھے کہ بے آواز گر رہے تھے۔ ماما نے مجھے دیکھا' اور اس بار میں ضبط نہیں کر سکی۔ مگر ماما تو مجھ سے اتنا خفا تھے کہ چیخ چیخ کر امی کو بلانے لگے۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔

پھر ماما' ابو کے آفس سے آنے تک رکے رہے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کیوں مگر میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ماما یہاں سے جائیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا' ماما ہی ایسے آدمی ہیں جو مجھے اس منحوس صورت حال سے نجات دلا سکتے ہیں۔

میں جانتی نہ تھی کہ صورت حال اور بھی منحوس ہو جائے گی۔ ایک دن کچھ لوگ ہمارے گھر پر آئے۔ میں ان کی آمد کا مقصد نہیں جانتی تھی اور ان کی آمد سے مجھے کوئی دلچسپی تھی بھی نہیں' پھر مجھے پتا چلا وہ لوگ اصل میں میرے لیے آئے تھے' مجھے اپنی بہو بنانے کے لیے۔ ابو کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے میری اس آدمی کے ساتھ بات طے کر دی تھی اور مجھ پہ تو جیسے ایک ساتھ کئی صدمات کے پہاڑ گر پڑے تھے۔ میں بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

یہ بھی ہونا تھا میرے ساتھ......

یہ بھی ہونا باقی ہے ابھی......

ہائے...... یہ بھی ہوگا اب

میں نے جو کچھ کیا تھا' اس کے لحاظ سے تو میری سزا یہ تھی کہ مجھے دھکے دے کر نکال دیا جاتا گھر سے مگر یہ بھی میرے گھر والوں کی مہربانی تھی کہ وہ ایسا [illegible]

تھے۔ مجھے تو شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ وہ مجھے رخصت کر رہے تھے اور اب تو وہ جو کچھ کرتے ان کا حق تھا اور برداشت کرنا میرا فرض تھا۔ میں نے اب تک سب برداشت کیا تھا۔ امی ابو کی ناراضی۔ ان کی قطع کلامی' نظروں کی کاٹ' ابو نے اسکول سے اٹھا لیا۔ اچھا کیا۔ گھر کے کام کاج میرے سپرد ہوگئے۔ کوئی بات نہیں' اتنا رونے دھونے' معافی کا طلب گار ہونے پر بھی میرا قصور معاف نہیں۔ ہاں' سب ٹھیک تھا۔ میرا قصور تھا' میری غلطی تھی۔ جو کچھ نہ ہوجاتا' کم تھا مگر یہ نیا زخم...... نئی چوٹ...... آہ......!

یہ تو میری استطاعت سے ہی باہر ہوا جا رہا تھا۔ اس معاملے پر مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میری برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ میری سوچیں بے ربط اور فضول ہوتی جا رہی تھیں۔ میرا ان دنوں صرف مرنے کو دل چاہتا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں ایسا کیا کھالوں کہ مر جاؤں۔ نیلا تھوتھا چاٹ لوں' پارہ کھالوں' کیڑے مار دوا پی لوں' کہیں سے مٹی کا تیل مل جائے تو خود پر چھڑک کر آگ لگا لوں۔ میں سوچتی رہتی تھی' لیکن میں اتنی بہادر نہیں تھی کہ اپنے ہی ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی۔ میں چپ چاپ گھر کے سارے کام کرتی اور روتی رہتی۔ جب آنسو تھم جاتے تو مزید نہ جانے کہاں سے آجاتے۔ یہ ایسا خزانہ تھا جو میں لٹائے جا رہی تھی اور جو خالی ہی نہیں ہو رہا تھا...... اور ان آنسوؤں کے علاوہ پچھتاوے بھی تھے جو ختم نہیں ہو رہے تھے۔

پھر اس دن جب وہ لوگ تاریخ لینے کے لیے آ رہے تھے تو اتنے دنوں کے بعد نانا' نانی اور مہر خالہ بھی اس واقعے کے بعد پہلی مرتبہ گھر پر آ رہے تھے۔ ماما بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ سب لوگ میری قسمت کا فیصلہ کرنے آئے تھے اور میں ایک لاش تھی جو دفن ہونے جا رہی تھی' بس۔

اس دن صبح سے مجھ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گھر بھر کی صفائی کی' پھر امی کے ساتھ کچن میں مختلف سامان کی تیاری میں مدد دی۔ اور یہ تو کہنا بیکار ہی تھا کہ میں بے حساب روئی بھی تھی اور اب میرے پاس کچھ کیا گیا تھا۔

ان کے آنے پر امی مجھ سے تیار ہونے کا کہہ کر چلی گئی تھیں اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بے حسی سے کسی لاش ہی کی طرح فرش پر بے سدھ پڑی رہی تھی۔ مجھ سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھ پر کپکپاہٹ سی طاری تھی۔

نانا' نانی' ابو' مہر خالہ اور خلدون ماما مستقل ان کے ساتھ اندر بیٹھے رہے اور میرا دل

چاہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کسی بھی طرح گھر سے نکال دوں۔ میں کچھ ایسا کردوں کہ تاریخ تو کیا' بات ہی ختم ہوجائے۔ سوچ' سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا۔ اسی وقت امی آ گئیں۔ میں ان کو دیکھتے ہی سرعت سے اٹھ بیٹھی۔ مجھے تیار نہ پاکر امی مجھ پہ ناراض ہونے لگیں۔

''کہا بھی تھا کہ تیار ہوجاؤ۔ اب کیا وں تو کرآ کر شہزادی صاحبہ کو تیار کریں گے؟''

''ایسے ہی ٹھیک ہے۔'' میں منمنانے لگی۔

''جاؤ' کپڑے بدلو۔'' امی نے میرے ہاتھ میں زبردستی کپڑے تھما کر مجھے غسل خانے میں بند کردیا۔ مردہ دلی سے میں نے کپڑے بدلے اور بالوں کو یونہی لپیٹ لیا۔ باہر آئی تو امی نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میں تو اس خیال سے ہی نیم جان ہوگئی کہ اتنے لوگوں کے سامنے مجھے پیش ہونا پڑے گا۔

''میں اندر نہیں جاؤں گی۔'' میں نے نہایت بے بسی سے کہا تھا۔

''تو کیا میں جاؤں گی؟'' امی اس وقت میری ماں نہیں لگ رہی تھیں۔ ''چلو.......'' انہوں نے مجھے پکڑنا چاہا مگر میں بھی اس وقت جنگلی بکری کی طرح اڑ گئی تھی۔

''نہیں.......نہیں.......'' مجھ پر دورہ سا پڑ گیا تھا۔

امی چند لمحے دیکھتی رہیں پھر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ابو اور ماما ساتھ ہی چلے آرہے تھے۔ ماما کو دیکھ کر میری نظر دھندلا گئی۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مجھے دشوار لگنے لگا۔ میں نے دیوار کو یوں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اگر چھوڑ دیا تو گر جاؤں گی۔ میں نے ماما کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ ماما نے نگاہ نیچی کرلی۔ میرا چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہنے لگا۔ میری سسکیاں میرا دم گھونٹنے لگیں۔ اندرونی جلن اس درجے بڑھ گئی کہ باہر آگئی۔ ابو نے مجھے زبردستی لے جانا چاہا تو اندازہ ہوا کہ بخار کی حدت سے جل رہی ہوں' تب منٹوں میں گھر بھر پریشان ہوگیا۔ میں حیران تھی کہ ابھی بھی میرے گھر والے میری پروا کررہے تھے۔ میں شرمندہ تھی کہ میں نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا۔ ماما مجھے پکڑ کر کمرے میں لائے۔ بستر پہ لٹا کر چادر اوڑھائی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین سا تھا کہ مجھے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو صرف ماما' سو میں ماما سے معافی مانگتی رہی۔ رحم کی درخواست کرتی رہی۔ التجائیں کرتی رہی۔ پھر مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ نہ جانے کیا کیا بکتی میں بے ہوش ہوگئی۔ آخری چیز جو مجھے یاد رہ گئی تھی' وہ ماما کے ہاتھ کا لمس تھا۔

اور اگر میرا بس چلتا تو ساری زندگی میں بے ہوش رہتی مگر بدقسمتی سے ڈاکٹر کی دواؤں کی بدولت ایسا نہ ہوسکا۔ میری بیماری سے البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ امی ابو کچھ نرم ہوگئے تھے مگر اس نرمی کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ایک تو بیماری نے مجھے پہلے ہی نچوڑ دیا تھا' یہ صورت حال دیکھ دیکھ کر میرا خون خشک ہوتا چلا جارہا تھا۔ میں روز بہ روز ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جارہی تھی۔ میں سوچ سوچ کر لرزتی رہتی کہ نہ جانے ابھی میری قسمت مجھے اور کیا کیا دکھائے گی۔ مصیبت کسی طور ٹلتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ تیاریاں تھیں کہ رک نہیں رہی تھیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ جس دن امی خریداری کرنے نہ جاتی ہوں۔ اب تو ماما نے بھی گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ امی جب بھی کہیں خریداری کرنے کے لیے جاتیں' تو نانی کو ساتھ لے کر جاتیں اور مہر خالہ کو میرے پاس چھوڑ کر جاتیں۔ اب میرے گھر والے میرے معاملے میں کسی قسم کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ بے اعتباری مجھے اور اذیت دیتی تھی۔ تازیانے کی طرح لگتی تھی۔

اس دن بھی امی اور نانی کو کہیں جانا تھا اور وہ بہت جلدی میں تھیں اس لیے مہر خالہ کے آنے کا انتظار کیے بغیر ہی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد بیل ہوئی تو میں یہ سوچ کر دروازہ کھولنے لگی کہ مہر خالہ ہوں گی مگر ماما کو دیکھ کر میرے سارے حوصلے جواب دینے لگے۔ میں ماما سے لپٹ کر روئی۔ آہوں سے' سسکیوں سے دھاڑیں مار مار کر ایسے جیسے کوئی مر گیا ہو۔ ہاں' ٹھیک تو تھا۔ میں زندہ کب تھی۔ آخری رسومات تو میری ہی ادا کی جارہی تھیں......

''کیا ہوا؟''

خلاف توقع ماما کے نرمی سے پوچھنے پر میری آنکھیں اور برسنے لگیں۔

''آپ مجھے اکیلے ملتے ہی نہیں۔'' میں نے بے دردی سے گال رگڑتے ہوئے کہا۔ ''سب ہیں تو کچھ بولتے نہیں۔ امی بھی نہیں بولتیں۔ ابو بھی نہیں بولتے۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ کوئی مجھ سے کچھ کہتا ہی نہیں۔ امی ابو سے میں نے بہت معافی مانگی۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ مجھے معاف نہیں کرتے۔ آپ نے بھی ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔'' میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ماما چپ کھڑے رہے۔ ان کی چپ مجھے مارنے کے لیے کافی تھی۔ ''آپ مجھے بھی معاف نہیں کریں گے۔'' میں نے بے قرار ہو کر انہیں جھنجھوڑ دیا۔ ماما کی چپ نہ ٹوٹتی تھی۔

''میں بیماروں کی ماما...... ابو سے کہیں مجھے معاف کردیں۔'' میں ماما کا کندھا

مضبوطی سے پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ''ماما...! ابو سے کہیے' مجھے معاف کر دیں۔ میں اور برداشت نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں' مجھ سے قصور ہوا ہے۔ ہاں' میں آپ سب کی مجرم ہوں۔ مجھے جتنی سزا ملے' کم ہے مگر ایسی سزا مت دیں مجھے۔ مجھے مار دیں' میرا گلا گھونٹ دیں۔ مجھے دفن کر دیں۔'' میں نے ہچکیوں کے درمیان کہا تھا۔ ''میری شادی نہ کریں ماما...! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں مر جانا چاہتی ہوں۔''

''نہیں...'' ماما نے ایک دم اپنا کندھا میری گرفت سے چھڑایا۔ ''میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔'' ماما بے بسی سے کہہ کر تیزی سے گھر سے باہر نکل گئے۔

'ماما کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے...؟' میرے آنسو آنکھوں میں ہی جم گئے تھے۔

'پھر کون کچھ کر سکتا ہے؟' میں نے خاصی وحشت سے سوچا تھا۔ 'پھر کس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے؟' میں شکستہ قدموں سے چلتی اپنے کمرے کے اندر آ گئی تھی اور خاصی دیر تک غائب دماغی کے عالم میں کمرے میں بیٹھی رہی تھی۔

'ماما لاچار ہیں۔ میں بے اختیار ہوں تو پھر با اختیار کون ہے؟'

'کون کرے گا پھر میرے لیے کچھ؟ کون ہے جو مجھے نجات دلا سکتا ہے اس مشکل سے۔ میں کس سے مدد مانگوں؟ میں کس کو پکاروں؟ کون ہے ایسا جو میری سن لے' سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا تھا اور فی الحال کوئی مناسب نام میرے ذہن میں آ نہیں رہا تھا۔ میرا ایک بار پھر دھاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہ رہا تھا اور میں بے اختیار رونے بھی لگی تھی۔ تبھی میں نے نانی' امی اور ماما کے بولنے کی آوازیں سنی تھیں اور میں نے تیزی سے آنسو پونچھ لیے تھے۔ میں کھڑی ہونے لگی تو بھول گئی کہ بک شیلف کے نیچے بیٹھی ہوں۔ سو اٹھتے ہوئے بک شیلف کا کونا سر میں لگ گیا۔ درد کی ایک تیز سی لہر اٹھی تھی جو میرے پورے وجود میں اچھل گئی تھی۔ میری آنکھوں میں تکلیف کے مارے آنسو آ گئے۔

''اللہ! امی...!'' کراہ کی صورت بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا اور دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں میں آنسو جم گئے تھے۔

بہت سیدھا سا' صاف' چھوٹا سا قاعدہ ہے' اصول ہے' مصیبت' تکلیف' پریشانی کے وقت انسان بہت قریبی ہستیوں کو یاد کرتا ہے۔ انہیں پکارتا ہے' ان کا نام لیتا ہے۔

ماں انسان کے قریب تر ہستی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ قریب ترین!

ماں بندی ہے خود لاچار ہے اس کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اللہ!

ہاں... اللہ!... ہی تو ہے۔ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ وہی تو ہے جو سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہی تو ہے جو با اختیار ہے۔ وہی تو مجھے نجات دلا سکتا ہے کسی بھی مشکل سے۔ میں اس سے کیوں نہ مدد مانگوں۔ اس کو کیوں نہ پکاروں۔ وہی تو ہے جو سن لے گا میری۔

ذہن کی گرہ جیسے ایک دم کھل گئی تھی۔ اس وقت اس لمحے اس سے زیادہ بہترین اور قریبی نام اور بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ کمال ہے' یہ تو بڑی سامنے کی بات تھی جو میری عقل میں اتنی دیر بعد آئی۔ میں اطمینان سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر کی تکلیف کا احساس بھی ایک دم مر سا گیا تھا۔

اسی وقت امی اور نانی مجھے خریدے ہوئے کپڑے دکھانے آ گئی تھیں۔ میں نے خاصی بے توجہی اور عدم دلچسپی سے سارے بکھرے کپڑوں کو دیکھا تھا اور وضو کرنے چل دی تھی۔

میں کافر نہیں تھی۔ میں بے دین نہیں تھی۔ میں مسلمان تھی مگر صرف کہنے کو۔ میں نے زندگی میں نمازیں کبھی نہیں پڑھی تھیں حالانکہ امی ابو سے لے کر نانا نانی' مہر خالہ' ماما سب گھر بھر نمازیں پڑھتا تھا۔ نانا' ابو اور ماما تو باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ مجھ پر کسی نے کبھی سختی نہیں کی تھی البتہ تلقین ضرور کی تھی۔

میں نے زندگی میں کبھی دعائیں نہیں کی تھیں کیونکہ مجھے کبھی دعاؤں کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو سب کا لاڈلا پایا تھا۔ میں نے جو چاہا تھا' جب چاہا تھا' مجھے ملا تھا۔ جو مانگا تھا' مجھے دیا گیا تھا اور کسی نے کبھی میری فرمائش کو رد نہیں کیا تھا۔ میری کوئی بات کبھی ٹالی نہیں گئی تھی اور اب مجھے اپنی اوقات کا پتا چل رہا تھا۔ مجھے ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں ہی اپنی اوقات کا پتا چل گیا تھا۔ اب مجھے صحیح معنوں میں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں کتنی حقیر تھی' بے مول تھی' ارزاں تھی' بے مایہ تھی' بے وقعت تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے میرے اکلوتے پن نے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا تھا۔ مجھ سے ایک قصور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک غلطی کر دی تھی اور میرے گھر والے مجھے معاف کر دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ مجھے بخشش دینے کے لیے راضی نہیں تھے اور میرے لاڈلے ہونے نے بچا نہیں لیا تھا مجھے۔ اب صرف دعائیں ہی مجھے بچا سکتی تھیں۔

سنا ہے کہ تقدیر کو کوئی نہیں بدل سکتا سوائے دعاؤں کے۔ ان دنوں میں نے

دعائیں کرنے اور نمازیں پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کون سا ایسا وظیفہ کروں کہ میری دعائیں مستجاب ہو جائیں اور تب مجھے خیال آیا تھا کہ اللہ کی کتاب سے بڑھ کر کوئی وظیفہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میں نے قرآن شریف میں سے چن چن کر چھانٹ چھانٹ کر دعائیں یاد کی تھیں۔ ان میں کچھ وہ دعائیں بھی شامل تھیں جو انبیاءؑ اپنی تکالیف' رنج اور مصیبتوں کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے کرتے رہے تھے۔ میں نے نبیوں کے سردار نبی کریم ﷺ کی مشکل اوقات میں کی جانے والی دعائیں تو حفظ کر لی تھیں۔ ہر اچھا کام جو میں کر سکتی تھی' ہر وہ اچھی نیت جو میں کر سکتی تھی' میں نے کی تھی۔ میں نے نیت کی تھی کہ اگر ابھی میری شادی نہ ہو تو میں شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔ ہر رکعت میں سورۃ رحمٰن پڑھوں گی اور میں نے سورۃ رحمٰن کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا اور جب میں "فذو اتا افنان" پر پہنچی تھی تو اٹک گئی تھی۔ میں جانتی نہیں تھی کہ اس سورۃ میں "افنان" کا نام بھی آتا ہے۔ ایک مرتبہ قرآن شریف ختم کر کے اس کو دوبارہ بھی کھول کر دیکھا ہوتا میں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی ہوتی تو میں جانتی بھی ہوتی۔ اب جب میں واقعی قرآن شریف کو صحیح طور سے پڑھنے کی غرض سے پڑھ رہی تھی تو مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔'' مجھے "ذو اتا افنان" پڑھتے ہوئے بھی خوف آ رہا تھا۔

میں سر پکڑے خاصی دیر تک اس دو لفظی آیت کو دیکھتی رہی تھی حتیٰ کہ اس دو لفظی آیت پر نظر جمائے جمائے میری آنکھوں کے آگے دھندلاہٹ چھا گئی۔ اس دھندلاہٹ میں مجھے افنان کے ساتھ گزرا ہوا لمحہ لمحہ یاد آ رہا تھا۔ بشمول اس رات کے' جس کے بعد ہر ہر آفت نازل ہوئی تھی اور میں اعلیٰ درجے والی آفتوں میں پڑ کر آفت کی جڑ کو بھول ہی گئی تھی۔

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ قرآن شریف کے صفحات گیلے ہوتے دیکھ کر میں نے قرآن شریف بند کر دیا۔ مجھے سورۃ رحمٰن یاد کرنا بھول گئی تھی اور استغفار پڑھنی یاد آ گئی تھی۔ میں روتی رہی۔ ہچکیوں سے' سسکیوں سے' آہوں سے' اور استغفار پڑھتی رہی' توبہ کرتی رہی۔ تھوڑا سکون ملنے پر میں نے قرآن شریف کھول کر ایک بار پھر کوشش کی کہ اس سورۃ کو یاد کر سکوں۔ مگر مجھ سے "ذو اتا افنان" پڑھا نہ گیا۔ میں نے چاہا کہ زبان سے نہ پڑھ سکوں تو دل میں پڑھ لوں۔ دل سے بھی "ذو اتا افنان" پڑھتے ہوئے میں کانپتی رہی تھی۔ میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ 'اب میں اس سورۃ کو کیسے یاد کروں؟' میں نے خاصی وحشت کے عالم میں سوچا تھا۔ یہ سورۃ مجھ سے حزید یاد نہ

ہو سکی۔ اس میں افنان کا نام آتا ہے۔ مجھے اس کا نام لیتے ہوئے بھی خوف آتا ہے کہ کہیں میرا لہجہ نہ پڑھ لے۔ میرے جرم کو کوئی پکڑ نہ لے۔ کوئی سن نہ لے۔ کوئی جان نہ لے۔ اس کے بعد تو میں نے بارہا کوشش کر کے دیکھ لی۔ ہر بار سورۃ رحمٰن کی "ذو اتا افنان" پڑھ کے میری عجیب حالت ہو جاتی۔ بالآخر میں نے سورۃ رحمٰن ادھوری یاد کر کے چھوڑ دی اور فیصلہ کیا تھا کہ جتنی یاد کر سکی ہوں' اتنی ہی پڑھ لیا کروں گی۔ میں نے یہ نیت بے شک کی تھی کہ میں شکرانے کے نفل پڑھوں گی اور ہر رکعت میں سورۃ رحمٰن پڑھوں گی لیکن میں نے یہ نیت بالکل نہیں کی تھی کہ میں سورۃ رحمٰن پوری پڑھوں گی۔ اب چاہے ہر رکعت میں' میں اس کا ایک رکوع ہی پڑھتی' میری نیت بہرحال پوری ہوتی۔

جس دن میں نے یہ فیصلہ کیا تھا' اس دن کارڈ چھپ کر آ چکے تھے۔ میں مطمئن سی ہو گئی تھی اور میں نے دنوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ چیزیں جو میں نہیں چھوڑ رہی تھی' وہ دعائیں تھیں' نمازیں تھیں' درود تھے' توبہ تھی' استغفار تھی۔ قرآن تھا۔ اب پتا نہیں میری کس چیز کو' کس دعا کو' کس نیت کو' کس توبہ کو' کس استغفار کو قبول کیا گیا تھا کہ میرے سر پر منڈلانے والی بلا ٹل گئی تھی۔

جس طرح اچانک میری شادی کا غلغلہ اٹھا تھا' اسی طرح بیٹھ بھی گیا تھا اور مجھے تو کافی دیر تک یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی ایسا ہو گیا ہے' پھر جب میں نے یقین کر لیا تھا تو مجھے اللہ تعالیٰ پر بے طرح پیار آیا تھا۔ اس کا فضل' اس کی مہربانی' اس کی کریمی' اس کا رحم' اس کی رحمت پا کر' دیکھ کر مجھے رونا آیا تھا۔ تب میں تڑپ کر رو رہی تھی اور اب میں شکر اور خوشی کے مارے روئی تھی۔ پورے دل سے اور نیت کے مطابق میں نے شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔

میں نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا' کیوں ہوا؟ میں یہ سب جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں تو صرف اتنا جانتی تھی کہ جیسے بھی ہوا ہو' بس کر دیا گیا ہے میرے لیے۔ سن لی گئی تھی میری اور قبول بھی کی گئی تھی۔ ہاں' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی سنتا بھی کرتا ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔

اس مصیبت کے ٹلنے کے باوجود گھر میں عجیب سوگواریت تھی۔ ابو کو جب میں تھکا ہوا اور خاموش بیٹھا دیکھتی تو میں مزید احساسِ جرم کا شکار ہو جاتی۔ مجھے ابو پر ترس آتا تھا۔ میری وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اس کی ذمے دار میں ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ... رہتا تھا۔

اس دن اتنے دنوں کے بعد ماما بھی آئے تھے۔ میں نے چائے بنا کر انہیں اندر کمرے میں پہنچائی تھی اور اس وقت میں کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی کہ میں نے ماما کے منہ سے اپنا نام سنا۔ ٹوہ لینا اور چھپ کر کسی کی باتیں سننا میری بالکل عادت نہیں ہے مگر اس وقت ماما کے منہ سے اپنا نام سن کر میں رک جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں نے سنا' ماما مستقلاً ابو سے میرا کیس فائٹ کر رہے ہیں۔ ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ یقیناً کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً ماما نے ابو سے میرے سلسلے میں بات کی ہوگی۔ میں حیران تھی کہ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی ماما میرے لیے ایسے تھے۔ مجھے ایک دم ان پر بہت پیار آیا تھا۔ ماما کتنے اچھے تھے اور میں کتنی بری تھی۔ اپنی اس ایک حرکت کی وجہ سے مجھے ماما سے غیرت سی آنے لگی۔

اس وقت ابو نے اگرچہ ماما سے سوچ لینے کے لیے کہا تھا مگر شاید یہ ماما کی ابو سے ہونے والی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ ایک دن امی نے صبح مجھے اٹھایا۔ ''الماس......! اٹھو...... آج اسکول جانا ہے۔''

میں نے بے یقینی سے پوری آنکھیں کھول کر امی کو دیکھا۔ وہ میرا نام لے رہی تھیں۔ مجھے لگا' میری سماعتوں کو دھوکا ہوا ہو۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھ سے کہا تھا۔ ''الماس......! کیا اسکول نہیں جاؤ گی؟'' اور میں خاصی بے یقینی سے بستر پہ پڑی چھت کو گھورتی رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل پر' اس کے کرم پر' اس کے رحم پر ایک بار پھر مجھے رونا آیا تھا۔ اس رحم پر جو اس نے اپنے بندوں کے دل میں میرے لیے ڈالا تھا۔ ورنہ تب بھی یہی بندے تھے۔

پھر میرے اندر نہ جانے کیسے توانائیاں بھر گئی تھیں۔ میں چھلانگ مار کر بستر سے اتری۔ ناشتے کی ٹیبل پر ابو موجود تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ اتنے دنوں کے بعد ابو نے مجھے جواب دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا۔ ''تیار ہو جاؤ۔ اسکول چلنا ہے۔''

وہ دن واقعی حیرتوں کا دن تھا شاید یہ اس رشتے کے لوٹ جانے کی بنا پر بھی تھا کہ ابو امی نرم پڑ گئے تھے میرے لیے۔ شاید ماما کا بھی اس میں کچھ ہاتھ تھا۔ وسیلہ انہیں ہی بنایا گیا تھا۔

میں نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا اور ٹرانس کے عالم میں چلتی اپنے کمرے میں جا کر الماری کے سب سے نچلے خانے میں دبا ہوا یونیفارم نکال کر استری کیا۔ اتنے عرصے بعد اسکول کے لیے تیار ہوتے ہوئے میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ مجھے بہت عجیب سا لگ

رہا تھا۔ ابو کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے صدیوں کے بعد باہر کی دنیا دیکھی ہے۔ بار بار میری آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر جاتیں۔ میری نظر دھندلا رہی تھی۔

ابو کے اسکول سے اٹھا لینے کے بعد میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں اب بھی اسکول کی شکل دیکھ بھی پاؤں گی۔ اسکول کی شکل دیکھ پانا ویسی ہی مشکلات میں سے تھا جیسے میری شادی کا رک جانا اور اس وقت اسکول کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ جیسے میں نے تین مہینے بعد نہیں' بلکہ تین سال بعد اسکول کی شکل دیکھی ہے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ جسم پر کپکپی طاری تھی۔ آنسوؤں کی وجہ سے مجھ سے راستہ چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ یہ بہت تھا۔ یہ بہت سے بھی بہت تھا۔ یہ تو میں نے مانگا بھی نہیں تھا۔ یہ تو بے مانگے عطا کیا گیا تھا۔ مجھ سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں حساب کتاب کر رہی تھی تو اندازہ ہوا تھا کہ فائنل ایگزام اب ہونے ہی والے ہوں گے۔ اس سال تو ایگزام دینا مشکلات میں سے ہی نہیں' بلکہ ناممکنات میں سے ہے اور یہ کہ یہ سال تو میرا گیا ہی گیا۔ پھر میں نے سوچا' بے شک سال چلا گیا ہو مگر یہ بھی کیا کم ہے کہ ایسا کر دیا گیا ہے کہ میں ایک بار پھر اسکول کی شکل دیکھ رہی ہوں۔ میں آٹھویں فیل تو نہ کہلاؤں گی۔ نری جاہل تو نہ رہ جاؤں گی۔

پھر ابو کلاس ٹیچر سے ملے۔ پرنسپل کے پاس گئے۔ وہ میری اتنی لمبی غیر حاضری کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ میں نہیں جانتی کہ ابو نے کیا کہہ کر انہیں مطمئن کیا۔ میرا نام اسکول سے کٹ چکا تھا۔ ابو نے میرا ری ایڈمیشن (Re-admission) کروایا۔ اینول چارجز (Annual Charges)' ایگزامینیشن فیس بھری۔ ڈیڑھ ہفتے بعد ایگزام ہونے والے تھے۔ میری کلاس ٹیچر کا کہنا تھا' میرا ایگزام پاس کر لینا معجزہ ہی ہوگا۔ مجھے خود یقین نہ تھا کہ یہ معجزہ ہو ہی جائے گا۔

ابو جب ساری فارمیلیٹیز پوری کر کے جانے لگے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو بیٹا الماس......! ہم ایک بار پھر تم پر اعتماد کر رہے ہیں۔''

میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''ابو......! آپ کو اب انشاء اللہ' میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' میں نے بہ وقت تمام کہا۔

ابو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

''اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے معاف کر دیا۔'' میں نے ایک دم انہیں دیکھ کر

پوچھا۔

''ہاں.....!'' ابو آہستگی سے کہہ کر چلے گئے۔ میں خوشی کے مارے رو پڑی تھی' پھر نہایت اطمینان سے چلتی کلاس میں پہنچی۔ فرینڈز مجھے دیکھ کر خوش کم اور حیران و پریشان زیادہ ہوئیں۔

''جواہر' تم کدھر تھیں؟''

رابعہ نے بڑے جوش سے پوچھا تھا اور نہ جانے کیوں اس کی شکل سے مجھے بےزاری ہونے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی چاروں بھی مجھ سے پوچھنے لگیں بلکہ انہوں نے کیا' پوری کلاس نے مجھ سے اتنی طویل غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ میں کسی کو جواب دہی کی ذمے دار تو نہ تھی لہٰذا میں نے کہا۔

''یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں اسے ڈس کلوز نہیں کرنا چاہتی۔'' میرا جواب اس قدر روکھا پھیکا تھا کہ کسی کو مزید سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔

کلاس ٹیچر نے کلاس کی سب سے اچھی لڑکی کو ہدایات دی تھیں کہ کام وغیرہ کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کرے اور اتنا کام پہلے ہی دن اپنی کاپی میں اتارنے کے باوجود بھی بہت کچھ رہتا تھا۔ ایسے میں مہر خالہ نے اپنی یونیورسٹی کو میرے لیے تج دیا تھا۔ امی بھی ان کے ساتھ مل کر جلدی جلدی کام اترواتی تھیں کیونکہ ظاہر ہے' امتحان قریب تھے۔ کسی اسٹوڈنٹ کی کاپی اسکول سے گھر لے جانے کی اجازت نہ ٹیچر دے سکتی تھیں اور اگر دے بھی دیتیں تو پیرنٹس اجازت نہ دیتے لہٰذا جو کام بھی کرنا تھا' اسکول میں ہی کرنا تھا۔ مہر خالہ اور امی کو اپنے لیے یوں جتا دیکھ کر میری شرمندگی دوچند ہو جاتی۔ مجھے خیال آتا' غلطی میری اور اس کی سزا دوسرے بھگت رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں اس عزم کو دہراتی رہتی کہ وہ میری زندگی کی پہلی اور آخری غلطی تھی۔ اب کبھی نہیں......

امی اور مہر خالہ نے تین دن کے اندر اندر مجھے سارا کلاس ورک' ہوم ورک اتار کر دیا۔ اب پڑھنے کا معاملہ تھا جو سراسر میرا تھا' اس میں بھی مہر خالہ نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا بلکہ مستقل میرے ساتھ لگی رہی تھیں۔ مجھے میتھس کی ایکسرسائزز کروانا' یاد کرنے والے سبجیکٹ سننا' سوالات لکھ کر دینا' پورے پورے پیپرز solve کروانا۔ جو کمی رہ جاتی تھی' وہ امی پوری کر دیتی تھیں۔ مجھے اتنے لوگوں کا اپنے لیے پریشان ہونا' اپنی اس حرکت کے باوجود اچھا بھی لگتا تھا اور میں یہ بھی سوچتی تھی کہ میں خود کتنی بری ہوں۔ نانا نانی' ابو' مہر خالہ' امی یہ سب کتنے اچھے ہیں۔ وہ سب میرا حوصلہ بڑھاتے اور میں سوچتی رہتی تھی

کیوں چلی تھی' کیا کرنے چلی تھی۔

اتنے کم عرصے میں' میں نے تیاری کر کے نہ صرف امتحان دیا بلکہ میرا رینک بھی کوئی اتنا برا نہیں آیا تھا۔ پینتالیس بچوں پر مشتمل کلاس میں میرا رینک ففتھ تھا اور رہ گئی رابعہ تو وہ بمشکل پاس ہونے پر شکر ادا کیا کرتی تھی۔ باقی فرینڈز کے گریڈز بھی بس گزارے لائق ہی تھے۔ اس جذبے کے پیچھے دراصل ایک جذبہ یہ بھی کارفرما تھا کہ رابعہ لوگ مجھ سے آگے نکل جائیں گے اور میں پیچھے رہ جاؤں گی۔ بہرحال بغیر سال ضائع ہوئے میں نے نائنتھ کلاس میں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔

نائنتھ کلاس میں آ کر رابعہ اور بھی آزاد ہو گئی تھی اور فیضان چونکہ میٹرک میں آ گیا تھا لہٰذا بالکل آؤٹ......! خیر' مجھے ان لوگوں سے کیا لینا دینا تھا' میں تو خود ایسی زک اٹھا کر آئی تھی کہ اردگرد کی نہیں' صرف اپنی خبر رکھتی تھی۔ میں شعوری اور لاشعوری پوری کوشش کرتی تھی کہ اب ابو اور امی کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ میں فرماں بردار بیٹی بنتی جاتی تھی اور والدین کی پھٹکار سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں پہلے کی طرح اب بھی سارے کام کرتی تھی۔ امی کے ساتھ کچن میں مدد کرواتی تھی اور خود پڑھتی بھی تھی۔ ابو امی کہیں آنے جانے پر ٹوکتے نہیں تھے۔ اس معاملے میں بھی میں اب آزاد تھی۔ میں نانا کے یہاں بھی اکثر چلی جاتی۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ سب پہلے ہی جیسا ہو گیا تھا۔ بیچ میں یہ جو کچھ دن آ گئے تھے' وہ ایک بدترین اور بھیانک خواب کی طرح تھے۔ میں انہیں نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ کسی قیمت پر نہیں...... مگر میں اس کا کیا کرتی کہ کبھی کبھار بھولے بھٹکے سے کوئی خیال آ بھی جاتا تھا کیونکہ وہی اسکول تھا' وہی راستے تھے' وہی [illegible] تھے جہاں کبھی میں اور افنان...... مگر ساتھ ہی مجھے اپنے اور افنان سے Related sequel بھی فوراً یاد آ جاتی تھی۔ میں سوچتی' کیا واقعی ابو مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں دوبارہ؟ کر سکتے ہیں؟ دل میں ایک مرتبہ گرہ پڑ جائے تو وہ کھلتی نہیں' شیشے میں crack آ جائے تو اسے ٹوٹتے ہی بنتی ہے۔

مگر بظاہر ایسا لگتا تو نہیں تھا۔ ابو پہلے ہی جیسے لگتے تھے۔ وہ مجھے اپنے کسی کام کو اب منع نہیں کرتے تھے۔ میں بھی خوشی خوشی ان کا ہر کام کرتی۔ اب تو مجھے روٹی بھی بہت اچھی پکانی آ گئی تھی۔ جب میں نے نئی نئی روٹی پکانی سیکھی تھی' کناروں کی طرف سے جل جاتی اور حالانکہ عاقب' ثاقب اتنے منہ پھٹ تھے کہ کہہ بھی دیتے تھے۔ ''آپی.....! جلی ہوئی روٹی بنائی ہیں۔'' ابو نے کبھی اس بات پر کچھ نہیں کہا۔ الٹا دونوں کو سمجھایا کرتے تھے۔

ابو نے مجھے کافی بنانی سکھائی۔ اس دن پہلی مرتبہ جب میں نے کافی بنائی تو انہوں نے بہت تعریف کی۔ جب خالی مگ میں کچن میں لائی تو اتفاق سے پین (Pan) میں کافی تھوڑی بچی ہوئی تھی۔ میرا ایک دم دل چاہا کہ چکھوں تو ابو کو بڑی پسند آئی ہے۔ میں نے چکھی تو اتنی کڑوی تھی کہ ایک گھونٹ کے بعد دوسرا گھونٹ لینا محال ہو گیا۔ تلخی سے نہ صرف میری زبان بلکہ حلق چھل گیا۔ مجھے حیرت ہوئی اتنی کڑوی کافی ابو نے پی کیسے لی۔ نہ صرف پی بلکہ اس کی تعریف بھی کی۔

مجھے ایک دم رونا آنے لگا۔ باپ کی شفقت کا یہ عالم تھا اور بیٹی کی حرکت کا کیا عالم تھا؟ مجھے خود پہ شرم آنے لگی۔ تف تھی مجھ پر لعنت تھی......!

ہر بار جب میں محبتوں اور شفقتوں کا یہ عالم دیکھتی تو احساسِ شرمندگی میں گھر جاتی۔ خلدون ماما کو دیکھ کر یہ کیفیت اور بھی دوچند ہو جاتی تھی اسی لیے جب میٹرک میں آنے کے بعد ابو نے مجھ سے کہا تھا کہ کوچنگ تو تم جاؤ گی نہیں۔ تمہارے ماما ہی تم کو میتھس، فزکس اور انگلش پڑھا دیا کریں گے۔ میں لمحے بھر کو چپ سی ہو گئی تھی۔ مہر خالہ سے پڑھنا اور بات تھی کیونکہ نائنتھ میں ابو نے مجھ سے کوچنگ جوائن کرنے کے لیے کہا تھا کیمسٹری اور بائیولوجی کے لیے تو میں نے صاف منع کر دیا تھا۔ پھر میں نے اس وقت مہر خالہ کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ ابو نے خود ہی ان سے پڑھانے کو کہا تھا۔ مہر خالہ کے پڑھانے کا انداز مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ بالکل گھریلو انداز میں پڑھاتی تھیں۔ مہر خالہ سے مجھے ڈر بھی نہیں لگتا تھا لیکن ماما کے سامنے آنے پر ہر ہر کیفیت مجھ پہ طاری ہو جاتی تھی۔

ابو نے مجھ سے صرف ذکر ہی کیا تھا اور اگلے دن سے ماما گھر پر موجود تھے۔ ابھی تو میں ذہنی طور سے خود کو آنے والی صورت حال کے لیے تیار نہیں کر پائی تھی کہ صورت حال آن موجود ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ ماما پوچھ رہے تھے اور میں گم صم تھی۔

”آپ اب تک ناراض ہیں مجھ سے؟“ بالآخر ہمت کر کے میں نے پوچھا تھا۔

ماما نے چند لمحے سکوت اختیار کیا پھر بولے۔ ”فزکس کی بک دو مجھے۔“

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں نے خاموشی سے کتاب ان کے آگے کر دی۔ ماما مجھے سنجیدگی سے پڑھانے لگے۔

ماما جب مجھے پڑھا رہے ہوتے تو میں چوری چوری ان کو دیکھتی رہتی۔ ان کے پڑھانے کا انداز مہر خالہ سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ میرا دل چاہتا ان سے کہوں ”ماما

تک Maps ڈیزائن کرتے رہتے ہیں؟ کوچنگ کھول لیں تو بہتوں کا بھلا ہو جائے گا مگر اب ماما سے مذاق کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے ماما کی خاموشی سے ان کی چپ سے خوف آنے لگا تھا۔ میرا احساسِ شرمندگی کچھ اور بڑھ جاتا انہیں ایسے دیکھ کر۔ میرے ضمیر پر بوجھ آن پڑتا۔ اصل میں تو میں ان کی مجرم تھی۔ مجھے ان سے معافی مانگنی چاہیے تھی۔ میں ان سے معافی مانگتی تو وہ اپنے منہ سے تو کچھ نہ کہتے تھے۔ میرا دل اور بھر آتا۔ بالآخر میں نے ان سے یہ سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ماما میرے لیے لونگ (Loving) تھے، کیئرنگ (Caring) تھے وہ میرے لیے سب کچھ تھے مگر مجھ سے راضی نہ تھے اور اب جبکہ ابو اور امی کی طرف سے تھوڑا سکون ہوا تھا تو ماما کی طرف سے بے سکون ہو گئی تھی۔ ماما کی طرف سے ہونے والی بے سکونی اس قدر بدترین تھی کہ میرا دل مر گیا تھا۔ میں ان کو منانے کے لیے کیا کروں، مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میرا دل ہر چیز سے اٹھ گیا تھا۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ نہ تفریح، نہ میوزک، نہ ٹی وی، نہ دوستیاں اور نہ دوستیں...... ویسے بھی میری دوستوں میں وہ پہلے والی بات رہ بھی کب گئی تھی۔ میں تین مہینوں کے لیے ان کی دوستی سے آؤٹ کیا ہوئی تھی، مستقلاً آؤٹ ہو گئی تھی۔ ان چاروں کی آپس میں بہت بننے لگی تھی۔ رہ گئی رابعہ تو وہ اپنے چکروں میں رہتی تھی۔ اس کا ابھی تک فیضان کے ساتھ بڑا ٹھیک ٹھاک قسم کا چکر تھا حالانکہ فیضان اسکول چھوڑ چکا تھا، پھر بھی چھٹی پر تقریباً روزانہ ہی نظر آتا تھا۔ رابعہ باقی وقت اس کے فراق میں آہیں بھرتی نظر آتی۔ اب ان دونوں کا افیئر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہا تھا بلکہ زبان زدِ عام ہو گیا تھا اور ان دنوں جبکہ نائنتھ کلاس میٹرک کلاس کو فیئر ویل دینے والی تھی، ایک واقعہ ایسا ہو گیا کہ جس سے رابعہ بری طرح بدنام ہو گئی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ اس دن فیضان چھٹی میں آنے کی بجائے خلافِ معمول Recess میں رابعہ سے ملنے آیا تھا۔ رابعہ اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ Recess ختم ہو گئی اور پیریڈ اور بھی ہو گیا تو رانی جو ہیڈ پری فیکٹ تھی اور رابعہ کی گہری دوست بھی تھی، اس کو فکر لاحق ہو گئی کہ یہ اب تک آئی کیوں نہیں؟ سوئے اتفاق اسی وقت کلاس ٹیچر نے رابعہ کے بارے میں رانی سے ہی پوچھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟ وہ اٹھی اور چپکے سے جا کر کلاس ٹیچر کو بتایا پھر کلاس ٹیچر نے رانی اور ایک اور لڑکی کو رابعہ کی تلاش میں روانہ کیا اور خود جا کر پرنسپل کو بھی بتا دیا۔ پرنسپل خود ہی اس معاملے میں انوالو ہوئیں۔ انہوں

نے رابعہ اور فیضان کو اسکول کی بلڈنگ کی پچھلی طرف رازونیاز میں مصروف پکڑا تھا۔
لمحوں میں بات پورے اسکول میں پھیل گئی تھی۔ رابعہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل
نہیں رہ گئی تھی اور خیر اس کے خلاف جو Disciplinary Action لیا گیا تھا' وہ
الگ تھا۔ اس دن رانی نے مجھ سے کہا تھا۔ ''یہ لڑکے کس قدر ''کمینے'' ہوتے ہیں۔ پھنسوا
دیتے ہیں لڑکی کو۔''
اور میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے رانی' لڑکیاں بھی
برابر کی ''قصوروار'' ہوتی ہیں۔ انوالومنٹ دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ اگر لڑکیاں' لڑکوں
کو شہ نہ دیا کریں تو لڑکوں کو کبھی بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو۔''
رانی سوچ میں ڈوبی نظر آنے لگی۔ ''ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔'' چند لمحے بعد اس نے
کہا اور رابعہ کے ساتھ گزرنے والا واقعہ کہہ سنایا۔
میں نے جو سب کچھ سنا تو مجھے ایک دم اپنے ساتھ ہونے والا اس رات کا واقعہ یاد
آ گیا۔ میں خوف کے مارے کانپنے لگی تھی۔ میں نے بھی تو اپنی بربادی میں کوئی کسر نہیں
چھوڑی تھی۔ اگر اس رات ماما نہ آ گئے ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا میرا۔ اتنے چھوٹے سے
قصور کے Consequences اتنے بڑے تھے۔ اگر اس چھوٹے سے قصور کے نتائج
کسی بڑے گناہ کی صورت میں ہوتے تو میں کیا کرتی؟ میرا کیا بنتا؟ رابعہ کا تماشا ایک
دنیا نے دن میں دیکھا تھا۔ میرا بھی تماشا ایک دنیا دیکھتی اگر رات کی تاریکی نے سب
نگل نہ لیا ہوتا۔ دیگر احسانات کے ساتھ یہ ایک اور احسان تھا اللہ تعالیٰ کا جو اس نے مجھ
پر کیا تھا۔ میں اس کی قرض دار تھی۔ اس کا شکر مجھ پر واجب تھا اور اس کا جتنا بھی میں شکر
ادا کرتی' وہ کم تھا۔ اس رات اس نے ماما کو واقعی غیبی مدد کے طور پر بھیجا تھا۔ یوں مجھے ماما
سے اور بھی شرم سی آنے لگی۔ میرے ضمیر پر بوجھ کئی گنا مزید بڑھ گیا۔ میں اور بھی
خاموش اور گم صم سی رہنے لگی۔
میرے اور ماما کے تعلقات میں جیسے ایک حجاب سا آ گیا تھا۔ ایک تو ویسے ہی مجھے
پچھلا کچھ بھولتا نہ تھا۔ تب نئے سرے سے شرمندگی' بے بسی' پچھتاوا' افسردگی اور افسوس
جیسی کیفیتیں مجھے گھیر لیتیں۔ میری ہنسی' مسکراہٹ' انہی کیفیات نے چھین لی تھی۔ میرا
دل نہیں چاہتا تھا کہ ماما کو اپنی شکل بھی دکھاؤں اور میں جتنا ان سے بھاگنا چاہتی تھی' اسی
قدر مجھے ان کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ واقعی آدمی جس چیز سے جتنا بھاگنا چاہتا ہے' وہی
پلٹ پلٹ کر اس کے پیچھے آتی ہے۔

انٹر تک مجھے ماما نے ہی پڑھایا تھا اور ان سب باتوں کے باوجود مجھے ماما دل سے
پڑھاتے تھے اور یہ بھی میری ایک سزا تھی کہ انہی ساری کیفیات کے خود پر مسلط ہونے
کے باوجود' ماما کے پڑھائے ہوئے پر پوری طرح سے concentrate کروں۔ یہی
وجہ تھی کہ مجھے ان سے زیادہ سوالات کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پھر بھی وہ مجھ سے
پوچھا کرتے تھے۔
''بات سمجھ میں آتی ہے؟''
میں فوراً اثبات میں سر ہلا دیتی۔ ایک دن انہوں نے اسی سوال کو اس طرح پوچھا
تھا۔ ''بات سمجھ میں آتی ہے۔ بھا......''
وہ روانی میں بھانجی کہتے کہتے رک گئے تھے۔ میں نے ایک دم نظر اٹھا کر بڑے
عجیب انداز میں انہیں دیکھا تھا۔
''ماما' آپ مجھ کو بھانجی کیوں نہیں کہتے اب؟''
ماما ہلکے سے مسکرائے۔ ''بھانجی کہنے کی ضرورت کیا ہے' تم بھانجی ہو نہیں کیا میری؟''
میں نے ان سے کہا۔ ''پہلے بھی تو کہتے تھے۔''
انہوں نے جواب دیا۔ ''پہلے مجھے زیادہ یقین نہیں تھا کہ تم میری بھانجی ہو۔ اب
ہو گیا ہے۔''
میرا بڑا دل چاہا تھا کہ ان سے ضد کروں۔ ماما' بھانجی کہیں نا۔ مگر میں شاید کوئی
ضد کرنے کی حق دار رہ نہیں گئی تھی۔ ماما مجھ سے پڑھائی کی بات کے سوا کوئی بات
نہیں کرتے تھے اور میرا ہر بار دل چاہتا کہ ماما پہلے کی طرح مجھ سے خوب ساری باتیں
کریں۔ اس دن میں اس خواہش پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔
''ماما' آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟''
ماما مجھے دیکھتے رہے' پھر پوچھا۔ ''اور پڑھانے کے دوران میں پورے
وقت کیا کرتا ہوں؟''
[illegible] لاجواب سی ہو گئی۔ ''نہیں' میرا مطلب ہے......'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا۔
''تم کر لیا کرو مجھ سے باتیں۔'' ماما کی اس بات پر میرا دل چاہا' ان سے کہوں'
کیا باتیں کروں ماما؟ آپ تو اس شعر کی تفسیر ہیں کہ

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

انٹر میں میری پرسنٹیج بہت اچھی آئی تو ماما نے مجھ سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی اب کیا ارادے ہیں؟''

''میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لوں گی ماما......!'' میں نے مضبوطی سے کہا۔

''کیوں؟ میڈیکل میں نہیں لینا؟'' ماما حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔

''نہیں' مجھے دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''ارے دلچسپی کیوں نہیں ہے؟'' ماما نے حیرانگی سے پوچھا۔ ''لڑکیوں کو تو بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔''

''مجھے قوم کی خدمت کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے ماما......! اپنے گھر والوں کی خدمت کرلوں تو یہی بہت ہوگا۔'' میں یہ کہتے ہوئے ماما کو گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"Alright! As you Please." ماما نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔

انہوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا حالانکہ ماما اگر ایک آدھ مرتبہ کہہ دیتے تو میں میڈیکل میں تو کیا' کہیں بھی ایڈمیشن لے لیتی بلکہ ماما پر ہی کیا موقوف' کسی نے بھی فیصلہ بدلنے کے لیے مجھ پر زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔

میں نے یونیورسٹی میں زیادہ دوستیاں پالنے سے گریز کیا تھا۔ پچھلی دوستیوں کی وجہ سے میں کچھ کم مشکل میں نہیں پڑی تھی کہ نئی دوستیاں کرنے کا خیال آتا مجھے۔ کبھی کبھار مجھے یہ خیال بھی آتا کہ انسان کو برے افعال کے لیے دوستیاں اور ماحول بھی اکساتے ہیں۔ مجھے خیال آتا کہ رابعہ لوگ کی کمپنی اور لڑکوں میں دلچسپی دیکھ کر مجھے بھی یہ ترغیب ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ

"A man is known by the company he keeps."

اگر آپ کی کمپنی اچھی ہے تو آپ بہت برے بھی ہوں گے تو سدھر جائیں گے لیکن اگر آپ کی کمپنی بری ہے تو آپ لاکھ اچھے ہوں' برائی کے پھیر میں آ ہی جائیں گے۔ یہی حال ماحول کا بھی ہے لیکن خراب ماحول سے آدمی خود کو بچا سکتا ہے۔ اگر وہ خود اسٹرونگ ہو تو ماحول اس پر اثر نہیں کرسکتا اور strength آدمی میں اللہ رسول اس کی کتاب پر اندھا یقین ہونے سے آتی ہے۔ بدقسمتی سے اس بات کی سمجھ مجھے بعد میں آئی تھی۔ وقت نے اب مجھے بہت کچھ ''سمجھا'' دیا تھا اسی لیے یونیورسٹی کے ماحول میں میں نے خود کو بہت ''سنبھال'' کر رکھا تھا۔ لڑکوں نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی لوہے کا ٹکڑا تو مقناطیس کی طرف کھنچتا ہی ہے لیکن لوہے کے ٹکڑے اور مقناطیس کے

درمیان فاصلہ ہو تو ناممکن ہے کہ لوہے کا ٹکڑا مقناطیس کی طرف کھنچے۔ میں لڑکوں سے وہی ایک کا فاصلہ رکھنے لگی تھی۔ لڑکے بھی وہ' جو کچھ رازی کی طرح تھے' اور کچھ افنان کی طرح......

میں ایک افنان کو بھگت چکی تھی۔ دوسری بار اسے بھگتنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنے گھر والوں کی نظروں میں اپنا امیج دوبارہ بنایا تھا۔ رابعہ کا انجام دیکھ لینے سے پہلے اکثر یہ سوچ میرے ذہن میں آتی تھی کہ رابعہ تو کیا کچھ نہیں کرتی رہتی' اس کی کبھی پکڑ نہیں ہوئی۔ ایک میں نے تھوڑا کچھ کرلیا تو زمانے بھر کی لعن طعن میرا نصیب ٹھہری...... میں آخر انسان ہی تھی' ایسی سوچ ذہن میں آ ہی جاتی تھی۔ مجھے پتا نہ تھا کہ رابعہ کی صورت مجھے مزید سبق سکھایا جانے والا ہے۔ مجھے یہ بتایا جانے والا ہے کہ آدمی بچا رہتا ہے تو بچا رہتا ہے مگر جب پھنستا ہے تو گلے گلے تک پھنستا ہے۔ وہ مجھے یہ بتانے والا تھا کہ اس کی رسی ایک حد تک ہی دراز ہوتی ہے اور جب وہ کھینچنے پر آتا ہے تو آدمی کی گردن ٹوٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا اور یہ بات تو اب ہر وقت میرے دھیان میں رہتی تھی۔ ہر وقت مجھے یاد رہتی تھی اور میں ہر ایسے موقع پر فوراً اس کی طرف رجوع کرلیتی تھی۔ اس کا رحم مجھ پر تھا مگر میں مزید رحم کی درخواست کرتی تھی۔

انہی دنوں ماما پر شادی کرلینے کے لیے زور دیا جانے لگا۔ ماما کے سر میں دو تین سفید بال دیکھ کر مجھے بھی یہی خیال آتا تھا کہ ماما کو اب شادی کر ہی لینی چاہیے۔ تقریباً ہر روز نانا کے گھر کا یہ ہاٹ ایشو ہوتا تھا۔ ہر بار ماما کے سامنے جب ایسا کوئی تذکرہ ہوتا تھا تو وہ متوقع نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ اس دن مجھ سے پوچھنے بھی لگے۔

''ہاں بھئی الماس' کرلوں شادی؟''

اگرچہ ماما اس واقعے کے بعد سے مستقل میرا نام ہی لینے لگے تھے لیکن ہر بار ماما کے منہ سے یہ نام اجنبی ہی لگتا تھا۔ دوسرے مجھے خوشی ایک دم اس بات کی بھی ہوگئی تھی کہ ماما نے اتنے سالوں کے بعد اس دن پڑھائی سے ہٹ کر کوئی سوال کیا تھا مگر ماما کے ''الماس'' کہنے پر مجھ پر بے نام اداسی مسلط ہوگئی۔ ہر بار جب ماما مجھے الماس کہتے تو مجھے وہ منحوس ترین' سیاہ و تاریک رات یاد آجاتی تھی جسے میں لاکھ چاہنے کے باوجود نہیں بھول پائی تھی۔ اس رات بھی تو ماما نے سیدھا سیدھا میرا نام لے لیا تھا۔

''آپ مجھ کو الماس نہ کہا کریں۔'' بے اختیار میں نے کہا تھا۔

''کیوں؟'' ماما نے قدرے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ ''تم کو اپنا نام پسند نہیں ہے؟''

اب وہ مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

میں خاموش ہو گئی' پھر کہا۔ "آپ کے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا تو جواہر کہہ لیا کروں؟" ماما نے قدرے شرارت سے پوچھا۔

میں ان کو دیکھتی رہ گئی۔ آج ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ کیا اس وجہ سے کہ گھر میں ان کی شادی کی بات چھڑی ہوئی تھی اور ماما کا اس خیال سے موڈ اچھا تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر تو ماما کو فوراً شادی کر لینی چاہیے تھی۔ شاید مامی کے گھر میں آ جانے سے ماما کی مجھ سے ناراضگی مکمل طور سے ختم ہو جاتی یا شاید ماما اب مجھ سے ناراض تھے ہی نہیں۔ پتا نہیں۔ مجھے پتا نہیں چل پاتا تھا۔ ماما کا رویہ اکثر ناقابل فہم ہوتا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں' تم کو جواہر کہہ لیا کروں؟"

"نہیں..... وہ بھی نہیں....." میں نے ایک دم انہیں ٹوکا۔

"تو کیا کہا کروں؟" ماما حیرانگی سے پوچھنے لگے۔

"بھابھی.....!" میں نے فوراً جواب دیا تھا۔

ماما ایک دم چپ سے ہو گئے' پھر پوچھا۔ "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"سب کہتے ہیں تو کر لیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اور..... تم کیا کہتی ہو؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں بھی یہی کہتی ہوں۔"

"اچھا..... تو ڈھونڈ دو کوئی......" ماما نے شرارت سے کہا۔

اس فرمائش پر میں نے ماما کو کافی دیر تک چوری چوری دیکھا تھا۔ میرے ماما اتنے اچھے تھے کہ ان کے لیے کوئی اتنی ہی اچھی لڑکی ہونی چاہیے تھی' مگر پتا نہیں' منیرہ مامی میں امی' مہر خالہ اور نانی کو کیا پسند آیا کہ ماما کے لیے ڈن کر دیا۔

اس دن بات فائنل کرنے جانا تھا۔ امی' مہر خالہ اور نانی زبردستی مجھے بھی ساتھ لے گئیں۔ منیرہ مامی مجھ کو تو بالکل اچھی نہ لگیں۔ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو میں چپ چپ اور خاموش تھی۔

"کیا ہوا؟ مامی پسند نہیں آئیں؟" ماما نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"نہیں..... وہ آپ کے جیسی نہیں ہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

ماما بے ساختہ مسکرائے۔ "ارے بھئی' وہ میرے جیسی ہو بھی نہیں سکتیں کیونکہ میں لڑکا ہوں نا۔"

ماما کے اس مذاق پر میں خاموش سی ہو گئی تھی۔ میں نے مزید کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔

بالآخر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میں بجھی بجھی سی تھی۔ گم صم اور چپ چاپ۔ ماما نے یہ بات محسوس کر لی اور ایک دن پوچھ بھی لیا۔

"کیا بات ہے' تم خوش نہیں ہو؟"

"آپ خوش ہیں؟" میں نے الٹا ان سے سوال کیا۔

"تم خوش ہو گی تو میں بھی خوش ہوں گا۔"

ماما کے کہنے پر مجھے یک گونہ سکون ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا' وہ اب مجھ سے ناراض نہیں تھے اور مجھے معاف کر چکے تھے' سو میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں خوش ہوں ماما.....!"

وہ تصدیق چاہنے والی نظر سے مجھے دیکھتے رہے تھے مگر مزید کچھ کہا نہیں تھا۔

پھر اس دن ماما کی شادی کی تیاری ہی کے سلسلے میں امی کو شاپنگ کے لیے جانا تھا اور میں اس دن مہر خالہ کی عدم دستیابی کے باعث امی نے مجھے ہی ساتھ میں لے لیا۔ تمام مطلوبہ چیزیں لے لینے کے بعد ایک کپڑے کی دکان کے باہر رک کر انہوں نے کہا۔

"یہاں ہر قسم کے کپڑے کی ہمیشہ زبردست ورائٹی ملتی ہے اور بالکل مناسب داموں۔ آئے ہیں تو دیکھتے ہی چلیں۔"

میں کوئی اعتراض کیے بغیر امی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ وہاں بے حد رش تھا اور کچھ دیر تک بڑے تحمل سے کھڑے رہنے اور دھکم پیل کو برداشت کرنے کے بعد میں نے بے حد کوفت سے حتول اور مہذب خواتین کی اس بھیڑ کو دیکھا اور امی سے کہا۔

"میں باہر کھڑی ہو کر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ خرید لیجیے جو خریدنا ہے۔"

میں باہر آ گئی اور ستون کے ساتھ ٹیک کر کھڑی ہو گئی تبھی دوسرے ستون کے برابر میں ایک لڑکا بھی آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک خاتون اس لڑکے کے پاس آ کر کہنے لگیں۔

"ارے بیٹا' تم یہاں کھڑے ہو' میں کب سے تمہیں اندر دیکھ رہی ہوں۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں ممی' اندر اتنا رش ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے یا تو ساری دنیا کی خواتین کپڑا ادھر ہی سے خریدتی ہیں یا پھر ادھر سب کچھ فری مل رہا ہے۔" اس کا لہجہ قدرے جھلایا ہوا سا تھا۔ اسی وقت امی بھی باہر آ گئی تھیں۔

"کیا ہوا امی' کچھ لیا؟" میں نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"ارے کہاں سے لیتی' میرا تو دم الٹنے لگا اتنا رش دیکھ کر۔" امی نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا تھا۔

تبھی وہ خاتون امی کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھیں اور خاصی دلچسپی سے امی کو دیکھا تھا۔

"قمر..... تم قمر ہی ہو ناں؟"

امی نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تھا۔ "نفیسہ..... تم.....!"

"ہاں' میں نفیسہ.....!" کہہ کر وہ خاتون بڑی گرم جوشی سے امی سے گلے ملی تھیں پھر تقریباً پندرہ منٹ تک امی اور وہ خاتون اس دکان کے باہر ہی کھڑی باتیں کرتی رہی تھیں اور میں لاتعلقی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"ممی' اور تو کچھ نہیں لینا آپ کو؟" بالآخر میں نے اس لڑکے کو ان خاتون سے سوال کرتے سنا۔

"ارے نہیں.....!" کہہ کر وہ خاتون ایک دم ہنسیں۔

"تو میں گاڑی میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" مطلع کر کے وہ جانے لگا۔

"ارے رکو تو..... کدھر جا رہے ہو؟" ان خاتون کے روکنے پر وہ ایک دم رک گیا۔

"قمر.....! یہ میرا دوسرے نمبر والا بیٹا ہے بلال' بی ای کیا ہے۔ غیر ملکی کمپنی میں ایگزیکٹو انجینئر ہے۔" ان کے لہجے میں فخر سمٹ آیا۔ "اس سے چھوٹی دو بیٹیاں ہیں۔ اس سے بڑا ایک بیٹا ہے' ہلال.....!"

امی نے اسی وقت میرا تعارف ان سے کروایا تھا۔ "یہ میری بیٹی ہے جواہر.....!"

"ارے قمر..... ماشاء اللہ' تمہاری بیٹی تو بڑی پیاری ہے۔ ایک دم گڑیا سی.....!"

اب کی بار انہوں نے خاصی دلچسپی سے مجھے دیکھا تھا۔

"ممی' اب جاؤں؟" اس مرتبہ اس لڑکے نے قدرے بے زاری سے پوچھا تھا۔

"اچھا قمر' میں تمہارے گھر آؤں گی۔ اپنا پتا مجھے دو۔"

امی نے نفیسہ خاتون کے کہنے پر اپنا پتا انہیں دیا اور امی گرم جوشی کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔

امی نے ان کے جانے کے بعد مجھے بتایا کہ یہ نفیسہ خاتون اور وہ کالج فرینڈز ہیں۔ نفیسہ خاتون تب بھی رئیس باپ کی بیٹی تھیں اور اب بھی ان کے شوہر بہت بڑے بزنس مین تھے مگر مزاج کی ہمیشہ سے سادہ ہیں۔ چونکہ اتنے عرصے بعد ان کا ملنا ہوا تھا

امی بہت خوش تھیں اور بہت پُرجوش بھی۔ سارے راستے وہ ان کی باتیں کرتی آئی تھیں۔

پھر اس واقعے کو دو دن بھی نہیں ہوئے تھے اور اس دن میں یونیورسٹی سے گھر آئی تو انہیں گھر پر موجود دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مجھ سے اتنی محبت اور اپنائیت سے ملیں کہ میں متاثر ہو گئی۔ اس بار بھی ان کا بیٹا ان کے ساتھ تھا۔

"مجھے تمہاری بیٹی بہت اچھی لگی ہے قمر.....!"

ان کے لہجے میں کوئی ایسی "خاص بات" ضرور تھی کہ میں چونک گئی تھی اور چونک تو ان کا بیٹا بھی گیا تھا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ اس نے مجھ پر ڈالی تھی اور نگاہ نیچی کر لی تھی۔ میں ان سے معذرت کر کے اندر چلی آئی۔ بعدازاں میں نے ان کے لیے ریفریشمنٹ کا انتظام کیا۔ عاقب کے ہاتھوں اندر بھجوا دیا اور اس کے بعد میں ان کے سامنے نہیں گئی۔

امی ان کو رخصت کر کے آئیں تو خاصا مسکرا رہی تھیں۔

"اپنے بیٹے بلال کے لیے لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہے نفیسہ..... تم اس کو بہت پسند آئی ہو اور اب کی بار وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آئے گی۔"

"اچھا.....!" میں نے خاصی عدم دلچسپی سے سنا تھا۔

پھر وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میرے گھر والے بالکل راضی تھے' خوش تھے' ایک دم تیار تھے البتہ نفیسہ خاتون کو ابھی تک کوئی حتمی جواب دیا نہیں گیا تھا۔ امی نے اس دن ہنس کر ماما سے کہا تھا۔

"تمہاری شادی بہت مبارک ثابت ہو رہی ہے۔ بھانجی کا معاملہ بھی ساتھ ہی ساتھ نمٹ رہا ہے۔"

ماما نے کچھ کہا نہیں تھا۔ اس وقت دھیمے سے مسکرا رہے تھے۔ امی کے جانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"کیوں بھئی الماس' اب تو تم خوش ہو؟ کر دیں تمہاری شادی؟ اب تو تم انکار نہیں کرو گی؟"

میں نے بڑی طویل سانس لے کر ماما کو دیکھا تھا۔ مجھے شادی وادی سے کوئی دلچسپی تھی نہیں۔ یہ معاملہ تو میں نے کلی طور پر امی ابو کے سپرد کر دیا تھا لہٰذا وہ سب تیار تھے تو میرے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

"نہیں.....!" میں نے ماما کو ایک لفظ میں جواب دیا تھا۔ ماما نے گویا اطمینان سے [illegible] یا تھا۔

میرے گھر والوں نے نفیسہ خاتون کو ہاں میں جواب دیا تھا۔ بلال مرتضیٰ سے میری بات طے ہوگئی تھی۔ نفیسہ خاتون تو ماما کی شادی سے پہلے ہی میری شادی کی تاریخ رکھنے کے لیے اصرار کر رہی تھیں مگر امی نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

"ارے نفیسہ! تم تو بالکل بے صبری ہوئے چلی جارہی ہو۔"

نفیسہ خاتون نے کہا۔ "جو کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔ تم میرے بیٹے کو جانتی نہیں ہو۔ اس کا کب ارادہ کیا ہوجائے۔ کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"ارے تو میرے بھائی کی شادی تو خیریت سے نمٹ جانے دو۔ پھر اس طرف دیکھا جائے۔ آخر ہم لوگ بھی تو تیاری کریں گے ہی۔" امی نے فوراً کہا۔

"اس طرف دیکھنے کے لیے میں ہوں ناں، تم لوگوں کو تیاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹی کو ایک جوڑے میں بھی بھیج دو گی تو ہمیں قبول ہے۔" نفیسہ خاتون نے نہایت خوش گوار لہجے میں کہا تھا۔

"سوچ لو نفیسہ، ساسیں، بہوؤں کو لے کر تو ایسے ہی جاتی ہیں۔ اصلیت بعد میں کھل کر سامنے آتی ہے۔"

امی کی اس بات پر نفیسہ خاتون نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا تھا۔ "ارے بھئی، میں بیاہ لے کر جاؤں گی، اسے رکھوں گی بھی ویسے ہی۔ بس تم لوگ تیاری میں زیادہ محنت نہیں کرو۔ کوئی قریبی تاریخ دے دو ہم کو۔"

ان کے کہنے پر بڑی ضد بحث کے بعد ماما کی شادی کے دو ہفتے بعد میری شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی۔

نفیسہ خاتون تاریخ طے ہونے کے بعد بار بار ہمارے یہاں آئی تھیں۔ ہر معاملے میں وہ میری پسند کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہ رہی تھیں۔ چاہے وہ شادی کا جوڑا ہو۔ چاہے جیولری وغیرہ کا معاملہ ہو۔ وہ ہر بار میری رائے ضرور معلوم کرتی تھیں۔ ہر بار ان کی آمد سے میں شپٹا سی جاتی۔ مجھے ان سب چیزوں کا آئیڈیا نہ تھا اور ایسے معاملات کے لیے مجھے بازاروں کے چکر لگانے سے خاصی کوفت ہوتی تھی۔ ماما کی شادی کی تیاری نے ویسے ہی تھکا کر رکھا ہوا تھا لہٰذا اپنی بے زاری کا اظہار میں نے امی کے سامنے کر دیا تھا۔ امی نے اس پر نفیسہ خاتون سے کہا کہ میری پسند کے معاملے میں وہ کوئی تردد نہ کریں۔ اپنی پسند سے جو کرنا چاہیں، کریں۔

اس کے بعد سے واقعی انہوں نے کسی معاملے میں مجھے زحمت نہیں دی تھی۔ دلہا...

اس میں کچھ شک نہیں تھا کہ ان کی پسند تھی بہت شاندار۔ ارزاں چیزیں انہیں پسند نہیں آتی تھیں۔ (میں پتا نہیں کیسے پسند آگئی تھی؟) اس کا اندازہ مجھے شادی اور ولیمے کے جوڑوں کو دیکھ کر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ زیورات اور دیگر بری کا سامان بھی خاصا قیمتی تھا۔

☆=======☆=======☆

ابو کے جملے تھے یا نوکیلے پتھر تھے۔ ابو کے الفاظ تھے یا تیز دھار خنجر تھے۔ ابو کا لہجہ تھا کہ نشتر...... جس کی چبھن سے میں نے اپنا زخمی وجود مزید زخمی ہوتا محسوس کیا تھا۔ ابو کا ہر لفظ اس قدر حتمی، ہر جملہ اس قدر مکمل اور لہجہ ایسا اٹل تھا کہ میں نے سوچ لیا تھا اب تو یہ شاید ساری زندگی کے لیے ہی لکھا گیا ہے۔ میں ہر بار یہ سوچ کر ہی تڑپ کر بے بسی سے سسک پڑتا تھا۔ میں رو کر، گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا رہا تھا۔ فی الحال تو مجھے کچھ نہیں چاہیے اللہ تعالیٰ! ابو کے دل میں میرے لیے تھوڑا رحم تو ڈال دے۔ میں بہت اذیت میں ہوں اللہ تعالیٰ! مجھے اس اذیت سے کچھ تو نجات دلا دے۔ اور اس دن جب ابو نے میرے پاس آ کر مجھ سے وہ سوال کیا تھا تو میں نے اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا تھا۔ ابو سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"آپ...... آپ...... مجھے معاف کر دیجیے بس۔" بہت تکلیف کے عالم میں، میں نے کہا تھا۔

"ہوں......!" ابو نے ہنکارا بھر کے میرا کندھا تھپتھپایا تھا۔ "جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔"

مارے تشکر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ابو کا اتنا کہہ دینا بھی بہت تھا میرے لیے۔ میری ذہنی اذیت میں خاصی حد تک کمی واقع ہوگئی تھی۔

پھر اس دن بڑے بھائی نے میرے پاس آ کر پوچھا۔ "افنان......! ابو پوچھ رہے تھے، تم سے پوچھوں، تم نے آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" مجھے ایک دم دکھ سا ہوا۔ بے حد تکلیف سے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ ابو یہ سوال خود بھی تو مجھ سے کر سکتے تھے۔ بڑے بھائی کے through مجھے Message ملنے کا کیا مطلب تھا؟ مجھے نئے سرے سے اذیت نے آ لیا تھا۔

"بڑے بھائی......! ابو ابھی تک ناراض ہیں مجھ سے؟" میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کی بجائے بہت تکلیف کے عالم میں ان سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے مجھے ... خاموشی اختیار کی پھر کہا۔

''اوہو......! ابو کی تم فکر چھوڑ دو۔ وہ مانتے مانتے ہی مانیں گے۔ تم اپنی کہو۔''

'ابو کی فکر کیسے چھوڑ دوں......؟' میں نے بہت وحشت زدہ سا ہو کر سوچا تھا۔ 'یہ فکر مجھے کسی اور چیز پر concentrate کرنے دے گی اور اس حالت میں' میں اپنی کیا کہوں گا؟' میں نے تکلیف کے مارے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا تھا۔

''امتحان کب سے ہیں؟'' انہوں نے پوچھا تھا اور میں نے ایک دم آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔

میں تو اب تک یہ بھول بھی چکا تھا کہ میں میٹرک کلاس میں تھا جس کے فائنل ایگزام ہونے ہی والے ہیں۔ مجھ پر تو ایسی افتاد پڑی تھی کہ مجھے یاد ہی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ میں دنوں کا شمار بھول چکا تھا اور تاریخیں مجھے یاد نہیں رہ گئی تھیں۔ ''بھئی افنان' کچھ تو بولو۔ امتحان کب سے ہیں؟'' بڑے بھائی نے ایک بار پھر پوچھا تھا اور اس بار میں دنوں کا حساب کتاب کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ امتحانوں میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ میرے ہوش و حواس سب معطل ہو گئے۔ دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بڑے بھائی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''ایک ماہ اکیس دن بعد......'' نہایت مرے ہوئے انداز میں' میں نے جواب دیا تھا۔

''ہوں......!'' بڑے بھائی سوچ میں ڈوبے نظر آنے لگے تھے' پھر چند لمحے بعد پوچھا۔ ''تیاری کتنی ہے؟'' بڑے بھائی کے اس سوال پر میرا خون خشک ہو گیا۔ 'تیاری......' میں نے نہایت دہشت سے دل میں دہرایا تھا۔ 'میری تیاری صفر تھی۔ اس سال تو امتحان دینا ناممکنات میں سے تھا۔ یہ سال تو گیا میرا۔' یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔

''سب کچھ داؤ پر لگا دیا اس نے...... عاقبت' عزت' آبرو' کیریکٹر' کیریئر......'' مجھے ابو کے الفاظ اچانک یاد آنے لگے تھے۔ ''اب رہ کیا گیا ہے؟''

'واقعی اب رہ کیا گیا ہے؟ سب کچھ داؤ پر لگ گیا تھا۔' میرا چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہا۔ 'اب واقعی میرا مستقبل کیا ہوگا؟ میرے کلاس فیلوز مجھ سے آگے نکل جائیں گے اور میرا سال برباد ہو جائے گا۔ میں ایک سال پیچھے رہ جاؤں گا۔' خاصی اذیت' ڈپریشن اور سخت مایوسی کے عالم میں' میں نے سوچا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں؟'' بڑے بھائی بدستور میرے جواب کے منتظر تھے اور مجھے اپنی سوچوں سے نجات نہیں مل رہی تھی۔

''کچھ بھی نہیں......'' میں نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔

بڑے بھائی نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے؟ پورے سال تم کیا کرتے رہے تھے پھر؟''

مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔ اب میں بڑے بھائی کو کیا بتاتا؟

''بتاؤ افنان' سارے سال تم نے کیا کیا؟'' بڑے بھائی نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ میں ایک بار پھر چپ رہا۔

''ہوں......!'' بڑے بھائی نے ہنکارا بھرا۔ ''تمہاری خاموشی سے میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم اپنی پڑھائی کی طرف سے بھی لاپروا ہو گئے تھے۔'' ان کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔ ''اف......! مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' تم سے کیا کہوں؟ تم کو کیا کہوں؟ ہر طرح کی بربادی تم نے خود اپنے ہاتھوں چنی ہے۔ سزا اچھی ملی ہے تمہیں...... اور سبق بھی ٹھیک ٹھاک ملا ہے۔'' بڑے بھائی سر تھامتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

میری نگاہ جھک گئی تھی۔ نئے سرے سے مجھے رونا آنے لگا تھا۔ بڑے بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ واقعی مجھے اچھی سزا ملی تھی۔ میری زندگی پہ سزا مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ دیگر سزاؤں کے ساتھ ایک سزا یہ بھی تھی کہ میں اپنا ایک سال برباد ہوتا دیکھتا رہوں' روتا رہوں اور کچھ نہ کر سکوں۔ میں افسوس کرتا رہوں...... اور سبق کہتے کسے ہیں؟ سزا اور سبق میں فرق کیا ہوتا ہے؟ الماس کے ماما نے تو مجھے سچ کا مزا چکھایا تھا ایسا کہ اس کی تلخی نے اس کی کڑواہٹ نے' اس کے ذائقے نے میری زندگی اذیت ناک ہو کر رہ گئی تھی۔ الماس کے ماما نے سچ چوٹ دی تھی مجھے۔ سچ کی مار دی تھی۔ میں اگرچہ اپنے مارنے والے کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس کے نتائج مجھے ابھی سے بہت اچھی طرح اپنا تعلیمی سال ضائع ہونے کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

بڑے بھائی مزید کہہ رہے تھے۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا تو تمہارا رزلٹ دیکھ کر ہمیں شاک لگتا۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بہر حال تم تیاری کرنا شروع تو کرو۔ ٹائم کم ہے اگرچہ لیکن اگر آدمی خود کو لگا دے تو یہ مشکل نہیں ہے۔''

بڑے بھائی نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا اور میں نے خاصی بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔ انہیں کیسے یقین تھا کہ میں کچھ کر سکوں گا اور انہوں نے گویا میری سوچ پڑھ لی تھی۔

''یہ تم کو کرنا پڑے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا سال برباد نہ ہو اور تمہارے کلاس

فیلوز تم سے سینئر اور تم ان کے جونیئر نہ کہلاؤ۔“

مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ ایک میری وجہ سے کس کس کو اور کتنا suffer کرنا پڑ رہا تھا اور میں تو خیر suffer کر ہی رہا تھا۔ میں بے اختیار توبہ کرنے لگا۔ یہ بس میری زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ تھا۔ اب نہیں...... کبھی نہیں......

پھر میں نے بڑے بھائی کی ہدایات کے مطابق خود کو لگا دیا تھا اور اس کے پیچھے صرف امتحان پاس کرنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ پیچھے رہ جانے کا خوف بھی تھا۔ عزت کا سوال بھی تھا۔ میں نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً رات دن ایک کر دیے تھے۔ پہلے پرچے میں صرف دو دن رہ گئے تھے اور میں ابھی بھی اس قابل نہیں تھا کہ اپنے پیروں پر چل پھر سکتا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ امتحان کی تیاری تو جیسے تیسے کر لی تھی۔ امتحان دینے کیسے جاؤں گا میں؟ میرا یہ مسئلہ بھی بڑے بھائی ہی نے حل کیا تھا بلکہ دیگر تمام مسائل بھی انہوں نے ہی حل کیے تھے۔ اسکول میں آخری کلاسز کے لیے .M.C (میڈیکل سرٹیفکیٹ) دے کر ایڈمٹ کارڈ لینے سے امتحان کے لیے سینٹر کا پتا کرنے تک بڑے بھائی نے ہر تکلیف میرے لیے اٹھائی تھی۔ پھر جس دن امتحان ہوتا' وہیل چیئر پر مجھے امتحان دلانے لے کر جاتے۔ مجھے اپنی زندگی پر' اپنے وجود پر مزید شرمندگی ہونے لگتی۔ میں کیسا ظالم تھا کہ جرم میں نے کیا تھا' اور سزا میرے گھر والوں کو مل رہی تھی۔ میں کیسا نادان تھا کہ غلطی میں نے کی تھی' اور اس کا خمیازہ میرے گھر والے بھگت رہے تھے۔ قصور میں نے کیا تھا اور تکلیف میرے گھر والے اٹھا رہے تھے۔

مکمل طور سے صحت یاب ہونے میں پورے پانچ ماہ سترہ دن لگے تھے اور یہ عرصہ میں نے کیسے گزارا تھا' میں ہی جانتا ہوں' یا اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ان پانچ ماہ سترہ دنوں کے لمحے لمحے میں' میں مر مر کے جیا تھا اور جی جی کے مرا تھا۔ گلٹی (guilty) ہونے کی فیلنگ (feeling) میرے دل سے نہیں جاتی تھی۔ گلٹی ہونے کی فیلنگ میرے دل سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔ احساس شرمندگی' احساس گناہ نہیں جاتا تھا میرے دل سے کیونکہ مجھے پچھلا کچھ بھولتا ہی نہ تھا۔ مجھے وہ تاریک اندھیری رات نہیں بھولتی تھی۔ مجھے اپنی بے اختیار کیفیت نہیں بھولتی تھی۔ مجھے اس رات اپنا تماشا بننا نہیں بھولتا تھا۔ اپنی بے بسی نہیں بھولتی تھی۔ مجھے اپنے گھر والوں کا رویہ نہیں بھولتا تھا۔ مجھے اپنی اذیت' اپنی تکلیف' اپنے آنسو نہیں بھولتے تھے۔ مجھے اپنی کوئی کیفیت نہیں بھولتی تھی۔ ہاں' مجھے کچھ نہیں بھولا تھا۔ اچھا ہے' مجھے بھولنا چاہیے بھی نہیں تھا۔ یہ بات تو ساری زندگی مجھے یاد رکھنی چاہیے تھی۔

میٹرک میں اگرچہ میری پرسنٹیج گر گئی تھی مگر میرا اے ون گریڈ برقرار تھا۔ خیر یہ مجھ اکیلے کی کامیابی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے میرے گھر والوں کا ہی ہاتھ تھا۔

شہباز نے میرا رزلٹ دیکھا تو مجھے پُرجوش طریقے سے گلے لگا کر مبارک باد دی۔

”یار تو نے تو کمال کر دیا......!“

میں ٹھیک طرح سے مسکرا بھی نہ سکا تھا' بس ہونٹ پھیلا کر رہ گیا تھا۔

پھر شہر کے بہترین کالج میں میرا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ میں "Man" بننے کے لیے کتنا مرا کرتا تھا۔

Man بننا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ مجھے اب پتا چل رہا تھا کہ انسان Man اپنے کیریکٹر کی وجہ سے بنتا ہے۔ کیریکٹر نہیں' تو کچھ بھی نہیں۔

Man' انسان اپنے اچھے عمل کی وجہ سے بنتا ہے۔ اور اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ نیت اچھی نہ ہو تو ہر اچھا عمل بے کار ہے۔ پھر انسان کا انسان ہونا بے کار ہے۔ Man ہونا بے کار ہے۔

میں نے انٹر میں پری انجینئرنگ لے لی تھی اور ایک بار پھر میں نے خود کو لگا دیا تھا' رگڑ دیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ہر تفریح خود پر حرام کر لی تھی۔ میری تفریحات پہلے بھی محدود تھیں۔ دوستیاں میں نے شروع سے کبھی نہیں پالی تھیں۔ بس ایک شہباز میرا اکلوتا دوست تھا۔ میں نے ٹی وی والے کمرے کے پاس سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اب کسی میرین لائف' سی ورلڈ سے بھی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے خوف آتا تھا ”نفس“ سے اور نفس کو induce کرنے والی ہر چیز سے۔

میرے انٹر میں آتے ہی بڑے بھائی کی شادی کے ہنگامے بھی جاگ اٹھے تھے۔ بڑی بھابی کو امی نے ہی پسند کیا تھا۔ ان کا تعلق اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ بڑے بھائی کے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوئی تھیں۔ ان کے آتے ہی بڑے بھائی کی ترقی ہو گئی تھی۔ اب وہ اس ملٹی نیشنل کمپنی کے ڈائریکٹرز میں سے تھے۔

مجھے بڑے بھائی بہت عزیز تھے۔ ان کے حوالے سے بڑی بھابی بھی مجھے بہت پیاری تھیں۔ میں ان کا لاڈلا دیور تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں' میں بڑے بھائی کا نالائق مگر پیارا وہ بھائی ہوں۔

پھر انٹر میں بہترین پرسنٹیج کی وجہ سے مجھے انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل گیا اس دن میرے گھر والے بہت خوش تھے۔ ابو مسکرا رہے تھے۔ ابو کو میں نے بہت

عرصے بعد اپنی کسی کامیابی پہ مسکراتے دیکھا تھا ورنہ ابو کا ہر عمل بتاتا تھا کہ وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے کچھ کھنچ سے گئے تھے اور پتا نہیں' میں خوش تھا یا نہیں؟ مجھے اپنی کیفیات سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ بہر حال یہ غنیمت تھا کہ میں نے اب پروفیشنل انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

پروفیشنل انسٹی ٹیوشن میں آ کر لوگ جامے سے "باہر" ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی سی "آزادی" میسر آ جاتی ہے ناں' اور تھوڑا سا سکون حاصل ہو جاتا ہے کہ پروفیشنل کیریئر میں تو قدم رکھ لیا ہے۔ اب تو کچھ بن کر ہی نکلیں گے اور مجھے نہ سکون ہی ملا تھا نہ اس آزادی سے ہی کچھ لینا دینا تھا مجھے۔ اس کو ایجوکیشن ادارے میں' میں آزادی کے "اعلیٰ اعلیٰ مظاہرے" دیکھتا تھا۔ رومانس' دھواں دار افیئرز' فلرٹس' کرپٹ لڑکے' کرپٹ لڑکیاں' بے وقوف بنانے والے لڑکے' بے وقوف بننے والی لڑکیاں اور میری تھیوری......! زمین اور اس پر گرنے والا سیب......! میگنیٹ اور لوہے کا ٹکڑا......! Force of gravity اور Magnetic Force

مجھے اپنے الفاظ کی بازگشت ہوا میں سنائی دیتی۔ "لعنت ہو......!" میں سر جھٹکتا۔ سب بے کار ہے۔ سب فضول ہے۔ دھوکا ہے۔ ڈھکوسلے بازیاں ہیں۔ ڈراما ہے۔ ہر افیئر کے پیچھے ایک ہی غرض ہے۔ ایک ہی جذبہ کارفرما ہے۔ اس جذبے کے پیچھے آدمی کی Civilization صفر بھی نہیں رہ جاتی۔ آدمی کی آدمیت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ "حیوان" بننے میں اسے سیکنڈ بھی نہیں لگتے۔ شہباز جو میرے ساتھ ہی ہوتا تھا' اب بھی اکثر اپنا مقولہ دہراتا۔

"یار' یہ لڑکیوں کے چکر برے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں آدمی کو تباہ کر دیتی ہیں' برباد کر دیتی ہیں۔"

اور میں سختی سے اسے ٹوک دیتا۔

"نہیں شہباز' صرف لڑکیوں کی وجہ سے آدمی پر تباہی نہیں آتی بلکہ آدمی اپنی تباہی کا خود ذمے دار ہوتا ہے۔ قصوروار دونوں ہوتے ہیں۔ انوالومنٹ دونوں طرف سے ہوتی ہے۔"

شہباز ایسے منہ بناتا تھا جیسے اسے میری بات پہ یقین نہ آتا ہو حالانکہ یہ سچ تھا۔ میں اس کو سمجھا نہیں سکتا تھا کہ ابن آدم اور بنت حوا کی "Relationship" ایسی ہی ہے جیسے پیٹرول اور آگ......! پیٹرول کو آگ سے دس فٹ کے فاصلے پر رہنا چاہیے

جہاں کہیں یہ دونوں ملے تو تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر سب جل جاتا ہے۔ کچھ باقی نہیں بچتا۔ میں بھی دودھ کا جلا تھا' اور چھاچھ پینے کا مجھے شوق نہ تھا۔ میں پہلے ہی اتنی تکلیف' اتنی اذیت' اتنی بے بسی' اتنا دکھ' اتنی پریشانی اٹھا کر آیا تھا کہ مجھے اب ہر چیز سے خوف آتا تھا۔ اب میں کہتا تھا۔ "سیب کو شاخ سے ٹوٹنا ہی نہیں چاہیے۔ شاخ سے ٹوٹے گا تو زمین پر گرے گا ناں۔ لوہے کے ٹکڑے کو خود مقناطیس سے دور رہنا چاہیے کیونکہ مقناطیس تو اسے کھینچے گا ہی۔ سو میں بھی اب لڑکیوں سے دور رہنے لگا تھا حالانکہ میں کلاس کا جینئس اسٹوڈنٹ تھا۔ میں دیکھنے میں بھی اچھا لگتا تھا مگر کسی لڑکی کو مجھ میں انٹرسٹ لینا تو دور کی بات' مجھ سے بات تک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ میرا رویہ ان سے بہت rude ہوتا تھا بلکہ پہلی کوشش تو میری یہ ہوتی تھی کہ میں ان سے بات ہی نہ کروں۔ مجھے اب لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ہی لڑکی میں دلچسپی لینے کا مجھے اتنا "زبردست" اور "عظیم" نقصان اٹھانا پڑا تھا کہ میں دوبارہ غلطی سے بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے الماس نام ہی سے خوف سا آنے لگا تھا اور میرے Batch میں تین تین الماسیں موجود تھیں۔ الماس مرزا' الماس عابد اور الماس وحید۔ ان میں سے کوئی بھی الماس مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ سب کہتے تھے کہ افنان جلال ایک بدتمیز' بددماغ اور اکھڑ مزاج لڑکا ہے۔ مجھے اپنی اس "شہرت" سے بھی شرمندگی نہیں ہوئی تھی اور کلاس فیلوز سے مجھے لینا دینا بھی کیا تھا۔ میں نے اپنے ٹیچرز سے تو کبھی Misbehave نہیں کیا تھا۔ ٹیچرز میں میری پہچان اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے ہی تھی۔

میرے فائنل ایئر میں آتے آتے چھوٹے بھائی کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ بڑی بھابی کی طرح چھوٹی بھابی کو بھی امی نے ہی پسند کیا تھا حالانکہ چھوٹے بھائی مزاج کے خاصے اور قدرے غصیلے بھی ہیں لیکن اس لمحے مجھے بڑے بھائی کی طرح چھوٹے بھائی کی فرمانبرداری پر بھی بے حد رشک آیا تھا۔ ابو نے اگر میرے سامنے اس دن بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی مثالیں دی تھیں تو واقعی وہ دونوں مثال دیے جانے کے قابل تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ اس رات کے بعد پچھلے آٹھ سالوں میں' میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ میں انہی دونوں جیسا بن سکوں۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرے گھر والوں کو اب مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ خاص طور سے ابو کو۔ میں ان کو راضی رکھنا چاہتا تھا' اپنی طرف سے خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ابو کی ہر ممکن اطاعت کرنے

کی کوشش کی تھی اور یہ میرا فرض بھی تھا۔ اس سے کم از کم اتنا تو ہو گیا تھا کہ ابو میرے لیے کچھ ذرا نرم پڑ گئے تھے۔ پھر بھی وہ مجھ سے زیادہ بات وات نہیں کرتے تھے۔ میرے لیے یہ بھی بہت تھا۔

جس دن فائنل ایئر کا رزلٹ آیا تھا' اس دن گھر بھر بے حد خوش تھا۔ باقاعدہ مٹھائیاں بٹ رہی تھیں میری شاندار کامیابی پر۔ میں سیکنڈ پوزیشن ہولڈر تھا اور اس دن اتنے عرصے بعد ابو نے میرا کندھا تھپک کر مجھے مبارک باد دی تھی۔ میں گم صم سا ہو گیا تھا۔ مجھے اب کسی بات سے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ میں جو بے حد شرارتی' بلا کا شوخ اور حاضر جواب ہوا کرتا تھا' اب بے حد خاموش اور چپ رہنے لگا تھا۔ میری ہنسی مسکراہٹ' میرے مزاج کی شوخی سب رخصت ہو گئی تھی۔ میں سنجیدہ اور بردبار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اصل والا افنان عادل مر گیا تھا۔ یہ تو کوئی نیا ہی افنان عادل تھا جو میرے اپنے لیے بھی اجنبی تھا۔

حادثات آدمی کو بدل دیا کرتے ہیں۔ Nature تو یہی کہتی ہے۔

رزلٹ نکلنے کے بعد مجھے جاب کے لیے زیادہ خوار نہیں ہونا پڑا کیونکہ اخبار میں گورنمنٹ سروسز کے لیے Vacancies آئی تھیں۔ میں نے اپلائی کر دیا۔ مجھے یقین تو نہیں تھا کہ Reply کیا ہی جائے گا' لیکن جس دن کال لیٹر مجھے موصول ہوا' تو مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ بہر حال میں نے انٹرویو دیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میرا سلیکشن ہو ہی جائے گا کیونکہ یہاں میرٹ چلتا کب ہے؟ لیکن جس دن اپائنٹمنٹ لیٹر مجھے ملا' میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی اور جتنا میں حیران تھا' گھر بھر بے حد خوش تھا۔ ابو بھی بہت خوش لگ رہے تھے اور مجھے بہت اطمینان ہوا تھا یہ سب دیکھ کر۔

جاب ہوتے ہی مجھ پر گھر والوں کی طرف سے شادی کے لیے دباؤ ڈالا جانے لگا۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی نہیں...... کبھی نہیں —— اور جب دباؤ حد سے بڑھنے لگا تو میں چڑنے لگا۔ جلنے بھننے لگا۔ میرا دل چاہتا کہ کہیں بھاگ جاؤں۔

انہی دنوں مجھے اسکالرشپ پر ایم ایس کرنے انگلینڈ جانے کا چانس مل گیا۔ میں نے سن کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ یہ چونکہ متوقع تھا لہٰذا اپنے افسران بالا کو میں نے پہلے ہی اس بات سے آگاہ کر رکھا تھا حالانکہ میری جاب کو ابھی تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے مگر واٹر مینجمنٹ اتھارٹی (Water Management Authority) نے اسے اچھا اعزاز سمجھتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دے دی تھی اور واپس آ کر میں اپنی

جوائن کر سکتا تھا۔ میرے گھر والے البتہ اس خبر سے زیادہ خوش نہیں تھے' خاص طور سے ابو۔ لیکن انہوں نے براہ راست مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی وجہ گھر میں دونوں بھابیوں کی موجودگی بھی تھی مگر جس رات مجھے جانا تھا' اس سے ایک رات پہلے یہ اتفاق تھا کہ دونوں بھابیاں اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھیں۔ اس دن صبح سے ہی ابو کا موڈ خراب تھا۔

''میں اس کے اس فیصلے سے بالکل خوش نہیں ہوں۔'' ناشتے کی ٹیبل پر ابو نے امی کو مخاطب کر کے indirectly پانچویں چھٹی مرتبہ گویا مجھ سے کہا تھا۔

''آپ کہیں تو میں نہیں جاؤں؟'' مجھ سے بالآخر ضبط نہیں ہو سکا۔ میں نے کہہ دیا۔

''میں کہہ دوں گا تو تم نہیں جاؤ گے؟'' اب ابو نے براہ راست مجھ سے ٹھنڈے لہجہ میں پوچھا تھا۔

''جی......!'' میں نے سر جھکا کر کہا تھا۔

''تو ٹھیک ہے' میں نہیں چاہتا کہ تم جاؤ......''

ابو نے دوٹوک انداز میں کہا۔

ڈائننگ روم میں ایک دم سناٹا ہو گیا۔ امی' بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی حیرانگی سے ابو کو دیکھنے لگے۔

''ابو' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' بالآخر بڑے بھائی نے کہا تھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' ابو نے بڑی درشتی سے کہا۔

میں نے ایک نظر ابو کو دیکھ کر نظر جھکا لی۔

''میں اسے تم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔''

ابو یہ کہہ کر کرسی کھسکا کر غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور مزید کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ میری اٹھ کر ان کے پیچھے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن امی' بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی ان کے پیچھے ہی چل دیے تھے۔

''مگر کیوں......'' بڑے بھائی کی آواز میں یہ سوال بھی سن سکتا تھا جو خاصی پُر احتجاج تھی۔

''کیوں کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔'' ابو کا انداز ابھی بھی دوٹوک تھا۔

''ابو......! یہ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔'' چھوٹے بھائی نے بہت استعجاب سے

"مستقبل جتنا بننا تھا بن گیا۔ اب اس سے کہو جتنا رہ گیا ہے ادھر رہ کر بنائے۔"

میں نے ابو کو بے نیازی سے کہتے سنا۔

"ارے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں بھی اس کے جانے سے خوش نہیں ہوں مگر آپ تو حد کیے دے رہے ہیں۔" اب کی بار میں نے سنا' امی کہہ رہی تھیں۔

"میں حد کیے دے رہا ہوں۔" ابو نے ایک دم جیسے چیخ کر کہا تھا۔ "حد تو آپ کے صاحب زادے کر چکے ہیں۔ ارے اس وقت ہم اس کے سر پر بیٹھے تھے' تب یہ خود کو سنبھال نہیں سکا۔ خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اسے انگلینڈ جانے دوں میں؟ کیا میں جانتا نہیں ہوں' وہاں کا ماحول کیسا ہے؟ ارے بالکل آزاد ماحول ہے وہاں تو۔ اس وقت تو اس کے سر پر ہم بھی نہیں ہوں گے۔ وہاں تو اور بھی "فری ہینڈ" مل جائے گا اسے۔"

ابو کہہ رہے تھے اور میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"ابو' یہ ٹھیک نہیں ہے۔" بڑے بھائی نے گویا بلبلا کر کہا تھا۔

"اب تم بتاؤ گے کہ کیا ٹھیک ہے؟ اور کیا ٹھیک نہیں ہے؟" ابو نے کڑے تیوروں سے بڑے بھائی سے پوچھا تھا۔ "تم مجھے بتاؤ' یہ وہاں خود کو بچا سکے گا؟ خود کو سنبھال لے گا؟ تم کہو ہاں...... تو مجھے یقین نہیں آئے گا۔ مجھے یقین نہیں ہے۔" ابو نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

'اف......!' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے بے اختیار۔ 'بس کر دو۔ کوئی بس کر دو......' میں نے بہت بے بسی سے سوچا تھا اور لمحے بھر کے لیے اس ایک رات کے بعد اپنی زندگی کے گزارے ساڑھے آٹھ سال یاد آ گئے۔ ان ساڑھے آٹھ سالوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی ابو کے الفاظ نہیں بھولے تھے۔

میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ابو کے لیے مطیع' صالح اور سعد بن سکوں......

میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ مجھ پر سے ابو کا اعتبار جو اٹھ چکا ہے' اسے دوبارہ بحال کر سکوں......

اور اب ابو کے الفاظ سن کر مجھے اپنی ساری محنت ضائع جاتی نظر آ رہی تھی۔ ابو اتنے بے اعتبار ہیں میری طرف سے۔ ہاں' ٹھیک تو ہے۔ آئینے میں ایک بار crack آ جائے تو عکس کے بھی دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اعتبار اگر ایک بار اٹھ جائے تو پھر بے اعتباری ہی رہتی ہے آدمی کو۔ مار دیا تھا ابو کی اس بے اعتباری نے مجھے۔ تبھی میں نے امی کو احتجاجاً کہتے سنا تھا۔

"آپ زیادتی کر رہے ہیں۔"

"ہاں...... زیادتی...... مجھے بتاؤ تو زیادتی کہتے کسے ہیں؟ کافی سے زیادہ زیادتی تو آپ کے بیٹے کی طرف سے ہو چکی' اب رہ کیا گیا ہے؟"

اور اب کی بار مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور خاصی وحشت کے عالم میں' میں ابو کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ امی' بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ابو کے چہرے پر البتہ سکون تھا۔

"ابو' اس بات کو کافی سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔" میں نے بہت لاچاری سے کہنا شروع کیا۔ "اس واقعے کے بعد سے کیا آپ نے مجھے سدھرا ہوا نہیں پایا؟ کیا اس کے بعد سے میرا کردار آپ کے سامنے نہیں رہا جو آپ ابھی بھی بے اعتبار ہیں؟"

میرے لہجے میں بے بسی' بے چارگی' لاچاری' دکھ' اذیت' سب ہی کچھ سمٹ آیا تھا۔ ابو نے اگرچہ زبان سے کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر مجھے جواب مل چکا تھا۔ خاموشی آدھی ہاں ہوتی ہے۔ ابو نے مہر ثبت کر دی تھی۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی کو روکنا محال ہو گیا۔ ہونٹوں کی لرزش پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ میں جس کرسی کے پاس کھڑا تھا' اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ آنکھوں کی نمی کو پلکیں جھپک کر اندر اتارنے لگا۔

"میں...... میں...... میں...... آپ کو کیسے یقین دلاؤں......؟" جب میں بولا تو آواز بھاری ہو گئی تھی۔ گلا رندھ گیا تھا۔ "میں اب کچھ نہیں کروں گا۔ آپ...... آپ یقین کیجیے میرا...... اعتبار کیجیے مجھ پر...... اعتبار کیجیے۔" میری آواز پھٹ سی گئی تھی۔

ابو نے اس بار بھی کچھ نہیں کہا۔ میں بہت بوجھل دل کے ساتھ پیچھے پلٹا تھا۔ میں نے چھوٹے بھائی کو کہتے سنا تھا۔

"ابو' میں سمجھ نہیں سکتا' آپ اب اس معاملے پر اتنے حساس کیوں ہو رہے ہیں؟ اس اسٹیج پر آ کر تو انسان میں شعور آ جاتا ہے۔ وہ اپنا اچھا برا خود جاننے لگتا ہے۔ اب ہم اسے ایک حد تک ہی سمجھا سکتے ہیں اور سمجھنے والوں کو سمجھ میں آ بھی جاتا ہے۔ انسان اپنے ہر عمل کے لیے خود جواب دہ ہے۔"

"عفان' تم بے شک ٹھیک کہہ رہے ہو مگر کیا روکنا میرا فرض نہیں ہے؟ ہیڈ آف دی فیملی میں ہوں۔ ہر بندہ جواب دہ ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے نہ صرف اپنے ہر عمل کے لیے بلکہ اپنی اولاد کے بارے میں بھی سوالات اسی سے کیے جائیں گے کہ تم نے کس

حد تک اپنی ذمے داری پوری کی اور ایسی ذمے داری پوری کی ہے میں نے ایسی تربیت کی ہے؟''

میں نے ابو کا جواب سنا تھا اور بہت بوجھل دل کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا۔

''آپ بے شک ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر وہ بھی تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' نکلتے نکلتے امی کی آواز میرے کان میں پڑی تھی۔ ''ساڑھے آٹھ سال ہو گئے ہیں اس بات کو۔ آپ ابھی تک بھولے نہیں؟ میں کہتی ہوں' بے شک نہ بھولیں اور ہر وقت کڑی نگاہ رکھیں مگر اتنے عرصے تک آپ نے' میں نے' سب نے اسے دیکھا ہی ہے' کردار میں اس کے کمی نہیں پائی۔ بہک گیا تھا اگر وہ تو ایک ہی بار بہکا تھا۔ اچھے اچھے بہک جاتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ اسے بار بار یاد دلایا جائے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ باغی ہی ہو جائے۔ جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ معاف کر دیجیے اسے۔ جا رہا ہے اگر وہ تو اچھے الفاظ' اچھی سوچ اور اعتماد دے کر بھیجیے اسے۔''

میں نے گہری سانس لی اور ابو کا جواب سنے بغیر واپس آ گیا۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ ابو کا سلگتا' چبھتا اور بے اعتباری سے بھرپور جواب سنتا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں یونہی بستر پر بیٹھ گیا۔ خاصی خالی الذہنی کے عالم میں' میں نے بستر پر بے ترتیبی سے بکھرے کپڑوں اور اٹیچی کیس کو دیکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے پاسپورٹ کو دیکھا تھا' ٹکٹ کو دیکھا تھا۔ تبھی دستک کی آواز پر میں نے بے حد چونک کر پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔ بڑے بھائی دروازے کے عین بیچوں بیچ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر شاید مسکرائے بھی تھے۔

''پیکنگ کمپلیٹ ہو گئی تمہاری؟'' اندر آ کر انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔

''نہیں......!'' میں نے مختصراً کہا۔

''ارے' تو کب کرو گے؟ آج رات کی فلائیٹ ہے ناں۔'' انہوں نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''مجھے کہیں نہیں جانا۔''

''ارے' اس کا کیا مطلب ہوا؟'' بڑے بھائی نے نہایت حیرت سے پوچھا تھا۔

''جب ابو کو مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے' پھر تو سب کچھ ہی بے کار ہے ناں......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

بڑے بھائی بے اختیار ہنسے۔ میں ایک ٹک انہیں دیکھتا رہا۔ ''تم بالکل احمق انسان ہو۔ ہر فیصلہ جلدی میں کرتے ہو۔''

''کچھ فیصلے آدمی کو جلدی کر لینے چاہئیں ورنہ نقصان ہو جاتا ہے۔'' میں نے گہرے لہجے میں کہا۔

''اور اس وقت تمہارا سب سے بڑا نقصان تب ہو گا جب تم اس موقع کو Avail نہیں کرو گے۔'' بڑے بھائی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''بے وقوف' لوگ تو ایسا موقع ملنے کی دعائیں کیا کرتے ہیں۔ تم کو تو خود اللہ تعالیٰ اس کا موقع دے رہا ہے' اور تم ہو کہ ناشکری پر تلے ہوئے ہو۔ فرسٹ کلاس اسکالرشپ تم کو مل رہی ہے۔ لندن کی بہترین یونیورسٹیز میں سے ایک میں تم پڑھو گے۔ اکاموڈیشن کے لیے گورنمنٹ تم کو پے کرے گی۔ بس کھانے پینے کا خرچہ ہی تم کو کرنا پڑے گا اور تم کو کیا چاہیے؟ میرے بھائی' بے فکر ہو کر جاؤ۔ ابو کے سارے خدشات کو غلط ثابت کر دو اور ایسا کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ملے گا تم کو۔''

میں نے بڑے بھائی کو نگاہ میں بہت ساری عزت بھر کے دیکھا تھا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میں چلا جاؤں؟'' میں نے ان سے آہستگی سے پوچھا۔

انہوں نے جواباً بڑے استعجاب سے مجھے دیکھا تھا۔ ''میں کیوں نہ چاہوں گا کہ تم جاؤ۔ ارے بھئی' یہ نہ صرف تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے بلکہ ہمارے پورے خاندان کے لیے ہے۔''

''ابو کے لیے یہ اعزاز کی بات نہیں ہے۔'' میری آواز میں سو ہزار توے تھے۔

بڑے بھائی بے ساختہ مسکرائے۔ ''یہ کیوں نہیں۔ وہ مانتے ہیں۔ کہتے نہ ہوں تو اور بات ہے۔ تمہارے دشمن تو نہیں ہیں وہ۔ اور تمہارے بدخواہ بھی نہیں ہیں۔ تھوڑے بدگمان ہیں تم سے۔ یہ بدگمانی ان کی تم ہی دور کر سکتے ہو۔ یقین جو اٹھ گیا ہے ان کا' وہ تم ہی دوبارہ بحال کر سکتے ہو' کر کے دکھا دو۔''

''آپ کہتے ہیں تو......'' مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

''احمق' میں کہہ رہا ہوں۔'' بڑے بھائی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''اب وقت کم ہے۔ چلو' تمہارے ساتھ پیکنگ کروا دوں میں۔'' بڑے بھائی نے خود اٹھتے میرا بازو پکڑ کر مجھے بھی اٹھا دیا۔

''نہیں' میں خود کر لوں گا۔'' میں نے ایک دم انہیں روکا۔

یونیورسٹی فیلو ہو۔"

ہم بہت جلدی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ دوران سفر ہم میں خاصی اچھی شناسائی ہو گئی تھی۔

ایئرپورٹ پر اترتے ہوئے اس نے مجھے اپنا رہائشی پتا دیا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے یونیورسٹی کے بالکل قریب ہی دو کمروں کا ایک اپارٹمنٹ مل گیا تھا۔ میرے اپارٹمنٹ سے یونیورسٹی تک کا راستہ صرف پندرہ منٹ کا تھا جو پیدل بھی آرام سے طے کیا جا سکتا تھا۔ ایک ہفتے بعد کلاسز کا باقاعدہ آغاز ہونا تھا۔ یونیورسٹی کا سارا حدود اربع میں اور بلال پہلے ہی گھوم پھر کر معلوم کر چکے تھے۔ جس دن پہلی کلاس لینے جانا تھا' اس دن میں نے اور بلال نے طے کیا تھا کہ دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔ ایک پوائنٹ پہ ہماری میٹنگ طے تھی' پھر ہم دونوں یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ شیڈول کا پتا کرتے ہوئے میں اور بلال لیکچر ہال کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بڑے مطمئن انداز میں بلال سے باتیں کرتے ہوئے میں نے جونہی اندر قدم رکھا تھا' اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔

میرے سامنے بلاشبہ الماس تھی۔

☆======☆======☆

ماما کی شادی کے کارڈ نفیسہ خاتون اور ان کے گھر بھر کو بھی دیے گئے تھے۔ آخر کو وہ ماما کی بھانجی کی سسرال تھی مگر یہ بڑے مزے کی بات تھی کہ بارات' ولیمے اور دیگر تقریبات میں نفیسہ خاتون' ان کے شوہر' دونوں بیٹیاں اور سب سے بڑا بیٹا مع بہو تو موجود تھے۔ اگر ایک موجود نہیں تھا تو بلال مرتضیٰ نہیں تھا۔ میرے گھر والوں کے بے حد پوچھنے پر نفیسہ خاتون اس کی مصروفیات کے بارے میں بتاتی رہتی تھیں کہ آج یہاں مصروف ہے۔ کل وہاں مصروف ہوگا۔ امی نے ہنس کر جس پر کہہ بھی دیا تھا۔ "ارے نفیسہ اپنی شادی کے لیے تو وہ وقت نکال لے گا ناں؟" نفیسہ خاتون کی طرف سے بڑا جاندار قہقہہ پڑا تھا لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں تھا۔ مذاق کی بات تھی مذاق میں ختم ہو گئی۔

ہر تقریب میں ان کی نظر التفات مجھ پر مستقل رہی تھی اور اتنے اعلیٰ محبتوں کے مظاہرے مجھے الجھن میں بھی مبتلا کر رہے تھے اور مجھ سے ہضم بھی نہیں ہو رہے تھے۔ میں اسے Avoid ہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بارات والی رات ماما اتنے شاندار لگ رہے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ مجھے منیرہ مامی ان کے مقابلے میں خاک بھی نہیں لگ رہی تھیں۔ پتا نہیں ان میں کیا برائی تھی جو وہ مجھے پسند نہیں آئی تھیں۔

پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے' کچھ شخصیات کو ہم پہلی نظر میں ناپسندیدہ قرار دے دیتے ہیں۔ انہیں پہلی مرتبہ دیکھتے ہی مسترد کر دیتے ہیں۔ بہرحال ماما کے ولیمے سے فارغ ہوتے ہی گھر والے میری شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ امی کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ آگے دعوتیں آ رہی تھیں۔ ملنے جلنے آنے والوں کا سلسلہ الگ جاری تھا۔ ماما کے ولیمے کے بعد کئی لوگ میرے لیے آئے تھے۔ اور

ان سب ہی کو ظاہر ہے یہی کہہ کر منع کیا گیا تھا کہ میری تو آل ریڈی بات طے ہو چکی ہے اور اب تو شادی بھی ہونے والی ہے۔ اسی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ویسے ہماری طرف سے زیادہ تیاری کی ضرورت تو نہیں تھی۔ میرا زیادہ تر سامان تو اسی وقت سے تیار تھا جب میری پہلی بار شادی ہو رہی تھی۔

پہلی بار کی شادی کی کہانی بھی عجیب تھی۔ میں جس کو ان دنوں بالکل نہیں سوچنا چاہ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ یہ موقع زبردستی تب آیا تھا میری زندگی میں جب میں ساڑھے تیرہ سال کی تھی اور اب ٹھیک ساڑھے آٹھ سال بعد یہ موقع دوبارہ آ رہا تھا اور اس بار کسی زبردستی اور سزا کے نتیجے میں نہیں بلکہ میرے گھر والے واقعی شادی سمجھ کر کر رہے تھے۔

میرے گھر والوں نے دیگر معاملات میں میری مرضی کو اہمیت دی تھی۔ میرج لان کی بکنگ میری پسند سے ہوئی تھی۔ کارڈ کا ڈیزائن میں نے پسند کیا تھا۔ مہر خالہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تیار کس پارلر سے ہونا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی معاملات میں ابو امی نے مجھ سے مشورے لیے تھے۔

بالآخر شادی کا دن بھی آن پہنچا تھا۔ میرا دو بجے کا ہی پارلر میں اپائنٹمنٹ تھا۔ آٹھ بجے تک میں تیار ہو کر گھر آ چکی تھی۔ پروگرام کے مطابق نو بجے ہمیں شادی لان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ دس بجے بارات کا آنا طے تھا اور ساڑھے دس بجے تک نکاح ہونا تھا۔ اس رات میرج لان کے لیے نکلنے میں ہمیں دیر ہو گئی تھی۔ چونکہ لان تھا بھی گھر سے دس منٹ کی ڈرائیو پر اس لیے گھر والوں کو زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ کون سا دولہا والے اتنی جلدی آ ہی جائیں گے۔ لہٰذا جب پونے دس بجے ہم نکلنے لگے تو ایک فون آ گیا۔ امی نے فون اٹینڈ کیا تھا۔

''ہاں نفیسہ..... ہم نکل ہی رہے تھے۔''

امی نے خاصے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ امی کے نفیسہ کہنے پر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کس کا ہے۔

''تم لوگ کب تک پہنچ رہے ہو؟''

امی اب ان سے سوال کر رہی تھیں اور دوسری طرف سے ان سے نہ جانے کیا کہا گیا تھا کہ میں نے امی کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوتی دیکھی تھی۔ ابو، نانا، نانی، مہر خالہ، ماما اور مامی اور دیگر مہمان بھی فون کے پاس ہی آن کھڑے ہوئے

تھے۔ میں تو خیر صوفے پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا..... کیا کہہ رہی ہو تم.....'' میں نے امی کو کانپتے ہوئے دیکھا تھا۔

''کیا ہوا..... کیا ہو گیا۔'' ابو نے ایک دم امی کو ہلا ڈالا تھا۔

''آپا! کیا ہوا۔'' ماما اور مہر خالہ امی سے پوچھ رہے تھے۔

''قمر کیا ہو گیا۔'' نانا نانی پوچھ رہے تھے اور امی ریسیور ہاتھ میں پکڑے ساکت کھڑی تھیں۔

''نہیں..... نہیں ہم لان کے لیے نہیں نکلتے۔'' امی نے وحشت سے بھرپور آواز میں کہا تھا۔ ''ہاں۔ ہاں تم جب تک دوبارہ خود فون نہیں کرو گی۔ ہم نہیں نکلیں گے۔ ہم بالکل نہیں نکلیں گے۔'' امی کی آواز میں پہلے سے کہیں زیادہ وحشت تھی۔

''اوف۔ لاؤ مجھے دو۔'' ابو نے جھپٹ کر ریسیور ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ امی بے دم سی ہو کر صوفے پر گر سی گئی تھیں۔ ''بند ہو گیا۔'' ابو نے پریشانی سے ریسیور کو دیکھتے ہوئے امی کو دیکھا تھا۔ ''تم بتاتی کیوں نہیں۔ آخر کیا کہہ رہی تھی نفیسہ۔'' ریسیور رکھ کر ابو نے بہت پریشانی سے پوچھا تھا۔

''وہ کہہ رہی تھی کہ بلال، ساڑھے چھ بجے یہ کہہ کر گھر سے نکلا تھا کہ بس ابھی آتا ہوں۔ نفیسہ کے بہت پوچھنے پر کہ کہاں جا رہے ہو۔ تو کہا۔ بس ابھی آ رہا ہوں۔'' امی رک رک کر خواب کی سی کیفیت میں بتا رہی تھیں۔ ''اور اب دس بج رہے ہیں۔ اس کا کوئی نام و نشان پتا ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ لوگ بلال کے تمام دوستوں سے، آفس کولیگز سے اس کے متعلق پتا کر چکے ہیں۔'' امی مشینی انداز میں نفیسہ خاتون کے کہے ہوئے الفاظ دہرا رہی تھیں۔

''کیا؟'' کئی لوگوں کی بیک وقت آوازیں آئی تھیں۔

''وہ لوگ بلال کو ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کر چکے ہیں۔ ابھی بھی اس کی تلاش جاری ہے۔'' امی نے مزید بتایا تھا۔

''اتنے بڑے شہر میں کسی کو تلاش کر لینا آسان کام رکھا ہوا ہے۔'' نانا نے بہت ناراضگی سے کہا تھا۔

''ابو..... ہیں تو بہت بارسوخ لوگ۔ گمان غالب ہے کہ تلاش کامیاب ہو ہی جائے گی۔ خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔'' ابو نے کہا تھا۔

پھر ابو، نانا، نانی، ماما، مہر خالہ امی سے کچھ اور سوالات بھی کر رہے تھے مگر میرا

دھیان اب کسی بات پر نہیں تھا۔ مجھے تو نفیسہ خاتون کے فون کا انتظار تھا اور شاید انتظار تو باقی لوگوں کو بھی تھا۔ ویسے بھی باقی لوگوں میں بچ کون گیا تھا۔ نانا' ابو' ماما اور خالو نے نفیسہ خاتون کا فون آتے ہی دیگر مہمانوں کو ان کے گھروں کو روانہ کر دیا تھا کیوں کہ مہمان چہ مگوئیاں اور سرگوشیاں تو آپس میں کر ہی رہے تھے۔ رکتے تو مزید تماشا بنتا۔

میرے بقیہ گھر والے بھی ایسے بالکل خاموشی سے بیٹھے نفیسہ خاتون کے فون کا انتظار کر رہے تھے جیسے کسی ماتمی جلوس میں شرکت کے لیے آئے بیٹھے ہوں۔ پھر ساڑھے دس بجے' گیارہ بجے' ساڑھے گیارہ' بارہ ساڑھے بارہ بھی بج گئے۔ نفیسہ خاتون کا کوئی فون نہ آیا۔ امی پریشانی کے عالم میں بار بار فون کی طرف ہاتھ بڑھاتیں۔ پھر رک جاتیں۔ ابو' نانا' نانی۔ ماما' خالہ کے چہروں سے ان کی پریشانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اور مجھے پتا نہیں کیوں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا اور میری چھٹی حس بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی کہ بلال مرتضیٰ واپس آنے والوں میں سے نہیں ہے۔ اس کو تلاش کرنے کی ہر کوشش بے کار ہے۔ وہ اب ملنے والوں میں سے نہیں ہے۔ نفیسہ خاتون کا فون تو نہیں آیا۔ البتہ ڈیڑھ بجے حواس باختہ سی وہ خود اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے گھر پہ آن موجود ہوئیں۔

''بلال آج رات کی فلائٹ سے لندن چلا گیا ہے۔'' نفیسہ خاتون کے شوہر نے مجرمانہ انداز میں نہایت دھیمے لہجے بتایا تھا۔

میرے گھر والے احمقوں کی طرح سے نفیسہ خاتون اور ان کے شوہر کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جواباً انہوں نے ایک پرچہ نہایت خاموشی کے ساتھ نانا کی طرف بڑھا دیا تھا۔

نانا کے بعد وہ پرچہ مختلف ہاتھوں میں گردش کرتا رہا تھا۔ پرچے میں پتا نہیں ایسا کیا لکھا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ تبھی سب ایسے خاموش ہو گئے تھے جیسے کسی کی وفات کا ٹیلی گرام ملا ہو۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' بالآخر ماما نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ دھاڑ کر پوچھا تھا اور تبھی سب لوگوں کے ہاتھوں سے گزرتا ہوا وہ پرچہ میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ میری نظریں اس آدھے صفحے پر لکھی تحریر پر پھسلنے لگیں۔ یہ الفاظ صاف

لگتا تھا کہ بہت عجلت میں گھسیٹی گئی تھیں۔

''ڈیئر ممی' پاپا۔

میں نے پہلے دن ہی آپ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ میں اس شادی کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ آپ لوگ بھی جانتے تھے کہ میں کسی اور کو اپنا نصیب نہیں بنا سکتا۔ کیوں کہ میں جس کو اپنا نصیب بنانا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ لوگ راضی نہیں ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کی یا اپنی مرضی رکھی ہی نہیں۔ میں انگلینڈ جا رہا ہوں۔ جس وقت آپ کو میری تحریر ملے گی۔ اس وقت تک فلائٹ روانہ بھی ہو چکی ہوگی۔ نہ میں ادھر ہوں گا۔ نہ مجھ پر میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ٹھونسا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آج میری وجہ سے آپ لوگوں کو بہت سبکی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مگر مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میرا اس میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر آپ لوگ اپنی مرضی کریں گے تو میں بھی اپنی مرضی کر سکتا ہوں۔ پھر یہ سبکی اور یہ شرمندگی اس شرمندگی سے بہت کم ہے جو آپ کی پسند کردہ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے اور پھر اسے طلاق دینے پر ہوتی۔

بلال مرتضیٰ۔

میں نے پوری تحریر پڑھ کر بہت گہری سانس لی تھی۔

اس دن جب اس آدمی نے ایک نظر کے بعد دوسری نظر مجھ پر نہیں ڈالی تھی اور نگاہ نیچی کر لی تھی تو میں نے بڑے تعریفی انداز میں سوچا تھا کہ بڑا شریف آدمی ہے' اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ محض شرافت نہ تھی بلکہ کسی سے کی ہوئی کمٹ منٹ کا لحاظ بھی تھا۔ مجھے بے اختیار اس لڑکی پر رشک آیا تھا جس کو بلال مرتضیٰ اپنا نصیب بنانا چاہ رہا تھا۔

میرے گھر والے نفیسہ خاتون اور ان کے شوہر سے گرما گرمی پر آمادہ تھے۔ ظاہر ہے' یہ ان کا حق بھی تھا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''غضب خدا کا کیسے ماں باپ ہیں۔ بیٹا آنکھوں کے سامنے سے نکل گیا۔ کلفٹن' ڈیفنس' گلشن اقبال جانے کے لیے نہیں بلکہ انگلینڈ جانے کے لیے۔ اور ماں باپ کو پتا بھی نہ چلا۔'' نانی کہہ رہی تھیں۔

''ہمیں پتا چل بھی کیسے سکتا تھا۔'' نفیسہ خاتون بڑی بے بسی سے بتا رہی تھیں۔ کمرے میں اس کا سامان جوں کا توں پڑا تھا۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر تھی۔ کہیں

کوئی شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک دم خالی ہاتھ گھر سے روانہ ہوا تھا۔ نکلتے وقت اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔“

”اگر ہمیں ذرا بھی شک ہو جاتا تو بیرون ملک جانے والے مسافروں کی لسٹیں چیک کرواتے ہم۔“ نفیسہ خاتون کے شوہر کہہ رہے تھے۔

”حتیٰ کہ ہمیں تو یہ تحریر بھی کوریئر سروس سے ملی ہے۔ میں تو اسے پڑھ کر شاک میں آگئی تھی۔“

نفیسہ خاتون کے کہنے پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ خاصا عقل مند آدمی تھا۔ اس نے ایسا کوئی رسک لیا ہی نہیں تھا جس سے اس کے پھنس جانے کے امکانات ہوتے۔

اور ابو کہہ رہے تھے۔ ”چلیے ٹھیک ہے آپ نے رشتہ تو طے کر دیا تھا۔ مگر جب وہ شروع سے ہی شادی کے لیے راضی نہیں تھا تو آپ شادی کی تیاریاں کیسے کر رہی تھیں؟ آخر ہر معاملے میں آپ اس کی مرضی تو پوچھ ہی رہی ہوں گی۔“

”ہاں مگر تب اس نے کہا تھا آپ کی جو مرضی آئے کریں۔“ نفیسہ خاتون نے خاصے صدمے کے عالم میں بتایا تھا۔

میں نے نانا کو بڑی تلخی سے ہنستے ہوئے دیکھا۔ ”کمال ہے۔ آپ کو اس کی فرمانبرداری پر ذرا بھی شک نہ ہوا کہ کہاں تو وہ شادی کے لیے سرے سے راضی ہی نہیں تھا اور کہاں تمام معاملات کلی طور سے آپ کے سپرد کر دیے اس نے؟“

”آپ ہی بتائیے کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ کسی کے دل میں کیا ہے؟ اور بلال اس حد تک بھی جا سکتا ہے یہ تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا ہمارے۔“ نفیسہ خاتون نے بڑی لاچاری سے کہا تھا۔ ”میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید اسے عقل آگئی ہے۔“

”اونہہ۔ آپ کا بیٹا ایک اچھا منصوبہ ساز ہے اور ہر کام بہت Deliberately کیا ہے اس نے۔“ ماما نے تلخی سے کہا تھا۔

”اب یہ بحث بالکل بے کار ہے۔“ ابو نے دل شکستہ لہجے میں کہا تھا اور میں پُرسکون انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سب آپس میں الجھے ہوئے تھے اور میری طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوتے ہوئے نہ میرے قدم لرز رہے تھے نہ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اندر پہنچ کر میں نے ایک ایک کر کے سارا زیور اتارا۔ شادی کا جوڑا اتار کر سادہ سا کاٹن کا سوٹ پہنا۔ میک اپ صاف کیا۔ پھر میں نے بری میں آنے والا سارا زیور علیحدہ کر کے ان کے ڈبوں میں رکھا۔

شادی کا جوڑا اور دیگر آئٹمز Items ویسے ہی پیک کیے جس طرح آئے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے کوئی افسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی تکلیف، کوئی دکھ نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ادھار کا سامان تھا۔ جو میں لوٹا رہی ہوں...... میں نے سارا سامان اٹھایا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”میرے پاس آپ لوگوں سے معذرت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں ہے۔“ نفیسہ خاتون کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

”اب آپ کی معذرت سے بھلا کیا ہو جائے گا۔ ایک تماشا بننا تھا۔ سو بن گیا۔“ نانا نے تلخی سے کہا۔

”مجھے نہایت شرمندگی ہے کہ میرے بیٹے کی نالائقی کے سبب یہ دن بھی دیکھنا پڑ رہا ہے مجھے۔“ نفیسہ خاتون کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

”نہیں، آپ کو اپنی ضد کے سبب یہ وقت دیکھنا پڑ رہا ہے۔“ ابو نے تلخی سے کہا تھا۔ ”اور ساتھ ہی ہمیں بھی۔“

”ارے بھئی کر دی ہوتی تم نے اپنے بیٹے کی شادی جہاں وہ کرنا چاہ رہا تھا۔ ہم بھی ٹھنڈے ہوتے آج۔“ امی کے لہجے میں رنجیدگی تھی۔

میں نے نہایت سکون کے ساتھ سارا سامان سینٹر ٹیبل پر رکھا تھا۔ سب ہی لوگ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

”آپ اپنی ہر چیز اپنے ساتھ لے جائیے۔“ بڑے ٹھنڈے لہجے میں، میں نے کہا تھا۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں بیٹی۔“ نفیسہ خاتون کے لہجے میں حقیقتاً شرمندگی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ”ہماری ہر چیز آپ ہمیں بھجوا دیجیے۔“

نفیسہ خاتون نے مزید کچھ نہیں کہا اور بہ آہستگی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ساتھ میں ان کے شوہر بھی پھر وہ دونوں مع سارے سامان کے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد گھر کی فضا ایک بار پھر ماتمی ہو گئی تھی۔ امی رو رہی تھیں۔ ابو سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ماما فرش کو گھورے جا رہے تھے۔ مہر خالہ اور نانا نانی گم صم سے بیٹھے تھے۔

میں نے ایک نظر سب پر ڈالی تھی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر بستر پر

لائٹ بجھا کر لیٹ گئی تھی۔ ابھی مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ابو آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے لائٹ جلا دی۔ میں ایک دم انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ ابو میرے پاس بستر پر آ کر بیٹھنے کے بعد خاصی دیر تک مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔ مجھے اپنا آپ اس نمی سے بھیگتا ہوا لگا۔ ابو نے ایک دم مجھے خود سے چپٹا لیا۔ میرے دل میں کوئی حسرت' کوئی افسوس' کوئی درد نہیں ہوا' اس پر جو کچھ ہوا تھا۔

''آپ میرے لیے پریشان مت ہوں ابو۔'' میں نے بہت تسلی سے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیسے پریشان نہ ہوں۔ اپنے شوہر کا گھر نصیب نہیں ہو پا رہا میری بیٹی کو۔ ساتھ خیریت کے باپ کے گھر سے رخصت ہونا نصیب نہیں ہو پا رہا۔'' ابو کے لہجے میں اس درجے رقت تھی کہ میرا دل ڈوبنے لگا۔

''میری قسمت میں جب شادی ہونا لکھی ہوگی' ہو جائے گی۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

''کیسے شادی ہوگی تمہاری الماس...... ان دو دو ٹیلیلو کے ساتھ...... کیسے شادی ہوگی تمہاری۔ کون قبول کرے گا اب تم کو؟'' انہوں نے جیسے سسکی لے کر کہا تھا۔ میرا دل ایک دم تڑپ سا گیا تھا۔ ''تم نے ایسا کیا کیا ہے۔ ایسا کیا قصور ہوا ہے تم سے الماس' تم جس کی ابھی تک سزا اٹھا رہی ہو اور تمہارے ساتھ ہم بھی اٹھا رہے ہیں۔''

ابو کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ میں ایک دم ساکت ہو گئی۔

میں نے کیا کیا تھا...... میں نے بڑے استعجاب سے دل میں دہرایا تھا۔

مجھ سے ایسا کیا قصور ہوا تھا۔ بڑی وحشت کے عالم میں میں نے سوچا تھا اور بالکل اچانک بے اختیار مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ مجھے اپنا قصور بھی یاد آ گیا تھا۔ وہ قصور جسے میں سب اچھا' سب ٹھیک' سب سیٹ ہونے پر بھول چکی بیٹھی تھی۔ مجھے ایک دم سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اپنی زندگی کی وہ سب سے بدترین سیاہ ترین تاریک رات یاد آ گئی تھی۔ اس سے وابستہ ہر ہر واقعہ یاد آ گیا تھا مجھے......

میں آہستگی کے ساتھ ابو سے علیحدہ ہو گئی تھی۔

تو...... کچھ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ کچھ سیٹ ہوا بھی تھا۔ کچھ اچھا ہوگا بھی؟ میں نے نہایت صدمے کے عالم میں سوچا تھا۔ ہائے...... اس رات کے After effects اب تک ختم نہیں ہوئے تھے۔ ہو گئے ہوتے تو آج اتنا مجبور اور بے بس ہو کر ابو مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہوتے۔ مجھے یہ سوچ کر رونا آنے لگا۔

تو معاف نہیں کیا گیا تھا مجھے...... مجھ سے آنسو ضبط نہیں ہو سکے۔ واقعی یہ سزا مل رہی ہے مجھے۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے اس طرح رونے سے ابو پریشان ہو گئے۔ ''الماس...... کیا ہوا۔''

مجھ سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ ''ارے ابھی تو مجھے سمجھا رہی تھیں۔ ابھی خود رو رہی ہو۔ کیا ہو گیا بیٹے۔''

اور میں ابو کو کیا بتاتی کہ کیا ہوا ہے...... کیا ہو گیا ہے۔ میں روتی رہی۔

اتنے میں امی بھی آ گئیں۔ ''الماس میری بیٹی......'' کہہ کر وہ مجھے خود سے لپٹا کر خود بھی رو پڑیں۔

''ارے کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔'' ماما نے اسی وقت آ کر امی کو ٹوکا تھا۔ ''آپا! اسے چپ کرانے کے بجائے آپ خود رو رہی ہیں۔''

''میرے بھائی! واقعہ کوئی چھوٹا موٹا تو نہیں ہوا ہے۔ بارات نہ آئے یا بارات آ کر لوٹ جائے۔ دونوں صورتوں میں یکساں نقصان ہے۔'' امی آنسو پونچھتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''قمر! بارات آتی اور پھر...... نقصان کا باعث بنتی تو کیا ہوتا؟'' نانی کہہ رہی

''ہاں۔ آپا شکر کریں۔ ایک بڑی مشکل ہمارے سر پر سے ٹلی ہے۔ شکر کریں الماس کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ رخصتی ہو کر دیا ہوتا جیسا وہ لڑکا لکھ رہا تھا تو [illegible] ہم۔'' مہر خالہ نے کہا تھا۔

''مہر ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس لڑکے نے خاصی بچت کروائی ہے ہماری۔ ورنہ [illegible] اس کے ارادوں کی مضبوطی کا پتا دے رہی تھی۔'' نانا کہہ رہے تھے۔

''الماس! اب تم تو رونا بند کرو۔'' ماما نے میرے پاس آ کر کہا تھا۔ ''ایک [illegible] دنیا ختم تو نہیں ہو گئی۔''

میں نے ماما کے کہنے پر بے اختیار ان کو دیکھا تھا۔ رونے کی وجہ تو کوئی اور ہی تھی۔ سب لوگ کیا سمجھ رہے تھے۔ مجھے بے اختیار حیا سی آئی۔ نہ صرف ماما سے بلکہ باقی سب سے بھی...... میں نے تیزی سے آنسو پونچھ لیے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

''تمہیں یقین ہے ناں کہ کچھ نہیں ہوا۔'' ماما نے تصدیق کرنے والے لہجے میں پوچھا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ ''آپ لوگ فکر مت کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

میں نے بہت بار کہہ کر سب کو بڑی مشکلوں سے یقین دلایا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ کس کو کتنا یقین آیا تھا۔ بہرحال وہ لوگ مجھے سو جانے کی تلقین کرتے ہوئے چلے گئے تھے۔ نیند مگر اب کہاں آتی مجھے۔ البتہ ان سب کے جانے کے بعد شدتوں سے رونا ضرور آیا تھا۔ میں بہت خاموشی سے اٹھ گئی اور اب کی بار وضو کے لیے جاتے ہوئے میرے قدم لرز رہے تھے۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے مجھے ابو کا سوال یاد آ رہا تھا اور بہت بے بسی سے نہایت بے یقینی سے اب کی بار میں نے سوچا تھا۔

ایسا بھی ہوتا ہے کسی کے ساتھ...... ایسا بھی ہوتا ہوگا کسی کے ساتھ......

ایسا بھی ہوسکتا ہے کسی کے ساتھ......

کیوں نہیں، میرے ساتھ ہو رہا تھا۔

میرے آنسو بے آواز گرنے لگے تھے۔

اس ایک رات کے بعد یہ دوسری رات تھی جو بے حد بھاری تھی مجھ پر۔

پھر اس رات میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف صدق دل سے رونا، گڑگڑانا، رقت، عاجزی......

کون سی ایسی دعا تھی جو میں نے کبھی یاد کی تھی اور جو میں نے نہیں کی تھی

کون سی کیفیت تھی۔ جو مجھ پر طاری نہیں تھی۔ لاچاری، بے بسی، دکھ، اذیت، تکلیف، پریشانی...... اور میں ان کیفیات کے مارے تڑپ رہی تھی۔ ترس رہی تھی، مر رہی تھی۔

صبح ہونے کے قریب بالآخر مجھے تھوڑا سکون ملا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد

سکون سے یونیورسٹی جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

کل کے واقعے کے اثرات ابھی تک گھر میں سے زائل نہیں ہوئے تھے۔ وہ اتنی جلدی زائل ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اگرچہ میرے گھر والے بہت شکر کر رہے تھے کہ نکاح ہوا نہیں تھا مگر ماتمی فضا برقرار تھی۔ میرے گھر والوں نے ایک لمحے کو بڑی حیرت سے مجھے تیار ہوتا دیکھا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی اشارے ہوئے تھے۔ امی نے جلدی جلدی ناشتہ بنا کر مجھے دیا تھا اور یونیورسٹی کے لیے [illegible] ہوئے میں نے باقی ہر خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

ان دنوں میرا بی ایس سی آنرز کا سیکنڈ سمسٹر چل رہا تھا اور اس شادی کے چکر میں میرا خواہ مخواہ پہلے ہی اتنے دن کا نقصان ہوگیا تھا۔ اب میں نہیں چاہتی تھی کہ مزید نقصان ہو۔

ایک بار پھر یونیورسٹی نے مجھے خاصا مصروف کر دیا تھا۔ اپنی فکر تو پہلے بھی نہیں تھی مجھے اب تو اور بھی میں نے اپنی فکر کرنی چھوڑ دی تھی اور جب ماما کے یہاں بیٹا ہوا تو میں تقریباً یہ واقعہ بھول ہی گئی تھی۔ میری خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس [illegible]ے عرصے بعد میں سمیر کو گود میں لے کر کھل کھلا کر ہنسی تھی۔ اس کے بعد تو گویا میرے ہاتھ گڈا آ گیا تھا۔ سمیر لگتا بھی گڈا سا تھا۔ بالکل ماما پر گیا تھا۔ ایک دم کھڑی [illegible] چوڑی پیشانی، لمبی پلکوں اور ملی ہوئی بھنوؤں والا خوش نصیب بچہ۔ میرا فرسٹ [illegible]...... میں اس کے آ جانے سے خاصی بہل گئی تھی۔

یونیورسٹی سے آ کر میرا کام صرف سمیر کو گود میں لیے لیے پھرنا ہوتا تھا۔ سمیر [illegible] سارے کام کرنا ہوتا تھا۔ اس وقت میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ نانا کے گھر سے کہیں جاؤں۔ نانی مجھے اتنا دیوانہ دیکھتیں تو کہتیں۔

''تمہارا ماما بھی اتنا ہی پاگل تھا تمہارے لیے۔''

ایک دن جب یہ جملہ نانی نے ماما کے سامنے کہا تھا تو ماما کو میں نے چوری [illegible] دیکھا تھا۔ ماما کے ہونٹوں پر بڑی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ مجھے سمیر کو گود میں [illegible] دیکھ کر بھی مسکرائے ہی جاتے تھے۔

جتنا میں سمیر سے Attached تھی۔ ماما کو یہ Attachment اسی قدر [illegible] لگی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ [illegible] پسند نہیں کرتی ہیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ کیوں لیکن اس دن مجھے پتا چل

گیا تھا۔ اس دن جس بدتمیزی سے انہوں نے سمیر کو مجھ سے لیا تھا تو مجھے بے اختیار رونا آ گیا تھا۔ اس سے بھی کہیں زیادہ دل میں چھرا گھونپ دینے والے ان کے الفاظ تھے۔ میں نے ماما کو آنسو بھری نگاہوں سے دیکھا تھا اور ایک آدھ آنسو شاید گال پر بھی پھسل گیا تھا اور ماما نے اسی وقت مامی کو نہ صرف اچھی طرح سے ڈانٹ دیا تھا بلکہ سمیر کو مجھے واپس بھی لاکر دے دیا تھا۔ اس کے بعد بھی ماما نے مامی کو اور بھی بہت کچھ کہا ہوگا۔

ماما میری بہت پروا کرتے تھے۔ خاص طور سے اس واقعے کے بعد سے تو وہ میرا اور بھی خیال رکھنے لگے تھے۔ اس کے بعد مامی کا رویہ ٹھیک تو ہوگیا تھا مگر اس دن ان کو کسی سے فون پر اپنے متعلق گفتگو کرتا سن کر حقیقت کا اندازہ ہوگیا مجھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''قسم سے وہ لڑکی زہر لگتی ہے مجھے۔ پوری فسادن ہے۔ اسی کی وجہ سے ان سے کئی بار جھگڑا بھی ہوا ہے میرا۔ اسی کی وجہ سے انہوں نے کئی بار مجھے ڈانٹا بھی ہے۔ اس دن تو حد ہوگئی۔ کہنے لگے۔ میں تم پر ہاتھ بھی اٹھا سکتا ہوں۔ انہیں وہ سمیر سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ بلکہ سمیر کیا' کسی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔''

میں تو مامی کے یہ الفاظ سن کر ہی شاک میں آ گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مامی اپنے دل میں میرے لیے اتنی نفرت رکھتی ہیں۔ میرے قدم جیسے منوں وزنی ہوگئے تھے۔ مجھ سے اس جگہ سے ہلا نہیں جاسکا۔ مامی کہہ رہی تھیں۔

''اف۔ میں تم کو کیا بتاؤں۔ وہ کس قدر منحوس ہے۔ خود کا تو گھر بس نہیں سکا میرے بچے کے پیچھے وہ ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔ ہاں۔ جس شخص سے اس کی شادی ہو رہی تھی وہ اسی رات اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔'' مامی کے لہجے میں تمسخر تھا۔

اف...... اور میرا دل جیسے کسی نے چھید ڈالا تھا۔ مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہوگیا۔ بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی الٹے قدموں میں وہاں سے واپس ہوئی تھی۔ صدمے کے مارے آنسو بھی خشک ہوگئے تھے میرے۔

اس کے بعد میں نے نانا کے گھر جانا بالکل بند کر دیا۔ اب وہ صرف نانا کا گھر نہیں رہ گیا تھا۔ مامی کا بھی تھا اور مامی کے اپنے متعلق خیالات جان کر مجھ کو رو لگا تھا۔ یہ جان لینے کے بعد نہ میرا مامی کو دیکھنے کو دل چاہتا تھا نہ ان سے

کرنے کا۔ صاف سی بات تھی۔ میں ان کی طرح منافقت کر نہیں سکتی تھی کہ دل میں تو بغض ہو اور سامنے...... ! پھر جہاں تک سمیر کا تعلق تھا۔ اس کے آنے سے پہلے تک بھی تو میں زندہ ہی تھی۔ اب کوئی قیامت تو نہیں آ گئی تھی اور جہاں اور باتوں پر میں نے صبر کیا تھا۔ ایک اس پر بھی سہی۔

پھر ایک دن گزرا۔ دو دن گزرے۔ میں بے چین تو تھی اسے دیکھنے کو۔ گود میں لے کر پیار کرنے کو مگر میں نانا کے گھر بالکل نہیں گئی۔ پھر تیسرے دن ماما خود سمیر کو لے آن موجود ہوئے۔

''تم اتنے دنوں سے آئی نہیں۔ میں نے سوچا سمیر کو خود تم سے ملا لاؤں۔'' ماما نے سمیر کو میری گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت مس کرتا ہے تم کو۔''

میں چپ چاپ سمیر کو گود میں لیے اس سے کھیلتی رہی۔

''تم کیوں نہیں آئیں گھر؟'' ماما مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ پھر خود ہی اپنی بات کا جواب دے دیا۔ ''کیا منیرہ کی وجہ سے؟'' میں نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ''منیرہ اب تو بالکل ٹھیک ہوگئی ہے تم نے دیکھ بھی لیا ہے۔'' ماما نے فوراً کہا۔

میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں چاہتی تو ان کو بتا سکتی تھی کہ میرے متعلق ان کے کیا خیالات تھے...... مگر میں نے ان کا پردہ رکھ لیا تھا۔ میں ماما کو جانتی تھی۔ اگر انہیں مامی کے اس طرح کے کہے ہوئے دو لفظ بھی پتا چل جاتے تو وہ مامی سے میرے لیے لڑتے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں مامی کے کہنے کے مطابق واقعی صحیح طرح کی فسادن ہوں۔ میری وجہ سے دونوں کے درمیان جھگڑے ہوں مامی کی نفرت میں اضافہ ہوجائے اور دونوں کے درمیان رنجشیں بڑھیں۔ ٹھیک ہے میرا گھر اگر بس نہیں سکا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ میری وجہ سے مامی کا گھر اجڑ جائے۔ البتہ مجھے اکثر افسوس ہوتا تھا کہ ماما کے ساتھ زیادتی ہوگئی ہے۔ منیرہ مامی کسی لحاظ سے ماما کے ساتھ جچتی نہیں تھیں۔ میں اکثر سوچتی کہ ماما کے ساتھ تو کسی ایسی کو ہونا چاہیے تھا جو انہی کے جیسی ہوتی۔ اچھی...... بلکہ بہت اچھی......

مگر یہ عجیب ہی قسمت ہوتی ہے۔ اچھے مردوں کو اچھی بیویاں نصیب نہیں ہوتیں اور اچھی بیویوں کو ڈھنگ کے شوہر نصیب نہیں ہوتے۔ ماما اور منیرہ مامی ایسی

ہی ایک سامنے کی مثال تھے۔ میں ماما کو دیکھے جا رہی تھی اور سوچے جا رہی تھی۔

''ماما آپ کے ساتھ زیادتی ہوگئی۔'' ایک دم بالکل اچانک میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

ماما نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں! میں بھی یہی سوچتا ہوں اکثر۔'' پھر شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ ''اسی لیے تو تم سے کہا تھا کہ ڈھونڈ دو کوئی۔ تم نے کوشش ہی نہیں کی...... اب تو گزارہ کرنا پڑے گا مجھے...... صبر کے سوا اب تو کوئی چارہ نہیں ہے...... جو اللہ کی مرضی۔ کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مگر خیر تم بے فکر رہو۔ منیرہ اب تم کو کچھ نہیں کہے گی۔'' ماما نے یقین دلانے والے لہجے میں کہا تھا۔

میں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ حقیقت تو میں جانتی ہی تھی۔

پھر ماما کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا۔ مگر ان کے آنے میں کسی قسم کا وقفہ نہیں آیا تھا۔ اگر کبھی ماما خود کسی وجہ سے نہ بھی آپاتے تو سمیر کبھی نانا' کبھی نانی کے ساتھ ہمارے گھر آجاتا تھا۔ وہ مجھ سے خوش بھی بے حد رہتا تھا۔ وہ اب دو سال کا ہوگیا تھا اور میرا ماسٹرز مکمل ہوگیا تھا۔

ماسٹرز کرنے کے بعد جب میں نے ایم فل میں ایڈمیشن لینا چاہا تو امی نے پریشانی سے کہا۔ ''بس کرو...... اب الماس۔''

میں امی کے اس طرح کہنے پر خاموش سی ہوگئی۔ پھر چند لمحے بعد کہا۔ ''اچھا۔ جیسا آپ کہیں۔''

''اسے پڑھ لینے دو قمر۔'' ابو نے تھکے تھکے سے لہجے میں امی سے کہا تھا۔ ''منع مت کرو۔''

امی نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے ابو کو دیکھا مگر اس کے بعد انہوں نے مجھ سے اس طرح کی کوئی بات کبھی نہیں۔ میں نے اگرچہ ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ مگر میں جانتی تھی کہ اس طرح امی کی فکروں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ میں یہ محسوس کرکے کڑھ کر رہ جاتی تھی۔ امی کی نمازیں' سجدے' دعائیں...... طویل ہوتی جا رہی تھیں۔ وظیفے بڑھتے جا رہے تھے۔

ابو میری فکر کے مارے آدھے بھی نہیں رہ گئے تھے۔ میں نے جب بھی انہیں دیکھا۔ الجھا ہوا' پریشان اور فکروں میں ڈوبا ہوا ہی دیکھا۔ ابو کو ہر بار اس طرح دیکھ کر مجھے ان کا اس دن کا کہا ہوا سوال یاد آجاتا۔

میں شرمندگی' پشیمانی اور لاچاری جیسے احساسات میں گھر جاتی۔ نئے سرے سے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتی۔

اور فی الوقت تو میرے دائرہ اختیار میں اور کچھ تھا بھی نہیں۔

☆=======☆=======☆

اس دن اسے دیکھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

وہ الماس کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ گولڈن براؤن' کندھوں سے ذرا اونچے بال' بندھے ہوئے تھے۔ ویسے ہی ایک بالوں کی لٹ گال پر جھول رہی تھی جس کو اس نے ہاتھ سے کان کے پیچھے کیا تھا۔ ویسے ہی اس کے گالوں پر سرخ ہالے تھے اور فیئر کامپلیکشن پر جو بے حد نمایاں تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ارد گرد سے بے خبر...... بیٹھنے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ لمبی بھی ہے۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ کیا ہوگیا ہے میرے ساتھ! یہ بھی ہوسکتا ہے میرے ساتھ! بے یقینی سے چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد بے اختیار میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

''نہیں...... نہیں...... میں تم کو دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا۔''

میں ایک دم بہت زور سے چیخا تھا۔ پھر پلٹ کر بے تحاشہ بھاگا تھا۔ پیچھے سے آتے شخص سے میں بہت بری طرح ٹکرایا تھا اور اس کی طرف توجہ دیے بغیر' اس سے کوئی معذرت کیے بغیر میں بھاگتا چلا گیا تھا۔ بلال مرتضیٰ چیختا رہ گیا تھا۔ ''افنان...... کیا ہوا...... کیا ہوگیا...... افنان۔''

اور افنان کو کچھ ہوش نہ تھا۔ یونیورسٹی میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے میں کتنے ہی لوگوں سے ٹکرایا تھا۔ کتنے لوگوں کو گرا دیا تھا میں نے...... اور میں خود کتنی مرتبہ گرا کس کس چیز سے ٹھوکر لگی تھی مجھے...... مجھے کچھ خیال نہ تھا۔ میں تو بس جلد از جلد یونیورسٹی کی حدود سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ایسے جیسے اگر میں نے وہاں سے نکلنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی کی تو الماس کسی بھوت کی طرح چمٹ جائے گی مجھ سے......

یہ خیال اس قدر تکلیف دہ اور بے بس کر دینے والا تھا کہ مارے تکلیف کے میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر بھر کے آرہا تھا۔ اس پانی کے باعث میری نظر دھندلا رہی تھی۔ اپنی کسی کیفیت پر نہ مجھے قابو تھا نہ اختیار...... اس عالم میں بے تحاشہ بھاگتے ہوئے مجھے پچھلے ساڑھے آٹھ سال میں کیا اپنا ہر ہر عمل یاد آرہا تھا۔

میں بالکل بھی پکا مسلمان نہیں ہوں‘ میں اسلام کے متعلق زیادہ جانتا بھی نہیں ہوں۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر اتنا عمل پیرا بھی نہیں ہوں مگر ان کے فرامین پر میں جس حد تک عمل کر سکتا تھا‘ میں کرتا ہوں۔ میں ان کے اسی فرمان پر عمل کرتا تھا کہ ”دن میں کم از کم سو مرتبہ استغفار پڑھا کرو...... کیوں کہ میں بھی پڑھتا ہوں۔“ اور چونکہ انہوں نے حکم فرمایا تھا‘ اسی لیے میں بھی پڑھتا تھا۔ میں نے تو بہت استغفار پڑھی تھی۔ بلکہ میں نے تو سید الاستغفار بھی پڑھی تھی۔ پانچواں کلمہ استغفار اور چھٹا کلمہ رد کفر بھی پڑھا تھا۔ میں نے تو بہت توبہ بھی کی تھی۔ لاحول‘ تعوذ...... کیا کیا نہیں پڑھا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے تو کوئی کمی نہیں کی تھی۔

تو کیا کچھ بھی قبول نہیں کیا گیا تھا......

مجھے بڑے بھائی کی اپنے لیے ساڑھے آٹھ سال پہلے کی‘ کی ہوئی ہر دعا یاد آرہی تھی۔

”اللہ کرے‘ تم خوش رہو افنان!“ میں خوش کہاں تھا۔ میں تو مستقل رو رہا تھا۔ سسک رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔

”اللہ! تم کو خوب ساری عزت دے اور ذلت کبھی نہ دے۔“ عزت کہاں تھی اور ذلت کسے کہتے ہیں۔

”اللہ! تم کو خوب ساری عزت دے اور ذلت کبھی نہ دے۔“ عزت کہاں تھی اور ذلت کسے کہتے ہیں۔

”اللہ ہر مشکل‘ ہر آفت‘ ہر پریشانی سے تم کو دور رکھے۔“ ساڑھے آٹھ سال پہلے کی میرے اپنے ہی ہاتھوں لائی ہوئی یہ پریشانی‘ یہ آفت‘ یہ مشکل کسی طور مجھ پر سے ٹل نہیں رہی تھی۔

”اللہ کرے‘ تم جو دعا مانگو وہ قبول ہو۔“ کچھ قبول نہیں ہوا تھا۔ کوئی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔

وہ کچھ قبول کرتا بھی ہے؟ میں نے بڑے استعجاب سے سوچا تھا اور پہلی بار مجھے اللہ تعالیٰ کے وجود پر شک ہوا تھا۔ میری دہشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

اب میں محسوس کر سکتا تھا کہ آنکھوں میں آنے والے نمکین پانی سے میرے گال بھی گیلے ہونے لگے ہیں مگر مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ اندھا دھند سڑک پر بھاگنے کے نتیجے میں میں کتنی ہی بار حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی

کہ میں کسی گاڑی کے نیچے آ نہیں گیا تھا۔ مجھے بچانے کے چکر میں کتنی گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے تھے۔ کتنی گاڑی والوں نے بروقت بریکس لگائے تھے۔ کتنے گاڑی کے مالکان نے مجھے برا بھلا بھی کہا تھا مگر اس لمحے مجھے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا‘ نہ کچھ سجھائی دے رہا تھا۔ یہ بھی میری دوسری خوش قسمتی تھی کہ کوئی پولیس فورس میرے پیچھے نہیں لگ گئی تھی۔ میں اپنے آپ میں کب تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس جگہ پر کیسے پہنچا جہاں میں رہ رہا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کی بیرونی سیڑھیاں بہت دہشت کے عالم میں چڑھتے ہوئے کناروں پر بکھری پگھلتی برف سے میرا پیر بری طرح پھسلا اور میں لڑھکتا ہوا اوپر سے نیچے دھڑام سے آرہا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو میں یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا‘ پھر آہستہ سے اٹھ بیٹھا اور وہاں اس جگہ پر بیٹھے ہوئے مجھے کیا کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔

الماس کے ساتھ گزارے ہوئے چار ماہ اکیس دن......

وہ ایک منحوس سیاہ رات......

گھر والوں کی توجہ کو ترستے ہوئے سات دن......

زندہ لاش کی طرح ہسپتال کے بستر پر پڑے سترہ دن اور ابو کی بے توجہی کے ملا کر ... دن......

... ہر مر کے گزارے ہوئے پانچ ماہ سترہ دن......

محنتوں‘ ریاضتوں‘ کوششوں سے بھرپور ساڑھے آٹھ سال......

ابھی ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی ابو سے ہونے والی جگر‘ دل بلکہ روح تک کو زخمی کر دینے والی آخری گفتگو......

ابو کے روانگی کے وقت کے الفاظ......

موٹا موٹا حساب تھا سارا...... ہر ہر حساب میری انگلیوں پر تھا۔ مجھے کچھ بھولا نہیں ... اپنی کوئی تکلیف نہیں بھولی تھی۔ میں کچھ بھول بھی کیسے سکتا تھا۔ مارے اذیت ... ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ تکلیف کے علاوہ کون سا ایسا احساس تھا جو اس وقت مجھے نہیں ہو رہا تھا۔ بے یقینی‘ صدمہ‘ دکھ‘ بے بسی‘ اذیت۔ احساسِ گناہ‘ احساسِ شرمندگی‘ احساسِ ندامت‘ میں سسکیاں لینے لگا تھا اور خود پر کسی طور قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ آج اور ابھی ہر چوٹ نئے سرے سے مجھے تکلیف دے رہی تھی۔ ہر زخم ابھی ... تھا۔ ہر ٹانکا کچا تھا جو آج اور ابھی کھل گیا تھا۔ خون رسنے لگا تھا۔

میری سسکیاں تیز ہو گئی تھیں اور اب میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آتے جاتے

لوگ گزرتے ہیں تو گزرا کریں۔ دیکھتے ہیں تو دیکھا کریں۔ مجھے پروا نہیں تھی۔ پھر جیسے یکا یک مجھے ایک خیال آیا تھا اور اسی خیال کے ساتھ میری سسکیاں تھم سی گئی تھیں۔ آنسو آنکھوں میں جم گئے تھے۔ ایک دم فیصلہ ہو گیا تھا۔

نہیں، نہیں، میں ادھر نہیں رہوں گا۔ میں نے بہت وحشت کے عالم میں سوچا تھا۔ میں واپس پاکستان چلا جاؤں گا۔ ایم ایس بھاڑ میں جائے۔ میں ایم ایس نہیں بھی کروں گا تو کوئی مجھ سے کسی قسم کی بازپرس نہیں کرے گا۔ میرے گھر والے مجھے گھر سے نکال نہیں دیں گے۔ میں نے بی ای تو کر رکھا ہے۔ میں بے روزگار بھی نہیں ہوں۔ وہاں گورنمنٹ جاب ہے میری۔ میں اسے جا کر دوبارہ جوائن کرلوں گا۔ میں بس ادھر نہیں رہوں گا۔ میں الماس کو اپنے سامنے برداشت نہیں کرسکتا۔ الماس کو دیکھ کر خون جلے گا میرا۔ اسے دیکھ کر کچھ بھولے گا نہیں مجھے۔ ویسے ہی مجھے کچھ بھولا نہیں ہے۔ پہلے اگر مجھے سب کچھ ہر رات یاد آتا تھا تو اب چوبیس گھنٹے یاد آیا کرے گا۔ سب طرح کے احساسات میری جان نہیں چھوڑیں گے۔ ان احساسات کو لیے میں مرا نہیں بھی تو میں پاگل ضرور ہو جاؤں گا۔ میں پاگل نہیں ہونا چاہتا۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا تھا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ آج ہی پہلی فلائٹ سے سیٹ بک کروا[ؤں] ہوں، میں اب کسی طور یہاں نہیں رکتا۔

یہ فیصلہ کرتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اگرچہ مجھے لگا تھا کہ [ٹانگ] میں کچھ چوٹ آئی ہے۔ بائیں کندھے میں بھی تکلیف ہے اور سر بھی دُکھ رہا ہے مگر اس لمحے مجھے ذرہ برابر بھی اپنی کسی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ اپنی چوٹوں پر، اپنی حالت پر میرا دھیان تھا ہی نہیں اور سچ بات ہے، تکلیف جب ذہنی ہو تو جسمانی تکلیف بھلا کیا معنی رکھتی ہے۔ ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسی عالم میں، میں چلتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔ اندر پہنچ کر دروازہ بھی لاک کیے بغیر میں جلدی جلدی پیکنگ کرتا رہا۔ ایسے جیسے اگر کچھ منٹوں کی بھی میں نے دیر کردی تو کراچی جانے والی یہ فلائٹ مس ہو جائے گی۔ پاگلوں کی طرح سے اپنا سامان اٹیچی کیس میں ٹھونسنے کے دوران مجھے بارہا ابو یاد آئے تھے۔ مختلف پچھتاوے مجھے گرفت میں لیتے رہے تھے۔ ابو کی بات میں نے مان ہی لی ہوتی کاش...... ابو روانگی کے وقت مجھے روک ہی لیتے۔ مجھے بڑے بھائی پر بھی آج زندگی میں پہلی مرتبہ غصہ آ رہا تھا۔ مجھے آخر کیا ضرورت پڑی تھی ان کی بات ماننے کی۔ ایم ایس کرنا ضروری تو نہیں تھا۔

میں ادھر آ ہی کیوں گیا تھا آخر؟

مختلف سوچیں میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ انہی سوچوں کے درمیان میں نے اپنی پیکنگ مکمل کی تھی۔ پھر سارے ڈاکیومنٹس رکھنے کے بعد جب پاسپورٹ نکالنے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کی سب سے اوپر والی دراز کھولی تو پاسپورٹ وہاں نہیں تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی صبح ہی تو میں نے یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ سے ادھر ہی رکھا تھا۔ اب وہ کہاں چلا گیا؟ میں نے وحشت کے عالم میں سوچا تھا اور اسی عالم میں ہر دراز دیکھ ڈالی۔ پورا اپارٹمنٹ چھان مارا۔ مجھے پاسپورٹ مل کر نہ دیا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی سب سے نچلی والی دراز کو کئی بار دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنا سامان کھول ڈالا بلکہ یوں کہنا چاہیے، بالکل ادھیڑ ڈالا۔ پاسپورٹ کا کہیں نشان نہیں تھا۔ مجھے رونا آنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردوں۔ میں نہایت صدمے کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ اب پاسپورٹ ایسی چیز تو نہیں ہے جسے میں جیب میں لیے گھومتے پھرتا۔ میں اسے کبھی بھی باہر لے کر نہیں گیا اور ایک ملک میں پاسپورٹ غائب ہونے کا مطلب تھا، آپ کی کوئی Identity ہی نہیں۔ آپ کی امیگریشن مشکوک ہے۔ یہ سوچ کر ہی میرا دم حلق میں آ گیا۔

الماس کی مشکل ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اب مجھے نئی فکر، نئی پریشانی، نیا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ مجھ پر ذہنی، جسمانی، ہر قسم کی تھکن طاری ہو گئی اور اب تمام ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ مجھے اپنے پیروں پر زیادہ دیر کھڑا رہنا مشکل لگنے لگا تھا۔ اب اپنی چوٹوں کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ میرے بائیں کندھے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور مجھے اب اپنا جسم بھی گرم ہوتا لگ رہا تھا۔

شام تک مجھے بخار چڑھ چکا تھا۔ بہت تیز بخار...... ! بخار کی شدت سے میں نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا اور اس عالم میں بھی میں محسوس کرسکتا تھا کہ دائیں پیر کے ٹخنے سے اٹھنے والی ٹیسیں ناقابل برداشت ہیں۔ کندھے کی تکلیف شدید ہے۔ سر کا پچھلا حصہ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔

اس پورے عرصے میں بھی الماس کے بھوت آ آ کر مجھے ڈراتے رہے تھے۔ تکلیف کے مارے میں کراہتا تو رہا ہی تھا، شاید خوف کے مارے میں چیختا چلاتا بھی رہا تھا۔ مجھے نہیں پتا یہ کیفیت مجھ پر کب تک طاری رہی البتہ نیم غنودگی کے عالم میں،

میں نے ڈور بیل بجتی ضرور سنی تھی اور اس کے متواتر بجتے چلے جانے پر میں نے اٹھنے کی بڑی کوشش کی بھی تھی مگر اس کوشش میں بائیں کندھے سے اٹھنے والی ٹیسوں کے نتیجے میں میری بے اختیار چیخ نکل گئی تھی۔ میں بے جان سا ہو کر بستر پر گر سا گیا تھا۔

''افنان' کیا ہوا؟'' اسی سوتے جاگتے سے عالم میں' میں نے ایک جانی پہچانی سی آواز سنی تھی مگر مجھے سمجھ میں نہیں آسکا' یہ آواز کس کی تھی؟ مجھ سے آنکھیں کھول کر آواز کی سمت دیکھا بھی نہیں گیا۔

''افنان' تم ٹھیک تو ہو؟''

اس بار میں نے کسی کو اپنے اوپر جھکتا ہوا محسوس کیا تھا اور بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ میں نے سامنے والے کی شکل دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ دھندلا سا خاکہ مجھ کو نظر آیا بھی تھا مگر میں ہنوز اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد تو ذہن جیسے مکمل طور سے تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے کسی بات کا ہوش رہ ہی نہیں گیا تھا۔

☆=======☆=======☆

پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بستر پر ہی پایا تھا۔ پہلے کی نسبت میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا تھا۔ میرا سر اب بالکل دکھ نہیں رہا تھا۔ splint میں جکڑے بائیں ہاتھ کو میں نے بڑے استعجاب سے سینے پر رکھا دیکھا تھا اور دائیں ٹخنے پر بھی کچھ لپٹا محسوس کیا تھا۔ یقیناً پٹیاں ہی ہوں گی۔

''اوہ' شکر ہے' تم نے آنکھیں تو کھولیں افنان!'' میں نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا تو بلال مرتضیٰ کو سامنے پایا۔ میں نے اسے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''اب تم ٹھیک ہو؟'' اس نے سوال کیا تھا۔

''ہاں' کیوں' کیا ہو گیا تھا؟'' میں نے قدرے حیرت سے پوچھا تھا۔

''وہی تو میں تم سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ کیا ہو گیا تھا؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں' بس تھوڑی چوٹ آئی تھی مجھے۔ پھر بخار ہو گیا تھا۔ شاید بے ہوش بھی ہو گیا تھا۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

''شاید نہیں۔ تم بالکل بے ہوش تھے۔'' بلال مرتضیٰ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''اور آج سات دن بعد تم کو ہوش آیا ہے۔'' اس کے بتانے پر میں پیچھے گرتے

گرتے بچا تھا۔

''سات دن بعد......!'' میں نے خاصی بے یقینی سے دہرایا تھا۔

''ہاں' اس دن جب تم یونیورسٹی سے چلے آئے تھے تو میں تمہاری فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر تم اگلے دن بھی یونیورسٹی نہیں آئے تو میری تشویش حقیقتاً بڑھ گئی لہٰذا شام کو میں یہاں پہنچا تھا۔ پہلے تو میں خاصی دیر تک کھڑا بیل بجاتا رہا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر میں یہ سمجھا کہ تم یہاں موجود نہیں ہو۔ میں بس آخری کوشش کے طور پر بیل بجا کر جانے ہی والا تھا کہ میں نے تمہاری چیخ سنی تھی۔ پھر غیر ارادی طور سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ خوش قسمتی سے لاک نہیں تھا۔ اندر تم جس حالت میں پڑے تھے' اس نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ پھر میں نے پھر فون کر کے ایمبولنس بلوائی۔ تم کو ہسپتال لے کر گیا۔ تفصیلی چیک اپ کروانے پر ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہارا لیفٹ شولڈر اور رائٹ ٹخنہ effected ہوئے ہیں۔ تم کہیں گر گئے تھے کیا؟''

وہ اب مجھ سے پوچھ رہا تھا اور میں تو اس شاک سے ابھی تک نہیں نکل پایا تھا کہ میں ہفتے بھر تک بے ہوش رہا تھا۔ وہ مجھے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں......!'' بالآخر میں نے کچھ دیر کے بعد آہستگی سے بتایا تھا۔ ''سیڑھیوں پر سے میرا پیر پھسل گیا تھا۔''

''ہاں......! اس کا تو مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا۔'' بلال مرتضیٰ نے آرام سے کندھے اچکا کر کہا تھا۔ ''تم اس دن جس طرح سے بھاگ رہے تھے' مجھے لگ رہا تھا' ایسا ہی کچھ ہوگا۔ خیر' ڈاکٹر کے مطابق سر میں تو کوئی میجر انجری نہیں تھی۔ تھوڑی bleeding ہوئی تھی مگر خون جم گیا تھا۔ شکر ہے' کوئی فریکچر نہیں ہوا البتہ شولڈر اور ٹخنے کی حالت نازک تھی۔ یہاں بھی الحمدللہ! کوئی فریکچر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے ٹریٹمنٹ تو شروع کر دیا تھا۔ تمہاری بے ہوشی بخار کی وجہ سے تھی۔'' بلال مرتضیٰ تفصیلات بتا رہا تھا اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ ''اور ایک بات بتاؤ' تمہارے گھر میں سب خیر تو ہے؟ کوئی مسئلہ تو نہیں چل رہا؟'' بلال مرتضیٰ نے اچانک ہی پوچھا تھا۔

میں نے ٹھٹکا کر اسے دیکھا تھا۔ فوری طور سے مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔ بلال مرتضیٰ منتظر نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم...... تم...... کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا

''بے ہوشی کے دوران تم کو میں نے مستقل بڑبڑاتے ہوئے سنا تھا کہ اللہ! اب دوبارہ نہیں...... کیا دوبارہ نہیں؟''

میں اس کے اس سوال پر کچھ دیر کے لیے تو کچھ کہہ نہ سکا۔

''اور یہ پاسپورٹ کا کیا قصہ تھا؟'' وہ اب دوسرا سوال کر رہا تھا۔ ''بے ہوشی کے دوران تم دو ہی باتوں کو بار بار دہرا رہے تھے۔ پاسپورٹ کو کیا ہو گیا تمہارے؟''

''میرا پاسپورٹ کھو گیا ہے۔'' اب کی بار بہت دھیمے لہجے میں میں نے اسے بتایا۔

''کیا......؟ پاسپورٹ کھو گیا؟'' اس نے بہت حیرت سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ملا نہیں پھر؟''

''کہاں ملا۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

''گر گیا ہے کہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے آہستگی سے بتایا۔

''اچھا چلو پریشان مت ہو۔ اس کو بھی دیکھ لیں گے۔'' بلال مرتضیٰ نے تسلی دینے والے انداز میں کہا پھر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں دو منٹ میں آیا۔'' میں نے اس کے کہنے پر سر ہلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھکن ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت میرے ذہن میں کسی قسم کا کوئی خیال نہیں تھا۔ کوئی احساس نہیں تھا۔ میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد میں نے بلال مرتضیٰ کی آواز سنی۔

''اب تم تھوڑی ہمت کر کے اٹھ جاؤ۔ کچھ کھا کر دوا لینی ہے تم کو۔'' میں نے آنکھیں کھول کر بلال کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کے لوازمات سے بھری ٹرے تھی۔ میں نے اب کی بار بہت ممنونیت سے اسے دیکھا تھا۔

''تم نے بہت تکلیف کی میرے لیے۔''

وہ ایک دم مسکرایا۔ ''نہیں! میں نے کچھ نہیں کیا تمہارے لیے۔ جو کچھ بھی ہوا ہے بہت اچانک اور اتفاقاً ہوا ہے ورنہ یہ بالکل ضروری نہیں تھا کہ دروازہ نہ کھلنے پر بھی میں اتنی دیر تک کھڑا گھنٹیاں بجاتا رہتا۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ پلٹ کر جاتے ہوئے تمہاری چیخ میں سن ہی لیتا۔ دروازہ لاک نہ ملنا بھی ایک اتفاق ہی تھا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ اس وقت ہم کراچی میں نہیں ہیں اور یہ واقعہ تمہارے ساتھ لندن میں پیش آیا ہے۔'' وہ اطمینان سے بتا رہا تھا۔ ''اور سب سے بڑا اتفاق تو یہ ہے کہ میں تمہاری طرف کے مارے ادھر چلا ہی آیا بلکہ یہ بات اس طرح کہنی زیادہ مناسب ہے کہ اس دن مجھے تمہارے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ فیصلہ کرنے والا تو اللہ ہے۔ وسیلہ وہ بندوں کو بناتا ہے۔ نہیں تو جانے کب تک تم اسی حالت میں رہتے۔''

اس کے کہنے پر میں نے بے حد چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''اور تم نے مجھے اپنا Present Address کب بتایا تھا۔ وہ تو میں نے تمہارے پرسنل یونیورسٹی کارڈ سے چھان کر نکالا ہے۔ اس کی بھی بہت لمبی اور الگ ہی کہانی ہے۔ سنانے بیٹھ گیا تو کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' اس نے شگفتگی سے کہا تھا پھر اس کر پوچھا تھا۔ ''اب اٹھنے میں مدد دوں کیا تم کو؟''

''نہیں! شکریہ......!''

کہتے ہوئے مجھے بے حد غیرت بھی آئی تھی اور اسی احساس نے نہ صرف مجھے اٹھا کر بٹھا دیا تھا بلکہ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا بھی ہوا تھا مگر دائیں پیر پر مجھ سے وزن دیا نہیں جا رہا تھا۔

''افوہ! ڈاکٹر نے رائٹ اینکل پر زور دینے سے منع کیا تھا۔ تم چلنے کی کوشش مت کرو۔'' بلال مرتضیٰ نے ایک دم ٹوکا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں بلال!'' میں نے دیوار کا سہارا لے کر چلتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

''اوہو! پھر سہارے کے لیے یہ لے لو۔'' بلال نے میری طرف Forearm crutch بڑھائی تھی۔

''نہیں بس! ایسے ہی ٹھیک ہے۔''

کہہ کر میں دیوار کا سہارا لیتا ہوا دائیں پیر پر وزن کم سے کم ڈالنے کی کوشش کرتا ہوا آہستہ آہستہ واش روم کی طرف چل پڑا۔ برش کرتے ہوئے آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر دھکا سا لگا تھا۔ میری صورت میرے لیے بھی اجنبی تھی۔ الجھے بے ترتیب بال 'ہفتہ بھر' بڑھی ہوئی شیو' سوجے ہوئے پپوٹے' اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں' آنکھوں کے گرد حلقے۔ میں ہفتے بھر کا نہیں بلکہ سال بھر کا بیمار لگ رہا تھا۔ لباس میلا اور شکن آلود تھا۔ میں لباس کے معاملے میں کبھی بے پروا نہیں رہا تھا بلکہ نہایت خبطی تھا۔ ان ہفتے بھر کے پہنے لباس سے مجھے نفرت سی ہونے لگی مگر ہاتھ ہلا جلا نہ سکنے کی وجہ سے فی الحال کپڑے بدلنا مشکل ہی تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح سے چلتا ہوا ادھر آ تو گیا تھا' اب واپس جانا مجھے ایک عذاب سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ مشکل اور بہت مرے ہوئے

طریقے سے چلتا ہوا میں بستر تک پہنچا تھا۔ بلال مرتضیٰ مجھے توصیفی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ویسے یار! یہ بات ماننے کی ہے کہ تمہاری ول پاور خاصی اسٹرانگ ہے۔"

میں نے اس کے اس کمنٹ پر کچھ کہا نہیں۔ آہستگی کے ساتھ اس کے لائے ہوئے سینڈوچز اور کافی حلق سے اتارنے کے بعد دوا کھائی۔ کچھ کھا لینے سے واقعی مجھ میں توانائی سی آ گئی تھی۔ بلال مرتضیٰ خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتا رہا تھا۔

"تم ناحق تکلیف کر رہے ہو بلال!" اس کے برتن سمیٹنے پر میں نے شرمندگی سے کہا تھا۔

"یہ تم بار بار مجھ سے مت کہو کہ میں تکلیف کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ "میں کچھ نہیں کر رہا۔" کہہ کر وہ کچن کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا جو خاصا صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی حالانکہ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ میں نے پاسپورٹ تلاش کرتے ہوئے کمرے میں موجود ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی۔

"یہ کمرہ......!" میں نے بلال مرتضیٰ کو واپس آتا دیکھ کر پوچھنا چاہا تھا۔

"ہاں، خاصا صاف ستھرا لگ رہا ہے ناں۔" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی خوشی خوشی پوچھا تھا۔ "اس دن میں تو پہلی مرتبہ اندر آنے پر تم کو دوسرے کمرے کو دیکھ کر چکرا سا گیا تھا۔ میں نے کہا، شاید یہاں کوئی جنگ ہوئی ہے۔" وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔ "معاف کرنا یار، میں بہت صاف طبیعت کا آدمی ہوں۔ بے قاعدگی، بدنظمی اور بے ترتیبی مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوتی لہٰذا اس دن تم کو ہاسپٹل سے لانے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا میں نے۔ اصل میں، میں ان سب چیزوں کا عادی ہوں۔ میں نے بہت Disciplined لائف گزاری ہے۔ میری آدھی زندگی کیڈٹ اسکول اور کالج میں گزری ہے۔"

"اور میری زندگی کیڈٹ اسکول کالج میں نہ گزرنے کے باوجود میں بھی بدقسمتی سے ایسا ہی آدمی ہوں کیونکہ...... میرا Brought up ایسا ہوا ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "تم کسی اور وقت یہاں آتے تو گھر کو اتنا صاف ستھرا پاتے کہ سوئی تک ڈھونڈ لیتے۔ ایک پاسپورٹ ڈھونڈنے کے چکر میں سب تلپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔"

"پاسپورٹ کیوں ڈھونڈ رہے تھے تم؟" اس نے سوال کیا۔

"میں واپس جانا چاہ رہا تھا۔" میں نے آہستگی کے ساتھ بتایا۔

"کہاں؟ پاکستان؟" اس نے استعجاب سے پوچھ کر خود ہی جواب دے دیا تھا۔

"ہاں......!" میں نے مختصراً بتایا۔

"ایم ایس کیے بغیر؟"

"ہاں......!"

"کیوں؟" اس کا اگلا سوال تھا۔

میں بےزار سا ہو گیا تھا۔ "اب بس بھی کرو یار! کتنے سوالات کرو گے؟"

وہ بےساختہ مسکرا دیا۔ "اچھا، نہیں کرتا سوال۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میرے خیال میں تم ٹھیک ٹھاک اور بالکل خیریت سے ہو تو میں اجازت چاہوں۔" میں اس کے کہنے پر بغیر کچھ کہے خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ "اپنے گھر کی شکل بھی ذرا جا کر دیکھ آؤں میں۔ کافی دن ہو گئے۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"اتنے دن سے تم مستقل یہاں ہو؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"...... تو اور بھلا میں تم کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر کیسے چلا جاتا؟" اس نے مجھ سے کہیں زیادہ استعجاب سے پوچھا تھا۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔ تم کو میری وجہ سے اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، یہ وقت تو کسی کے اوپر بھی پڑ سکتا ہے۔ میرے اوپر ایسا وقت آتا تو تم میرے لیے پریشانی اٹھا لیتا۔" بلال مرتضیٰ نے ہنس کر آرام سے کندھے اچکا [illegible]ھا اور میں لرز سا گیا تھا۔

"اللہ نہ کرے! اللہ کبھی نہ کرے جو تمہارے اوپر کبھی ایسا وقت پڑے!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

"تو تم ناحق شرمندہ ہو رہے ہو ناں۔ اب دیکھو، میں تم کو بتاؤں افنان، یہ شرمندگی، [illegible] پریشانی، زحمت، یہ سب غیریت والے الفاظ ہیں اور ہم غیر نہیں ہیں۔ ہمارے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔ ہمارے حوالے بہت معتبر ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ مسلمان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ ہم ایک ہی ملک سے ہیں۔ ہمارا شہر بھی ایک ہے۔ ہم کراچی کی زبردست انجینئرنگ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے بھی ہیں۔ گویا ہماری مادرِ علمی

بھی ایک ہی ہے اور اس وقت ہم ایک غیر ملک میں رہ رہے ہیں' پھر مجھے بتاؤ' ایک غیر ملک میں رہتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو سپورٹ نہیں کریں گے تو اور کس کو کریں گے۔"

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا اور میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم مسکرایا۔

"آل رائٹ' اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ دوائیں پابندی سے لینا۔ کل پرسوں تک بہتر محسوس کرو تو یونیورسٹی آجانا۔ نہیں تو میں آجاؤں گا یہاں۔" کہہ کر بلال مرتضیٰ چلا گیا۔

یونیورسٹی جانے کا خیال خاصا وحشت زدہ کر دینے والا' اور اذیت میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ وہاں الماس ہوگی اور میں اس کا سامنا کیسے کروں گا...... میں نے بڑی تکلیف کے عالم میں سوچا تھا۔ سات سمندر پار آ گیا تھا اور الماس کا بھوت بھی میرے پیچھے آ گیا تھا۔

مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ الماس ہو...... ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ الماس "نہ" ہو۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے' لیکن بس اچانک یہ سوچ میرے ذہن میں آ گئی تھی۔ میری آنکھوں کو یقیناً دھوکا ہوا ہوگا...... میں نے خاصی خوش فہمی سے سوچا تھا اور خود کو تسلی دینے کی کوشش کے طور پر جلدی جلدی انگلیوں پر حساب لگانا شروع کیا۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت الماس آٹھویں کلاس میں تھی جس وقت میں میٹرک میں تھا۔ میرے حساب سے الماس مجھ سے دو تین سال تو چھوٹی ہوگی ہی۔ پھر اب ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ میرے برابر آ جاتی اور اسی کلاس میں ہوتی جس میں' میں ہوں۔ میرے حساب سے تو ابھی اسے سیکنڈ یا تھرڈ ایئر میں ہونا چاہیے تھا۔ ماسٹرز میں تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر بالفرض وہ ماسٹرز میں تھی بھی تو کیا یہ ضروری تھا کہ انجینئرنگ ہی اس کا سبجیکٹ ہوتا؟ اگر تھا بھی تو وہ میری یونیورسٹی میں' میری جونیئر تو نہیں تھی...... اگر ہوتی تو ایک ہی یونیورسٹی میں ہوتے ہوئے یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ اس سے سامنا نہ ہوتا؟ اور اگر انجینئرنگ اس نے کہیں اور سے کی بھی تھی تو کیا یہ ضروری تھا کہ وہ اسی یونیورسٹی سے ماسٹرز کرتی جس سے میں کرنے آیا تھا؟ سات سمندر پار کی یونیورسٹی سے......!

یہ پہلی ہی possibility ایسی تھی کہ اس کے نفی ہو جانے کے بعد باقی ہر possibility پر سوچنا بے کار تھا۔ اس سوچ نے مجھے خاصی تسلی دی تھی۔ میں تھوڑا پُرسکون ہو گیا تھا۔ اسی سکون کے مارے پھر میں سو بھی گیا تھا۔

اگلے دو دن میں نے مزید گھر پر گزارے تھے اور اس دوران میں نے اپنی ہر ممکن کوشش کر کے الماس اور اس سے وابستہ کسی سوچ کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا

اور ایسا کرنا کتنا مشکل کام تھا' یہ میں ہی جانتا تھا۔

پھر اس دن بلال مرتضیٰ مجھ سے ملنے آیا تھا۔

"افنان' اس دن تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔" اندر گھستے ہی اس نے توصیفی نظروں سے میرے اپارٹمنٹ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے کیا کہا تھا؟" میں نے کافی اور سینڈوچز اس کے سامنے رکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہاری بیوی کو کم از کم صفائی کے معاملے میں تم سے شکایت نہیں ہوگی۔ تم اس کے لیے بہت Co-operative شوہر ہو گے۔"

"شکایت پیدا ہونے کا تو تب سوال پیدا ہوگا ناں' جب بیوی ہوگی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا تھا۔

"تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی تک؟" اس نے سوال کیا تھا۔

"نہیں......!" میں نے اطمینان سے کہا' پھر اس سے پوچھا۔ "تمہاری ہو گئی؟"

"ہوئی تو نہیں' ہونے ضرور جا رہی تھی۔" اس نے کافی کا گھونٹ لے کر بے پروائی سے بتایا۔

"ہیں...... اس کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

"مطلب صاف اور سیدھا سا ہے۔ میرے گھر والے جس لڑکی سے میری شادی کرنا چاہ رہے تھے' میں اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں تھا اور میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا' میرے گھر والے اس سے میری شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔" اس نے آرام سے بتایا۔

"تمہارے گھر والوں کو تمہاری پسند سے شادی کرنے پر کیا اعتراض تھا؟"

"میرے گھر والوں کو نہیں' زیادہ میری ممی کو اعتراض تھا۔" اس نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔ "رقیہ اور میں میٹرک سے کلاس فیلوز تھے۔ انجینئرنگ کالج سے ہم نے ساتھ پڑھا اور اس سارے عرصے میں' میں نے محسوس کیا کہ اس کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کیا۔ میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا بلکہ اس سے وعدہ بھی کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے گھر والے میری پسند کو رد نہیں کریں گے کیونکہ میرے بڑے بھائی نے بھی اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ اس وقت بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا' میری دفعہ بھی کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں انجینئرنگ کالج

سے پاس آؤٹ کرنے کے بعد انگلینڈ چلا آیا۔ رقیہ بھی جاب کرنے لگی۔ ایک سال بعد واپس آ کر میں نے بھی اسی جگہ جاب کی جہاں وہ کر رہی تھی۔ پھر جب میں نے اپنے گھر والوں کے سامنے اپنی مرضی رکھی اور ان کو اپنی پسند بتائی تو ممی کو سب سے بڑا اعتراض اس کے جاب کرنے پر تھا۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا بھی کہ وہ شادی کے بعد جاب نہیں کرے گی۔ ممی نے ہر بار جاب کرنے والی لڑکیوں میں پائی جانے والی خامیوں کی لمبی لسٹ مجھے تھما دی۔ میں نے ان سے بہت کہا اچھا آپ ایک بار اس سے مل تو لیں۔ ممی طوعاً کرہاً مانی تھیں اور پہلی مرتبہ ہی اسے دیکھ کر انہوں نے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ میں پوچھتا ہی رہ گیا کہ آخر اس میں کیا برائی ہے؟ مجھے کچھ بتائیں تو؟ ممی نے صرف ایک جملہ کہا۔ ''بس مجھے پسند نہیں آئی وہ۔''

وہ بہت تلخی سے بتا رہا تھا۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا۔

''اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ممی کو اس شادی کے لیے کیسے راضی کروں؟ انہی دنوں ممی کو اپنی ایک دوست کی بیٹی پسند آ گئی۔ دوست سے ملنے کا واقعہ بھی بڑا اتفاقیہ اور اچانک ہی تھا۔ ممی کی ان سے ملاقات شاپنگ کے دوران ہوئی۔ ممی کو ان کی بیٹی اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے میری اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخ تک طے کر دی۔ میں نے ممی کو اسی وقت بالکل صاف منع کر دیا تھا کہ میں اس بات کے لیے بالکل راضی نہیں ہوں۔ ممی نے میری کسی بات کو اہمیت نہیں دی۔ میں ان دنوں بہت غصے میں تھا اور پریشان بھی۔ غصہ مجھے اس بات پر تھا کہ آخر ہلال نے بھی تو اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ اس پر تو ممی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سارے اعتراضات مجھ پر کیوں تھے اور پریشانی کے مارے میں نے رقیہ کے پیرنٹس سے کہا کہ آپ اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دیں۔ انہوں نے کہا۔ ہماری بیٹی کا نکاح ہوگا تو ایک دنیا کے سامنے ہوگا۔ چند لوگوں کے سامنے نہیں۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب آپ کے پیرنٹس راضی ہو جائیں۔ وہ بھی ٹھیک کہہ رہے تھے کہ ہماری بیٹی کو سامنے کے دروازے سے لے جاؤ' چور دروازے سے نہیں..... اور افنان' میرے لیے تو سارے دروازے بند ہو چکے تھے۔ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں اور میں رقیہ سے کہہ رہا تھا۔ ''ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے پیچھے میری دو بہنیں بھی ہیں۔''

وہ بھی غلط نہیں کہہ رہی تھی اور ان دنوں مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا

ہوتا ہے اور کیا غلط...... انہی دنوں ایک بار پھر میرا انگلینڈ جانے کا سلسلہ ہو گیا۔ میں نے گھر والوں کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی اور میں نے ایسا کر کے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔

''میں نے آخری مرتبہ ممی سے اپنی اور رقیہ کی شادی کی بات کی اور ممی نے دوٹوک انداز میں انکار کر دیا۔ اس پر مجھے بھی ضد ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ایسا ہے تو ایسا سہی۔''

ممی ہر معاملے میں میری رائے پوچھتیں اور میری مرضی معلوم کرتیں تو میں جل بھن کر رہ جاتا۔ جب شادی کا فیصلہ ان کا اپنا کیا ہوا تھا اور اس معاملے میں میری مرضی معلوم کر کے بھی اس کا احترام نہیں کیا جا رہا تھا تو یہ فارمیلیٹی بھی کیوں؟ باقی معاملات میں بھی میری مرضی بھاڑ میں جاتی۔ میں نے غیر دلچسپی سے ممی سے کہہ دیا تھا کہ جو مرضی آئے کریں۔ مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔

میرے انگلینڈ جانے کا وقت بھی قریب ہی تھا اور فلائیٹ کی بکنگ تو نکاح سے ایک ہفتے بعد کی ہو چکی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ ایک ہفتے بعد بھی جانا ہے تو ایک ہفتے پہلے کیوں نہیں۔ تو میں نے اسی رات کی بکنگ کروا لی۔ پھر نکاح والی شام چھ بجے میں کسی سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں اور گھر سے نکل کر آیا۔ ظاہر ہے' کسی کو مجھ پر شک کہاں ہونا تھا جبکہ اس وقت اس لمحے گھر سے نکلتے وقت میرے پاس میرے ڈاکومنٹس میں پاسپورٹ اور ٹکٹ تھا اور کیش تھا۔ باقی میں ایک دم خالی ہاتھ تھا۔ پھر میں سب سے پہلے رقیہ سے ملنے کے لیے گیا۔ میں نے اس کو سب کچھ بتانے کے بعد پھر مارکیٹ کا رخ کیا۔ مختصر خریداری کی اور بس۔''

وہ ہنس کر بتا رہا تھا اور میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ کتنی بڑی بات وہ کتنے آرام اور مزے سے بتا رہا تھا۔

''پھر میں کوریئر کمپنی کے آفس گیا۔ وہاں جلدی جلدی ایک Message لکھا اور ان کو ہدایات دیں کہ اسے اتنے بجے تک اس پتے پر پہنچ جانا چاہیے۔ پھر سارے کام جلدی جلدی کر کے "I was in time for the flight." وہ آرام سے بتا رہا تھا۔

''پھر اس لڑکی کا کیا ہوا؟'' میں نے نہایت صدمے کے عالم میں پوچھا۔

''میں کیا بتا سکتا ہوں کہ کیا ہوا؟'' اس نے نہایت بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ ''میں اب جب وہاں سے آ ہی گیا تھا تو اس کی شادی پھر کس سے ہوئی ہوگی؟ یا ایسا فلموں میں ہو جاتا ہے کہ ہیروئن کی بارات واپس جانے پر یا نہ آنے پر ہیرو کا

باپ اس سے کہتا ہے۔ "تم ہیروئن سے شادی کر لو۔" ہیرو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں بھی ایسی ہی کوئی سچویشن کری ایٹ ہو گئی ہو۔"

اس کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا اور مجھے یہ بہت برا لگ رہا تھا۔

"بلال! یہ کوئی فلم نہیں چل رہی تھی۔" میں نے بے حد برا مان کر کہا۔ "ایک لمحے کو تم سنجیدگی سے سوچو، تمہیں نہیں لگتا اس بے چاری لڑکی کے ساتھ کچھ زیادتی ہو گئی ہے؟"

بلال نے اس مرتبہ بہت سنجیدگی سے مجھے دیکھا۔ "افنان! میں مانتا ہوں، اس لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر میرا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے تو کوئی کمٹ منٹ نہیں کی تھی اور میں نے جس سے کمٹ منٹ کی تھی، اسی سے مجھے پوری بھی کرنی تھی۔ "I had my Promise to keep."

"لیکن اس معاملے میں اس لڑکی کا کیا قصور تھا؟" میں اس لڑکی سے بہت ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ، اس معاملے میں میرا کیا قصور تھا؟" وہ الٹا مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"اس لڑکی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا بلال!" میں نے تاسف سے کہا۔ "تم نہیں جانتے بلال! تم اپنے پیچھے کیا کر آئے ہو۔ تم اس پر لیبل لگا آئے ہو۔ اس کی زندگی برباد ہو گئی ہے۔" میں نے افسوس کرنے والے انداز میں کہا۔

"زندگی تو اس کی ہر حالت میں برباد ہو رہی تھی۔ افنان! میں اگر اس سے شادی کر لیتا تو یہ اور بھی بدتر ہوتا۔ پھر تو دو ہی کام ہوتے۔ نکاح کے وقت جب قاضی صاحب مجھ سے پوچھتے۔ "بلال مرتضیٰ! ولد مرتضیٰ حیات! تم کو فلاں بنت فلاں سے نکاح قبول ہے؟" تو میں کہہ دیتا۔ "نہیں! مجھے قبول نہیں ہے۔" یا پھر اگر اس وقت میں "قبول ہے۔" کہہ بھی دیتا۔ اس سے نکاح کر بھی لیتا تو پہلی رات اسے طلاق دے دیتا۔"

اس کا لہجہ اس قدر ہنیلا اور پتھریلا تھا کہ میں چند ساعت تک تو کچھ کہہ ہی نہ سکا اور وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"بتاؤ! اب اچھا ہوا ہے یا تب اچھا ہوتا؟ لیبل تو اس پر ہر حالت میں لگ رہا تھا۔ تب طلاق یافتہ کا لگتا۔"

"I would still say Bilal! you should have stayed over there and faced it like a man."

"میدان چھوڑ کے بھاگ آنا بہادری تو نہیں ہے۔"

بلال مرتضیٰ سے یہ بات کرتے ہوئے میں بالکل بھول گیا تھا کہ ابھی چند دن پہلے میں بھی یہی کرنے جا رہا تھا۔ میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ بہادر ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا تھا۔

بلال کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں غصے سے یا غصے کو ضبط کرتے ہوئے۔

"میں وہاں سے بھاگ کر نہیں آیا بلکہ اپنے پیچھے سب چھوڑ کر آیا ہوں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اپنے باپ کا جما جمایا بزنس' اپنے باپ کی دولت' اپنی جائیداد۔ ہر آسائش' اپنا عہدہ' سارے رشتے۔ اپنا شہر' اپنا ملک۔ Each and everything بہت فرق ہوتا ہے بھاگ جانے اور ہر چیز چھوڑ کر آ جانے میں۔"

"پھر بھی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم یہ بھی تو کر سکتے تھے کہ اس لڑکی کو فون کرتے۔ اسے ساری صورت حال بتاتے اور اس سے کہتے' تم خود مجھ سے شادی سے انکار کر دو یا اس کے پیرنٹس کے through یہ کام کرواتے۔"

"میں پہلے ہی اس نہج پر سوچ چکا تھا۔" بلال مسکرا کر بولا۔ "میں اس سے ایسا کہہ بھی دیتا لیکن کل کو امی کو کوئی اور پسند آ جاتی۔ پھر کوئی اور..... آخر میں کتنوں سے ایسا کرنے کو کہتا؟ میں نے یہ قصہ ہی تمام کر دیا۔"

"تمہارے گھر والے تو پھر تم سے ناراض ہوں گے؟" چند لمحے بعد میں نے پوچھا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔" اس نے پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر بہت بے پروائی سے کہا۔ "ہوا کریں ناراض۔"

میں اس کی اس بات پر گرتے گرتے بچا تھا۔ کیسا شخص تھا یہ جسے اپنے ماں باپ کی ناراضی کی پروا نہیں تھی اور ایک میں تھا۔ میرا باپ مجھ سے ناراض تھا اور میں اس کو منانے کے لیے مرا جا رہا تھا اور اس کے لیے میں نے ہر کام کر کے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے بس دیکھے گیا۔

"اوہ افنان! اب جانے بھی دو۔ بھول جاؤ اس بات کو۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تمہیں کوئی شرمندگی بھی نہیں ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بس' اسی حد تک کہ اس لڑکی کے گھر والوں کو میری وجہ سے suffer کرنا پڑا لیکن پھر بھی یہ اس suffer کرنے سے بہت اچھا ہے جس کے امکانات کے بارے میں' میں تم کو بتا چکا ہوں۔"

"اور اس لڑکی کو کتنا کچھ suffer کرنا پڑے گا۔ ایک لیبل یافتہ سے کون کرے گا شادی؟ کون قبول کرے گا اسے؟" میں نے دکھ سے کہا۔

"ارے یار! ہو ہی جائے گی اس کی شادی۔ کوئی نہ کوئی قبول کر ہی لے گا اسے۔" بلال مرتضیٰ نے ازحد لاپروائی سے کہا۔

"تمہاری رقیہ تو بہت خوب صورت ہوگی پھر؟" میں نے ایک دم کہا۔

بلال مرتضیٰ زور سے ہنسا۔ "ہاں! وہ مجھے ہر لڑکی سے خوب صورت لگتی ہے۔ اصل میں خوب صورتی آپ کی نظر میں ہوتی ہے۔ آپ جس کو چاہتے ہیں' وہ آپ کو ہر حال میں خوب صورت لگتا ہے۔ اس بات سے بالکل قطع نظر کہ رقیہ کیسی ہے' میں نے اسے بہت ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "اس کے باوجود میں نے اس matter کو کبھی expose کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ میرے اور اس کے درمیان قصہ کیا ہے اور خیر' میرے اور اس کے گھر والے تو جانتے ہی ہیں۔" وہ کہہ کر ہنسا۔ "حالانکہ کہتے ہیں' عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ میں کہتا ہوں' اگر آپ کی نیت میں پاکیزگی ہے تو ہر بات possible ہے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

"تم مجھے اس طرح مت دیکھو۔" وہ ایک دم ہنس کر بولا۔ "تم جانتے نہیں' میں بہت ضدی ہوں۔ میں Taurian ہوں۔ Taurians ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ ہٹ دھرم اور اڑیل بھی ہوتے ہیں۔ ان کی قوت فیصلہ بہت مضبوط ہوتی ہے۔ کسی بات کو وہ اگر "نہ" کردیں تو کسی کا باپ بھی "ہاں" نہیں کرا سکتا۔"

"ہاں' وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں' اور محسوس بھی کر رہا ہوں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"خیر' اپنی ہاؤ۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "کافی مزے دار تھی اور [illegible] لذیذ تھے۔ مجھے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے ناں' اس کے لیے؟"

وہ مجھ سے شگفتگی سے پوچھ رہا تھا۔ میں جو اس کی باتیں سن کر قدرے ٹینس ہو گیا تھا' ایک گہری سانس لے کر اپنی ٹینشن ریلیز کرنے کی کوشش کی۔

"ارے بالکل نہیں۔" میں نے ایک دم کہا۔ "پرسوں ہی تو تم نے مجھے اتنا لمبا لنچ دیا تھا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "تمہاری یادداشت غضب کی ہے۔ یہ بات تم میں بہت اچھی ہے' [illegible]

ہر بات یاد رکھتے ہو۔"

میں اس کی بات سن کر ایک دم گم صم سا ہو گیا تھا۔ یہ بات اچھی ہے یا بری ہے...... اس کے جانے کے بعد میں نے خاصی وحشت سے سوچا تھا۔ میری یادداشت اچھی ہونا' میرے لیے ایک عذاب ہے۔ میں نے خاصی تکلیف سے سوچا تھا اور خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔

ایک بار پھر میں نے الماس اور اس سے وابستہ ہر بری یاد کو ذہن سے جھٹکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ خود کو تسلی دینے کے لیے اس دن کی سوچی ہوئی possibility پر میں نے بہت غور کیا تھا اور ساتھ میں دعائیں بھی کی تھیں کہ اللہ تعالیٰ! میں نے جیسا سوچا ہے' ویسا ہی ہو اور اس سے یہ دعائیں کرتے ہوئے مجھ کو یہ بات بالکل بھول گئی تھی کہ مجھے تو اس کے وجود پر شک تھا جس سے میں دعا کر رہا تھا۔

اگلے دن طوعاً کرہاً جبراً میں یونیورسٹی گیا تھا۔ دائیں پیر پر مجھ سے ابھی بھی زیادہ وزن نہیں دیا جا رہا تھا۔ forearm crutch کے بغیر مجھ سے چلنا دشوار ہوا جا رہا تھا۔ splint شدہ بایاں ہاتھ بدستور سینے پر تھا۔

بلال مرتضیٰ مجھے دیکھ کر خاصا خوش ہوا۔ ہم دونوں خاصی دیر تک ادھر اُدھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے لان ہی میں جا بیٹھے تھے۔ پھر کلاس شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے میں اور وہ آ کر لیکچر ہال میں بیٹھ گئے تھے۔ میں جس سیٹ پر بیٹھا تھا' اس سے تھوڑا آگے وہی بیٹھی تھی جس کو دیکھ کر پچھلے ہفتے بھر تک میں نے تکلیف اٹھائی تھی اور اس بار بھی اس کو دیکھ کر مجھے اپنا سانس رکتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔ میرا ایک بار پھر وہاں سے اٹھ کر بھاگ جانے کو دل چاہا تھا' تبھی اسکول آف انجینئرنگ کے Dean پروفیسر جی اے تھامس (Prof. G.A.Thomas) لیکچر ہال کے اندر داخل ہوئے تھے۔

"اس دن باہر نکلتے ہوئے تم انہی سے ٹکرائے تھے اور ان کو گرا بھی دیا تھا۔" بلال مجھے بتا رہا تھا اور میرا دھیان اس کی بات پر نہ تھا۔ پروفیسر جی اے تھامس' اپنے لیکچر کا آغاز کر چکے تھے اور میرا دھیان ان کے لیکچر پر بھی نہیں تھا۔ میں تو دایاں ہاتھ گال پر رکھے بس ایک ٹک اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو حیرت انگیز طور سے الماس سے بے حد مشابہ تھی اور میں نے نہایت ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔ یہ مشابہت نہیں ہے' یہ الماس ہی ہے' لیکن اگر یہ الماس ہے تو میری موجودگی سے بے خبر کیسے ہے؟ اس کی یادداشت اتنی تو نہ ہوگی کہ مجھے بھول جائے۔ میں نے ملی جلی کیفیات کے درمیان سوچا تھا اور

ایک دم میرا وہاں سے اٹھ کر بھاگ جانے کو دل چاہا تھا۔

میں اٹھ بھی جاتا مگر اسی وقت اس لڑکی نے پیچھے مڑ کر ایک نظر مجھ کو دیکھا تھا اور تب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں نیلی ہیں' بالکل کانچ جیسی یا شاید سمندر جیسی...... الماس کی آنکھیں لائٹ براؤن تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی بھی تھی اور مسکرانے پر اس کے گالوں میں ڈمپل نہیں پڑتے تھے اور الماس کے پڑتے تھے۔

یہ دیکھ کر بے اختیار میرے پھیپھڑوں سے شکر کی طویل سانس آزاد ہوئی تھی۔ یہ الماس نہیں ہے...... شکر الحمدللہ! یہ الماس نہیں ہے اور عین اس وقت جبکہ پروفیسر جی اے تھامس ہائیڈرولوجک سائیکل (Hydrologic cycle) بتا رہے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"She is not the one."

کلاس کے پن ڈراپ سائلنس میں میری سرگوشی نما آواز خاصی بلند تھی' سبھی پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے۔ وہ لڑکی تو دیکھ ہی رہی تھی۔

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایکسکیوزمی......!"

کہہ کر میں نے اپنی forearm crutch اٹھائی اور جانے ہی کو تھا کہ جی اے تھامس نے مجھے پکارا تھا۔

"مسٹر افنان!"

میں نے ایک دم رک کر پیچھے دیکھا۔

"I wish to see you in my office right after this class."

"ویری ویل سر......!" کہہ کر میں کلاس سے باہر چلا آیا۔

باہر آ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرا رکا ہوا سانس آزاد ہوا ہو۔ میں نے کئی گہرے گہرے سانس لیے تھے۔ یہ دعا تو میری قبول کر لی گئی تھی کہ وہ الماس نہ ہو مگر میں اس کا کیا کرتا کہ وہ "الماس جیسی" تو تھی۔ میری نظروں کے سامنے تو تھی۔ مجھے ہر ہر لمحے کی یاد دلانے کے لیے...... ہر قسم کے احساس میں مبتلا کرنے کے لیے...... کسک' اذیت اور تکلیف دینے کے لیے......

میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور نہ جانے کب تک اسی طرح بے بسی کے عالم میں بیٹھا رہا تھا۔

"تم کو بیٹھے بٹھائے ہو کیا جاتا ہے افنان؟" میرے خیال میں کلاس ختم ہو گئی تھی۔

بلال مرتضیٰ باہر آ کر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں......!" میں نے مختصراً کہا تھا۔

"اس دن بھی تم ایسے یہاں سے بھاگے تھے جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ بے ہوشی کے دوران بھی پورے وقت تم "اللہ! اب دوبارہ نہیں۔" کہتے رہے تھے اور آج تم نے کیا دیکھ کر وہ جملہ کہا تھا؟"

میری آنکھیں گیلی ہونے لگی تھیں۔ کیسا پردہ رکھا گیا تھا میرا۔ ہاں' اللہ تعالیٰ بندوں کا پردہ رکھا کرتا ہے۔ میں بے ہوشی کے دوران اس کا نام تو لیتا رہا تھا' الماس کا نہیں...... ورنہ آج بلال' آج مجھ سے پوچھ رہا ہوتا۔ "یہ الماس کون ہے؟" اور جب وہ یہ سوال کرتا تو میرے پاس جواب دینے کے لیے کیا ہوتا؟ کیا میں اس سے یہ کہتا کہ الماس میرے برے اعمال کا نتیجہ ہے؟

بلال مرتضیٰ مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بالآخر آہستگی سے کہا۔

"پھر تمہاری اس بات کا مطلب کیا تھا؟" وہ بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"یہ "کچھ نہیں۔" speciality آف دی ڈے ہے؟" اس نے اب کی بار مجھے چڑ کر پوچھا تھا۔ میں کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "کہاں چل دیے اب؟" وہ اب کی بار حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"پروفیسر جی اے تھامس نے بلایا تھا۔" میں نے مختصراً کہا۔

"ہاں' ضرور ملو ان سے۔ بہت متاثر ہیں تمہارے اکیڈیمک ریکارڈ سے۔ کافی وہ تمہارے متعلق مجھ سے پوچھ چکے ہیں کیونکہ انہوں نے اس دن تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ تم پر کیا گزری تھی۔"

بلال ابھی اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس کی بات پوری ہونے کا انتظار کیے بغیر Dean کے آفس روانہ ہو گیا۔ پروفیسر جی اے تھامس مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ حادثہ کیسے ہوا؟" میں نے ان کے پوچھنے پر مختصر سے مختصر الفاظ میں تفصیلات بتا دیں۔

"مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب تم اچھا محسوس

کر رہے ہو؟“

”زیادہ نہیں۔“ میں نے ایک دم کہا تھا کیونکہ ان کے اس سوال پر مجھے الماس سے ملتی جلتی اپنی کلاس فیلو یاد آ گئی تھی۔

”تم جلد ہی بہتر ہو جاؤ گے۔“

ان کی اس بات پر میرا قہقہے لگا کر ہنسنے کو دل چاہا تھا۔ وہ مزید کہہ رہے تھے۔

”تمہارے اتنے شاندار اور اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔“ ان کے لہجے میں ستائش تھی۔ ان کے سامنے میرا سارا ریکارڈ کھلا رکھا تھا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ اتنے اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل آدمی کو کوئی ذہنی الجھن بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ اب بغور میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ”میرے حساب سے ہونی تو نہیں چاہیے۔“

میں ان کی اس بات پر خاموش رہا۔ خاصی دیر تک وہ بھی کچھ نہ بولے پھر یکایک مسکرا کر کہا۔

”اچھا، تو پھر مستقبل میں کامیابی کے لیے میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔“

ان کے کہنے پر میں ”تھینک یو سر!“ کہہ کر باہر آ گیا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ بلال مرتضیٰ جو Dean کے آفس کے باہر میرے ہی انتظار میں کھڑا تھا، مجھ سے پوچھنے لگا۔

”کچھ خاص نہیں۔ وہی سب کچھ جو تم مجھ کو بتا چکے تھے۔“ میں نے اطمینان سے بتایا، پھر اس سے پوچھا۔ ”کیا ایک ہفتے میں بہت loss ہو چکا ہے۔“

”نہیں، زیادہ تو نہیں۔ انگلینڈ کا نظام تعلیم مجھے یونہی تو پسند ہے کہ یہاں پڑھائی سر پر مسلط نہیں کی جاتی۔ ہمارے اسٹوڈنٹس کی طرح آدمی under stress نہیں پڑھ رہا ہوتا۔ میں تم کو بتا دوں گا، تمہارا کیا کچھ مس ہوا ہے۔“

”آج کے دن کا مزید شیڈول ایک کلاس اور......“ میں نے تصدیق کرنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں، اور پھر ٹھنڈے ٹھنڈے گھر......“ اس نے شگفتگی سے کہا۔

پھر ہم دونوں لیکچر ہال میں چلے آئے۔

دوسری کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ جب بلال یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

”میں ابھی آیا۔“ میں نے سر ہلا کر ایک نظر اسے دیکھا، پھر اس کی نوٹ بک اٹھا کر اس کے لیکچر نوٹس کو پڑھنے لگا۔ چند لمحے بعد میں نے کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے نظر اٹھائی

تو میں ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔ مجھے اپنی سانس بند ہوتی محسوس ہوئی۔

الماس سے مشابہت رکھنے والی لڑکی بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں مارے بوکھلاہٹ کے ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تو بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا۔ وہی قد، وہی صاف رنگ، گالوں پر سرخ پمپلز، وہی گولڈن براؤن بال، ویسے ہی بندھے ہوئے بال، وہی گال پر جھولتی ایک لٹ، تراشیدہ بھنویں، لمبی گھنی پلکیں، گلابی ہونٹ، بس ایک لباس کا فرق تھا۔ وہ لانگ اسکرٹ بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اسکارف گلے میں تھا۔ پہلی بار اتنا قریب سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔ اف......! اتنی مشابہت......! وہ الماس نہیں تھی مگر بالکل الماس جیسی تھی۔ میں نے ایک بار پھر بے اختیار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ایسا کرنے میں دائیں ہاتھ میں پکڑی forearm crutch ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری تھی۔ میرا لہجہ ہسٹریکل ہو گیا تھا۔

”چلی جاؤ میرے سامنے سے۔“

میں سامنے سے آتے بلال مرتضیٰ کو نہ دیکھ سکا اور اس لڑکی کا دھواں ہوتا ہوا چہرہ بھی میں نے نہیں دیکھا تھا بلکہ میں چیخ رہا تھا۔

"I don't want to see you again."

بلال مرتضیٰ نے ایک دم مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ”افنان، کیا ہوا؟“

میں جیسے ایک دم حواسوں میں واپس آ گیا تھا۔ میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر وحشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ فوری طور سے جھک کر forearm crutch اٹھائی اور لیکچر ہال سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چلتے ہوئے مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ اپنی بے اختیاری پر غصہ آ رہا تھا۔

”افنان عادل، تم تماشے کرتے پھر رہے ہو اور آج کے دن کا یہ دوسرا تماشا ہے بلکہ صحیح طور سے تیسرا۔“

اپنے اپارٹمنٹ پہنچنے پر میں نے اشتعال کے عالم میں خود سے کہا تھا مگر پھر بے اختیار سر پکڑ لیا تھا مگر میں کیا کروں، میرا ہر عمل بے اختیار ہے۔ اس میں میرے کسی ارادے کو دخل نہیں ہے۔ خاصی بے بسی سے میں نے سوچا تھا۔

جانے اسی عالم میں، میں کب تک بیٹھا رہتا کہ مسلسل بجتی ڈور بیل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دروازہ کھولنے پر بلال مرتضیٰ سامنے کھڑا تھا۔

”افنان، تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ایسے چلے آئے وہاں سے؟“ اس نے مجھے دیکھتے

ہی کہا۔

''ہاں بس یونہی۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''تم اس بے چاری لڑکی پر چیخ کیوں رہے تھے آخر؟''

اس کے سوال پر میں چپ رہا۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں اس لڑکی پر نہیں چیخ رہا تھا' میں تو الماس جیسی پر چیخ رہا تھا۔

''تم مارتھا ایوانز کو کیا جانتے ہو جو اس سے کہہ رہے تھے کہ دوبارہ تم اس کو نہیں دیکھنا چاہتے؟''

''مارتھا ایوانز.....؟'' میں نے بہت حیرت سے دہرایا تھا۔ ''کون مارتھا ایوانز؟''

''وہی جس پر تم چیخ چلا کر آرہے ہو۔'' بلال مرتضیٰ نے جیسے زچ ہو کر بتایا تھا۔

''اچھا' میں نہیں جانتا تھا۔'' میں نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

بلال مرتضیٰ چند لمحے میری شکل دیکھتا رہا' پھر تاسف کے عالم میں سر ہلا کر بولا۔

''افنان' میں یہ بات کہنا تو نہیں چاہ رہا مگر تمہاری بھلائی کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔'' وہ یہ بات کہہ کر چند لمحے رکا' پھر کہا۔

"What you need is to consult a Psycho analyst."

میں اس کی بات پر کافی دیر تک بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ تو کیا میری حرکتیں ایسی ہو گئی ہیں جو مجھ کو ذہنی مریض بنانے لگی ہیں؟ میں نے بہت صدمے کے عالم میں سوچا تھا۔

It is an alarming situation.

بلال مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔ ''افنان' اندر ہی اندر مت گھٹو۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم اپنا مسئلہ کسی سے ڈسکس کر لو' شیئر کر لو۔ مجھ سے کرنا چاہو تو یو آر موسٹ ویلکم!''

اور میرا دھیان اس کی کسی بات پر نہیں تھا۔ میں تو اس کی پہلی بات میں الجھا تھا۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ میری یہ حرکتیں واقعی میرا ذہنی توازن بگڑنے کی طرف پہلا قدم ہیں۔ یہی حال رہا تو میں واقعی پاگل ہو جاؤں گا۔ بلال مرتضیٰ میری طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' بالآخر میں نے کہا تھا اور تب بلال مرتضیٰ تصدیق کرنے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا تھا۔ ''دراصل فالتو بیٹھنے سے مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔ مصروفیت میرے لیے نعمت ہوتی ہے۔'' مجھے بات بنانی ہی تھی سو میں نے بنا لی تھی۔

اب بلال مرتضیٰ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میری بات پہ یقین نہ آیا ہو۔

''بلال' تم ایک احسان کر سکو مجھ پر تو کر دو۔'' میرے منہ سے بلا سوچے سمجھے بے اختیار اور بلا ارادہ ہی نکلا تھا۔

''او بھائی' یہ احسان وحسان کی باتیں مجھ سے مت کیا کرو۔ سیدھی اور صاف بات کیا کرو۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔

''میرے لیے کسی جاب کا انتظام ہو سکتا ہے تو کر دو۔ اپنی عزت نفس بہت عزیز ہے مجھے اور اس سے گر کر میں کوئی کام کرنا نہیں چاہتا۔''

وہ بے اختیار مسکرایا۔ ''عزت نفس تو مجھے بھی اپنی بے حد عزیز ہے۔ اسی وجہ سے میں ایک Respectable جگہ پر جاب کر رہا ہوں۔ ویسے تمہارے مسئلے کا حل ہے میرے پاس۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کمپیوٹر سے know how ہے کچھ؟''

''نہیں' میں کمپیوٹر کا "C" بھی نہیں جانتا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''چلو' یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ میں تم کو کرا دوں گا۔ تم کو کچھ کورسز کرنے ہوں گے۔ کہاں سے' کس طرح' یہ میرا مسئلہ ہے۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر جب یہ کام ہو جائے گا تو پھر میں ایسا کروں گا کہ جس کمپیوٹر سافٹ ویئر ہاؤس میں' میں کام کر رہا ہوں۔ وہیں کے لیے تم کو بھی recommend کر دوں۔ میری پوزیشن ذرا الگ ہے۔ میری recommendation ہر حالت میں چلے گی۔ خدانخواستہ اگر بات ادھر ادھر ہو بھی گیا تو کہیں اور کے لیے بھی کوشش کریں گے۔ میرے سارے دوست اسی لائن میں ہیں اور بہت کامیاب ہیں۔''

بلال مرتضیٰ بتا رہا تھا اور میرا دھیان اس کی کسی بات پر نہیں تھا۔ میں تو اپنی ہی بات پر غور کرتے ہوئے صدمے کے سے عالم میں تھا۔

''ویسے مجھے امید ہے' کسی تیسرے کی ضرورت پڑے گی نہیں۔'' بلال مرتضیٰ مزید کہہ رہا تھا۔ ''مجھے بھی کمپیوٹر سے ہیلو ہائے کرنے کا موقع تب ملا تھا جب میں ایک سال پہلے انگلینڈ آیا تھا۔ تب میں نے شوق شوق میں اسے سیکھا تھا۔ شوق کی ہی بناء پر میں نے جلدی جلدی کئی کورسز کیے تھے۔ جہاں سے میں نے کورسز کیے تھے' انہی لوگوں نے مجھے ایک جگہ recommend بھی کیا تھا۔ میں نے پانچ چھ مہینے وہاں کام بھی کیا پھر ابو کی وجہ سے پاکستان چلا گیا۔ قسمت دیکھو' انہی لوگوں نے ایک سال بعد مجھ سے رابطہ کیا۔ یہ لوگ تو فوراً قیمت لگاتے ہیں ہنر مند آدمی کی۔ آفر اچھی تھی۔ مجھ سے انکار

نہ کیا جا سکا' لیکن میرا مستقل پروفیشن کے طور پر اپنانے کا ارادہ نہیں ہے۔ میری اپنی فیلڈ بہت زبردست ہے۔ مجھے اس میں آگے بڑھنا ہے مگر یہ بھی بہت مزے کی چیز ہے اور میری آنکھ جہاں تک دیکھتی ہے' آئندہ کچھ سالوں میں یہ مزے کی چیز ضرورت بن جائے گی۔ ان گوروں کے ترقی یافتہ ہونے میں کچھ کلام ہے؟ اور ہم بالکل ایسے ہیں جیسے کنویں میں رہ رہے ہوں۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے میری طرف دیکھا۔ ''اس کو سیکھنا کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ جس آدمی کے پاس دماغ نہ بھی ہو' وہ بھی اسے سیکھ سکتا ہے۔ تم تو خاصے ذہین ہو۔ تمہیں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔'' وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔ ''تم سن رہے ہو ناں' میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

اس نے ایک دم مجھے مخاطب کیا تھا اور میں گڑبڑا سا گیا تھا۔

''ہاں......! ہاں......! ہاں......!''

''اچھی بات ہے' پھر کل سے ہی شروع کرتے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کل یونیورسٹی آ رہے ہو ناں؟''

اس کے پوچھنے پر بلا سوچے سمجھے میں نے سر ہلا دیا تھا' لیکن اس کے جانے کے بعد میں خاصی حواس باختگی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ 'یہ مصروفیت تو یونیورسٹی ٹائم کے بعد میں ہو گی۔ یونیورسٹی ٹائم کے دوران میں کیا کروں گا؟'

یہ ایک ایسا سوال تھا کہ میں بے اختیار اضطرابی کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سلیقے سے سجی جمائی چیزوں کی میں نے اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی تھی۔ کمرے کی سیٹنگ چینج کرنے لگا اور ایسا کرنے میں میرے کسی بھی ارادے کو دخل نہ تھا۔ میں جیسے مشینی آدمی تھا۔ سب کام آٹومیشن کے تحت کر رہا تھا۔ صوفہ سیٹ کے زاویے تبدیل کر دیے۔ بیڈ کھسکا کر دیوار سے لگا دیا۔ ڈائننگ ٹیبل کو مزید کونے میں دھکیل دیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کو کھینچ کر تھوڑا آگے لاتے ہوئے اس کی پہلی دراز خود ہی الگ ہو گئی تھی اور سامنے ہی گرین کلر کے چمکتے پاسپورٹ کو دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ ''گورنمنٹ آف پاکستان'' کا سنہرا مونوگرام اور سنہرے حروف میں لکھے الفاظ مجھے اپنی آنکھوں میں آتے نمکین پانی کے باعث دھندلے سے لگے۔ اپنے پاسپورٹ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے میرا دھاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ آج پورے دس دن بعد یہ مجھے اسی جگہ سے مل رہا تھا جہاں میں نے اسے دس دن پہلے رکھا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟

مطلب بالکل صاف تھا۔ مجھے جو دکھایا گیا تھا' مجھے جو بتایا گیا تھا' مجھے جو

کیا تھا' اب مجھے بالکل سمجھ میں آ رہا تھا۔ دس دن پہلے مجھے اس کے وجود پر شک ہوا تھا۔ اس کے وجود پر شک کرتے ہوئے مجھے دھیان نہیں آیا تھا کہ میں تو پہلے ہی قصوروار ہوں۔ اس کے وجود پر شک رکھ کے میں کہاں جاؤں گا؟ میرا ٹھکانہ کیا ہو گا......؟ اور وہ کتنا زبردست ہے۔ کتنا طاقت ور ہے۔ کتنا قادر بھی ہے۔ کیسے اپنے وجود کا پتا دیا کرتا ہے انسان کو! سو اس کے وجود کا پتا دیا گیا تھا مجھے۔ میرے ساتھ کیا ہو سکتا تھا اور میرے ساتھ کیا نہیں کیا گیا تھا۔

نمکین پانی اب میرے گالوں پر بہہ رہا تھا۔ میں تو اس عالم میں پڑا تھا کہ میرا زندہ ہونا یا مر جانا ایک برابر تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے اسی عالم میں اپنے پاس بلا لیا جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میری کیا مجال تھی کہ میں ادھر سے ادھر ہو جاتا مگر ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے موقع دیا گیا تھا۔ سدھرنے کا' اپنی سوچ کا زاویہ درست رکھنے کا...... مجھے مارتھا کے سامنے پھینک دیا گیا تھا تاکہ میں اپنی اوقات یاد رکھوں۔ میں کچھ بھولوں نہ۔ اللہ تعالیٰ سے رجوع کروں!

اور میں اس کے حضور کھڑا بس خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا۔

میرے اوپر ایک مشکل آن پڑی تھی۔ مشکل پر تو صبر ہی کیا جا سکتا ہے اور مشکل وہ جو کہ سراسر میری لائی ہوئی تھی۔ اس تباہی کا ذمے دار میں تھا سراسر۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہ تھا۔ میرے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس آئی ہوئی مشکل کو face کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مارتھا ایوانز کو برداشت کرنے کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔ کوئی حل میرے پاس نہیں تھا۔ کوئی آپشن میرے پاس نہیں تھا۔ رہ ہی نہیں گیا تھا اور یہ بھی بہت غنیمت تھا کہ وہ الماس نہیں تھی۔ الماس ہوتی اگر تو میں کیا کر لیتا؟ مارتھا ایوانز بدقسمتی سے میری کلاس فیلو تھی۔ لیکچرز' سیمینارز' پریزینٹیشنز وغیرہ میں سامنا میری برداشت کا' صبر کا کڑا امتحان ہوتا۔ میرا دل ان جگہوں سے اٹھ کر بھاگ جانے کو چاہتا۔ میری ذہنی کیفیت اعتدال سے باہر ہو جاتی۔ مجھے مختلف احساسات ... میں ہر ممکنہ حد تک اسے avoid کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کو ignore کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں شعوری اور لاشعوری پوری کوشش کرتا کہ اسے نظر اٹھا کر نہ دیکھوں۔ اس کے باوجود مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہو جاتا تھا۔ کلاسز ختم ہونے کے بعد ... ضرورت کے تحت بھی ایک منٹ کے لیے یونیورسٹی میں نہیں رکتا تھا۔

... ایل آر سی (لرننگ ریسورس سینٹر) تک شاپ کسی ایسی جگہ پھٹکتا نہ تھا

جہاں اس کی موجودگی کے امکانات ہوسکتے۔ میں ہر ایسی جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا جہاں وہ پائی جاسکتی تھی اور وہ عجیب لڑکی تھی شاید جان گئی تھی کہ میں اس سے بھاگ رہا ہوں' سو وہ ہر جگہ مجھے نظر آتی تھی۔

بلال اور اس کے درمیان اب تو اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے اس سے چڑ ہونے لگی تھی۔ بلال سے بھی میں کھنچ کر رہ گیا تھا البتہ یونیورسٹی کے بعد میں اور وہ ساتھ ہوتے تھے۔ نہایت کم وقت میں کمپیوٹر کے کئی کورسز کرنے کے بعد میں اس سافٹ ویئر ہاؤس میں کام کر رہا تھا جس میں وہ تھا۔ وہ اس فیلڈ کا نہیں تھا مگر اس فیلڈ میں ایکسپرٹ تھا۔ کمپیوٹر اس کا شوق تھا۔ میری مجبوری تھی۔ ضرورت تھی۔

یونیورسٹی ٹائم میں بلال شکوہ کرتا ہی رہتا تھا اکثر۔ ''تم کہاں ہوتے ہو؟'' میں اس کی کسی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں خود کو نہ پاتا۔ یہ بھی بہت غنیمت تھا کہ مارتھا ایوانز صرف یونیورسٹی میں ہی میرا خون جلانے کے لیے موجود ہوتی تھی اور باقی وقت وہ میری نظروں سے دور رہتی تھی۔ یہ دوسری غنیمت بات تھی کہ جاب کی مصروفیت میں اس فضول خیالات' تکلیف دہ احساسات میرے آس پاس نہ پھٹکتے اور واپسی پر میں اس قدر تھکا ہوا ہوتا تھا کہ بستر پر گرتے ہی سو جاتا تھا۔ کوئی تفریح میری زندگی میں رہ نہیں گئی تھی حتیٰ کہ ویک اینڈ پر جب بلال مرتضیٰ اور اس کے دوست مل کر سیر و تفریح کے پروگرام بناتے اور بلال مجھے دعوت دیتا تو میں اس سے معذرت کر لیتا۔ میرے sundays بھی اسی سافٹ ویئر ہاؤس میں گزرتے۔ کام کرتے' محنت کرتے' مصروف رہتے۔ لوگ لندن میں رہ کر گھوم پھر تو لیتے ہی ہیں۔ میری دنیا صرف یونیورسٹی' گھر اور سافٹ ویئر ہاؤس تک محدود تھی۔ ان جگہوں کو جانے والے راستوں کے علاوہ میں نے دوسرے راستوں کو پیار رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ چوتھی جگہ اگر میں جاتا تھا تو وہ ''اسلامک سینٹر'' تھا جو سافٹ ویئر ہاؤس کے قریب ہی تھا۔ کام کے دوران جب نماز کا وقت ہو جاتا تو میں نماز پڑھ لیتا تھا وہاں جا کر اور کافی مرتبہ نماز کے بعد دیا جانے والا درس بھی سن لیتا تھا۔ شیخ عبداللہ بن حسن کے بولنے کا انداز بڑا متاثر کن ہوتا تھا۔ وہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ روزانہ کسی بھی ایک آیت کو لے کر اس کی Depth تک چلے جاتے۔

اس آدمی کے پاس علم تھا......

وہ تو بحر ذخار تھا علم کا......

جتنی ان کی عربی فصیح تھی' اسی قدر وہ انگریزی زبردست بولتے تھے۔ احادیث

اور تفسیریں کہ ہر موقع پر فوراً Quote کرتے تھے۔ ان کی آواز میں' ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس لیے تو میں نماز پڑھ کے نکلنا چاہتا تھا کہ ان کی آواز میرے قدم روک لیتی۔ میں وہیں کھڑا رہتا۔ وہ سا گھنٹوں کھڑا رہتا' سنتا رہتا۔

ایک دن انہوں نے بطور خاص مجھے بلا کر کہا۔ ''میں آپ کو کافی دن سے دیکھ رہا ہوں' آپ اکثر کھڑے ہو کر ہی سنتے ہیں۔ آپ بیٹھ کر' آرام سے سن لیا کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ میں کھڑا ہوا ہوں۔''

میں شیخ عبداللہ بن حسن سے متاثر تھا۔ اکثر مجھے لگتا کہ یہی وہ آدمی ہیں جو میرا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ میں نہایت ابتر ذہنی حالت میں ان کے پاس گیا کہ آج تو ان کو بتا کر ہی رہوں گا۔ آج تو ان سے پوچھ کر ہی رہوں گا۔ ڈسکس کر کے رہوں گا۔ اپنی ساری ٹینشن ریلیز کر دوں گا' لیکن پتا نہیں کیوں' جب میں بولنے کے لیے منہ کھولتا تو میرے منہ پر بڑے بڑے تالے پڑ جاتے۔ میں اپنا مسئلہ پوچھنے کی بجائے کسی قرآنی آیت کے حوالے سے کچھ پوچھنے لگتا۔ اور وہاں سے واپسی پر میرا سر پیٹنے اور بال نوچ لینے کو دل چاہتا رہتا۔

بلال مرتضیٰ کی گفتگو میں اکثر اب مارتھا ایوانز بھی شامل رہنے لگی تھی۔ وہ اکثر اس کے متعلق مختلف معلومات مجھے دیتا ہی رہتا تھا۔ وہ دو بہنیں ہیں۔ اپنے والد کے ساتھ شہر کے مضافات میں رہتی ہیں۔ مارتھا ایوانز ایک ٹریولنگ ایجنسی میں Receptionist کے طور پر کام کرتی ہے۔ اپنی پڑھائی کے اخراجات وہ خود اٹھا رہی ہے۔ اس کی بہن بھی جاب کرتی ہے۔ مالی پوزیشن اتنی مستحکم نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں بہت غیر دلچسپی اور بے پروائی سے سنتا۔ پتا نہیں' بلال کس لحاظ سے اور کیوں مارتھا ایوانز سے متعلق معلومات مجھے دیا کرتا تھا؟ حالانکہ اس سے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کی میں نے کوشش کبھی کیا تھا۔ مجھے مارتھا ایوانز سے کوئی رشتے داری تو جوڑنی نہیں تھی۔ میں رشتے داری جوڑ بھی کیسے سکتا تھا جبکہ وہ ''اصل'' نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے اس بھیانک رات کا خیال دلاتی تھی۔ اس کی موجودگی میں' میں تو وقت کو کسی کڑوے گھونٹ کی طرح صبر سے پی کر گزار رہا تھا۔ بڑی تسلی کے ساتھ خود کو سمجھاتا کہ دو سال گزر چکے ہیں۔ باقی جو رہ گئے ہیں' وہ بھی گزر جائیں گے۔ ان دو سمسٹرز میں پوزیشن کی خاطر ہی سے لڑنے کے جنون میں' اپنی پوری جان' اپنا دھیان لگا دینے کی وجہ سے میرے پروفیسرز قابل رشک تھے۔ میرا گریڈ بہت اچھا تھا۔

بلال مرتضیٰ حیران تھا۔ "تم بالکل unpredictable آدمی ہو افنان!"

میں اس کے اس کمنٹ پر خاموشی اختیار کرنے کے علاوہ کیا کرتا بھلا؟ میں اس کے سامنے اپنا گھٹنا کیا کھولتا؟

مارتھا ایوانز نے مجھے اچھا گریڈ لینے پر دونوں سمسٹرز میں مبارک باد دی تھی اور میں نے اس کو بہت روکھے انداز میں "تھینک یو!" کہہ کر مزید کوئی بات کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب اکثر ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ میں اور بلال کبھی بیٹھے باتیں بھی کر رہے ہوتے تو وہ درمیان میں کود پڑتی۔ ایسے موقعوں پر میں تو وہاں سے اٹھ ہی جاتا تھا۔ اس دن بھی میں اور بلال کلاس ختم ہونے کے بعد لیکچر ہال میں بیٹھے لیکچر کے مین پوائنٹس کو ڈسکس کر رہے تھے کہ مارتھا بھی آ گئی۔ بلال نے حسب معمول اسے بہت مسکرا کر ویلکم کیا۔ میں اس پر کوئی توجہ دیے بغیر بلال کو اہم پوائنٹس گنواتا رہا پھر اس کو بتا کر میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟" بلال نے حیرت سے پوچھا۔

"میں گھر جاؤں گا اب۔" میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"ارے رک ناں یار!" بلال مرتضیٰ نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے جھٹکے سے اپنے ساتھ میں بٹھا لیا تھا۔

میں طوعاً کرہاً بیٹھ تو گیا تھا مگر لاتعلقی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مارتھا ایوانز غور سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ پھر ایک دم مجھ سے پوچھا تھا۔

"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

یہ پہلا موقع تھا کہ مارتھا ایوانز نے براہ راست مجھ سے کوئی سوال کیا تھا ورنہ عموماً وہ مجھ سے بولتی نہیں تھی۔

"میری مرضی۔" نہایت بدتمیزی سے میں نے جواب دیا تھا۔

ایک لمحے کو تو بلال بھی ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس نے ایک دم مارتھا ایوانز کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ "اوہ تم اس سے بات مت کرو مارتھا......! مجھ سے بات کرو۔"

مارتھا' بلال کی طرف دیکھنے لگی۔ میں ماربل کے پکے فرش کو گھورنے لگا۔

"جانتی ہو مارتھا' تمہارے نام کے معنی کیا ہیں؟" وہ اب مارتھا سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں......!" اس نے مختصراً کہا۔

"مارتھا کے معنی ہوتے ہیں "Bitterness" تم میں تو بہت نرمی اور حلاوت ہے۔ تم میں کڑواہٹ تو بالکل نہیں ہے۔"

بلال کے کہنے پر میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکرا کر مارتھا کو دیکھ رہا تھا۔ مارتھا یہ بات سن کر مسکرائی تھی اور میرا منہ کڑوا ہو گیا تھا۔ کوئی میرے دل سے پوچھتا کہ اس میں کڑواہٹ تھی یا نہیں۔ اس میں تو اس قدر کڑواہٹ تھی کہ جس سے میری زندگی کڑوی ہو کر رہ گئی تھی۔ زہر ہو کر رہ گئی تھی۔

مارتھا کہہ رہی تھی۔ "مجھے پاکستانی مرد اچھے لگتے ہیں۔ وہ کم از کم sincere اور وفادار ہوتے ہیں۔"

بلال مرتضیٰ ہنس پڑا۔ "پاکستانی مرد زیادہ تر committed ہوتے ہیں۔"

"تم بھی ہو؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"ہاں......!" بلال مرتضیٰ نے بلاتاخیر جواب دیا تھا۔

وہ ایک دم مسکرائی۔ "مجھے اندازہ تھا۔" پھر میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "کیا تم بھی ہو؟"

"It is none of your concern." میں نے بہت ترشی سے جواب دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تم کو؟ سیدھی بات کا بھی الٹا جواب دے رہے ہو؟" بلال نے ایک دم مجھے اردو میں ٹوکا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اسے دیکھتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"ہم دونوں ہی چلتے ہیں ناں ابھی۔"

"تم لوگ انگلش میں بات کرو ناں!" مارتھا جو ٹکر ٹکر ہم دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی' فوراً بولی۔ "یا مجھے اردو سکھاؤ۔"

"اردو کوئی ایسی مشکل زبان نہیں ہے۔ وہ بھی سیکھ لینا۔" بلال نے نیم رضامندی سے کہا اور میں کھول کر رہ گیا تھا۔ "فی الحال تو میں کہہ رہا تھا۔ تم بہت ڈیسنٹ ڈریسنگ کرتی ہو۔ بالکل پرانے زمانے کی ہیروئنز کی طرح۔"

مارتھا بے یقینی سے بلال کو دیکھنے لگی۔ "تم ابھی یہی کہہ رہے تھے افنان سے؟"

اپنا نام لیے جانے پر اور خاص طور سے اس کے منہ سے سن کر مجھے شدید تاؤ آ گیا تھا۔ وہاں بیٹھنا اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

بلال نے مسکرا کر "ہاں......!" کہا تھا۔

"اصل میں میرے فادر پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ انہیں ماڈرن ڈریسنگ پسند ہے اس لیے ایسی ڈریسنگ کرتی ہوں۔" اس نے آرام سے بتایا۔ "کبھی میکسی' کبھی

لانگ اسکرٹ' بلاؤز' فرل والی آستین اور گلا مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور گلے میں اسکارف ڈالنا بھی پسند ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

واقعی میں نے اسے ایسی ہی ڈریسنگ میں دیکھا تھا۔ یہ لباس' آنکھوں کے رنگ اور گالوں کے ڈمپل کا ہی فرق تھا جو اسے الماس سے الگ کرتا تھا۔

''تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم ماڈرن ڈریسنگ کرو؟'' بلال قدرے دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں' جبکہ میری فرینڈز کرتی ہیں۔''

''تمہاری صرف فی میل فرینڈز ہیں؟'' بلال نے خاص طور سے فی میل پر زور دیا تھا۔

''ہاں۔''

''تو بوائے فرینڈز؟''

''میرے فادر کو پسند نہیں ہے میرا لڑکوں سے دوستی کرنا۔'' اس نے سچائی سے کہا۔

اب میں خاصا چڑ کر جھٹکے سے اپنا ہاتھ بلال کے ہاتھ سے چھڑا کر اٹھا تھا۔

''میں جا رہا ہوں۔ تم کو آنا ہو تو آجانا۔'' اردو میں کہہ کر میں نے آگے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔

''ارے یار' تمہارے ساتھ مشکل کیا ہے آخر' تم اس سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟'' تیز تیز قدموں سے میرے پیچھے آتے ہوئے بلال پوچھ رہا تھا۔

''میں اس سے چڑتا بھی ہوں اور اس کو اپنے سامنے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ''اور اگر تم کو اس سے بات چیت رکھنی ہوا کرے تو پلیز' بلال میرے پیچھے کر لیا کرو۔ میرے سامنے مت کیا کرو۔''

بلال نے کیوں' کیا' کب' جیسا کوئی سوال نہیں کیا تھا اور اچھا تھا اس نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا ورنہ میرے پاس جواب دینے کے لیے الفاظ نہ ہوتے شاید۔

''اچھا' اچھا اس میں خفا ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' بلال فوراً مصالحت پر آمادہ ہو گیا۔

اس کے بعد سے وہ میرے سامنے مارتھا ایوانز سے اگر بات کرتا تو بہت کم۔

انہی دنوں مجھے ابو اور امی کے حج پر جانے کی اطلاع ملی تھی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ میں دوسری مرتبہ چاچو بن گیا ہوں۔ بڑے بھائی کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا تھا۔ ابو کے ساتھ بڑے بھائی نے بھتیجے کی تصویریں بھی بھجوائی تھیں۔ میں خاصی دیر تک تصویریں

ہاتھ میں لیے دیکھتا رہا۔ بڑے بھائی' بھابی' فاران اور ایک اور ننھا سا وجود۔ ایک تصویر میں فاران اسے اپنی گود میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹا سا فاران جو خود بھی بہت خوبصورت اور پیارا بچہ تھا مگر تھا بے حد شریر۔ شروع سے ہی خاصا حاضر جواب تھا۔ پٹا پٹ جواب دیتا تھا۔ مجھ سے بے حد مانوس تھا۔ مجھے وہ پیارا بھی بہت تھا۔ آخر کو وہ بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑے بھائی سے وابستہ ہر چیز مجھے عزیز تھی۔ بڑے بھائی نے بھتیجے کا نام منتخب کرنے کے لیے کہا تھا۔ بڑے بھائی کے بڑے بیٹے فاران کا نام ابو نے تجویز کیا تھا۔ پوتوں کے نام کے آگے ابو کا نام تھا اور فاران عادل بڑا بھلا لگتا تھا۔ میں نے بڑے بھائی کو عفان' نام لکھ کر خط بھیج دیا تھا۔ عفان عادل بھی اچھا لگتا۔ فی الحال تو میں نے مبارک باد کا خط بھیج دیا تھا انہیں۔ تحفے بھجوانا چاہتا تھا مگر کس کے ہاتھ بھجواتا بھلا۔

پھر اس رات جب میں جاب سے واپس گھر پہنچا تو ابو کو اپنے اپارٹمنٹ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے کی ہول میں چابی لگانے پر دروازہ ابو نے کھولا تھا۔ ابو نے حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے یہ ارادہ بالکل ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ یہاں بھی آسکتے ہیں۔ بہر حال ان کو وہاں دیکھ کر خوشی سے زیادہ مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے ابو سے کہا کہ وہ ذرا بھی بتا دیتے مجھے تو میں خود ان کو لینے کے لیے ایئرپورٹ پہنچ جاتا۔ انہوں نے کہا گھر ڈھونڈنے میں ان کو کوئی مشکل نہیں ہوئی' وہ آرام سے ادھر پہنچ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس وقت یونیورسٹی سے گھر پہنچ گیا ہوں گا مگر پڑوس والے آرتھر فلپ نے ان کو بتایا کہ میں رات کو دیر سے گھر آیا ہوں۔ حفظ ماتقدم کے تحت میں نے ایک اپارٹمنٹ کی (Key) ان کے یہاں بھی رکھوا دی تھی۔ جب انہوں نے ابو کو راہداری میں پریشان سا کھڑا دیکھا تو چابی انہیں دے دی تھی۔

''اتنی دیر تک کیا کرتے رہتے ہو' جو اتنی دیر سے گھر آتے ہو؟'' ابو نے سیدھا سیدھا سوال کیا تھا۔

''مسٹر فلپ نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں جاب کرتا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے الٹا ان سے پوچھا۔

''تم جاب کر رہے ہو؟ اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔'' ابو نے حیرت سے پوچھا۔

''میں مصروف رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''پیسہ آ رہا ہے مصروفیت کے ساتھ اور بھی اچھا ہے۔''

''تم یہاں پیسہ کمانے نہیں پڑھنے کے لیے آئے ہو لہٰذا پڑھائی پر دھیان دو۔'' ابو

نے ذرا سختی سے کہا۔

''میری اس قسم کی کسی Activity کی وجہ سے میری پڑھائی Suffer نہیں کرتی۔'' میں نے ان سے آہستگی سے کہا۔

''اچھا چلو۔ چینج وغیرہ کرو۔ تھک کر آئے ہو گے۔'' ابو کو کچھ خیال آ گیا تھا میرا۔

''امی کو کیوں نہیں لائے؟'' کھانے کے دوران میں نے ان سے پوچھا۔

''میں تو آفیشلی آیا ہوں۔ امی کو لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

''آفیشلی؟ کتنے دن کے لیے؟'' میں ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ۔'' انہوں نے میرے پوچھنے پر آرام سے بتایا۔

''اچھا۔''

میں مزید کچھ کہے بغیر کھانے سے انصاف کرتا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا ابو صرف آفیشلی نہیں آئے ہیں بلکہ مجھے واچ کرنے بھی آئے ہیں۔ ان کے اگلے سوال سے مجھے اپنی سوچ کی درستگی کا پتا چلا تھا۔

''تم ایڈجسٹ ہو گئے یہاں؟'' ابو مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''جی۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''رنگت تو تمہاری اچھی ہو گئی پہلے سے۔ کچھ دبلے سے لگ رہے ہو۔ صحت کو کیا ہو گیا تمہاری؟ کمال ہے لوگوں کی صحت تو یہاں آ کر اچھی ہو جاتی ہے۔ تمہاری صحت گر رہی ہے۔''

میں نے ابو کی بات سن کر کچھ کہنے سے گریز کیا۔ اب میں ان کو کیا بتاتا۔ کیا کیا جھیل رہا ہوں میں لو پر۔ صحت تو گرنی ہی ہے۔

''اتنی محنت کرنے کو تم سے کون کہہ رہا ہے۔'' ابو نے مجھے خاموش پا کر پوچھا تھا۔ میں اب کی بار بھی خاموش رہا۔ ''کہاں جاب کر رہے ہو۔''

اب کی بار میں ان کے پوچھنے پر ان کو نیچر آف جاب بتاتا رہا۔

پھر ڈیڑھ ہفتے قیام کے بعد ابو واپس چلے گئے تھے۔ اس سارے عرصے میں مجھے اندازہ ہوتا رہا کہ میری سوچ کس حد تک درست تھی۔ میرے لمحے لمحے کا حساب ابو کے سامنے تھا۔ خیر سے اس سلسلے میں مجھے ڈرنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے [illegible] تھا۔ ان کے قیام کے دوران میں نے انہیں وقت دینے کی پوری کوشش کی تھی۔ دو دن میں یونیورسٹی نہیں گیا تھا تو تیسرے دن بلال مرتضیٰ خود آن موجود ہوا تھا۔

''کہاں ہو یار بغیر پتے ٹھکانے کے غائب۔'' اس نے دیکھتے ہی مجھے کہا تھا۔

''ابو آئے ہوئے ہیں اس لیے آ نہیں پا رہا تھا یونیورسٹی۔ جاب سے بھی آف لیا تھا۔''

''ارے تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا۔ میں انکل سے ملنے چلا آتا۔''

بلال مرتضیٰ کے پُر اشتیاق لہجے میں کہنے پر میں نے اس کو ابو سے ملوایا اور خود آداب میزبانی نبھانے کے لیے اٹھ گیا۔ جب میں واپس آیا تو دونوں یوں محو گفتگو تھے گویا صدیوں سے جان پہچان ہو۔

''انکل یہ آپ کا بیٹا بالکل حیرت انگیز ہے۔ اس کے بارے میں کبھی کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کیا کر بیٹھے۔ ویسے انکل آپ کے اس بیٹے کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے اپنے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی ہو گی۔'' وہ تعریفی انداز میں ابو سے کہہ رہا تھا۔ ''انسان میں کوئی برائی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور کردار کا تو یہ ایک دم کھرا ہے۔''

اس نے کہتے کہتے مجھے دیکھا۔ میں ابو کی طرف دیکھ رہا تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابو کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ ابو نے کچھ کہا بھی نہیں تھا اس بات پر۔

''ارے ہاں' یاد آیا۔ انسان' مارتھا ایوانز تم کو بہت یاد کر رہی تھی کہ تم یونیورسٹی آ کیوں نہیں رہے دو دن سے۔'' بلال نے ایک دم کہا تھا۔

میں تو مارتھا ایوانز کے ذکر پر ہی چکرا گیا تھا۔ ابھی بلال مرتضیٰ نے میرے کردار کے بارے میں ہی بات کی تھی اور اب...... چلو' مارتھا ایوانز...... میرے کردار پر ایک اور [illegible]

اور ابو نے جنہوں نے بلال کی میرے کردار کے متعلق کہی جانے والی بات کا کوئی [illegible] نہ دیا تھا' ان کا چہرہ بھی بے تاثر تھا۔ اب ان کے چہرے پر برہمی کا سا تاثر تھا۔ [illegible] گئے تھے۔ عضلات تن گئے تھے اور جن ملامتی نظروں سے انہوں نے مجھے دیکھا [illegible] پسینے آنے لگے تھے۔ میرا دم حلق میں آ گیا تھا۔ اس لمحے بلال کا گلا گھونٹ [illegible] کو دل چاہ رہا تھا میرا اور ابو انہی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے خاصے شک والے [illegible] میں پوچھ رہے تھے۔

''یہ مارتھا ایوانز کون ہے؟''

''اسی سے پوچھیں جو بتا رہا ہے۔'' میں نے خاصا چلبلا کر کہا تھا۔ ابو بلال کی [illegible]

''انگلش' مارتھا ایوانز' ہماری کلاس فیلو ہے۔ افنان سے بہت متاثر ہے مگر افنان اس کو گھاس بھی نہیں ڈالتا بلکہ اس سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔'' وہ ہنس رہا تھا۔

بلال مرتضیٰ کے بتانے پر میں نے ابو کے چہرے کے تاثر میں تبدیلی دیکھی۔ تنے ہوئے نقوش ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ میری سانس بحال ہوئی تھی۔

پھر جب میں اس کو رخصت کرنے نیچے گیا تو میں نے اس کو ٹھیک ٹھاک سنائیں۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی ابو کے سامنے مارتھا ایوانز کا تذکرہ کرنے کی؟'' میں نے خاصا دانت کچکچا کر اس سے سوال کیا تھا۔

''اوہ بس یار' زبان سے پھسل گیا تھا۔'' اس نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''جو سوچ سمجھ کر نہیں بولتے ناں' وہ ہمیشہ پچھتاتے ہیں۔ میں بارہا ٹوک چکا ہوں تمہاری اس عادت پر تم کو۔ اس کے باوجود جو منہ میں آتا ہے' کہے جاتے ہو تم۔'' میں نے چڑ کر کہا تھا۔

''بس اب تو ہو گیا ناں۔ اس کو اتنا سنجیدگی سے لینے والی کیا بات ہے۔ تمہیں کس بات کا ڈر پڑا ہے۔ ہمارے ہاں مرد جو چاہے' کرتا پھرے۔ اس کو کبھی قصوروار نہیں ٹھہرایا جاتا کیونکہ معاشرہ ہی مردوں کا ہے۔ زیادہ تر تو لڑکی ہی پھنستی ہے۔ بات تو ساری لڑکی پر آتی ہے اور تم لڑکی تو نہیں ہو' لڑکے رکھتے ہی ہیں دوستیاں لڑکیوں سے۔''

وہ اب Justification دے رہا تھا اور میرا اس کی بات پر قہقہے لگا کر ہنسنے کو دل چاہ رہا تھا۔

کس نے کہہ دیا تھا کہ معاشرہ مردوں کا ہے؟

کس نے کہہ دیا کہ مرد جو چاہے' کرتا پھرے۔ اس کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ میں بڑے استعجاب سے سوچ رہا تھا۔ میں بھی مرد ہی ہوں۔ میرے لیے تو ایک ہی رات عذاب بن کے رہ گئی ہے۔ اب جو چاہے' کرتے پھرنے کا تو کوئی قصور بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی مردوں کا ہی معاشرہ ہے اور میرا تو ایک ہی قصور معاف نہیں ہو رہا ہے۔

''میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اور خاص طور سے اس لڑکی کے بارے میں سو ہزار مرتبہ میں نے تم کو منع کیا ہے کہ اس کا ذکر بھی میرے سامنے مت کیا کرو۔''

''اچھا آئندہ نہیں کروں گا۔'' اس نے جیسے فوراً ہار مان لی۔ پھر سنجیدگی سے کہا تھا۔

''افنان ویسے ایک بات میں محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کچھ دیر کے لیے رکا۔ ''مارتھا ایوانز

تمہارے لیے سیریس ہوتی لگ رہی ہے۔''

اس کی بات سن کر چند لمحے کے لیے تو میں سکتے میں آ گیا۔ پھر خود پر قابو پا کر نہایت بے پروائی سے کہا۔ ''تو اس سلسلے میں' میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم!'' اس نے ہنس کر مجھے دیکھا۔ ''غور کر سکتے ہو۔''

اس کی بات سن کر تو میں بالکل آؤٹ ہو گیا۔

''میں غور نہیں کرنا چاہتا۔ نہ ابھی نہ آئندہ کبھی۔'' میری آواز قدرے بلند ہو گئی۔ ''مجھے نہ اس میں انٹرسٹ تھا نہ ہے اور نہ کبھی ہو گا۔'' میں ایک دم چیخنے لگا تھا۔

''آل رائٹ...... آل رائٹ تو تم اتنا چلا کیوں رہے ہو؟ میں نے تو تم سے صرف ایک بات کہی تھی۔'' بلال مرتضیٰ نے فوراً مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا تھا۔

''آئندہ مجھ سے ایسی کوئی بات مت کرنا۔'' میں نے تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔

بلال مرتضیٰ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

"Have you ever been deceived by someone, the one you loved most?"

اس کا سوال اتنا اچانک تھا کہ مجھے سوچنے سمجھنے' غور کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

"No, never!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "I thought may be."

میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "What made you think that?"

''یونہی۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ ''کبھی کبھار تو تم بہت ابنارملی ری ایکٹ کرتے ہو۔''

سنجیدگی سے کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ چلا گیا تھا۔ میں نے اس کے اس کمنٹ پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔

دو دن ابو کے ساتھ گزرے تو تیسرے دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کی وجہ سے اپنا حرج نہ کروں۔ لہٰذا اس دن میں یونیورسٹی چلا آیا۔

اس دن بلال آیا نہیں تھا اور میں کلاسز کے درمیانی وقفے میں اتفاق سے ایل آر سی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ورنہ عموماً بیٹھتا نہیں تھا۔ بس گویا غلطی ہی ہو گئی تھی مجھ سے...... مارتھا ایوانز کو خود اپنے پاس آتے دیکھ کر اس پر کوئی نظر مزید ڈالے بغیر میں جانے لگا۔

''تم مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟''

اس نے ایک دم میرا راستہ روک کر پوچھا تھا اور اس کی اس حرکت پر مجھے شدید تاؤ آیا تھا۔

"میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔" میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو میں بہت بری ہوں جو تم مجھ کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے؟" اس نے بہت دکھ سے پوچھا تھا۔

"ہاں' میں تم کو کبھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم میرے سامنے مت آیا کرو۔" میں نے درشت لہجے میں کہہ کر آگے قدم بڑھا دیے تھے۔

وہ ایک دم میرے سامنے آ گئی۔ میں غصے سے کانپنے لگا۔

"کیوں' میں نے کیا ہی کیا ہے؟" اب کی بار خاصی بے بسی سے اس نے پوچھا تھا اور میں اس کو کوئی جواب دیے بغیر پلٹ پڑا تھا۔

"میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔"

جاتے جاتے سسکی کی صورت میں نے سنا تھا مگر کوئی توجہ دیے بغیر اور رکے بغیر چلتا چلا گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے میں مارتھا ایوانز سے اور بھی کترانے لگا مگر میں اس سے جتنا کتراتا' وہ اتنا ہی مجھ سے ٹکراتی۔ میں اس سے جتنا بچتا' وہ اتنا ہی میرے سامنے آتی۔ میں جتنا اس سے بھاگتا' وہ اسی قدر میرے پیچھے آتی۔ مجھے اس صورت حال سے کوفت ہونے لگی۔ مارتھا ایوانز مجھے زہر لگنے لگی۔ مارتھا ایوانز کو اب مجھے دیکھ کر غصہ آنے لگا تھا۔ مجھے اس کی صورت سے ہی بے زاری ہونے لگی۔ کسی کے چہرے پر سرخ چھپلر مجھے اتنے برے نہیں لگتے تھے جتنے مارتھا ایوانز کے چہرے پر لگتے تھے۔ میرا دل چاہتا اس کو اتنے تھپڑ ماروں کہ سرخ چہرہ مزید سرخ ہو جائے۔ میرا دل چاہتا میں مارتھا ایوانز کو کہیں چھپا دوں۔ کہیں دھکا دے دوں۔ کہیں اٹھا کر پھینک دوں۔ میرا دل چاہتا کہ میں اسے قتل کر دوں۔ کہیں دفن کر دوں۔ اگر ناحق کسی جان کو مارنے کا حکم نہ ہوتا تو واقعی میں ایسا کر بھی دیتا۔ میں اس سے بالکل بات نہیں کرتا تھا مگر بالفرض کرنی پڑ بھی جاتی تو اس سے جتنی بدتمیزی' ترشی اور درشتی سے بول سکتا تھا' بولتا تھا۔ میرا رویہ بہت حوصلہ شکن اور روکھا ہوتا۔ ہر بار اس کے چہرے پر آثار مختلف ظاہر ہوتے۔ کبھی تکلیف' کبھی اذیت' کبھی بے بسی مگر اگلی بار وہ نئے سرے سے میرے پیچھے آتی۔

میں اس صورت حال سے سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ ابھی ایک مشکل سے میں نمٹ نہیں پایا تھا کہ یہ دوسری مشکل آن پڑی تھی اور یہ مشکل میری اپنی پیدا کردہ نہیں تھی۔ سراسر اس الماس کی ہم شکل کی پیدا کردہ تھی۔ وہ مجھے اپنے سامنے برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں اس سے بہت مرتبہ کہہ بھی چکا تھا۔ "تم کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔" ہر بار یہ سن کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا۔ سفید رنگت کچھ اور سفید ہو جاتی۔

میں تو اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اس سے فرار کی۔ اس سے بھاگ جانے کی۔ دعائیں کر رہا تھا اس سے بچ جانے کی اور لاشعوری طور سے میں کیا یاد نہ کرنے اور کس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ میں جانتا تھا۔

بلال مرتضیٰ نے اس دن کے بعد سے مجھے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا مگر اس دن وہ بے اختیار کہہ اٹھا تھا۔

"افنان' تم ٹھیک نہیں کر رہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ ٹھیک کر رہی ہے؟" میں اس کے سامنے پھٹ پڑا تھا۔ "میں نے تو اس سے نہیں کہا کہ وہ مجھ میں انوالو ہو۔ مجھے پسند کرے اگر وہ کر رہی ہے تو یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ کم از کم وہ مجھ سے توقع نہ رکھے کہ میں اس میں انوالو ہو جاؤں گا۔ اسے پسند کرنے لگوں گا۔"

"تم تھوڑا تو اس کے جذبات کا احترام کرلو۔" گہری سنجیدگی کے ساتھ اس نے کہا۔

"اور جذبات کا احترام کیسے کیا جاتا ہے؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

"کم سے کم نرمی سے ہی بول لیا کرو اس سے۔"

"کیا کروں' فلرٹ کرنا شروع کر دوں اس سے؟" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"اسے فلرٹ نہیں کہتے افنان! یہ سب باتیں یہاں کی تہذیب و تمدن اور اخلاقیات کا حصہ ہیں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"بھاڑ میں جائے تہذیب' چولہے میں جائے تمدن۔ یہاں کی اخلاقیات سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔" میں نے برافروختہ ہو کر کہا اور وہاں سے اٹھ آیا۔

اس دن کے بعد سے مجھے یونیورسٹی سے وحشت ہونے لگی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے آخری سمسٹر ہو۔ اس سیشن کا اختتام ہو جائے اور میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں اس صورت حال سے اکتانے لگا تھا۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ آخر؟" اس دن میں نے بے زار ہو کر مارتھا ایوانز سے

پوچھا تھا۔ ''کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟''

''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

اس نے کبھی مجھ سے یوں کھلا کھلا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا جو اس نے مجھ سے اس طرح کہا تھا اور میں تو یہ سن کر ہی حق دق رہ گیا تھا۔

''بند کرو اس بکواس کو اور آئندہ مجھ سے اس قسم کی کوئی فضول بات مت کرنا۔'' میں غصے سے کانپنے لگا تھا۔

تب میرے سامنے فرش پر دو پانی کے شفاف قطرے گرے تھے...... میں نے بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ میں مرنے کے قریب ہو گیا۔ ایک الماس کے آنسوؤں کے اس دن کا بھگتان ہی ابھی تک میں بھگت رہا تھا کہ یہ دوسری......

''چپ......!'' میں نے دھاڑ کر اسے خاموش کروایا۔

اس نے جیسے سسکی لی تھی۔

''میں نے کبھی کسی سے......'' آنسوؤں کے مارے اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

''آواز بند کرو اپنی۔'' مارے غصے کے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ جیسے لاچاری سے گڑگڑا رہی تھی۔ آنسوؤں اور سسکیوں سے رو رہی تھی۔

''تم مجھ پر رحم کر دو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' انتہائی اہانت آمیز انداز میں کہہ کر میں وہاں سے ہٹ آیا تھا۔

اس کے بعد سے اگر میں نے کبھی اسے دیکھا تھا تو پلکوں کو گیلا اور گالوں کو بھیگا ہی پایا تھا۔ ہر بار جب وہ میرے سامنے رو رہی ہوتی تھی تو میرا دل چاہتا کہ کس کس کے اسے دو تھپڑ لگاؤں اور کہوں ''اب روؤ جتنا رونا ہے۔'' مگر میں یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسے اسی عالم میں اکیلا روتا چھوڑ کر پلٹ جاتا۔

''افنان! تم بہت ظالم ہو۔ ایک دم پتھر۔'' بلال مرتضٰی اس دن بہت تاسف سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں میں سب کچھ ہوں۔ میں ایسا ہی ہوں اور کچھ؟'' میں نے چڑ کر کہا تھا۔

''تم پگھلتے نہیں ہو؟'' وہ اب استعجاب سے پوچھ رہا تھا۔

''میں اب نہیں پگھلتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''تمہیں ایسی ہی ہمدردی ہو رہی ہے تو تم اس کی تسلی کر دو۔''

''تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ وہ مجھ میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ بات ختم ہوئی بس۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

بلال مرتضٰی کچھ مزید کہے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سر پکڑ لیا تھا۔

''اس سے کہو مجھے سکون سے رہنے دے۔ میں تو اس کی اصل کی وجہ سے پہلے ہی عذاب میں مبتلا ہوں۔ وہ مجھے دہرے عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ میں تو پہلے ہی برباد ہوں۔ وہ مجھے مزید برباد نہ کرے۔''

بے بسی سے کہتے ہوئے میرا دھاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں اب تھکنے لگا تھا۔ بے بسی میں مبتلا ہونے لگا تھا۔

وہ عجیب لڑکی تھی۔ دنیا بھر میں کوئی اور رہ نہیں گیا تھا محبت کرنے کے لیے جو وہ مجھ سے محبت کر رہی تھی...... انگلینڈ کے سارے مرد مر گئے تھے کیا جو وہ مجھ پر مر رہی تھی......

"What kind of woman are you?"

اس دن مار تھا ایوانز کو اپنے سامنے روتا گڑگڑاتا دیکھ کر میں نے بڑا تھک کر پوچھا تھا۔ "Don`t you have any self-respect?"

"Those who love, don`t have any self respect"

اس نے بلا تاخیر جواب دیا تھا اور اس کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔

''تم خدا پر، مقدس مریم پر، بائبل پر یقین رکھتی ہو؟ کرائسٹ کو مانتی ہو؟ تم کو ہر اس مقدس چیز کا واسطہ جس کو تم مانتی ہو۔ میرا پیچھا مت کرو۔ میرے پیچھے مت آؤ۔'' بہت بے بس ہو کر میں بالآخر اسے واسطے دینے آ گیا تھا۔

''تمہیں اپنے اللہ، اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اپنے قرآن کا، اپنی مقدس چیزوں کا واسطہ مجھ پر رحم کر دو۔ مجھے اس مشکل سے نکال دو۔''

اس کا جواب سن کر مجھے سکتہ ہو گیا تھا۔ میں اس کے اوپر رحم کیا کرتا۔ میں تو خود اللہ تعالیٰ کا رحم تلاش کر رہا تھا۔ میں اس کو مشکل سے کیا نکالتا، میں تو خود مشکل میں تھا۔ اس مشکل سے نکل جانے کی دعائیں کر رہا تھا۔

''تم جو چاہتی ہو وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔'' میں بہت بے بسی سے کہہ کر پلٹنے لگا۔ اس نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "Don`t leave me like that."

اس نے جیسے التجا کی تھی۔

میں خوف زدہ سا ہو کر ایک دم پیچھے ہٹا۔ بے دردی سے میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"Don`t try to touch me ever."

وحشت کے عالم میں چیخ کر کہتا ہوا میں اس کے پاس سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر میں نے دم لیا تھا۔

اب مجھے یونیورسٹی جانے کے نام سے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے مارتھا ایوانز سے خوف آنے لگا تھا۔ ان دنوں میری ذہنی حالت بالکل اچھی نہیں تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں ادھر سے بھاگ جاؤں۔ فائنل سمسٹر قریب تھے اور میرا کتاب کھول کر دیکھنے تک کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنی جاب چھوڑ دی تھی۔ گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ نمازیں بھی گھر میں پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں ایک دن بلال مرتضیٰ مجھ سے ملنے آیا تھا۔

''کیا بات ہے بھئی' کہاں ہو؟'' دروازہ کھلنے پر میری شکل نظر آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''ادھر ہی ہوں فی الحال تو۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تو یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہے؟ جاب بھی چھوڑ دی۔''

''دل نہیں چاہتا۔'' اس کے حیرانگی سے پوچھنے پر میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیوں بھئی؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''بس یونہی۔'' میں نے کندھے اچکا کر کہا۔

''کیا ارادے ہیں اس بار؟'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے خود نہیں پتا۔''

''ارے یہ کیا جواب ہوا۔'' اس نے بے حد حیران ہو کر پوچھا۔ میں نے اب کی مرتبہ بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ''ارے بھئی' عزت کا سوال ہے۔ تمہارے کیریئر کا سوال ہے۔''

''کیریئر!'' میں نے بے حد چونک کر بلال مرتضیٰ کی شکل دیکھی اور مجھے ایک دم

الفاظ یاد آ گئے تھے۔

''سب کچھ داؤ پر لگا دیا اس نے۔ عاقبت' عزت' آبرو' کیریکٹر' کیریئر اب رہ کیا گیا ہے؟''

کیا فرق تھا اب سے کچھ سالوں پہلے میں اور اب میں......

وہ اگر بے بسی کی انتہا تھی تو یہ بھی لاچاری کی حد تھی......

اُف ابھی بھی تو سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا......

اُف مجھ پر یہ برا وقت کبھی نہ آتا۔ مجھ پر یہ آفت کبھی نہ آتی اگر وہ رات میری زندگی میں نہ آتی۔ یہ ساری اسی کی تباہ کاریاں ہی تو تھیں جو میں بھگت رہا تھا۔ ابھی تک بھگت رہا تھا۔ یہ بات بھولی کب تھی مجھے۔ مجھے تو یہ آج بھی دو سیکنڈ پہلے ہونے والی بات کی طرح یاد تھی۔ بلال مرتضیٰ مجھ سے خاصی دیر سے پوچھ رہا تھا اور بالآخر اس نے مجھے ہلا دیا تھا۔

''کیا بات ہے افنان' تم کچھ ڈسٹرب ہو؟'' اور میں چونک گیا تھا۔

''نہیں...... انہیں تو......''

''بیٹھے بیٹھے کہاں کھو جاتے ہو؟''

''کہیں نہیں۔'' پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

''پھر سن لیا ناں تم نے۔ ایک دنیا کی نظریں تم پر ہیں۔ کئی لوگوں کی توقعات تم سے وابستہ ہیں۔ غیرت کا سوال ہے۔ تمہاری میری' یہاں موجود تمام پاکستانیوں کی۔ پاکستان کی۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا تھا اور میں نے بڑی دقت سے سوچا تھا۔

نہیں...... انہیں' عزت سے زیادہ' میرے کیریکٹر کا سوال ہے۔ یہاں نہ رکنے کا سوال ہے...... اس سے زیادہ اور اس سے آگے مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں نے پاگلوں کی طرح پڑھا تھا۔ دن رات ایک کر کے پڑھا تھا۔ اس خیال کے تحت پڑھا تھا کہ مجھے ہر حال میں اس سمسٹر کو کلیئر کرنا ہے۔ خدانخواستہ سمسٹر نہ دینے یا پھر رہ جانے کا مطلب تھا ادھر رک جانا...... اور میں کسی بھی طور یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ میں مارتھا ایوانز کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے ہول آنے لگا تھا۔ میں یہاں رک کر پاگل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

پھر میں نے پیپر جس عالم میں دیے تھے میں ہی جانتا تھا۔ آخری پیپر والے دن مارتھا ایوانز نے مجھ سے کہا تھا۔

''میں مسلم ہونا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری ہونا چاہتی ہوں۔ یا تم میرے ہو جاؤ۔''

اور میں نے اس سے کہا تھا۔ ''میں نے کبھی نہیں چاہا کہ تم میری ہو جاؤ اور نہ میں تمہارا کبھی ہو سکتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں اس کے لیے انتظار کر سکتی ہوں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' اس نے بلا تاخیر جواب دیا تھا۔

''نہیں، میرا کبھی انتظار مت کرنا۔'' میں نے خوف زدہ سا ہو کر کہا تھا۔ ''میں تمہارے لیے نہ بنا تھا نہ بنا ہوں۔'' دو ٹوک انداز میں کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا تھا۔

پھر میں پلٹ کر یونیورسٹی نہیں گیا تھا لیکن مجھے پتا چلا تھا کہ یونیورسٹی کے اسکول آف انجینئرنگ کی تاریخ میں، میں پہلا اسٹوڈنٹ ہوں جس نے اس کے اگلے پچھلے تمام ٹاپ اسکورز برابر کر دیے تھے۔ لوگ حیرت زدہ تھے اور مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ہاں خوف اور جنون آدمی سے سب کچھ کروا دیتا ہے۔

اسکول آف انجینئرنگ کے ڈین(Dean) جی اے تھامس مجھے خود چل کے مبارک باد دینے آئے تھے اور مجھے پی ایچ ڈی کی آفر بھی دی تھی۔ میرے لیے اس سے زیادہ اعزاز کی بات کیا ہو سکتی تھی مگر رزلٹ پتا چلنے کے بعد میری ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔ چار پانچ سال مزید تو کیا میں تو ادھر پانچ منٹ مزید رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری ذہنی ابتری مجھے اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے میں اگر یہاں رکا تو کیا سے کیا ہو جائے گا۔ میں تو ڈگری کنفرمنٹ کی تقریب تک میں شرکت کرنے کی اپنے اندر ہمت اور جرأت نہیں پا رہا تھا۔ وہاں مارتھا ایوانز ہوتی اور میں مارتھا ایوانز کو......

میں نے پہلی فرصت میں سیٹ کی بکنگ کروا لی تھی اور جس دن مجھے جانا تھا میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ میں خیریت سے یہاں سے نکل جاؤں۔

بلال مرتضیٰ آخری مرتبہ مجھ سے ملنے میرے اپارٹمنٹ آیا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے پیکنگ کرتا دیکھتا رہا تھا۔ پھر بڑی دیر بعد کہا تھا۔

''کم سے کم ڈگری کنفرمنٹ کی تقریب تک تو رک جاتے۔''

میں اس کی بات سن کر خاموش ہو رہا پھر کہا۔ ''ڈگری کنفرمنٹ کی تقریب...

سے بھرپور ہوتی ہیں۔ میں بور نہیں ہونا چاہتا۔''

''بوریت سے بھرپور تب ہی ہوتی ہیں جب آپ عام سے پاس آؤٹ ہونے والے ہوں اور دیگر عام سے پاس آؤٹ ہونے والوں کے ساتھ اپنی ڈگری کنفرم ہونے کا انتظار ہو لیکن جب آپ ٹاپ اسکورر ہوں، تب تو اعزاز کی بات ہوتی ہے اور جب شاہی خاندان کے کسی فرد کے ہاتھوں یہ اعزاز ملنے جا رہا ہو۔ تب تو اور بھی اعزاز کی بات ہوتی ہے۔''

میں نے بلال کی اس لمبی چوڑی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند لمحے بعد وہ خود ہی کہنے لگا۔

''افنان میں نے اپنی زندگی میں تم سے زیادہ عجیب کوئی آدمی نہیں دیکھا۔'' اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ ''تم بیٹھے بٹھائے کہیں کھو جاتے ہو۔ یونیورسٹی سے یوں بھاگ کھڑے ہوتے ہو جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ کسی بھی جگہ کہیں پر بھی با آواز بلند خود سے ہم کلام ہو جاتے ہو۔ ابھی اچھے بھلے ہوتے ہو۔ ابھی کسی پر چیخنے لگتے ہو اور تم یونیورسٹی کی اسکول آف انجینئرنگ کی تاریخ کے تمام ٹاپ اسکورز کی ایسی کی تیسی بھی کر دیتے ہو۔ کسی کو بھی لحہ لحہ حیران کر دیتے ہو۔ تم ہو کیا۔ میں تم کو سمجھ نہیں پایا۔''

''تم مجھ کو سمجھ کے کیا کرو گے۔'' میں نے پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تو خود آج تک اپنے آپ کو سمجھ نہیں پایا۔''

''کسی کسی پر اللہ تعالیٰ کی کچھ خاص نظر ہوتی ہے۔'' وہ مجھے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

میں نے اسے بہت چونک کر دیکھا تھا اور اس کی بات پر صرف خاموشی اختیار کی تھی۔

''کسی کو بھی عزت اور ذلت دینا اس کے اختیار میں ہے اور تم کو عزت دی گئی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

میں ایک بار پھر خاموش رہا تھا۔

وہ مجھے ایئرپورٹ پر رخصت کرنے آیا تھا۔

''میں تم کو ہمیشہ یاد رکھوں گا بلال! مجھ پر تمہارے بہت قرض ہیں۔ احسانات ہیں۔'' اس سے الوداعی طور پر گلے ملتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

''تم نے پھر بے کار کی باتیں شروع کر دیں۔'' اس نے کسی قدر خفگی سے کہا۔

''اب تو میں جا رہا ہوں ناں ادھر سے۔ اس لیے کہہ رہا تھا۔'' میں نے اسے دیکھتے سنجیدگی سے کہا۔

"تم اسے احسانات یا قرض سمجھ رہے ہو لیکن میں نہیں سمجھتا پھر بھی چکانا چاہو تو چکا دینا قرض۔ دینا چاہو تو احسان کا بدلہ دے دینا۔" بلال نے اطمینان سے کہا تھا۔

میں اس کی بات سن کر چند لمحے کے لیے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا۔ پھر خاصی دیر بعد کہا تھا۔ "تم مجھے لاجواب کردیا کرتے ہو۔"

"اور تم مجھے حیران۔" اس نے بے ساختہ ہنس کر کہا۔ "بات برابر ہوگئی۔"

"تم اپنے گھر کا پتا دو مجھے۔ میں تمہارے پیرنٹس کو تمہارے حق میں راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں افنان!" اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "آدمی کو اپنا کیس خود فائٹ کرنا پڑتا ہے۔"

میں اس کے اتنے حتمی انداز پر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں نے تمہیں بتایا نہیں پاپا آئے تھے پچھلے دنوں مجھے لے جانے۔ میں نے ان سے پوچھا۔" کیا آپ لوگ راضی ہو گئے ہیں رقیہ سے میری شادی کے لیے۔" پاپا نے خاموشی اختیار کی اور میں نے ان سے کہا جس دن آپ لوگ میری اس سے شادی کے لیے راضی ہو جائیں گے میں اسی دن پاکستان آجاؤں گا۔ میں شادی کروں گا تو ادھر ہی کروں گا' جہاں چاہتا ہوں اور آپ لوگ چاہیں گے تو کروں گا ورنہ تو نہیں کروں گا اور کسی سے بھی نہیں کروں گا۔ پھر پاپا مزید کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے۔" وہ یہ کہہ کر لمحے بھر کے لیے رنجیدہ ہوا۔ پھر فوراً اپنی جون میں آگیا۔ "لیکن خیر' میں انتظار کررہا ہوں بڑے صبر سے' بڑے حوصلے سے مجھے جلدی کوئی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ رقیہ کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ وہ کسی اور کی ہو نہیں سکتی۔ وہ صرف میری ہے اور مجھے ہی ملے گی۔" اس نے نہایت یقین سے کہا تھا۔

میں نے نہایت رشک سے اس کے یقین بھرے انداز کو دیکھا تھا۔

"میں دعا کروں گا تمہارے لیے کہ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔" میں نے خلوص سے اس سے کہا تھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں تھا بلکہ سر ہلا کر مسکرا دیا تھا۔

"اف..... اٹ از اوور ناؤ۔" ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے بڑی طمانیت سے خود سے کہا تھا۔ جتنا بھی وقت یہاں گزرا ہے' وہ ایک بھیانک خواب کی طرح تھا۔ جو چاہے صبر کے ساتھ گزارا ہو میں نے..... چاہے اذیت میں تکلیف کے ساتھ مر کے گزارا ہو..... بالآخر گزار کے میں ادھر سے جا رہا ہوں.....

میں نے جیٹ برج کے ذریعے Linked جہاز کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا تھا۔ اس عرصے میں مجھے ابو کے الفاظ کبھی نہیں بھولے۔ میں اپنی سوچ کے مطابق صاف ستھرے کردار کے ساتھ شرافت سے' شریفوں کی طرح مار تھا ایوانز سے' الماس کی ہم شکل سے دور جا رہا ہوں۔ آئندہ زندگی کے کسی بھی حصے میں' میری شدید خواہش ہے کہ اس کا دوبارہ سامنا نہ کرنا پڑے مجھے.....

ایئر ہوسٹس کی رہنمائی پر اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے الماس کی ہم شکل کو دیکھ کر ہمیشہ صبر کیا ہے کہ یہ غنیمت ہے کہ الماس نہیں ہے اور اب میری دل سے دعا ہے کہ آئندہ زندگی کے کسی حصے میں کوئی الماس اب کبھی مجھ سے نہ ٹکرائے۔ میں یہ اذیت اب زندگی میں کبھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے جتنی تکلیف اٹھانی تھی میں نے اٹھالی۔ اب میری دعا ہے کہ اس تکلیف' اس مشکل' اس مصیبت میں اللہ تعالیٰ اب مجھے کبھی نہ ڈالے.....

میں نے سیٹ بیلٹ لگا کے آخری دعا کی تھی اور جہاز کے ٹیک آف ہونے کا اعلان ہوتے ہی میں نے پُرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

زیادہ سفر میرا سوتے ہوئے گزرا۔

کراچی ایئرپورٹ پر پہنچ کر میں نے بہت اطمینان کی سانس لی اور گھر جاتے ہوئے میرے ساتھ گلٹی ہونے کی کوئی فیلنگ نہیں تھی۔ گھر بھر مجھے اچانک سامنے دیکھ کر بے حد حیران ہوا کیونکہ میں نے کسی کو بھی اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔

پھر دو دن تو ملنے ملانے میں گزر گئے۔ تیسرے دن سے میں نے آفس جوائن کرلیا تھا اور اس کے اگلے ہی دن لندن کی یونیورسٹی سے لیٹر آیا تھا جس میں میرے پیرنٹس کو مبارک باد دی گئی تھی میرے کارنامے پر۔ اس کے علاوہ مجھے پی ایچ ڈی کرنے کی آفر کی گئی کہ جب بھی میں وہاں سے پی ایچ ڈی کرنا چاہوں تو برٹش گورنمنٹ مجھے سپورٹ کرے گی۔ اتفاق سے یہ لیٹر میں نے ریسیو کیا تھا۔ پڑھ کے میں نے گہری سانس لی تھی اور گھر والوں سے چھپا لیا تھا البتہ اس کے کچھ دن بعد اخبار میں میرے حوالے سے ایک چھوٹی بڑی خبر چھپی تھی جس میں میرا کارنامہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد میری تعریفیں بھی کی گئی تھیں۔ یہ کوئی انٹرویو نہیں تھا بلکہ لندن میں شائع ہونے والی خبر کے حوالے تھے۔ اتفاق سے یہ خبر سب سے پہلے ابو نے پڑھی۔ وہ حیران سے زیادہ مجھ پر برہم ہوئے تھے۔

''کیا ہے یہ لڑکا اتنا کچھ ہو گیا اور اس نے کسی کو بتایا بھی نہیں۔ چپکے سے یہاں آ گیا۔ تمہارا کیا خیال تھا ہم کو پتا نہیں چلے گا۔'' ابو نے سیدھا سیدھا مجھ سے سوال کیا تھا۔ ''تمہارے اوپر ایسی کیا آفت آن پڑی تھی جو تم نے ڈگری کنفرمنٹ کی تقریب کا بھی انتظار نہیں کیا؟''

میں نے ان کی اس بات پر خاموشی اختیار کی۔

''ارے ہم بھی وہاں ہوتے۔ اپنے بیٹے کو اعزازی اسناد ملتے دیکھتے۔ خوشی ہوتی۔ اچھا لگتا۔''

ابو کہہ رہے تھے اور میں اس بار بھی خاموش رہا تھا۔ ابو بہت بے زار تھے مجھ سے۔ ظاہر ہے ان کا کہنا بھی صحیح تھا۔ بلکہ وہ کیا گھر کا ہر فرد باری باری مجھ سے سوال پوچھ رہا تھا کہ میں وہاں سے یونہی کیسے چلا آیا۔ نہ صرف خود رکا ہوتا بلکہ گھر والوں کو بھی اطلاع دی ہوتی' گھر بھر کو بلایا ہوتا۔ بڑے بھائی نے البتہ مجھے گلے لگا کر مبارک باد دی تھی۔

''بہت خوشی ہوئی یہ پڑھ کر۔'' انہوں نے گرم جوشی سے مجھے خود سے لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔ ''زیادہ خوشی تب ہوتی جب ہم تم کو دیکھتے بھی ایسے موقع پر۔ سچ ابو امی کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ اتنی بڑی بات چھپا کیوں لی تم نے افنان؟ تم کو ڈر کس بات کا تھا؟''

بڑے بھائی پوچھ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ میں گھر والوں کو کیا بتاتا۔ کون میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا؟ کبھی نہیں......

میں کن حالات سے گزر کر یہاں آیا تھا۔ کوئی جان سکتا تھا؟ کوئی نہیں......

ابو نے مزید کہا تھا۔ ''ہر الٹا سیدھا کام کروالو اس لڑکے سے بلکہ سیدھے کیا' سارے الٹے کام کرتا ہے۔''

میں ابو کی بات سن کر ہکا بکا سا رہ گیا تھا۔ ابو کا لہجہ سادہ ہی تھا مگر مجھے لگا۔ ہر الٹے کام سے مراد ابو کی اس رات سے تھی۔ ابو مجھ سے اتنا خفا رہتے تھے کہ مجھے اب ان کی سادگی سے کہی گئی ایک بات بھی کھٹک کر کے دل میں لگتی تھی۔ ابو کہے جا رہے تھے۔

''ابھی یہ وہاں رکا ہوتا تو جہاں برٹش گورنمنٹ اسے پی ایچ ڈی کے لیے سپورٹ کر رہی تھی' وہاں اسے جاب بھی آفر کرتی۔ ایسا ہوتا تو کیا بات تھی۔''

اور مجھے پتا نہیں تھا کہ ابو کی بات صحیح ہی ہو جائے گی۔ ابھی جاب جوائن کیے ہوئے مجھے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مجھے جاب کی آفر ہوئی تھی۔ بقول بلال مرتضیٰ کے' یہ تو فوراً قیمت لگاتے ہیں ناں آدمی کی اور ابھی تو

کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ میری پروموشن ہو گئی تھی۔ اوپر سے آنے والے آرڈرز کے نتیجے میں میرا تقرر سیدھا سیدھا ''واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے ہیڈ'' کے طور پر ہوا تھا اور اگر ایسا نہیں بھی ہوتا تو برٹش گورنمنٹ کو مجھے ناں ہی کرنا تھا۔ اس کے باوجود برٹش گورنمنٹ کی آفر برقرار تھی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ گورنمنٹ تو گورنمنٹ تک ہوئی تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے پاکستانی گورنمنٹ سے رابطہ کیا تھا اور مجھے ہر حال میں اپنے ہاں بلانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ پاکستانی گورنمنٹ نے میری قیمت لگانے سے انکار کر دیا تھا اور فوری طور سے مجھے یہ عہدہ دے دیا تھا تاکہ میں بھی کہیں برٹش گورنمنٹ کی آفر کو قبول نہ کر لوں۔

میرے خیال میں یہ پہلی پاکستانی گورنمنٹ تھی جس نے ایسا کوئی فیصلہ کیا تھا۔ ورنہ یہ سچ بات ہے ہمارے بیشتر دماغوں کو یہی اقوام خرید لیتی ہیں کیونکہ اپنے ہی لوگ ناقدری پر تلے ہوتے ہیں۔

ابو کو جب پتا چلا تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوئے۔

''ارے لوگ تو مستقبل بنانے کی فکر کرتے ہیں۔ تم بربادی پر تلے رہتے ہو۔ اتنی اچھی آفر کو تم نے ''نو'' کر دیا۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے سوچ تو لیا کرو کیا کرنے جا رہے ہو۔''

ابو کی بات سن کر چند لمحے تک تو میں یونہی سن سا کھڑا رہا۔ ایک بار پھر مجھے لگا کہ ہے......

میں نے خاصی بے بسی سے امی کو دیکھا تھا۔

''ارے آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ابھی آئے ہوئے اسے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو میں نے اسے اچھی طرح جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔ آپ دوبارہ چاہتے ہیں کہ وہ چلا جائے۔ سن لیجیے آپ' میں نہیں چاہتی کہ اب افنان میری نظر سے اوجھل بھی نہیں۔ کہہ دیا میں نے بس۔ جو کیا اس نے' اچھا کیا۔'' امی نے حتمی لہجے میں ابو سے کہا۔

''تمہارے اس بیٹے کے کسی بھی فیصلے کی تک مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔'' ابو نے بے مزا ہو کر کہا تھا۔

''چھوڑیے ابو' کوئی بات نہیں۔ وہاں اگر اچھا مستقبل ہے اس کا تو ادھر بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہونا ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔'' بڑے بھائی فوراً میری حمایت میں آئے تھے۔ ''اگر اسے اللہ وہاں دے رہا ہے تو یہاں پر بھی تو مل رہا ہے۔ میرے

خیال میں یہ واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہوگا کہ اتنا ینگ اور فریش مائنڈ ہیڈ مقرر ہوا ہو۔ افنان کے لیے اور ہمارے لیے اعزاز ہی کی تو بات ہے۔ پھر جب سرو (Serve) کرنا ہی ٹھہرا تو وہاں کیوں؟ یہاں کیوں نہیں؟ کیسی عجیب بات ہے ناں۔ آدمی کھائے یہاں سے' پڑھے یہاں سے' بنے یہاں سے اور جب اپنی سروسز دینے کا وقت آئے تو آدمی وہاں Serve کرے۔ سب کچھ اُدھر دے۔ ابو' یہ نمک حلالی تو نہ ہوئی۔ افنان' ٹھیک کر رہا ہے۔ اس نے سوچا بھی ٹھیک ہے۔ ہر کوئی اس طرح نہیں سوچتا۔"

بڑے بھائی کے آخری جملوں نے مجھے خاصی شرمندگی میں مبتلا کیا تھا۔ میں نے اس طرح اور اس نہج پر کب سوچا تھا۔ میں تو اپنی مشکل ہی سے نہیں نکل پا رہا تھا۔ بڑے بھائی کی اس بات نے مجھے سوچنے کے لیے نیا گراؤنڈ دیا تھا اور تب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہاں میں اس خیال کو سچ کرنے کی کوشش کروں گا۔

بڑے بھائی کے اس طرح کہنے پر ابو بھی خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے آنکھوں میں بڑا رشک بھر کے بڑے بھائی کو دیکھا تھا۔ ابو ان کی اکثر باتوں کے آگے کچھ زیادہ کہتے نہیں تھے۔ گھر میں ان کی بڑی چلتی تھی اور ابو ان کی بہت سنتے اور مانتے بھی تھے۔ یہ شرف تو چھوٹے بھائی کو بھی حاصل نہیں تھا۔

یوں میں نے واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے ہیڈ کی حیثیت سے باقاعدہ ایک تقریب میں اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس تقریب میں گورنر' وزیر اعلیٰ' صوبائی و وفاقی وزراء برائے بجلی اور پانی کے علاوہ شہر کی ممتاز شخصیات اور اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ تقریب کے اختتام پر اخباری رپورٹرز میرا انٹرویو لینا چاہ رہے تھے۔ میں نے مختصر ترین الفاظ میں سوالات کے جوابات دے کر یہ سلسلہ ختم کیا تھا۔ مجھ سے جب میری ترجیحات پوچھی گئیں تو میں نے کہا تھا۔ ہر وہ کام جو میرا ہے' وہ میری ترجیح ہے۔ مجھ سے جو ہو سکے گا میں کروں گا۔

اسی دن میں نے جنرل باڈی میٹنگ کال کی تھی۔ تمام ڈسٹرکٹ کے ہیڈز کو مخاطب کر کے میں نے اپنی نیچر کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ انہیں اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن پوری کرنے کی تلقین کی تھی۔ انہیں بتا دیا تھا کہ میں خود جائز محنت کی کمائی پر یقین رکھتا ہوں اور ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ جو اِدھر کی اُدھر کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ میں نے سختی سے یہ بات سب پر جتا دی تھی۔

اپنے عہدے کے ساتھ حکومت پاکستان کی طرف سے مجھے فرنشڈ بنگلہ' نوکر' گاڑیاں مع ڈرائیورز' ہائشی ایریا (جو واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کی انڈر پلاننگ تھا) میں دو ہزار گز کے پلاٹ' اس کے علاوہ ہر سہولت جو کسی آفیسر لیول کی جاب رکھنے والے آدمی کو مل سکتی تھیں' مجھے ملی تھیں۔

میں نے بنگلے کے لیے منع کر دیا لیکن اس بار میں نے گھر میں پوچھ لیا تھا ورنہ خواہ مخواہ ابو خفا ہی ہوتے۔ پھر بھی انہوں نے صاف منع کر دیا کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ امی بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کا بھی یہی جواب تھا تو اکیلا میں کیا کرتا' سو میں نے بنگلے کے لیے منع کر دیا۔ ابو اس پر بھی خاصے خفا ہوئے تھے۔

"یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ ملتی ہوئی نعمت کی ناشکری اور ناقدری کرنا کوئی اس سے سیکھے۔"

میں نے چپ چاپ ابو کی سن لی تھی۔ انہیں کیا وضاحتیں دیتا پھرتا میں اسی لیے پاس کے لیے چاہتے ہوئے بھی میں منع نہ کر سکا۔ نوکروں کا ہونا نہ ہونا بے کار تھا۔ امی ابھی تک نوکروں پر بھروسہ نہیں کرتی تھیں۔ گاڑی تو البتہ میری ضرورت ہی تھی۔ اس پر بھی ڈرائیور کی محتاجی مجھے پسند نہیں تھی۔ ہے تو ٹھیک ہے' نہیں تو نہ سہی۔ میری انہی باتوں کی وجہ سے لوگ مجھے احمق اور کھسکا ہوا سمجھتے ہیں۔ میں دوسرے لوگوں کو کیا کہتا۔ میرے گھر والے خود..... مگر میں نے اور لوگوں کی کبھی پروا نہیں کی۔

ذمہ دار افسر ہونے کے باوجود میں نے اپنی گھر کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ ابھی بھی میں ابو کا مطیع' صالح' سعد بیٹا بننے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

جب یہ سارے معاملات سیٹ ہو گئے تھے تو ایک بار پھر میرے گھر والوں کی طرف سے مجھ پر شادی کر لینے کا دباؤ بڑھنے لگا تھا اور اب مجھے اس بات سے چڑ ہونے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں پھٹ پڑتا' ایک بار پھر بڑے بھائی آڑے آ گئے تھے۔

"ارے بھئی' شادی کرنا دنیا کا آخری کام تو نہیں رہ گیا۔ وہ نہیں کرنا چاہتا اگر شادی تو اس کی مرضی ہے۔ جب کرنا چاہے گا کر لے گا۔ ابھی اس پر زبردستی نہ کی جائے۔"

اس طرح بڑے بھائی نے میری جان چھڑائی تھی۔

تین سال بہت سکون سے گزرے تھے۔ جن میں' میں مختلف مصروفیات' ذمہ داریاں میں گھر کر اپنا ماضی تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ اگر کبھی کچھ یاد آ بھی جاتا تو میں ہر

بار نئے سرے سے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا تھا۔ میں اس کو کبھی بھولتا نہیں تھا۔ مگر جب کچھ اور شدت سے اس کو یاد کیا کرتا تھا۔

انہی دنوں میں نے دیکھا کہ بڑے بھائی کچھ اپ سیٹ رہنے لگے ہیں۔ ایک دم کھوئے کھوئے بات مجھ سے کر رہے ہوتے تو دھیان کہیں اور ہوتا۔ فکر مندی چہرے سے ظاہر ہوتی۔ میں نے کافی مرتبہ پوچھا بھی تھا مگر وہ ہر بار ٹال گئے تھے۔ اس دن میں نے بہت پوچھا تو انہوں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''دراصل ہماری کمپنی اپنا ایک اور آفس یہاں Establish کرنا چاہ رہی ہے۔''

''اس میں مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے خاصی حیرانگی سے پوچھا۔ کیونکہ ظاہر ہے ان کی کمپنی ملٹی نیشنل کمپنی تھی اور اس کے لیے مسئلہ ہو بھی کیا سکتا تھا کسی قسم کا۔

''خلدون ابراہیم کو جانتے ہو؟'' انہوں نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا تھا۔

''بہت اچھی طرح سے۔'' میں نے بلا تاخیر جواب دیا۔ ''کافی مشہور آدمی ہیں۔ آرکیٹیکچر اینڈ ڈیزائننگ میں خاصا نام رکھتے ہیں بلکہ وہ بیک وقت بہت کچھ ہیں۔ سول انجینئر، پلس ڈیزائنر، پلس انٹیریئر ڈیکوریٹر۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟'' بڑے بھائی مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''ارے بڑے بھائی! میں کیا، پورا شہر جانتا ہے اتنے شہرت یافتہ آدمی کو۔ دوسرے سادہ مزاج اور درویش صفت آدمی ہیں۔ تیسرے میری ہی لائن کے ہیں۔ جاننا پڑتا ہے۔''

''کبھی ملے ہو؟''

بڑے بھائی کا لہجہ عجیب سا تھا۔ میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میں تو ان کے سوالات پر حیران ہو رہا تھا۔

''جی بڑے بھائی! بہت بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں ان سے پہلی بار باغ ارم ٹاؤن ہاؤسنگ اسکیم کی Inaugural ceremony کے موقع پر ملا تھا۔ اس کی ڈیزائننگ اور کنسٹرکشن وغیرہ انہوں نے ہی کی تھی۔ اس کے بعد سے اکثر میرے آفس میں آنا جانا لگا رہتا ہے ان کا اور وہاں جب بھی آتے ہیں مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتے۔ مجھ سے خاصے متاثر لگتے ہیں۔'' میں نے تفصیلاً بتایا۔

بڑے بھائی سوچ میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔

''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں یہ سب؟ کیا انہوں نے آپ کو اپنی سروسز دینے سے انکار کر دیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہے۔'' بڑے بھائی سنجیدگی سے کہہ کر اٹھ گئے تھے۔ میں ان کو حیرت سے اٹھ کر جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد مجھے بڑے بھائی سے دوبارہ اس سلسلے میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ تھوڑے دن بعد وہ خود بخود ٹھیک ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا بڑے بھائی! آپ کا مسئلہ حل ہو گیا؟'' ایک دن میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کام بھی شروع ہو چکا ہے۔''

''چلیے یہ تو اچھا ہوا ناں! آپ پریشان تھے۔'' میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

پھر اس دن صبح جب میں آفس کے لیے روانہ ہو ہی رہا تھا بڑے بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''افنان میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''جی کہیے!'' میں ایک دم Attentive ہو گیا۔

''دیکھو افنان تم اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر چکے ہو، ذمہ دار عہدے پر فائز ہو اور خود کو اس کا اہل بھی ثابت کر چکے ہو۔ تمہیں فائنانشل پرابلم کوئی نہیں ہے۔ تم ویل اسٹیبلشڈ ہو۔ لہٰذا اب تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟''

بڑے بھائی نے تمہید باندھنی شروع کی تھی اور میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا کہ وہ کس موضوع کی طرف آنا چاہ رہے ہیں۔ میں بہت برا پھنسنے والا تھا۔ سانس روکے بڑے بھائی کی بات سن رہا تھا۔

''امی کا، تمہاری بھابیوں کا تو بہت پہلے سے خیال ہے کہ تم کو شادی کر لینی چاہیے۔ اب یہ ابو اور سمعان کا بھی خیال ہے۔'' یہ کہتے ہوئے بڑے بھائی کے ہونٹوں پر بڑی غیر محسوس سی مسکراہٹ تھی۔

میں لمحے بھر کے لیے تو کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر دھیمے سے ان سے پوچھا۔ ''اور آپ کا کیا خیال ہے؟''

میرا بھی یہی خیال ہے۔'' انہوں نے بلا تاخیر جواب دیا۔

میں ایک بار پھر چپ ہو گیا۔ میں بہت برا پھنس چکا تھا۔

''کیوں؟ کرو گے شادی؟'' وہ متوقع نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اور میں اب کی بار انکار کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا۔ میں ان کی کسی بات کو انکار کر نہیں پاتا تھا۔ سو بے تاثر لہجے میں ان سے کہا۔

''آپ کہیں گے تو میں شادی کر بھی لوں گا۔''

بڑے بھائی کھل کر مسکرائے۔ ''احمق! میں کہہ تو رہا ہوں۔'' بڑے بھائی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''میں انکار نہیں کر رہا۔'' میرے لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''تو کس سے کرو گے شادی؟ کوئی ہے نظر میں؟'' بڑے بھائی نے اب کی بار شرارت سے پوچھا تھا۔

''نہیں' کوئی نظر میں نہیں ہے۔'' میں نے فوراً کہہ دیا تھا۔

''آہم..... کسی کو انگلینڈ میں پسند کر کے بھی نہیں آئے؟'' بڑے بھائی کا لہجہ بدستور شرارت لیے ہوئے تھا۔

اور میرا چہرہ یقیناً فق ہو گیا تھا۔ انگلینڈ سے پتا نہیں کیسے اچانک مجھے مارتھا ایوانز کا خیال آیا تھا اور مارتھا ایوانز سے الماس تک کا فاصلہ لمحے کے ہزارویں حصے میں طے ہو گیا تھا۔

میں دم سادھے چند لمحے تو سکتے کے سے عالم میں گزار گیا تھا۔ تکلیف کے احساس سے مرنے کے قریب ہو گیا۔

کیوں..... کیوں..... کیوں..... یہ سوچ آ بھی کیسے گئی میرے ذہن میں..... الماس اور اس کی ہم شکل کا خیال بھی کیوں آ گیا مجھے.....

میں دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا۔ لعنت ملامت کرنے لگا۔ برا بھلا کہنے لگا۔ لاشعوری طور سے سر جھٹکنے لگا۔ نہیں..... نہیں..... نہیں اللہ تعالیٰ! الماس ہرگز نہیں..... مارتھا ایوانز بالکل نہیں..... تاقیامت نہیں..... کسی قیمت پر نہیں..... کسی صورت نہیں۔

بڑے بھائی منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے بلکہ وہ کیا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ میں اس وقت کس کیفیت سے دوچار تھا۔

''نہیں..... نہیں' میں کسی کو پسند کر کے نہیں آیا۔'' میں نے بہت تکلیف میں کہا تھا۔ ''اب میں کسی کو پسند کرنا افورڈ نہیں کر سکتا۔'' خود بخود میرے لہجے میں لاچاری آ گئی۔

''Sure?'' بڑے بھائی نے تصدیق کرنے والے لہجے میں پوچھا۔

''یقین کر لیجیے بڑے بھائی!'' میں نے بہت لاچاری سے کہا تھا۔

''مجھے خود سے زیادہ تم پر یقین ہے۔'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا تھا اور لمحہ بھر کو میری ہر کیفیت جیسے ہوا ہو گئی تھی۔

''اچھا تو پھر بتاؤ جس لڑکی سے ہم کہیں گے شادی کر لو گے؟'' بڑے بھائی اب مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

''کر لوں گا۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

بس اللہ تعالیٰ وہ کوئی بھی ہو مگر الماس نہ ہو' الماس جیسی نہ ہو..... میں نے آخری دعائیہ جملے بڑے اخلاص سے بے ساختہ دل میں کہے تھے۔

''چہ..... اکیسا فرمانبردار بھائی ہے میرا۔'' بڑے بھائی نے ہنس کر کہہ کر میرے بال بکھرائے اور ایک دم کھینچ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''خوش رہو ہمیشہ!''

اور میرے اندر بجائے اس کے کہ اطمینان اترتا' عجیب سا اضطراب سا اتر آیا۔

پھر اس دن میرے سسرال سے واپس آ کر امی کافی دیر تک مجھے پیار سے دیکھتی رہی تھیں۔ پھر میرے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بہت پیاری لڑکی ہے' بہت جچے گی میرے بیٹے کے ساتھ۔''

''ارے بھئی' بھولاتے ہوئے ہر ساس یہی کہتی ہے۔'' ابو نے پیچھے سے آ کر امی کو چھیڑا تھا۔

امی نے خفگی سے ابو کو دیکھا۔ ''دو مثالیں پہلے ہی آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ میں نے بہوؤں کو ہمیشہ بیٹی سمجھا ہے۔ کیونکہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔''

''ارے بھئی' غلطی ہو گئی مذاق کر رہا تھا۔'' ابو نے ہنس کر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر انہوں نے ایک چھوٹا سا بند خاکی لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''تصویر ہے۔ اس لڑکی کی جو ہم نے تمہارے لیے پسند کی ہے۔'' امی نے مسکرا کر کہا۔

میں نے ایک لمحے کو ابو کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور ان کے ہاتھ سے لفافہ لیتے مجھے حجاب سا آ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے میں نے لفافہ لے لیا اور ویسا کا ویسا ہی لے جا کر بڑے بھائی کو دینا چاہا تو وہ مسکرا پڑے۔

''احمق' یہ مجھے کیوں دے رہے ہو۔ اپنے پاس رکھو ناں۔''

''میں رکھ کر کیا کروں گا۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''بھئی' جب تک وہ خود نہیں آجاتی' تصویر سے کام چلاؤ۔'' بڑے بھائی کے لہجے میں شرارت تھی۔

میں ایک دم خاموش سا ہو گیا۔

''آہم ...... ویسے کیسی لگی؟'' بڑے بھائی مجھے خاموش پا کر پوچھنے لگے۔

''پتا نہیں۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئے۔

''میں نے دیکھا نہیں۔'' میں نے آہستگی سے بتایا۔

''کیوں بھئی؟'' انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ لوگوں نے دیکھ لیا' بس کافی ہے۔'' میں نے غیر دلچسپی سے کہا۔

''ارے' کم از کم ایک نظر تو دیکھ لو۔'' انہوں نے کہا۔

''میں Live دیکھوں گا۔ ایک ہی مرتبہ۔'' لاتعلقی سے کہہ کر میں چلا آیا تھا۔

پھر باقاعدہ بات طے ہونے سے پہلے میرے سسرال والے گھر پر آئے تھے اور ان کے ساتھ میں خلدون ابراہیم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھ سے ہر بار کی طرح بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔ بعد میں بڑے بھائی نے مجھے بتایا کہ یہ میری ہونے والی بیوی کے ماموں ہیں۔

پھر تاریخ طے ہونے کے ساتھ ہی گھر میں باقاعدہ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

☆=======☆=======☆

میری اٹھائیسویں سالگرہ بھی آئی اور ایسے گزر گئی جیسے ستائیسویں سالگرہ آ کر گزر گئی تھی۔ جیسے جیسے میری عمر میں اضافہ ہو رہا تھا' ویسے ویسے ابو کی پیشانی پر فکروں کی لکیروں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تو ابو کی یہ حالت دیکھ کر مجھے رونا آنے لگا تھا۔ امی الگ مختلف بیماریوں میں گھرتی جا رہی تھیں۔ نانی مجھے دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ اٹھتے' بیٹھتے مجھے دیکھ کر صرف ایک ہی دعا کرتیں۔ ''اللہ میری بچی کا نصیب کھول دے! میری بچی کو اس کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دے۔''

نانا کا زیادہ وقت یا تو مسجد میں گزرتا اور اگر گھر پر گزرتا تو جائے نماز وں پر گزرتا۔ ایسے کہ آنکھیں بھیگی رہتیں۔ ہونٹوں پر دعائیں ہوتیں۔ مہر خالہ امی ابو کو تسلیاں دینے کے ساتھ ساتھ اکثر ایسی خواتین کو ساتھ لا رہی ہوتیں جو کئی کامیاب شادیاں کروا چکی ہوتیں۔

میں ہر بار خاموشی سے اپنا تماشا بنتے دیکھتی۔ ایسی خواتین کی تنقیدی' جانچتی' کھوجتی نظروں کا بڑی برداشت سے سامنا کرتی۔ وہ خواتین کھا پی کر پیسہ اینٹھ کر چل دیتیں پھر دنوں گزر جاتے' پلٹ کر کہیں سے کوئی خبر نہ آتی۔ پھر خالہ فون پر فون کھڑکائے جاتیں۔

''ارے بھئی' کچھ کہا تھا آپ سے۔''

''ارے بھئی' کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''ارے بھئی' بھول گئیں کیا؟''

''ارے بھئی' اتنا زمانہ ہو گیا۔ بہت دیر کر رہی ہیں۔''

''واہ' فیس لینے میں تو آپ نے بڑی جلدی دکھائی۔''

اور ایسی ہی کئی باتیں جن کا کچھ حاصل وصول نہ ہوتا۔ ماما جنہوں نے بیچ میں گھر پر آنا قدرے کم کر دیا تھا' اب بلا ناغہ آتے تھے۔ ماما پہلے سے اتنے بدل گئے تھے کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ان میں کئی ڈرامائی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اکثر ماما' سمیر کو اور اپنی بیٹی صالحہ کو ساتھ لے آتے۔ سمیر اب نو سال کا ہو گیا تھا۔ ماشاء اللہ نہایت تیز اور شریر سا تھا۔ ماما کی بیٹی صالحہ محض چار سال کی تھی اور بہت کیوٹ تھی۔ عاقب اور ثاقب اس کے ساتھ چھیڑ خانی میں لگے رہتے تھے۔ اس کو تنگ کر کے مزا لیتے تھے۔ سمیر بہن کی خاطر دونوں سے لڑتا رہتا۔ کچھ دیر کے لیے گھر میں بہت رونق ہو جاتی ورنہ سناٹے گونجتے۔

ماما خاصی دیر تک بیٹھ کر جاتے تھے۔ ابو اور امی سے لمبی لمبی گفتگو کرتے۔ یقیناً ان کو تسلیاں ہی دیا کرتے ہوں گے۔

کوئی مجھ سے کچھ کہتا نہیں تھا لیکن مجھے خود احساس تھا کہ اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی تکلیف کا باعث میں ہوں۔ کچھ دنوں سے میں ابو کا عجیب حال دیکھ رہی تھی۔ وہ گھنٹوں گھنٹوں خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ چھت کو تکتے رہتے' مجھ سے بات کر رہے ہوتے تو ایک دم کھو سے جاتے۔ مجھے دیکھتے رہتے۔ مجھے ابو کو اس طرح دیکھ کر ڈر لگنے لگا تھا۔ ابو کی طرف سے مجھے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں ایسا کیا کروں کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ سیٹ ہو جائے۔ اچھا ہو جائے۔ میں اور شدت سے اپنے ماں باپ کی مشکلات اور پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں کرنے لگی تھی۔

میرا ایم فل مکمل ہو گیا تھا اور میرے سپروائزر کا کہنا تھا کہ مجھے اس ٹاپک کو ادھورا نہیں چھوڑ دینا چاہیے بلکہ اس پر پی ایچ ڈی کرنی چاہیے۔ ابھی یہ معاملہ زیر غور ہی تھا

کہ ایک دن اچانک ماما کچھ اجنبی لوگوں کے ساتھ ہمارے ہاں آئے۔ ان میں تین حضرات اور تین ہی خواتین شامل تھیں۔ پتا چلا یہ لوگ ماما کے جاننے والوں میں سے تھے اور دراصل میرے لیے آئے تھے ان کی آمد کے ساتھ پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے دیکھ کر مجھے تو خاصی حیرانی ہوئی۔ اسی حیرانی میں، میں نے ریفریشمنٹ کا سارا سامان تیار کر کے عاقب ثاقب کے ہاتھوں اندر بھجوایا اور خود جا کر آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد امی ان خواتین کو ساتھ لیے چلی آئی تھیں۔

''یہ میری بیٹی ہے۔'' امی نے بہت شگفتہ لہجے میں ان تینوں کو بتایا تھا۔

میں ان سب کو دیکھ کر سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ارے بیٹھی رہو بیٹی۔'' نسبتاً معمر خاتون نے ایک دم مجھے ٹوکا تھا اور خود بھی بے تکلفی سے میرے بستر پر میرے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ ''یہ دونوں میری بہوئیں ہیں۔'' انہوں نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

وہ دونوں کچھ کہے بغیر بڑی پُرشوق اور نگاہ میں پسندیدگی لیے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے بہو کی تلاش تھی۔'' وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''تم کو دیکھ کر ختم ہو گئی۔''

میں ان کی بات پر کیا کہتی بھلا۔ سر جھکا لیا تھا۔ پھر انہوں نے امی کو مخاطب کر کے کہا۔

''قمر آپ کی بیٹی مجھے بہت پسند آئی۔ اپنے بیٹے کے لیے بڑی امید سے آپ سے اسے مانگ رہی ہوں۔ اسے مجھے دے دیجیے۔''

میں نے ان کی بات سن کر ایک نظر بغور امی کو دیکھا۔ امی کا چہرہ کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ اتنی مدت بعد آج میں نے انہیں خوش دیکھا تھا اور میں نے بڑے دل سے دعا کی تھی۔ ''اللہ تعالیٰ یہ خوشی دائمی ہو اور ماتم پر اس کا اختتام نہ ہو۔'' امی قدرے تذبذب سے کہہ رہی تھیں۔

''حتمی فیصلہ تو ہشام کو کرنا ہے۔''

''آنٹی! آپ انہیں راضی کر لیجیے پلیز! دیورانی مجھے یہی چاہیے ہے بس۔'' یہ غالباً بڑی بہو نے کہا تھا دوسری بہو نے سر ہلا دیا تھا اور معمر خاتون نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔ پھر امی سے کہا تھا۔

''یقین کیجیے قمر! میں نے بہوئیں تلاش کرنے میں دس گھر نہیں جھانکے۔ تین [illegible] ہیں میرے اور [illegible] اگر آپ کا ہے۔ میری دونوں بہوئیں گواہ ہیں اس بات کی [illegible]

[illegible] کے گھروں سے بھی اٹھی تھی تو بات فائنلائز کر کے اٹھی تھی۔ میری اب بھی یہی خواہش ہے اور یہی ارادہ بھی۔''

''بہن! آپ تو بہت جلدی کر رہی ہیں۔ ہم کو سوچنے کا فیصلہ کرنے کا وقت تو دیجیے۔'' امی نے [illegible] انداز میں کہا۔

''آپ کو سوچنے سے روکا کس نے ہے مگر پلیز فیصلہ کرنے میں دیر مت کیجیے گا۔'' انہوں نے کہا تھا اور چلتے وقت اپنے ہاتھ سے جڑاؤ کنگن اتار کر مجھے پہنا دیے تھے۔ ''میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے۔ بس یہ آج سے میرے بیٹے کی ہوئی۔''

سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ امی ارے...... ارے کیا کر رہی ہیں آپ' کہتی رہ گئیں۔ میں بھی بوکھلا سی گئی تھی۔ کنگن اتار کے ان کو دینے چاہے تو انہوں نے ایک نہیں سنی۔

'کچھ نہ کہو۔'' انہوں نے ایک دم مجھے ٹوک دیا تھا۔ ''بہو بنا کر لے کر جاؤں گی۔ [illegible] بنا کر رکھوں گی۔'' پھر میرے گال پر ہاتھ رکھ کر میں پھر آؤں گی' کہہ کر چلی گئی تھیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے ابو کو سر تھامے بیٹھے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ماما مستقل انہیں سمجھا رہے ہیں۔ پھر پتا نہیں ماما نے ان سے کیا کہا تھا کہ وہ افسردگی سے مسکرانے لگے تھے۔

اس بات کے ٹھیک تین دن بعد ماما نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ''ہاں بھئی الماس تم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو تمہاری مرضی آگے پہنچا دوں؟''

''اعتراض تو مجھے پچھلی بار بھی نہیں تھا ماما!'' بہت بے تاثر لہجے میں، میں نے کہا تھا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

''الماس' کوئی وہم دل میں مت لاؤ۔ بس دعا کرو۔'' ماما اتنا کہہ کر بہت آہستگی سے اٹھ گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں سوچ رہی تھی۔ کیا عجب بات ہے' پہلی مرتبہ جب میری بات [illegible] ہوئی تھی تو میں شادی کے لیے رضامند نہیں تھی اور تب میں نے رو رو کر اتنی دعائیں کی تھیں کہ کسی طرح سے یہ شادی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے میری سن بھی لی تھی۔

دوسری بار بلال مرتضیٰ کے گھر والے آئے تھے تو میں راضی بھی تھی اور مطمئن بھی لیکن شاید مجھے راس نہیں آیا تھا اور صرف میرے راضی ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلال مرتضیٰ میرے لیے رضامند نہیں تھا اور وہ مجھے ریجیکٹ کر کے چلا گیا تھا۔

تب جو کچھ ہوا تھا اس کا افسوس مجھے ذرہ برابر بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مصلحت وہی جانتا ہے یا پھر یہ میری سزا تھی جو بہر حال میں نے صبر کے ساتھ اٹھالی تھی۔ شکر کے ساتھ قبول کرلی تھی۔

تب شادی کا جوڑا اتارتے وقت میں نے سوچا تھا۔ شاید سرخ رنگ مجھے راس نہیں آتا......

اور مہندی لگے ہاتھ پیر...... صابن سے دھوتے وقت میں نے سوچا تھا۔ شاید سرخ رنگ سے وابستہ کوئی خوشی میرے نصیب میں نہیں ہے......

اسی لیے بیاہ کا سرخ جوڑا نفیسہ خاتون کو واپس کرتے ہوئے کسی بھی ایسی آرزو کو میں نے اسی وقت دل سے نکال دیا تھا لیکن بعد میں، میں صرف اپنے والدین کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے دعائیں کرنے پر مجبور ہوگئی تھی......

اور اب جب کہ تیسری مرتبہ یہ موقع میری زندگی میں آرہا تھا تو میں بے حد ڈری ہوئی تھی۔ پچھلے دو تجربات اتنے تلخ اور برے تھے کہ اس بار واقعی مجھے اپنے نصیب سے ڈر لگ رہا تھا۔

پچھلی مرتبہ ابو نے مجھ سے سوال ہی ایسا کیا تھا جو بھولنے والا نہیں تھا۔

لاجواب کردینے والا تھا......

شرمندہ کردینے والا تھا......

پچھتاووں میں مبتلا کردینے والا تھا......

تب بہانے کے لیے میرے پاس صرف آنسو رہ گئے تھے......

اٹھانے کے لیے صرف اذیت رہ گئی تھی......

اور چلو...... میں تو خیر جو اٹھا رہی تھی سو اٹھا رہی تھی۔ مجھے اپنی تو کوئی پروا نہیں تھی مگر میرے ماں باپ...... مجھے سارا خوف انہی کی تکلیف کا تھا۔ مجھے اپنی برداشت تھی مگر اس بار ان کی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہ تھا۔

☆======☆======☆

سب کہتے ہیں کہ خلدون ابراہیم بہت غصے والا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ مجھے یعنی خلدون ابراہیم کو غصہ بہت کم آتا ہے بلکہ اب تو بہت ہی کم آتا ہے۔ آخری بار مجھے غصہ اس رات آیا تھا جب رات کے اندھیرے اور سناٹے میں میں نے الماس کی سرگوشی نما چیخ سنی تھی۔ میں اس وقت ایک لمحے کو ڈر...... سنانے میں......

مجھے یقین ہی نہ آیا تھا کہ میرے کانوں تک الماس کی آواز پہنچی ہے۔ میں نے بے چینی، دکھ، صدمے، افسوس، بے اعتباری اور غصے کے عالم میں پکارا تھا۔ ''الماس!''

پھر مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا اور میں نے اس لڑکے کے بعد الماس کو بھی اچھی طرح سبق سکھا دیا تھا۔

اس کے بعد میں نے مسلسل الماس کو روتے، بلکتے اور اذیتیں اٹھاتے دیکھا۔ میں نے اکثر یہ سوچا کہ اگر اس رات میں شدید غصے کے بجائے کسی اور طریقے سے الماس کو سمجھاتا تو وہ یقیناً سمجھ جاتی۔ تب شاید اس کی زندگی میں اتنی تکلیفیں اور اذیتیں نہ آتیں۔ چند لمحوں کے اس کھیل میں جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا لیکن اس کے اثرات اب تک باقی ہے۔

گو کہ میں اپنی ذمہ داریوں میں گھر کر بہت مصروف ہو چکا تھا۔ اس میں سارا عمل دخل میرے بزنس کا تھا جو کہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ اپنے شہر میں آرکیٹیکچر اینڈ ڈیزائننگ کی دنیا میں میرا نام اب نیا نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے شہر کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی کئی عمارتیں ڈیزائن کی تھیں۔ شہر سے باہر کے کلائنٹس ہر وقت مجھ سے رابطے میں رہتے تھے۔ میں بھی ملک بھر میں گھومتا پھرتا تھا۔ نیشنل لیول کے علاوہ میں نے انٹرنیشنل لیول کے پراجیکٹس پر بھی کام کیا تھا۔ یہ ساری کامیابی میری کئی سالوں کی محنت کا نچوڑ تھی۔ بڑھتی ہوئی مصروفیت کے باوجود میں الماس سے ملنے اب بھی جاتا رہتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الماس بہت سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ہشام بھائی کو الماس کی فکر گھلائے جارہی تھی اور آپا تو مستقل مریض بن کر رہ گئی تھیں۔ میں نے جب یہ عالم دیکھا تو ہشام بھائی اور آپا کے لیے خاص طور پر وقت نکالنے لگا۔ دونوں کو تسلی دیتا اور سمجھاتا رہتا تھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ نادانی کے عالم میں الماس سے جو کچھ ہوا تھا، ہوش و حواس میں اس نے اس سے کہیں زیادہ بھگتا تھا بلکہ ابھی تک بھگت رہی تھی۔ خاموش اور چپ چپ سی الماس اپنے کام سے کام رکھتی۔ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی۔ ہشام بھائی دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ سال گنتے رہتے۔ اب الماس چھبیس سال کی ہوگئی۔ اب چھبیس سال کی ہوگئی۔ ستائیس سال کو کراس کرتے اور اٹھائیسویں میں قدم رکھتے ہی ہشام بھائی کی راتوں کی نیندیں بھی اڑ گئیں۔

''اکلوتی بیٹی ہے میری۔ میں اسے تک رخصت نہیں کر پا رہا ہوں۔ ایک ہی ذمہ داری ہے میری۔ اسے تک پورا نہیں کر پا رہا ہوں میں۔''

اس دن میرے بہت سمجھانے پر ہشام بھائی نے خود کلامی کے سے عالم میں کہا تھا۔
میں لمحے بھر کے لیے تو کچھ نہ بول سکا۔ ہشام بھائی کہہ رہے تھے۔
''میں کل کو مر مرا گیا تو اسے کس کے اوپر چھوڑ کر جاؤں گا؟ بھائی تو کسی کے نہیں ہوتے۔''
''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ہشام بھائی!'' میں نے ایک دم لرز کر کہا تھا۔
''آپ صرف میری بھانجی کے باپ نہیں ہیں بلکہ میری بہن کے شوہر بھی ہیں۔''
ہشام بھائی چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ ''تم بتاؤ مجھ کو خلدون! میری زندگی کا کیا بھروسہ ہے؟'' رنجیدگی سے انہوں نے سوال کیا۔ ''کل کس نے دیکھی ہے؟''
''ہشام بھائی! زندگی کا تو میری بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے تو 'ماشاء اللہ' بچے بڑے ہیں۔ اس قابل ہیں کہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکیں۔ میرے تو بچے بھی چھوٹے ہیں۔ کل تو میں نے بھی نہیں دیکھی ہشام بھائی!''
''نہیں...... نہیں خلدون! اللہ تعالیٰ تمہارا سایہ تمہارے بچوں کے سروں پر سلامت رکھے۔'' ہشام بھائی نے تڑپ کر کہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرایا۔
''اللہ تعالیٰ آپ کا بھی سایہ میری بہن اور اس کے بچوں پر سلامت رکھے۔ انشاء اللہ الماس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ اس کی فکر مت کریں۔ اللہ نے چاہا تو آپ اس ذمہ داری سے بھی نمٹ جائیں گے۔'' میں نے بے حد یقین سے کہا۔
''ہاں' یہی تو ساری شرط ہے۔ اللہ نے چاہا تو......'' ہشام بھائی بے دلی سے ہنسے۔ میں ہشام بھائی کی بات اور ان کے انداز پر لرز کر رہ گیا تھا۔ بے اختیار میرے دل سے اس لمحے دعائیں نکلی تھیں۔
جب سے ہشام بھائی نے مجھ سے یہ بات کی تھی' میں بھی پریشان سا رہنے لگا تھا۔ سچی بات ہے یقین تو بہت تھا مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر' امید بھی بے حد تھی مگر ... دعائیں بھی یقین سے کر رہا تھا مگر اس پریشانی پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔
پتا نہیں یہ الماس کی سزا تھی یا کیا تھا کہ بھگت وہ بھی رہی تھی اور ہم بھی متاثر ہو رہے تھے۔ میں سے تھے۔
''پتا نہیں کیسا نصیب تھا الماس کا کہ کھل کر ہی نہیں دیتا تھا......
پتا نہیں کیسی قسمت تھی اس کی کہ جاگتی ہی نہیں تھی......
یہ ایک ایسی پریشانی تھی جو گھر بھر کی مشترکہ تھی اور ہم ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے۔

شیئر کرتے تھے۔
ان دنوں میری آفس کے معاملات سے بھی عدم دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ میں کسی نئے پراجیکٹ میں ہاتھ ڈال ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ پرانے Projects ہی کو جلدی جلدی مکمل کروانے کی کوششوں میں تھا۔ اس دن بھی میں آدھے پونے گھنٹے آفس میں بیٹھ کر اٹھنے ہی کو تھا کہ میرے پاس ایک فون آیا۔
''ہیلو' السلام علیکم! جناب 'خلدون ابراہیم صاحب تشریف رکھتے ہیں؟'' بڑی متاثر کن مگر اجنبی مردانہ آواز میں پوچھا گیا تھا۔
''جی ہاں' بات کر رہا ہوں۔'' میں نے آواز پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''اوہ! میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ آپ ہی فون ریسیو کریں گے۔'' دوسری طرف ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہا گیا تھا۔ میں بھی بے اختیار مسکرایا۔
''جی ہاں' میں بس جانے ہی والا تھا۔ پھر اس صورت میں آفس کا کوئی اور آدمی فون ریسیو کرتا۔''
''چلیے' یہ بھی اچھا ہی ہوا ناں۔'' دوسری جانب سے بڑی خوش مزاجی سے جواب ملا تھا۔
''مگر معاف کیجیے گا ابھی تک آپ سے تعارف کا شرف حاصل نہیں ہوا۔'' میں نے اس بار قدرے الجھن سے کہا تھا۔
''میں کاشان عادل بات کر رہا ہوں۔ ڈائریکٹر......'' دوسری طرف سے ایک مشہور ملٹی نیشنل کمپنی کا حوالہ دیا گیا۔
''جی فرمائیے' کیسے زحمت کی؟'' میں نے خالصتاً پروفیشنل انداز میں پوچھا۔
''ہماری کمپنی دراصل ایک اور آفس یہاں Establish کرنا چاہ رہی ہے۔ اس لیے ہم آپ کی خدمات کے طالب ہیں۔ آپ کی مہارت' آپ کے فن آپ کے کام کے کام سے ہم متاثر ہیں اور چاہتے ہیں کہ ڈیزائننگ سے لے کر کنسٹرکشن اور انٹیریئر ڈیکوریشن تک کا سارا کام آپ ہی کریں۔''
دوسری طرف سے کہے جانے پر میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں خیال آیا کہ اسے منع کر دوں کہ معاف کیجیے گا۔ میں کسی نئے کام میں آج کل ہاتھ ڈالنے ہی میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں مگر پھر اگلے ہی لمحے نہ جانے کیا سوچ کر میں نے ایک دم اس سے کہا۔
''تو پھر کسی دن آفس تشریف لائیے۔ بیٹھ کر تفصیلی گفتگو کریں گے۔''

''کسی دن کیوں، کل ہی کیوں نہیں۔'' دوسری طرف سے جاندار قہقہے کے بعد کہا گیا۔

''چلیے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تو پھر کل کی ملاقات طے رہی؟'' دوسری طرف سے تصدیق چاہی گئی۔ پھر وقت اور دوسری کچھ اور رسمی باتوں کے بعد فون رکھ دیا گیا۔

پھر اگلے دن طے شدہ وقت اور ملاقات کے مطابق آنے والی شخصیت کو دیکھ کر میں کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

اور اس وقت آنے والی شخصیت کے منہ سے بھی۔ ''آپ'' ہی نکلا تھا۔

چند لمحے تک ہم دونوں ایک دوسرے کو یونہی کھڑے دیکھتے رہے۔

میں اگر صدمے کی حالت میں تھا تو سامنے والا بھی کم شاک میں نہیں تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر ایسے آدمی سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے جو کاشان عادل کہلاتا ہے۔ جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا ڈائریکٹر ہے اور جو میرا کلائنٹ بن کے میرے پاس آئے گا اور جو اسی لڑکے کا بھائی ہے جس کی میں کئی سال پہلے ٹھیک ٹھاک مرمت کر چکا ہوں۔

ایک دم ہی اس رات کے کئی مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میں نے تصور کر کے جھرجھری سی لی اور سر جھٹکنے لگا۔

غالباً کاشان عادل کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

''مم...... مجھے علم نہیں تھا کہ آپ ہی خلدون ابراہیم ہیں۔''

نہایت صدمے کی سی کیفیت میں اس کے منہ سے نکلا تھا اور میرے دل میں آیا تھا کہ اس سے کہوں اور اگر مجھے پتا ہوتا کہ کاشان عادل کون ہے تو میں کہیں vanish ہو جاتا۔

ایک نہایت گہری سانس میرے پھیپھڑوں سے آزاد ہوئی اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ اس وقت میرا کلائنٹ بن کے میرے پاس آیا ہوا ہے' سو کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تشریف رکھیے پلیز۔''

''جی شکریہ۔''

اس کے لہجے میں تکلف آ گیا۔ ''تاہم اس نے میری آفر کو رد نہیں کیا تھا۔ خاصی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''چائے' کافی یا کولڈ ڈرنک۔'' مجھے ایک دم پوچھنے کا خیال آیا کہ وہ صرف میرا کلائنٹ ہی نہیں تھا بلکہ اس وقت میرا مہمان بھی تھا اور پہلی مرتبہ میرے آفس آیا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' بہت تکلف سے اس نے کہا۔

میں نے بھی کوئی اصرار نہیں کیا۔ فضا میں ایک بار پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

''آپ کی بھانجی......'' خاصی دیر بعد اس نے پوچھا مگر جملہ مکمل نہ کیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ تذکرتاً پوچھ لیا ہے۔

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' میں نے بہت عام سے انداز میں کہا۔

اس نے سر ہلا دیا پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے الماس کو پوچھا ہے تو مجھے بھی مروتاً اس کے بھائی کو پوچھ لینا چاہیے۔ اتنی کرٹسی تو مجھ میں بھی ہونی ہی چاہیے۔

''آپ کا بھائی......'' میں نے بھی اسی کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں' وہ بھی ٹھیک ہے الحمد للہ!'' اس نے میرے ہی انداز میں جواب دیا۔ میں نے سر ہلا دیا۔

''مہینوں بعد جا کر اچھا ہوا تھا۔ چوٹیں بہت گہری آئی تھیں اسے۔'' کافی دیر بعد اس نے بتایا۔

میں نے یہ کہنے کے لیے منہ کھولا کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ کا حق دار تھا مگر میں نے ایک دم منہ بند کر لیا کیونکہ کاشان عادل نے فوراً ہی کہا تھا۔

''میں آپ کو Blame نہیں دے رہا ہوں۔ اس رات غلطی میرے بھائی ہی کی تھی۔ کچھ عجب نہیں تھا آپ کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید یہی کرتا۔'' اس نے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی پھر کہا۔ ''ہم شریف لوگ ہیں خلدون صاحب۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ہچکچاتے نہیں ہیں۔''

میں نے بھی مزید کچھ نہیں کہا۔ میں کہتا بھی کیا۔ سامنے والا جب خود ہی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سچائی قبول کر رہا تھا تو اس پر مزید سچائی مسلط کرنا کہاں کی شرافت تھی۔ کیونکہ اس سب کے باوجود میں بھی basically ایک شریف آدمی ہی ہوں۔

ہمارے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آ گیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھی بات ہے۔ اجازت دیجیے۔''

میں بھی سر کو خفیف سا خم دیتا میکانکی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھ سے بھی آفس میں بیٹھا نہیں گیا۔ بلا مقصد ہی

میں سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ نہ جانے ایسی کیا بے چینی تھی جو ختم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں کیوں بے چین ہوں۔ اس رات میرے ہاتھوں اس لڑکے کو زندگی بھر کے لیے سبق سکھا دیا گیا تھا۔ کاشان عادل خود اس بات کو تسلیم کر کے گیا ہے۔ الماس کو بہت اچھی طرح سے عقل آ گئی ہے۔ وہ بالکل ایسی ہی ہو گئی ہے جیسی میں چاہتا تھا کہ اس کو ہونا چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے؟

مجھے جواب نہ مل سکا۔

اگلے دن پھر اس سے اگلے دن...... میرا آفس میں پہلے ہی دل نہیں لگ رہا تھا اب کچھ اور نہ لگ سکا۔

کاشان عادل نے اس دن کے بعد سے پلٹ کر رابطہ نہیں کیا تھا اور مجھے پتا تھا وہ کرے گا بھی نہیں۔ اسے پتا ہوتا کہ خلدون ابراہیم کون ہے تو وہ میرے آفس میں قدم بھی نہ رکھتا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خاصی حیرانی ہوئی کہ ایک ہفتے بعد وہ ایک بار پھر میرے آفس میں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی معذرتی انداز میں اس نے کہا۔

''معاف کیجیے گا۔ میں آپ سے فون پر وقت نہ لے سکا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میری بھی ایسی کوئی خاص مصروفیت تھی نہیں۔'' میں نے جرا مسکرا کر کہا۔ پھر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ بیٹھیے ناں پلیز۔''

''شکریہ۔'' کہہ کر وہ تکلف سے کرسی پر ٹک گیا۔ ''کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی متفقہ رائے آپ کے حق میں ہے خلدون صاحب۔'' کاشان عادل نے جیسے دل پر پتھر رکھ کر بتایا تھا۔ ''اسے خوش قسمتی کہہ لیجیے یا بدقسمتی کہ بورڈ نے ساری Details ڈسکس کرنے کے لیے بھی مجھے ہی Nominate کیا ہے۔'' اس نے پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اپنی Services سے ہمیں فیض یاب کریں گے؟ کیا آپ میری بات سے Agree کرتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں بالکل Agree کرتا ہوں۔ آپ جیسا کہیں۔''

''اچھا تو آپ اگر کہیں اور مصروف نہیں ہیں تو بات کر لی جائے۔''

''وہ سب تو ہوتا رہے گا۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''پہلے آپ بتائیے چائے یا کافی؟'' میں نے اچھے میزبانوں کی طرح پوچھا۔

''نو تھینکس پھر کبھی۔'' اس نے شائستگی سے انکار کر دیا۔

''اس بار تکلف نہیں چلے گا کاشان صاحب۔'' میں نے اس بار ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کافی۔'' اب کی بار اس نے بغیر کسی حجت کے کہا۔

میں نے چپراسی کو بلا کر کافی اور سینڈوچز منگوائے۔ اس دوران وہ مجھے ساری تفصیلات بتاتا رہا۔ میں نوٹ کرتا رہا۔ ساتھ ہی مزید تفصیلات جاننے کے لیے سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ اتنے میں کافی آ گئی۔ بات چیت کا سلسلہ رک گیا۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔

''شادی ہو گئی آپ کی بھانجی کی؟'' کاشان عادل نے اچانک سوال کیا تھا۔

میں چونک سا گیا تھا۔ تاہم بڑے بے تاثر انداز میں کہا۔ ''جی نہیں۔''

''کیا کر رہی ہے وہ آج کل؟'' اس نے تکلف سے سینڈوچ کا کونا توڑتے ہوئے پھر پوچھا۔

''ایم فل کیا ہے اس نے۔'' میں نے مختصراً بتایا۔

''کہاں سے؟'' اس نے پھر پوچھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مجھے اس کا اس طرح پوچھنا برا نہیں لگ رہا تھا بلکہ میں بڑے آرام سے اس کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا۔

''یونیورسٹی کے مائیکرو بیالوجی ڈپارٹمنٹ سے۔''

''میرے بھائی نے ایم ایس کیا ہے۔ بنیادی طور سے وہ بھی انجینئر ہے۔'' کاشان عادل نے خود ہی بتایا۔

انجینئر کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آدمی میری ہی لائن کا تھا۔ مجھے اور بھی دلچسپی ہوئی۔

''پی ای کب کیا ہے؟''

''آٹھ نو سال پہلے۔'' اس نے مختصراً بتایا۔ ''پھر وہ اسکالرشپ پر انگلینڈ چلا گیا تھا اور آج کل وہ واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہے۔''

میں اس کی بات پر چونک گیا۔

''آپ...... آپ...... کہیں افنان عادل کی تو بات نہیں کر رہے؟'' میں نے لڑکھڑاتی سی آواز میں پوچھا تھا۔

''جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔'' وہ سر ہلا کر گویا۔

''وہ.....وہ..... آپ کا بھائی ہے؟'' مجھ سے مارے صدمے کے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''جی ہاں۔'' وہ متانت سے مسکرایا۔ ''آپ جانتے ہیں اسے؟'' وہ اب مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' میں نے مردہ سی آواز میں کہا تھا۔

''پھر تو آپ مل بھی چکے ہوں اس سے۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

''بہت مرتبہ۔'' کہتے ہوئے میرے لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کیونکہ تب بہت مرتبہ اس سے ملتے ہوئے میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ افنان عادل کون ہے۔

پہلی مرتبہ میری اس سے ملاقات ''باغ ارم ٹاؤن ہاؤسنگ اسکیم'' کی افتتاحی تقریب میں ہوئی تھی اور اس موقع پر اس نے ایک ٹیکنیکل فالٹ کی طرف نشاندہی کی تھی اور بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ تب میں نے اسی وقت جانچ لیا تھا کہ وہ ایک بہت قابل اور ذہین آدمی ہے۔ میرا واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے آفس میں اکثر آنا جانا لگا ہی رہتا تھا اور جب بھی میرا وہاں سے گزر ہوتا تھا میں افنان عادل سے ضرور ملنے جاتا تھا۔ وہ بھی بڑی خندہ پیشانی اور وضع داری سے مجھ سے ملتا تھا۔ مجھے اس سے مل کر ہمیشہ خوشی ہی ہوتی تھی۔ میں کیا جانتا تھا کہ افنان عادل...... حد تو یہ تھی کہ جب کاشان عادل کو پہلی مرتبہ میں نے دیکھا تھا۔ تب بھی مجھے یہ خیال بالکل نہیں آیا تھا کہ افنان عادل' کاشان عادل کا بھائی بھی ہو سکتا ہے اگر شکلیں نہیں تو کم از کم ان کے نام تو آپس میں ملتے ہی تھے۔

کاشان عادل کہہ رہا تھا۔

''بہت ذہین ہے میرا بھائی ماشاء اللہ! یہاں کی انجینئرنگ یونیورسٹی کا سیکنڈ پوزیشن ہولڈر اور لندن کی یونیورسٹی کی تاریخ میں تمام پوزیشن ہولڈرز کا اسکور بریکر ہے افنان۔'' کاشان عادل کے لہجے میں فخر سمٹ آیا تھا۔

اور مجھے یاد آیا تھا کہ تین سال پہلے ایسی ایک خبر میری نظر سے گزری تو تھی۔ مجھے ایک دم چپ سی لگ گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جسے اس دن میرے ہاتھوں ذلیل کیا گیا تھا۔ بے عزت کیا گیا اور اب وہی افنان عادل ایسا آدمی ہے کہ اب اسے بے حد و حساب عزت دے دی گئی ہے۔ ایک دنیا اس کی تکریم کرتی ہے عزت کرتی ہے۔ میں دنیا کی کیا بات کہوں' میں خود اس کی تکریم کرتا ہوں۔ اس کی عزت کرتا ہوں۔ میں اس سے متاثر بھی تھا متاثر ہوئے جا رہا تھا۔

کاشان عادل خاموش ہو گیا تھا اب اور میں بھی چپ تھا۔ ہمارے درمیان

کا لمبا وقفہ آ گیا تھا۔

''میں جانتا نہیں تھا کہ افنان عادل آپ کا بھائی ہے۔'' خاصی دیر بعد میں نے کہا۔

''جی ہاں' بہت سارے لوگ نہیں جانتے۔'' وہ تکلف سے مسکرا رہا تھا۔ ایک بار پھر ہمارے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آ گیا۔ کافی ختم ہو گئی۔ سینڈوچ آدھے ہو گئے۔

''آپ کی شادی ہو گئی؟'' بلا ارادہ بغیر سوچے سمجھے ایک بے تکا سوال میرے منہ سے نکلا تھا۔

وہ اب کی بار کھل کے مسکرایا تھا۔ ''جی ہاں کافی سال پہلے ہو گئی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ! میرے دو بیٹے بھی ہیں۔ ایک بارہ سال کا دوسرا پانچ سال کا۔ بڑے بیٹے کا نام فاران عادل ہے اور چھوٹے بیٹے کا نام عفان عادل۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''اوہ' آپ کے بچوں کے نام کے آگے آپ کے والد صاحب کا نام لگتا ہے۔'' میں نے قدرے حیرانگی سے کہا۔ پھر میرا لہجہ بے تاثر ہو گیا۔ ''ہاں' یہ اچھی روایت ہے۔''

''جی ہاں' نہ صرف میرے بچوں کے نام کے آگے بلکہ میرے چھوٹے بھائی کے بچوں کے نام کے آگے بھی والد صاحب کا نام لگتا ہے۔'' اس نے خفیف سا مسکراتے ہوئے بتایا۔

اس بات پر میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ ''آپ کے چھوٹے بھائی کی شادی ہو چکی ہے؟'' قدرے حیرانگی سے میں نے پوچھا تھا۔

''جی ہاں' میرے چھوٹے بھائی کی بھی ایک عرصے پہلے شادی ہو گئی تھی۔ اس کے بھی دو بچے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں نے بے تاثر انداز میں کہا۔

''اب بس صرف افنان ہی رہ گیا ہے۔'' اس کی اس بات پر ایک بار پھر میں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''سب سے چھوٹا ہے ناں افنان۔'' کاشان عادل نے وضاحت دی۔ اس کے لہجے میں بے حد محبت تھی۔

''میرے خیال میں اتنی تفصیلات کافی ہوں گی۔'' کاشان عادل کہہ رہا تھا اور میں افنان عادل ہی کے متعلق سوچ رہا تھا چونک سا پڑا تھا۔

''جی ہاں...... جی ہاں......''

''پھر آپ کب تک......'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''بس کچھ formalities کے بعد......'' میں نے اسے یقین دلایا تھا۔

''جی ہاں! ہماری طرف سے سب تیار ہے۔ آپ اپنی طرف سے دیکھ لیجیے گا۔''
کاشان عادل نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پھر مجھے اجازت ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کھڑے ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ جسے اس نے بغیر ہچکچاہٹ کے تھام لیا۔ میں اسے رخصت کرنے باہر تک گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے الوداعی طور سے ہاتھ ہلایا اور چلا گیا۔

پھر میں نے دیگر formalities کے بعد باقاعدہ کام کا آغاز کر دیا تھا۔ کاشان عادل سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ میں اگرچہ اس کی کمپنی کے دیگر اعلیٰ عہدے داران سے بھی ملا تھا۔ مگر کسی میں بھی کاشان عادل جیسی بات نہیں تھی۔ وہ ایک معاملہ فہم اور ذہین آدمی تھا۔ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بات کرنے کا انداز شائستہ اطوار اسے اچھے خاندان کا فرد ثابت کرتے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے میں نے افنان عادل کے متعلق رائے قائم کی تھی۔ اس کے متعلق بھی مجھے ماننا پڑا تھا کہ میں نے اسے ایک اچھا انسان پایا تھا۔ اپنے کہنے کے مطابق وہ واقعی شریف لوگوں میں سے تھا۔ غالباً اس کی میرے متعلق بھی یہی رائے تھی جو ایک دن اس نے مجھ پر واضح بھی کر دی تھی۔

''کمال ہے خلدون ابراہیم صاحب آپ کو میں نے جیسا سمجھا تھا آپ ویسے ہیں نہیں۔''
میں نے اس کی بات پر بہت گہری سانس لی تھی اور کہا تھا۔

''کاشان صاحب ایک ہی ملاقات میں کسی کے متعلق رائے کبھی قائم نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی کسی کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلدی کرنی چاہیے اور وہ بھی جب کہ صورت حال بھی اتنی نازک ہو۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کاشان صاحب کہ میں بھی شریف لوگوں میں سے ہوں اور غصہ آدمی کو جانور بنا دیتا ہے پھر جائز بات پر......''

وہ میری بات سن کر لمحہ بھر کو تو چپ سا ہو گیا۔ پھر ایک دم بات پلٹ دی۔

مجھے اکثر لگتا جیسے کاشان عادل میرے کام سے متاثر ہے اور ایک دن اس نے مجھ سے کہہ بھی دیا تھا۔

''خلدون صاحب! میں نے آپ کی ڈیزائن کی ہوئی کئی عمارتیں' مساجد' ریسٹورنٹس' آفسز وغیرہ دیکھے ہیں۔ ہر کسی کی اپنی ڈیزائننگ ہے۔ اپنا آرکیٹیکچر ہے اور بہت خوب ہے۔ ہر پراجیکٹ دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ کسی میں بھی کوئی similarity نہیں ہے۔ آپ ایسا کیسے کر لیتے ہیں؟''

میں خفیف سا مسکرایا۔ ''یہ سارے کام آدمی کی creative nature اس سے کرواتی ہے۔''

''creative nature رکھنے والے تو زیادہ تر آرٹسٹ ہوتے ہیں یعنی آپ ایک اچھے آرٹسٹ بھی ہیں۔'' اس نے فوراً کہا۔

''تعریف کا بہت شکریہ کاشان صاحب۔'' میں نے انکساری سے کہا۔ ''آپ کی معاملہ فہمی' ذہانت اور انداز گفتگو سے تو میں ہمیشہ سے متاثر ہوں۔''

کاشان عادل ہلکے سے ہنسا۔ ''آپ کچھ رکھتے نہیں ہیں' سب برابر کر دیتے ہیں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کاشان صاحب۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''میرے خیال میں اگر کسی میں کوئی کوالٹی ہو تو اعتراف بھی کرنا چاہیے اور اس کی ستائش بھی۔''

کاشان عادل چپ ہو گیا پھر چند لمحے بعد بولا۔ ''میرا بھائی اگرچہ اپنی فیلڈ میں ایکسپرٹ ہے اور بہت جینئس بھی مگر میرا بھائی آپ سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آپ میرے بھائی کے لیے اچھے استاد ثابت ہو سکتے ہیں۔''

میں ایک دم چپ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے آپ کو پسند نہیں آئی میری بات۔'' اس نے میری خاموشی کو محسوس کر کے فوراً کہا۔

''نہیں...... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میرا لہجہ خود بخود دھیما ہو گیا۔ ''میں سوچ رہا تھا آپ کا بھائی تو استادوں کا استاد ہے۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

اس نے بغور مجھے دیکھا۔ ''میں اسے compliment سمجھوں یا sarcasm۔''

''آپ نے میرے پچھلے جملے پر شاید غور نہیں کیا' کاشان صاحب! میں آپ کے بھائی کی کوالٹی کا اعتراف کر رہا ہوں اور ستائش بھی۔''

''اچھا'' وہ چند لمحے رکا پھر کہا۔ ''پھر اگر میں آپ کو کوئی پرپوزل دوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟'' میں اس کی بات پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''کافی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے کہوں مگر اس خیال سے کہ آپ برا نہ مان جائیں۔ میں کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔'' اس کی اس بات پر اب کی بار میں متجسس ہو گیا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا تھا۔ ''ہمارے خاندان کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آپ کے خاندان کے بارے میں مجھے پتا ہے۔'' وہ چند لمحے کے لیے رکا پھر کہا۔ ''آپ واقف ہیں ...... مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ میرا بھائی آپ کی بھانجی میں انٹرسٹڈ بھی رہ

چکا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا۔ میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے اسی لیے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ کی بھانجی ہی میرے بھائی کی بیوی بنے؟"

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے لہجے پر غور کیا۔ الفاظ کے چناؤ اور گفتگو کی خوش سلیقگی کو میں داد دیے بغیر رہ نہیں سکا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات بالکل بری نہیں لگی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے امید سی تھی کہ وہ ایسا ہی کچھ کہے گا۔

میرا ذہن تیزی سے بہت کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔ جب تک میں افنان عادل کو جانتا نہیں تھا اور جب بھی کبھی اس سے ملنے جاتا تھا تو پتا نہیں کیوں افنان عادل کو دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال آتا تھا کہ کیسا شاندار آدمی ہے۔ الماس کتنی اچھی لگے گی اس آدمی کے ساتھ...... اگر الماس کی شادی...... جب تک میں یہ نہیں جانتا تھا کہ افنان عادل شادی شدہ ہے۔ انگیجڈ ہے یا غیر شادی شدہ ہے۔ اس کا آفس اسٹاف تو یہی کہتا تھا کہ افنان صاحب کی شادی نہیں ہوئی ابھی۔ میں سوچتا تھا آفیسرز اپنے ماتحتوں کو کب اپنے پرسنلز بتاتے ہیں۔ بہرحال لگتا مجھے بھی یہی تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اب تک۔ لہٰذا اس دن جب کاشان عادل نے کہا کہ اس کے چھوٹے بھائی کی شادی ہو چکی ہے تو میں یہی سمجھا تھا کہ اس کی مراد افنان عادل سے ہے پھر اس کے وضاحت کرنے پر مجھے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں عجیب طرح کی خوشی اور سکون میں نے محسوس کیا تھا۔

اور کاشان عادل کہہ رہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے' آپ کو میری بات پسند نہیں آئی؟" اس نے میری خاموشی کا یہی مطلب نکالا تھا۔ "یہ صرف میرا اپنا خیال نہیں ہے۔ جب میں نے آپ کے بارے میں پہلی مرتبہ ابو کو بتایا تھا تو وہ اسی وقت مجھ سے اس بارے میں کہہ چکے تھے۔"

اس کے اس جملے پر میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ابو دراصل افنان...... سے...... ابھی...... تک...... خوش۔" وہ اٹک اٹک کر کہتے ہوئے رک گیا۔ "وہ ابھی تک بھولے نہیں ہیں اس بات کو۔" وہ جبراً مسکرایا۔ "ابو نے کہا کہ غلطی جس نے کی ہے بھگتنا بھی اسی کو چاہیے۔" کاشان عادل ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ "ابو کا کہنا ہے' ملاوٹ جس نے کی ہے ملاوٹ شدہ مال ملنا بھی اسی کو چاہیے۔ امانت میں خیانت

جس نے کی ہے۔"

اس کے اس جملے پر میں نے ایک دم اسے ٹوک دیا تھا۔

"آں ہاں کاشان صاحب' تھوڑی تصحیح کر لیجیے۔ امانت میں خیانت ہوئی نہیں تھی' ہونے ضرور جا رہی تھی۔" کاشان عادل چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "اور آپ کے پہلے جملے پر بھی مجھے اعتراض ہے۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ مال میں ملاوٹ ہوئی نہیں تھی ہاں ہو جاتی۔"

کاشان عادل اب کی بار بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تو آپ کیا سمجھ رہے تھے کاشان صاحب کہ خدانخواستہ ایسی ویسی کسی صورت میں' میں آپ کے بھائی کو ایسے ہی چھوڑ دیتا؟ آپ لوگوں کو یونہی جانے دیتا؟ ایسا ہو نہیں سکتا تھا اور میں آپ پر بھی آج یہ بات واضح کر رہا ہوں۔ میں حق بات کہنے سے گریز نہیں کرتا۔ جو سچائی ہے وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔"

کاشان عادل بے اختیار مسکرا دیا تھا۔ "تو پھر جب آپ اس بات کو realize کرتے ہیں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم گزرے کل کی سوچ سے باہر آ جائیں؟"

وہ مجھ سے کہہ رہا تھا اور میں ایک بار پھر چپ تھا۔

"بے شک جو کچھ بھی ہوا برا ہوا عمل بھی اور ردعمل بھی اور جو consequences تھے' وہ تو بدترین تھے۔ آپ معاف کر دیجیے' ہم بھی بھولنے کی کریں۔"

کاشان عادل کی معاملہ فہمی کا میں ہمیشہ سے قائل تھا۔ وہ بالکل reasonable بات کہہ رہا تھا۔ میں بالکل رضامند تھا۔ افنان عادل کو میں گزشتہ ساڑھے تین سالوں سے جانتا تھا۔ میں نے اس میں کوئی کمی نہیں پائی تھی۔ اس میں کئی بلکہ کئی سے زیادہ عادات ایسی تھیں جو پسند کیے جانے کے لائق تھیں۔ دنیاوی لحاظ سے' دینوی اعتبار سے۔ اس کی شہرت نیک تھی۔ میں نے اسے صاف نیت اور ایماندار پایا تھا۔ میں نے اسے اپنے فرائض ادا کرتے اور دوسروں کو ان کا جائز حق دینے والا دیکھا تھا۔ اس کے نام کے آخر میں "عادل" آتا تھا اور وہ حقیقتاً "عادل" تھا۔ اس کی طبیعت میں انکساری تھی' شرافت تھی' سادگی تھی۔ وہ ہر کسی سے بڑی وضع داری' اخلاق اور مروت سے ملتا تھا۔ بڑوں سے بات کرتے وقت اس کی آنکھوں میں ادب اور احترام ہوتا تھا اور چھوٹوں سے بات کرتے وقت لحاظ۔ وہ جب بولتا تھا سچ بولتا تھا۔ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ وہ بولتا تھا وہی کرتا بھی تھا۔ کسی سے وعدہ کرتا تھا تو پورا کرتا تھا اور وہ ایک دیانت دار افسر

تھا۔ وہ راشی نہ تھا۔ حلال کمانے والوں میں سے تھا۔ کسی بھی افسر [illegible] لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے کہ اس کے ماتحت صرف اس کے سامنے ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے بھی اس کی عزت کریں۔ اس کو اچھے الفاظ سے یاد کریں۔ اس کی تعریف کرتے پائے جائیں اور اس کے پیچھے اس کو گالیاں نہ دے رہے ہوں۔ برا بھلا نہ کہہ رہے ہوں۔

افنان عادل کو یہ اعزاز حاصل تھا۔ اس کے ماتحتوں کو میں نے اس کے پیچھے بھی اس کی عزت کرتے دیکھا تھا۔ اس کی تعریف کرتے بھی پایا تھا۔ اس کی عادات کی تعریف' اس کی ایمان داری کی تعریف' اس کے مزاج کی تعریف اور اس کے کردار کی تعریف۔ میں بھی گزشتہ ساڑھے تین سال کی شناسائی کی بنیاد پر آنکھیں بند کر کے کہہ سکتا تھا کہ افنان عادل کردار کا کھرا ہے۔ اب اگر سالوں پہلے اس رات وہ بہک گیا تھا تو بہک تو آدمی کبھی بھی سکتا ہے۔ ویسے بھی پہلا قصور تو معاف کر دیے جانے کے قابل ہوتا ہے جب کہ سبق بھی میں نے اس رات ٹھیک ٹھاک اس کو دے دیا تھا بلکہ میں سبق دینے والا کون تھا جو کچھ بھی ہوا تھا' اس رات بس کر دیا گیا تھا۔ میں تو صرف ایک mediator تھا۔

میرے پاس اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ الماس کے سلسلے میں ہم پہلے ہی بہت پریشان تھے۔ اس کے ساتھ اتنے بڑے بڑے دو واقعات ہو چکے تھے کہ جس نے گھر بھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ الماس پر لیبل لگ چکے تھے۔ اس کے نصیب پر ہم حیران تھے کہ کھل کر ہی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں کاشان عادل کا اس طرح کہہ دینا امداد غیبی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا نصیب اگر افنان عادل ہی سے کھلنا تھا تو اس سے اچھی بات اور بھلا کیا ہو سکتی تھی' سو میرے پاس رضامند ہونے کے لیے وجوہات کئی تھیں جن میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ اعتراض نہ کرنے کے لیے کئی باتیں تھیں جن میں ہر بات پر بھاری ایک یہی بات تھی اور رضامند نہ ہونے اور اعتراض کرنے کے لیے صرف ایک رات کی بات تھی اور شاید یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ میرے دل میں بھی اس رات کی وجہ سے افنان عادل کے لیے اب کوئی رنجش رو نہیں گئی تھی۔

کاشان عادل منتظر نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کاشان صاحب!'' میں نے بالآخر ٹھنڈی سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے گھر میں صرف اس کا ماموں ہوں۔ اس کی زندگی کے متعلق فیصلہ کرنے کا سارا [illegible] اس کے ماں باپ کو ہے۔''

''تو پھر آپ بتائیے۔ آپ کی بہن بہنوئی کے گھر ہم باقاعدہ کب آئیں؟''

اس نے خاصی بے صبری سے پوچھا تھا اور بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے نکلا تھا۔

''کاشان صاحب اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنی بہن بہنوئی کے گھر آنے کی دعوت دوں' آپ کو کچھ حقیقتیں اپنی بھانجی کے متعلق بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔''

کاشان عادل کچھ سمجھ میں نہ آسکنے کی سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں نے الماس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو چکا تھا' سب کا سب کاشان عادل کو بتا دیا تھا۔ ساری بات سن کر کاشان عادل نے لمبی خاموشی اختیار کی اور مجھے اس کی خاموشی سے گھبراہٹ سی ہوئی۔ تھوڑا پچھتاوا بھی ہوا کہ ناحق میں نے اسے یہ سب بتایا۔ پھر مجھے ایک دم یہ خیال آیا کہ اگر میں اسے نہ بتاتا اور ان لوگوں کو بعد میں کہیں اور سے پتا چلتا تو وہ اور برا ہوتا۔

''میں نے آپ کو یہ سب کچھ اس لیے بتا دیا کہ کل کو خدانخواستہ کہیں اور سے پتا چلے آپ کو تو آپ لوگ یہ نہ کہیں کہ ہم نے آپ لوگوں سے اصل حقیقت چھپائی تھی۔ آپ کو ہم نے دھوکا دیا۔''

میرا انداز غیر ارادی طور سے مدافعانہ ہو گیا۔ کاشان عادل میری بات سن کر سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔

''خلدون صاحب! آئی ایم ویری سوری کہ آپ کی بھانجی کے ساتھ یہ mishap ہوئے مگر میں mishap ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ آپ کی بھانجی میرے بھائی کی امانت تھی۔ پھر بھلا وہ کسی اور کی کس طرح ہو سکتی تھی۔''

میں کاشان عادل کی بات سن کر بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یقین کیجیے خلدون صاحب! آپ نے جو کچھ کہا میں نے سنا، آپ لوگوں نے ہمیں دھوکا نہیں دیا اور نہ ہی ہم سے کچھ چھپایا ہے۔ بات یا تو آپ کے خاندان کو پتا ہے اور میرے گھر میں ابو اور سمعان کو پتا چل جائے گی البتہ امی کو اور گھر کی دونوں عورتوں کو بھی اس بات کی خبر بھی نہیں ہونے دی جائے گی۔ آپ کو تو پتا ہے خواتین اس معاملے میں کیا سوچ رکھتی ہیں۔ بطور خاص لڑکوں کی مائیں اتنے کھلے ذہن اور خیالات کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ بالفرض اگر کسی تیسری سورس سے انہیں کچھ بھی پتا چلا بھی تو ہم ان کو پہلے ہی سے بتا کر رکھیں گے کہ آپ لوگ افواہوں پر کان مت دھریے گا۔ لوگ تو حسد میں آکر آپ کو ورغلانے کی کوشش کیا کرتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو خوش دیکھ نہیں سکتے۔''

کاشان عادل کی بات سن کر میں نے بہت اطمینان کا سانس لیا۔

''اصل میں پہلے دو واقعات کی وجہ سے گھر بھر ہل کر رہ گیا ہے۔ میرے بہنوئی کو ذرا اعتبار کم ہی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے بھائی کے حق میں اپنی بہن' بہنوئی کو راضی کر سکوں۔''

''اسی خدشے کے پیش نظر میں پوچھ رہا ہوں کہ معاملات آسانی سے طے پا جائیں گے؟'' اس کے لہجے میں بھی خدشہ ہی تھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''کاشان صاحب' اللہ مالک ہے! ویسے میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہی ہو۔'' کہہ کر میں رکا' پھر پوچھا۔ ''آپ کی والدہ کو تو اعتراض نہ ہو گا؟''

''ویسے تو ہم دونوں بھائیوں کی شادیاں امی کی پسند سے ہوئی ہیں۔ اس بار مگر ابو بیچ میں پڑیں گے تو انہیں کبھی بھی اعتراض نہیں ہو گا۔'' اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''خواہش تو امی کی بھی یہی ہو گی کہ افنان کی دلہن اور ان کی سب سے چھوٹی بہو بھی ان کی پسند سے آئے مگر اس بار ابو اپنی مرضی کریں گے تو امی اپنی مرضی نہیں کر سکیں گی۔''

''اور...... افنان...... رضا مند ہو جائے گا؟''

میں نے پہلی بار کاشان عادل کے سامنے اٹک اٹک کر افنان کا نام لے کر کوئی بات کہی تھی ورنہ تو ہمیشہ اسے آپ کا بھائی ہی کہتا تھا۔

''افنان۔'' وہ دھیمے سے مسکرایا۔ ''اس سے جب بھی امی نے' اس کی بھابیوں نے شادی کی بات کی تھی' اس نے ہمیشہ انکار ہی کیا تھا۔ ہر بار میں امی اور اس کی دونوں بھابیوں کو منع کر دیتا تھا کہ اس کو فورس مت کریں۔ اس بار میں اس سے کہوں گا تو وہ کیسے نہیں مانے گا۔'' اس کے لہجے میں بے حد مان تھا۔ ''وہ میری کوئی بات ٹالتا نہیں ہے۔'' اب کی بار اس کے لہجے میں محبت تھی' فخر تھا۔ ''مگر میں نے اس سے پوچھنے یا کہنے سے پہلے مناسب یہ سمجھا کہ آپ سے پوچھ لوں۔''

''اور اگر میں انکار کر دیتا تو......'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

''میں جانتا تھا کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔'' کاشان عادل کی طرف سے فوری جواب آیا تھا۔ ''مجھے یقین سا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔''

میں اس کی بات پر کچھ کہہ نہ سکا۔

پھر میں نے ہشام بھائی اور آپا کے سامنے یہ پروپوزل رکھ دیا۔ ہشام بھائی بے تاثر انداز میں مجھے دیکھتے رہے۔ پھر پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔ ''کیا کہوں۔''

ان کے اس انداز نے مجھے بھی افسردہ کر دیا۔

''لوگ میرے دیکھے بھالے ہیں اور بہت اچھے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''لڑکے سے تو میں خود پچھلے ساڑھے تین سال سے واقف ہوں۔ ہر لحاظ سے شاندار ہے۔''

''آجانے دو۔'' ہشام بھائی نے بے تاثر انداز میں کہا۔

بہر حال میں نے کاشان عادل کو باقاعدہ ہشام بھائی کے گھر آنے کی دعوت دی۔

اور اس شام عادل فیملی یوں پوری پوری تیاریوں اور شگن کی مٹھائیوں کے ساتھ آئی تھی۔ گویا الماس کو لے جانے ہی آئے ہیں۔ ہشام بھائی نے بڑی خندہ پیشانی سے ان لوگوں کا استقبال کیا۔

کاشان عادل اور افنان عادل سے تو میں واقف ہی تھا۔ اس کے والد اور دوسرا بھائی دونوں وضع داری اور شائستگی کی مثال تھے۔ بیٹھتے ہی کاشان عادل کے والد صاحب نے حرف مدعا بیان کر دیا تھا۔ ہشام بھائی نے ان سے کچھ وقت مانگا تھا۔ اس کے بعد ادھر اُدھر کے کچھ موضوعات پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ افنان کی والدہ اور ان کی دونوں بہوئیں بھی الماس کو دیکھنے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

پھر ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد ہشام بھائی بہت خاموش سے ہو گئے تھے۔

''سمجھ میں نہیں آتا' کس پر اعتبار کروں' کس پر نہ کروں۔ سب کچھ پہلے بہت اچھا لگتا ہے۔'' ہشام بھائی نے بڑی دل گرفتگی سے کہا۔ ''اصلیت تو بعد میں کھلتی ہے' دھوکا تو بعد میں ہوتا ہے غلط دن!''

''ہشام بھائی! انشاء اللہ' اس بار کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے نہایت یقین سے کہا تھا۔

ہشام بھائی نے خاصی بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

''لیکن اس بار آپ ایک کام ضرور کر لیجیے گا جو پچھلی دونوں بار آپ نے نہیں کیا۔''

ہشام بھائی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''پچھلی دونوں بار' آپ نے جو کیا تھا' اپنے طور کیا تھا اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا تھا۔ اس بار اس سے رجوع کر کے سب اس پر ڈال دیجیے۔ سارے معاملات اس کے سپرد کر دیجیے۔''

ہشام بھائی افسردگی سے مسکرائے۔ ''ہاں میں ایسا ہی کروں گا۔''

میں نے ابھی تک گھر میں اس بارے میں کچھ بتایا نہیں تھا۔ اس دن امی' ابو اور مہر کی موجودگی میں جب وہ لوگ آئے تو ابو تو فوراً انہیں پہچان گئے البتہ مہر اور امی نہ پہچان

سکیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مختصراً ابو کو سارا واقعہ بتا دیا۔ ابو نے اس بات کو ہشام بھائی کے گھر میں ڈسکس نہیں کیا بلکہ ہشام بھائی کو وہی مشورہ دیا جو میں نے دیا تھا۔ ابو نے ان کو استخارہ کر کے جواب دینے کے لیے کہا۔ گھر آ کر ابو نے صرف مجھ سے اتنا کہا۔

''پتا نہیں کیا اچھا ہوتا ہے اور کیا برا' اللہ بہتر طور سے جانتا ہے۔ وہ بس ہر حال میں بہتری فرمائے۔''

اور اللہ پر چھوڑ دینے کی ہی وجہ سے تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پاتے چلے جاتے ہیں۔ پچھلی دونوں مرتبہ کی طرح اب کی بار کسی فریق نے کسی بھی معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ ہشام بھائی نے استخارہ کر کے ان لوگوں کو ہاں میں جواب دے دیا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں زیادہ محنت کرنی ہی نہیں پڑی۔

بات طے ہو جانے کے اگلے دن کاشان عادل سائٹ پر آیا تو بڑے پُرجوش انداز میں بغل گیر ہو کر مجھے مبارک باد دی۔ میں نے بھی کھلے دل سے اسے مبارک باد دی۔

''تھوڑا بہت کھٹکا تھا میرے دل میں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی رخنہ ہو۔'' وہ ہنس رہا تھا۔

''رخنہ ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔'' میں نے بھی جواباً ہنس کر کہا۔ جس کے ہاتھ میں معاملات دیے ہیں' وہ ہستی ہی عظیم ہے۔ میں نے بہت دعا کی تھی اس سے۔ میں نے یہ جملے دل میں کہے تھے' پھر اس سے کہا۔ ''مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ آپ کی والدہ مجھے یا میرے گھر والوں کو پہچان نہیں پائیں۔ میرے والد صاحب تو فوراً پہچان گئے تھے۔'' مجھے جو بات شروع سے کھٹک رہی تھی' بالآخر زبان پر آ ہی گئی تھی۔

''اس بات کو کئی سال بھی تو ہو گئے خلدون صاحب! امی آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو پہچان بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس رات ان کا سارا دھیان صرف اپنے بیٹے پر تھا۔ کسی اور پر نہیں۔''

کاشان عادل مسکرا رہا تھا اور یہ سچ ہے کہ میں نے اسے اس دن پہلی بار اتنے اچھے موڈ میں دیکھا تھا۔

شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ کاشان عادل کے گھر والوں نے مہینے بھر کا وقت دیا تھا۔

پچھلی دونوں مرتبہ کے برعکس ان لوگوں نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کی تھی نہ خواہش۔ مہینے بھر کا ٹائم بھی انہوں نے اپنی طرف کی تیاریاں کرنے کے لیے لیا تھا۔ کیونکہ بقول کاشان عادل کے۔ ان کے گھر کی یہ آخری شادی تھی۔ امی اور بھابیاں تو سارے ارمان پورے کرنا چاہ رہی ہیں۔ مگر اس کو بھی افنان عادل منع کر رہا تھا۔ رہ گئے ہم لوگ تو ہمیں تیاری کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پچھلی دو مرتبہ میں تیاری کافی ہو چکی تھی۔

ان دنوں میں نے بارہا سوچا تھا اور ہر بار سوچ کر مجھے یقین آتا رہا تھا کہ واقعی کاشان عادل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ الماس کا نصیب یہی تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آتی رہی تھی کہ الماس کے سلسلے میں ہم ناحق پریشان تھے۔ افنان عادل تو نظروں کے سامنے ہی تھا۔ مجھے ہر بار یہ سوچ کر بھی ہنسی آئی تھی کہ یہ وہ لڑکا تھا کہ میں تو اسے جان ہی سے مار دینے کے درپے تھا اور جو اس رات مر جاتا میرے ہاتھ سے۔

مگر شاید اسے اسی دن کے لیے بچا کر رکھ لیا گیا تھا کہ الماس کا جوڑ اس کے ساتھ ہی تھا۔

☆======☆======☆

شادی کی تاریخ طے ہونے کے ساتھ ہی گھر میں زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ تقریباً ہر روز رات کو ٹی وی لاؤنج میں محفلیں جمتیں۔ میں عموماً ایسی نشستوں کو avoid کرتا تھا جس میں میرے پھنسنے کے پورے پورے امکانات ہوں۔ اس رات بھی بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی نے ڈانٹ ڈانٹ کر بچوں کو بستروں پر لٹایا تھا اور سارے بڑے اس وقت ٹی وی لاؤنج میں موجود تھے۔ ابو بڑے بھائی کو انتظامات کے متعلق مختلف ہدایات دے رہے تھے۔ لائٹنگ' ڈیکوریشن' مہمانوں کی لسٹ وغیرہ وغیرہ...... میں بغیر کسی دلچسپی کے سن رہا تھا۔

"افنان' تم اپنی طرف سے بلائے جانے والے مہمانوں کی لسٹ بھی فائنل کر کے دے دینا۔" ابو نے اچانک مجھے مخاطب کیا تھا۔

ابو کے اس جملے پر میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میرا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔ ایک میرا اکلوتا دوست شہباز تھا جو بی ای کرتے ہی گلف چلا گیا تھا اور اب مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ دوسرا بلال مرتضیٰ تھا جس سے انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد میرا کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ میں بلاتا تو زیادہ سے زیادہ اپنے آفس اسٹاف' شہر کی ممتاز اور صوبے اور وفاق کی چند سیاسی شخصیات کو بلا لیتا۔

"ٹھیک ہے۔ دے دوں گا۔" میں نے گہری سانس لے کر بالآخر کہا تھا۔ ابو مطمئن ہو کر بڑے بھائی کو مزید ہدایات دے کر سونے کے لیے چلے گئے تھے۔

"اور تم لوگوں کو بھی کل کیا اپنے آفسز نہیں جانا؟" امی نے سب لوگوں کو وہیں بدستور جما دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں جانا امی!" بڑے بھائی نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر سونے کی کرو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔" امی کہہ کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی

تھیں۔

بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی سعادت مندی سے سر ہلا رہے تھے۔ امی کے جانے کے بعد میں بھی چپکے سے اٹھ کر جانے لگا۔ بڑے بھائی نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ کر اپنے برابر میں بٹھا لیا۔ میں قدرے تکلف سے بیٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا آج تو میرا ریکارڈ لگنا لازمی ہے اور بڑے بھائی مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

"افنان' تم نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کون لڑکی ہے جس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے!"

"بڑے بھائی! اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہو۔" میں نے بے تاثر لہجے میں کہا پھر دل میں سوچا تھا۔ "الماس کے سوا......"

"کمال ہے۔ یہ عجیب لڑکا ہے۔ لڑکے تو اتنا تجسس میں رہتے ہیں کہ کس سے ان کی شادی ہو رہی ہے۔" بڑی بھابی نے تعجب سے کہا۔

"بڑی بھابی' اس کے ساتھ حوالہ ہی اتنا معتبر ہے۔ خلدون ابراہیم' بہت بڑا نام ہے اس سے آگے کچھ مزید جاننے کی گنجائش رہ نہیں جاتی۔" میرے لہجے میں ابھی بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"پھر بھی ایسا بھی کیا۔ آدمی کو تھوڑا بہت تو کسی کے متعلق جان ہی لینا چاہیے اور کسی بھی وہ...... جس سے وہ شادی کرنے جا رہا ہے۔" چھوٹے بھائی نے کہا۔

"ہاں کم از کم تم اس کی تصویر ہی دیکھ لو۔ تم نے جو لفافہ مجھے دیا تھا' وہ کیبنٹ کی اوپر والی دراز میں اب تک رکھا ہے۔" بڑے بھائی نے لفافہ پر زور دے کر کہا تھا۔

"واقعی افنان۔ تم نے اس کی تصویر بھی نہیں دیکھی اب تک؟" چھوٹی بھابی نے بڑے استعجاب سے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "مجھے اسے نہیں دیکھنا ابھی' تصویر میں بھی نہیں۔"

"چلو تصویر تو اچھا کیا تم نے نہیں دیکھی۔" چھوٹے بھائی نے اطمینان سے کہا۔

"لیجیے اس میں اچھا کیا ہے؟" چھوٹی بھابی نے اعتراض کیا۔ "آدمی اس کی شکل تک سے familiar نہ ہو جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔"

"چہ...... تصویر میں وہ بات کہاں جو live دیکھنے میں ہے۔ کچھ لوگ تصویروں میں کچھ اور دیکھنے میں کچھ نظر آتے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔

’’میں تو کہتی ہوں اچھے لوگ ہر حال میں ہمیشہ اچھے ہی نظر آتے ہیں سمعان۔‘‘ بڑی بھابی نے فوراً کہا۔

’’بڑی بھابی! شکل کے ساتھ اس کا تو نام بھی بہت اچھا ہے۔ جواہر ہشام۔‘‘ چھوٹی بھابی نے کہا۔ بڑے بھائی مسکرا کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں ایک نظر انہیں دیکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

’’ارے نام سن کر تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟‘‘ بڑے بھائی نے حیرانگی سے پوچھا۔

’’کیوں؟ اس میں حیرت زدہ ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔‘‘ میں نے ان سے کہیں زیادہ حیرت سے پوچھا۔

’’واقعی نام میں کچھ نہیں رکھا؟‘‘ وہ بدستور حیرانگی سے پوچھ رہے تھے اور مجھے ان کی حیرانگی کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

’’ہاں...... اچھا نام ہے جواہر ہشام!‘‘ میں نے سادگی سے کہا۔

’’مگر جواہر افنان اور بھی اچھا لگے گا۔‘‘ چھوٹی بھابی نے ٹکڑا لگایا۔

’’آہم...... ویسے افنان‘ تمہاری ہونے والی بیوی اس گھر کی سب سے کوالیفائڈ بہو ہوگی۔ امی تو بڑا خوش ہیں اس بات سے۔‘‘ بڑی بھابی ہنس کر رشک سے کہہ رہی تھیں۔

’’ایم فل کیا ہے اس نے۔‘‘

’’بھئی‘ میں نے پوچھا تو تھا۔ کوئی خواہش ہو تو بتایئے۔ آپ اس وقت بتاتیں۔‘‘ بڑے بھائی نے مسکرا کر کہتے ہوئے بڑی بھابی کو دیکھا۔

’’ہاں‘ لوگ پہلی خواہش پوچھتے ہیں۔‘‘ بڑی بھابی جلبلا کر کہہ رہی تھیں۔ ’’یہ آخری پوچھ رہے تھے۔ ایسے جیسے میں مرنے جا رہی تھی۔‘‘

’’ارے بھئی‘ غلطی سے نکل گیا تھا منہ سے۔ پہلی مرتبہ فون پر آپ سے بات کی تھی۔ حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔‘‘ بڑے بھائی جھینپ کر کہہ رہے تھے۔

’’اور کیا‘ اتنا بوکھلا رہے تھے توبہ!‘‘ بڑی بھابی ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

’’ہوں بڑے بھائی‘ فون پر۔‘‘ چھوٹے بھائی نے انہیں خوب چھیڑا تھا۔ ’’ذرا جلدی سے بتائیں نمبر کہاں سے لیا تھا؟‘‘ چھوٹے بھائی نے شرارت سے پوچھا۔

’’نمبر لینا بھلا کیا مسئلہ تھا۔ ان کے علاقے کے ایکسچینج کا ڈی ای میرا دوست ہے۔ ان کے گھر کا ایڈریس مجھے پتا تھا۔ فون نمبر بھی پتا چلا لیا۔‘‘ بڑے بھائی نے بڑی بھابی کو دیکھتے ہوئے آرام سے بتایا۔

چھوٹے بھائی اور چھوٹی بھابی ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار ہنسے۔

’’اُف! بڑے بھائی اتنے جتن کیے ایک نمبر کے لیے۔‘‘ چھوٹے بھائی نے ہنسی ضبط کر کے ان سے پوچھا۔

’’نہیں‘ زیادہ جتن نہیں کرنے پڑے۔‘‘ بڑے بھائی دھیمے سے مسکرا رہے تھے۔

’’مجھ سے کہتے تو......‘‘ چھوٹے بھائی نے شرارت سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ’’چلیے ہٹایئے اور جلدی سے یہ بتایئے فون کیا کیوں تھا؟‘‘

ان کی شوخیاں‘ شرارتیں ختم ہو کر نہیں دے رہی تھیں۔ وہ جو خاصے تیز مزاج کے تھے جب سے ان کی شادی ہوئی تھی‘ ان کے مزاج میں ڈرامائی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ خاصے خوش مزاج ہو گئے تھے۔ شوخیاں‘ چھیڑ چھاڑ‘ حاضر جوابی۔ یہ کبھی میرے مزاج کا حصہ ہوا کرتی تھی جواب چھوٹے بھائی میں آ گئی تھیں۔ چھوٹے بھائی کے ساتھ ویسا کچھ نہیں ہوا تھا جیسا میرے ساتھ ہوا تھا۔ ہاں ٹھیک تو تھا چھوٹے بھائی نے ایک دم صاف ستھری زندگی گزاری تھی اور مجھ سے زندگی میں ایک ہی غلط کام......

میرا ایک دم وہاں سے اٹھ کر بھاگ جانے کو دل چاہنے لگا۔ ہر چیز سے یکا یک اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بڑے بھائی فوراً میری طرف متوجہ ہو گئے۔

’’افنان‘ تم بھی اگر اسے فون کرنا چاہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ نمبر دوں اس کا؟‘‘ یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ شرارتی ہو گیا تھا۔

’’بڑے بھائی‘ آواز سے face expressions کا پتہ تھوڑا ہی چلتا ہے۔‘‘ چھوٹے بھائی نے اطمینان سے کہا۔ ’’اسی لیے میں نے تو فون کا کوئی چکر رکھا ہی نہیں تھا۔ سیدھا سیدھا جا کر مل لیا تھا۔‘‘

’’سمعان...... تم...... تم......‘‘ بڑے بھائی نے کشن کھینچ کر انہیں مارا۔ چھوٹے بھائی نے بچنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بیٹھے ہنستے رہے۔

’’مجھ سے پوچھیں ناں بڑے بھائی‘ میں بتاتی ہوں۔‘‘ چھوٹی بھابی نے ہنس کر کہتے ہوئے انہیں دیکھا۔

’’ارے چپ...... چپ۔‘‘ چھوٹے بھائی کے انداز میں شرارت تھی۔

’’پتا نہیں کیسے پتا چلا لیا کہ میں فلاں دن بڑی آپا کے ساتھ شاپنگ کرنے جاؤں گی۔ پہنچ گئے۔ اب بہنوئی بھی ساتھ میں ہیں ان کی موجودگی میں بڑی آپا سے کہہ رہے

ہیں کہ یہ غلط بات ہے بھئی۔ آپ نے یہ کب کہا تھا کہ آپ کے شوہر اور آپ کی موجودگی میں مجھے ان سے بات کرنی ہوگی..... آپا اور میرے بہنوئی کو ہنس کر خاصا دور ہٹنا پڑا۔"

میں نے چھوٹی بھابی کی اس بات پر گہری سانس لی تھی۔ میرے دونوں بھائیوں کی شرارتیں اب کھل کر سامنے آ رہی تھیں۔

"اور ان کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔" چھوٹے بھائی بے طرح ہنس رہے تھے۔

"ظاہری بات ہے۔" چھوٹی بھابی نے برا مان کر کہا۔ "شاپنگ مال کی main enterance تھی وہ۔ آتے جاتے لوگ دیکھ رہے تھے۔"

"ہاں تو کیا گناہ کر رہا تھا میں۔" چھوٹے بھائی نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"اف، تم تو مجھ سے بھی بڑھ کر نکلے سمعان!" اب بڑے بھائی کی باری تھی ان کا ریکارڈ لگانے کی۔ "بڑے چپ شریر ہو اور کمال ہے ہمیں پتا بھی نہیں چلا۔"

"لیجیے بڑے بھائی، آپ کو پتا چل جاتا تو سیکرٹ اوپن نہ ہو جاتا۔"

"سیکرٹ اوپن کے بچے!" بڑے بھائی نے ایک اور کشن چھوٹے بھائی کو کھینچ کر مارا اور اس بار انہوں نے اسے کیچ کر لیا۔ "بیچ بازار...... ہیں..... استغفراللہ!"

"بڑے بھائی، میں جو بھی کام کرتا ہوں، علی الاعلان کرتا ہوں۔ میں ڈرتا ورتا نہیں ہوں کسی سے۔ ڈرتے وہ ہیں جو غلط کام کرتے ہیں۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔" چھوٹے بھائی نے معصومیت سے کہا۔

"واہ سمعان! justification تو بڑی شاندار ہے تمہاری اور خاصی جاندار بھی۔" بڑی بھابی نے انہیں چھیڑا تھا۔

"ہے ناں بڑی بھابی!" چھوٹے بھائی نے چہک کر کہا۔ "اسی لیے تو اتنی جاندار آفر دے رہا ہوں افنان کو کہ اگر تم چاہو تو ایک شاندار سی ملاقات کا بندوبست بھی کروایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں چھوٹے بھائی!" میں نے آہستگی سے کہا۔ "اب تو جو کچھ بھی پوچھنا ملنا اور دیکھنا ہوگا۔ سب ایک ہی مرتبہ اکٹھا ہی ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں اس کو۔ جب یہ فیصلہ کر لیتا ہے تو کیا مجال کہ اِدھر سے اُدھر ہو جائے بھلے دنیا پھر کچھ بھی کہتی رہے۔" جاتے جاتے میں نے سنا بڑے بھائی کہہ رہے تھے۔

بڑے بھائی کے کہنے کے مطابق یہ میرا فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ میں نے تو سرے سے کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں تھا۔ شادی کرنے کا بھی فیصلہ بھی میرا نہیں تھا۔ وہ تو چونکہ بالعموم گھر والوں اور بالخصوص بڑے بھائی نے مجھ سے کہا تھا تو میں کر بھی رہا تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بھائی امی ابو مجھ سے جو کچھ کہتے جا رہے تھے، وہ میں خاموشی سے کرتا چلا جا رہا تھا۔

بڑے بھائی نے پوچھا۔ "شادی پر کیا پہنو گے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے خیال میں کیا پہنوں؟"

بڑے بھائی نے کہا۔ "میرے خیال میں شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور سلیم شاہی جوتے ٹھیک رہیں گے۔ ویسے والے دن پرنس کوٹ اور بوٹ۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کوئی اعتراض کیے بغیر کہا۔

بڑے بھائی نے کہا۔ "کپڑا خریدنے میرے ساتھ چلو۔"

میں نے کہا۔ "آپ خود ہی دیکھ لیجیے گا۔"

"ارے کم از کم کلر تو بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ "آپ خود ہی decide کر لیجیے گا۔"

"اچھا ڈیزائننگ وغیرہ۔"

"جیسی کروانا چاہیں کروا لیجیے گا۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "ٹیلر سے میری بات ہو گئی ہے جا کر اپنا ناپ دے آنا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔"

ابو نے مجھ سے پوچھا۔ "ولیمہ ہوٹل میں ہونا چاہیے یا کلب میں؟"

میں نے انہی پر چھوڑ دیا۔ "آپ بتائیں کس میں ہونا چاہیے؟"

ابو نے کہا۔ "میرے خیال میں ہوٹل میں ہونا چاہیے پول سائیڈ پر۔"

"سوچ لیجیے پھر ابو پول میں سب سے پہلے چھلانگیں لگانے والے ہمارے بچے ہی ہوں گے۔" برابر سے گزرتے بڑے بھائی نے اتفاق سے ابو کے جملے سن لیے تھے، سو فوراً کہا تھا۔

"اوہ ہاں۔" ابو ایک دم ہنسے۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا کہ my grand children are very fond of water انہیں تو کہیں بھی پانی نظر آ جائے گا تو اس میں ڈبکیاں لگانا شروع کر دیں گے۔"

''ابو کلب ہی کو consider کرلیں تو زیادہ بہتر ہے۔'' بڑے بھائی نے مشورہ دیا۔

''ہوں۔'' ابو نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' پھر میری طرف دیکھا۔ ''کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

بڑے بھائی نے اس دن شادی کے کارڈز کے کئی سیمپل میرے سامنے کر دیے۔

''ان میں سے ڈیزائن پسند کرلو۔ پھر ویسے ہی ڈیزائن کے کارڈز چھپوالیں گے۔ ورڈنگز تو ابو ہی بتائیں گے۔''

میں سارے سیمپلز کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ان سے پوچھا۔ ''آپ کو کون سا پسند آرہا ہے۔''

بڑے بھائی بے اختیار ہنسے۔ ''ارے بھئی شادی تمہاری ہو رہی ہے یا میری؟''

میں نے بے زاری سے سارے سیمپلز ان کو پکڑا دیے۔ ''مجھ سے نہیں ہوتے۔ آپ خود ہی پسند کر لیجیے۔''

پھر تو بڑے بھائی...... ''ارے افنان سنو تو بھئی۔'' کرتے ہی رہ گئے۔ میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

ابو نے ولیمے کا مینو مجھ سے پوچھا۔ میں نے ''بڑے بھائی سے پوچھ لیں۔'' کہہ کر اپنی جان چھڑالی۔

''ارے بھئی تو میں ہی کیوں؟'' بڑے بھائی سے ابو نے پوچھا ہوگا تو انہوں نے ریپیٹ کر مجھ سے کہا۔

''آپ زیادہ اچھا بنا سکتے ہیں۔'' میں نے آرام سے کہا۔

''چ...... مجھے اب تو واقعی لگ رہا ہے کہ جیسے یہ میری دوسری شادی ہو رہی ہے۔'' بڑے بھائی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اتفاق سے ان کے جملے پاس سے گزرتی بڑی بھابی کے کان میں پڑ گئے تھے۔ وہ وہیں رک گئیں۔

''جان سے مار دوں گی۔'' جلبلا کر انہوں نے کہا۔

''کس کو بھلا؟'' بڑے بھائی حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگے۔

''آپ کو اور اس کو جس سے آپ دوسری شادی کر رہے ہوں گے۔'' بڑی بھابی نے مستحکم لہجے میں کہا۔

بڑے بھائی بے اختیار ہنسے۔ ''تو پھر آپ کیا کریں گی۔'' خاصی شرارت سے انہوں نے پوچھا تھا۔

''خود بھی مر جاؤں گی۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''تو پھر بچوں کا کیا ہوگا؟''

''دوسری شادی کرتے وقت آپ کو خیال نہ آئے گا کہ بچوں کا کیا ہوگا۔'' بڑی بھابی نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

''بالکل غلط! مجھے سب سے پہلا خیال تو یہ آئے گا کہ بچوں کی والدہ کا کیا ہوگا۔''

بڑے بھائی اور بھابی کے بیچ کھڑا میں نے خود کو نہایت فالتو محسوس کیا سو گہری سانس لے کر ادھر سے جانے لگا۔

''کچھ لحاظ کر لیجیے۔ اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' بڑے بھائی حیرانگی سے بھابی کو دیکھنے لگے۔

''لیجیے آپ ہی بتائیے کیسی باتیں کر رہا ہوں میں۔''

''چ...... کیا سوچے گا افنان آپ کے بارے میں۔'' انہوں نے مصنوعی تاسف سے کہا۔ بڑے بھائی بے اختیار مسکرائے۔

''سوچنا کیا ہے جان جائے گا۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔ ''جب یہ تھوڑے دن بعد خود صاحب بیوی ہو جائے گا۔''

بڑے بھائی کی اس بات پر مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔ میں کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ آیا۔

اس دن بڑے بھائی نے مجھے ٹوک بھی دیا تھا۔ ''افنان کیا بات ہے۔

"you are least interested in any matter, what seems to be the problem?"

میں چند لمحے بڑے بھائی کو بغور دیکھتا رہا پھر ان سے پوچھا۔ ''آپ ہی بتائیں میں کس بات میں اپنا کیا انٹرسٹ show کروں۔ آپ نے مجھ سے کپڑوں کے بارے میں پوچھا۔ اب دس بار تو دولہا بن نہیں چکا ہوں کہ گیارہویں مرتبہ میں آپ کو پسند بتاؤں۔ کپڑے کی کوالٹی کلر اور شیروانی اور کوٹ کی ڈیزائنگ کے بارے میں مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ شادی کارڈ کے ڈیزائن کے بارے میں آپ نے پوچھا مجھے تو سارے کارڈز کا ڈیزائن ایک ہی سا لگ رہا تھا۔ میں کیا پسند کرتا کیا چھوڑ دیتا۔ ابو نے

مجھ سے پوچھا کہ ولیمہ کہاں ہونا چاہیے میں تو دوسروں کی شادیوں تک میں اتنی رغبت سے نہیں جاتا کہ میں رائے دے سکوں کہ میرے اپنے ولیمے کے لیے کون سی جگہ زیادہ بہتر رہے گی۔ اب مینو کا سوال رہ گیا تو میں کسی ریسٹورنٹ یا ہوٹل کے کیفے ٹیریا کا مینو selecter تو ہوں نہیں کہ مینو کا selection میری advice سے ہو گا۔"

میرے اتنے لمبے چوڑے جواب پر بڑے بھائی دھیمے سے مسکراتے رہے تھے۔ پھر شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ایک سوال تو پوچھنا رہ ہی گیا۔"

"وہ بھی پوچھ لیجیے۔" میں نے بے اختیار گہری سانس لے کر کہا۔

"سیج کیسی سجے گی؟"

بڑے بھائی کی مسکراہٹ تو جیسے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے ان کو اتنے اچھے موڈ میں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میرے خیال میں مجھ سے پوچھنے کے بجائے یہ کانٹریکٹ کسی florist کو دے دیا جائے۔"

میں نے جلے سے کہا اور وہاں سے چلا آیا۔ بڑے بھائی کے کھی کھی کر کے ہنسنے کی آوازیں میں واضح طور سے سن سکتا تھا۔ ان معاملات میں، میں اپنی مرضی کیا دکھاتا۔ میں تو جو گھر والے مجھ سے کہہ رہے تھے، فرمانبرداری کے ثبوت دیتے ہوئے چپ چاپ کرتا جا رہا تھا البتہ دو معاملات پر میں نے اختلاف کیا تھا اور میری اس سلسلے میں امی سے خاصی بحث بھی ہوئی تھی۔ میں نے امی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"کسی بھی فضول رسم including مایوں مہندی کو میں بالکل برداشت نہیں کروں گا۔"

امی نے سن کر سر پیٹ لیا تھا۔ "غضب خدا کا! بڑے دو بھائیوں کی بھی شادی ہوئی۔ انہوں نے تو کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ جو کہا، مانا ہے۔" میں سن کر ہی چڑ گیا تھا۔

"اب کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی برائی کے خلاف نہ بولے تو میں بھی چپ رہوں۔ کہہ دیا جب ایک بار کہ یہ سب میری شادی میں نہیں ہو گا تو اس کا مطلب ہے نہیں ہو گا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

امی نے فوراً ابو کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں ناں اس کو اور سن بھی رہے ہوں گے؟"

"بھئی یہ آپ ماں بیٹے کا آپس کا معاملہ ہے۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے اس معاملے سے

الگ رکھا جائے۔"

امی ناراض ہوتی رہی تھیں۔

"امی جانے دیجیے ناں، اتنی مشکلوں سے تو کسی بات سے اس نے اختلاف کیا ہے۔" بڑے بھائی فوراً میری مدد کو آئے۔ "شکر ہے کسی معاملے میں تو اس نے اپنی مرضی بتائی ہے۔"

امی کی ناراضی وقتی تھی۔ تھوڑی حجت، دلیلوں کے بعد وہ مان گئی تھیں مگر سہرے کے معاملے پر وہ اڑ گئی تھیں۔

"نہیں نہیں، سہرا تو ہماری روایت ہے۔ اس معاملے پر تو تم کو راضی ہونا ہی پڑے گا۔" انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"بے کار کی روایتوں کو میں بالکل نہیں مانتا۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "سہرا تو میں ہرگز نہیں باندھوں گا۔"

"تمہارے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی باندھا تھا۔ تم کو بھی باندھنا پڑے گا۔" امی کا لہجہ بالکل حتمی تھا۔

"میں کیسا لگوں گا امی! آپ دیکھیں ناں۔" میں نے امی کا اٹل انداز دیکھ کر تقریباً رو دینے کی سی آواز میں کہا۔

"بالکل دولہا لگو گے۔" امی نے کوئی نوٹس نہ لیتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

مجھے سخت جھنجلاہٹ ہوئی۔ "تو پھر ایک کام اور کر لیجیے گا ناں۔ سہرا بندھوا کر مجھے گھوڑے پر بھی بٹھا دیجیے گا۔ بڑا اچھا لگے گا۔ گھوڑے پر گدھا لدا ہوا۔" میں نے چڑ چڑا کر کہا۔ اس پر ڈرائنگ روم میں بیٹھے تمام لوگوں نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔ میں یہ دیکھ کر اور جھلا گیا۔

"تم سے چڑچڑاہٹ کے عالم میں اس کی ظرافت طبع عروج پر ہوتی ہے۔" بڑے بھائی نے یہ ہنسی روک کر کہا۔

"بڑے بھائی! میں سچ کہہ رہا ہوں، میں بالکل کارٹون لگوں گا۔ ایک دم جوکر۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"خواہ تم جیسے بھی لگو، سہرا باندھنا ہے تو باندھنا ہے بس۔" امی نے اطمینان سے کہا۔

"امی! افنان ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ آج کل سہرے کا رواج رہ کہاں گیا ہے۔ تم

سے گھٹنوں تک لمبے سہرے کی وجہ سے چلنا تک دشوار ہو جاتا ہے۔ نظر کچھ آ نہیں رہا ہوتا۔ دلہن کو تو چار خواتین پکڑ کر لے جاتی ہوئی زیادہ مضحکہ خیز نہیں معلوم ہوتیں جتنے مضحکہ خیز چار لوگ دولہا کو پکڑ کے لے جاتے ہوئے لگتے ہیں۔" بڑے بھائی نے ہمیشہ کی طرح میری طرف داری کی تھی۔

"تم تو رہنے ہی دو کاشان۔" امی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "افنان کچھ کہے اور تم اس کو سپورٹ نہ کرو۔"

"تو پھر امی! فورس مت کریں ناں اسے۔" بڑے بھائی نے فوراً کہا۔ "جیسے افنان کی خوشی۔ اس نے دوسری بار ہی تو اختلاف کیا ہے ورنہ تو بالکل فرمانبردار ثابت ہو رہا ہے ہر معاملے میں۔"

بڑے بھائی کے بہت بار اس طرح کہنے پر امی مان گئی تھیں۔ البتہ میں سوچ رہا تھا کہ بڑے بھائی کے کہنے کے مطابق میں واقعی فرمانبردار ثابت ہو رہا ہوں یا بے زار.....

کیونکہ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے' میری بے زاری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ نامعلوم سی بے بسی میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ میں Idiopathic depression کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

حالانکہ میں نے بارہا کھوجنا چاہا۔ خود سے پوچھنا چاہا کہ کیوں ہے ایسا؟ یہ بھی نہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھ سے پوچھا نہ ہو۔ میری مرضی معلوم نہ کی ہو یا اپنی مرضی مجھ پر مسلط کی ہو۔ پھر بھی مجھے کوئی جواب مل نہ سکا۔

پھر اس رات جب کہ میں بستر پر لیٹا ہی تھا اور سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ بڑے بھائی میرے کمرے میں آئے' انہیں دیکھ کر میں بیٹھ گیا تھا۔ بڑے بھائی بستر پر میرے برابر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ کافی دیر تک مجھے دیکھتے رہے۔ میں منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"افنان! ایک سوال کروں تو اس کا جواب ملے گا مجھے؟" بالآخر انہوں نے پوچھا تھا۔

"کیسا سوال بڑے بھائی؟" میں نے بے حد چونک کر پوچھا۔

بڑے بھائی کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر پوچھا۔

"افنان! تم اس رات اس لڑکی کے پاس کیوں گئے تھے؟"

میں اس سوال پر سُن سا رہ گیا۔ گم صم سا ہو کر ان کی شکل تکنے گیا۔ بڑے بھائی بے حد سنجیدہ تھے اور آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ بڑے بھائی کے "

سوال نے مجھے ساڑھے تیرہ سال پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ اذیت' وہ چبھن' وہ بے بسی' ساڑھے تیرہ سال گزر جانے کے باوجود برقرار تھی۔ تازہ تھی۔ بدستور تھی۔ ساڑھے تیرہ سال گزر جانے کے باوجود کچھ نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ وہیں تھا۔ ویسا ہی تھا۔ ہر تکلیف اسی طرح تھی۔ خاصی تکلیف کے عالم میں بڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کو اس سوال کا کیا جواب دوں۔ ذہن جیسے ایک دم سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو گیا تھا۔ میں یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ایسا سوال کرنے کا کون سا موقع ہے۔

واقعی بعض سوالات اسی لیے ہوتے ہیں کہ آدمی کو گونگا کر دیں۔

واقعی بعض سوالات ایسے ہی ہوتے ہیں کہ آدمی لاجواب ہو جائے۔

اور میں بھی بڑے بھائی کو اس سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں خود کو نہیں پا رہا تھا۔

میں تو بڑے بھائی سے یہ تک نہیں پوچھ پا رہا تھا کہ "آپ کو کیسے یہ سوال پوچھنے کا خیال آیا؟"

میں تو یہ بھی ان سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ "آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

میرا دل تو یہ بھی چاہ رہا تھا کہ ان سے پوچھوں۔ "یہ کیا وقت ہے ایسا سوال کرنے کا؟"

مگر میں تو ایسا چپ تھا کہ جیسے صدیوں سے بولا ہی نہیں ہوں۔

اور تب میں جب بولا تھا تو گلا رندھ گیا تھا اور آواز کراہ سے مشابہ تھی۔

بڑے بھائی کافی دیر تک جامد نظروں سے مجھے تکتے رہے تھے۔ پھر مزید کچھ اور پوچھے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میرا دل چاہا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔

بڑے بھائی کا آج یہ سوال پوچھنا اس بات کی دلیل تھا کہ کوئی کچھ نہیں بھولا تھا اور نہ کوئی مجھے بھولنے دے رہا تھا۔

وہ رات ایسی گزری تھی کہ نیند بالکل اڑ گئی تھی میری آنکھوں سے۔

وہ رات ایسی تھی کہ میں بے حد تکلیف میں تھا اور تکلیف کے مارے کراہے جا رہا تھا۔ میں اسی عالم میں اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے جا کھڑا ہوا تھا۔

اگلی صبح کچھ سوگوار سی تھی یا شاید مجھے ہی لگ رہی تھی۔ نامعلوم سی اکتاہٹ میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ میں بے زار سا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس بے زاری میں اضافہ ہی ہوئے جا رہا تھا۔ جتنا میرے گھر والوں میں جوش تھا۔ میرے جذبات اسی قدر ختم ہو گئے تھے۔ میرے گھر والے بہت خوش تھے اور میں اپنے لیے

خوشی تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے جذبات مر گئے تھے۔ دفن ہو گئے تھے۔

اس رات کے بعد سے بڑے بھائی ایسے ہو گئے تھے بالکل جیسے انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی بات اس موضوع پر کی ہی نہ ہو۔ سارے گھر والوں کے ساتھ مل کر وہ مجھے چھیڑتے تھے۔ مذاق کرتے تھے۔ جملے کستے۔ کبھی مسکراہٹ معنی خیز ہوتی اور کبھی انداز...... میں چپ رہتا تھا اور اب تو اس چھیڑ چھاڑ پر مجھے غصہ آتا تھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں گھر پر آؤں۔ آفس مجھے بہت غنیمت لگتا تھا۔

شادی میں زیادہ دن نہیں رہ گئے تھے اور میں عجیب طرح کی کیفیات کا شکار تھا۔ بے زاری، وحشت، بے چارگی...... کوئی ایک کیفیت نہیں تھی۔

شادی سے دو دن پہلے چھوٹی بھابی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "ہماری دیورانی کو کیا دے رہے ہو منہ دکھائی میں؟"

چھوٹی بھابی کے اس سوال پر سب کی توجہ میری طرف ہو گئی۔ اس طرح کے کسی سوال کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ میں سٹپٹا سا گیا تھا۔ فوری طور سے تو مجھ سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ چھوٹے بھائی اتفاق سے وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انہی کو متوقع نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ بولے نہیں مسکراتے رہے۔

"اب کیا منہ دکھائی بھی دینا ضروری ہے۔ میں اسے مل رہا ہوں کافی نہیں ہے کیا؟" چھوٹے بھائی کو کچھ بولتا نہ پا کر میں نے بڑی بے زاری سے پوچھا۔

چھوٹی بھابی قہقہہ مار کے ہنسیں اور غضب یہ ہوا تھا کہ بڑی بھابی سے مصروف گفتگو ہونے کے باوجود امی نے میری یہ بات سن لی تھی۔

"الٹی سیدھی ہی ہانکے گا مجال ہے کوئی ڈھنگ کی بات بھی کرلے۔"

"اس میں بے ڈھنگی بات کیا ہے۔" میں نے خاصا چڑ کر کہا۔

"چہ...... افنان......! تم تو نکاح کے فوراً بعد اسے مل جاؤ گے۔" چھوٹے بھائی نے ہنس کر کہا۔ "مگر تم خود سوچو ذرا اس سے پہلی مرتبہ تم ملو گے۔ یونہی خالی ہاتھ جانا تم کو اچھا لگے گا کیا؟ تمہیں اسے کچھ دینا چاہیے یا نہیں؟"

"میں ان فارملیٹیز کو نہیں مانتا۔" میں نے قطعی انداز میں کہا۔

"فارملیٹیز اگر ہیں بھی تو کچھ فارملیٹیز پوری کرنی پڑتی ہیں۔ آدمی ویسے بھی کسی سے ملنے جاتا ہے اگر تو خالی ہاتھ نہیں جاتا کچھ نہ کچھ لے کر ساتھ ضرور جاتا ہے۔ وہ تو پھر تمہاری بیوی ہو گی۔ یہ کچھ ایسے تقاضے ہوتے ہیں جو آدمی کی وضع داری، شائستگی اور اخلاق

کی تقاضا ہی کرتے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے آرام سے کہا۔

"سمعان! یہ صرف آدمی کی وضع داری شائستگی اور اخلاق کے تقاضے نہیں ہوتے بلکہ یہ ہماری کچھ روایات ہیں جو اچھی لگتی ہیں۔" امی نے مجھے گھورتے ہوئے چھوٹے بھائی سے کہا تھا۔

"دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم ابھی تک فضول کی روایات میں ہی الجھے ہیں۔" میں نے منہ بنا کر کہا اور جواباً مجھے چہار طرف سے عظیم گولہ باری کا سامنا کرنا پڑا۔ میں کہہ کر پچھتایا۔

"آپ لوگ ہی پھر مشورہ دیں ناں کہ مجھے کیا دینا چاہیے۔" کوئی فرار کی راہ نہ پا کر بالآخر ناچار مجھے پوچھنا پڑا۔

"کوئی گولڈ کی چیز دے دو۔" امی نے مشورہ دیا۔

"کیا...... امی! آخر گولڈ کتنا دیا جائے گا؟ جہیز میں بھی وہ لا رہی ہے۔ بری میں بھی آپ لوگ دے رہے ہیں۔ میں سنار بن جاؤں گا کیا؟ دکان کھول لوں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

اس بات پر سب لوگوں کا مشترکہ قہقہہ پڑا تھا۔ میں بے زاری سے سب لوگوں کو دیکھتا رہا۔

"ارے بھئی تو ڈائمنڈ دے دو۔" چھوٹے بھائی نے ہنسی روک کر کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر تھوڑی دیر بعد بے زاری سے چھوٹی بھابی سے کہا۔

"چھوٹی بھابی آپ ہی کوئی رنگ وغیرہ پسند کر کے لے آئیے۔ میں آپ کو پیسے دے دوں گا۔"

"افنان! پیسہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر مجھے کیا پتا تم کو پسند آئے گی یا نہیں۔" چھوٹی بھابی نے قطعی انداز میں کہا۔

"میری پسند یا ناپسند کا کیا سوال۔ مجھے تو نہیں پہننی۔ جس کو پہننی ہے اس کو پسند آ جائے گی۔" میں نے چڑ کر کہا اور وہاں ٹھہرا نہیں۔

باقی سب بھی حیرت سے مجھے جاتا دیکھ رہے تھے۔

"اسے ہو کیا گیا ہے؟"

میں نے سنا چھوٹے بھائی حیرت سے پوچھ رہے تھے۔ میں نے پروا بھی نہیں کی۔ البتہ اپنے کمرے میں آ کر میں سوچ رہا تھا۔ آخر کیا ہو گیا ہے مجھے؟ میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ ضمیر پر بوجھ سا کیوں ہے؟ میں ایسے کیوں ری ایکٹ کر رہا ہوں۔ یہ الجھن کیا

ہے آخر؟ آخر میری شادی ہو رہی ہے بربادی تو نہیں ہو رہی..... تو پھر مسئلہ کیا ہے۔ مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں مل پا رہا تھا۔

"اس کے بعد بارہا امی نے بڑے بھائی، چھوٹے بھائی نے پوچھا بھی کہ افنان مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تو میں کسی اور کو کیا بتاتا۔

بالآخر شادی کا دن بھی آ گیا اور وحشت میری جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس دن بھی نا صرف میں آفس گیا تھا بلکہ سائٹ پر بھی گیا تھا اور آفس ٹائم تک رکا بھی تھا۔ تبھی گھر سے میرا بلاوا آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر مجھے ہر کسی سے ٹھیک ٹھاک سننا پڑی تھی۔ ابو سب سے زیادہ بولے تھے۔ میں ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ مجھے نہیں بلکہ دیواروں سے کہہ رہے ہیں اور تیار ہوتے ہوئے میں جھنجلا کر سوچ رہا تھا۔ کیا مشکل ہے۔ یہ شادی ہے یا مصیبت ہے۔ بڑے بھائی تیار ہونے میں میری مدد کر رہے تھے۔

"آج آفس جانا ضروری تو نہیں تھا افنان!" بڑے بھائی نے نرمی سے کہا۔

"میں سائٹ پر تھا۔" نروٹھے لہجے میں، میں نے انہیں بتایا۔ "میری موجودگی وہاں ضروری تھی۔"

"اچھا تو پھر ذرا جلدی آ جاتے۔"

بڑے بھائی سے بحث مشکل ہی تھی۔ میں چپ ہو گیا تھا۔ پھر میں نے بے اختیار انہیں پکڑ لیا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیرانگی سے پوچھنے لگے۔ میں بے اختیار بچوں کی طرح ان سے چمٹ گیا۔ بڑے بھائی ہولے ہولے میرا کندھا تھپکنے لگے۔

"بڑے بھائی اس رات..... آپ..... نے..... مجھ سے کیوں..... پوچھا..... تھا کہ:....." میں اٹک اٹک کر کہتے ہوئے بھی جملہ مکمل نہ کر سکا۔

بڑے بھائی نے نرمی سے مجھے خود سے علیحدہ کیا۔ "ارے ابھی اچھی باتیں ہو رہی... کون سا موقع ہے ایسی باتیں پوچھنے کا۔" ان کا انداز صاف ٹال دینے والا تھا اور میرا دل چاہا تھا ان سے پوچھوں۔ وہ کون سا وقت تھا ایسا سوال کرنے کا؟ میں یہ تو نہیں کہہ سکا البتہ زور دے کر یہ ضرور کہا۔ "مجھے بتایئے بڑے بھائی۔"

"بس ایسے ہی۔" انہوں نے بڑے مصروف سے انداز میں بے پروائی سے جواب دیا، پھر بہت عام لہجے میں کہا۔ "شیروانی تھوڑی ڈھیلی نہیں ہے؟ میں نے کہا بھی تھا فٹنگ دیکھ لینا۔"

"چہ..... ٹھیک ہے۔" مجھ پر بے زاری حملہ آور ہو گئی۔

تبھی بڑی بھابی ساڑھی سنبھالتی ہوئی تیزی سے اندر آ گئیں۔ "ارے بھئی افنان! بارات تیار کھڑی ہے۔ ابو چلنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تمہاری سسرال سے کتنے ہی فون آ چکے ہیں اب تک۔ یہاں دولہے میاں کی تیاری ہی ختم نہیں ہو رہی۔"

"تیاری ہو گئی میری۔" میں نے بے زاری سے جواب دیا۔

بڑی بھابی چند لمحے مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر کہا۔ "دنیا بھر کے لڑکے کم از کم اپنی شادی پر خوش ہوتے ہیں۔ ایک تم ہو، لگتا ہے زبردستی شادی ہو رہی ہے۔"

بڑے بھائی نے چونک کر پہلے بھابی کو پھر مجھے دیکھا۔ "بھئی زبردستی تو کسی نے نہیں کی تھی تم رضامند نہیں تھے تو انکار کر دیتے۔"

میرا دل چاہا تھا بڑے بھائی سے کہوں آپ نے کہا تھا کہاں سے انکار کر دیتا مگر میں چپ رہا تھا۔ وہ مزید کہہ رہے تھے۔

"میں نے تو پوچھا بھی تھا۔ کوئی ہو نظر میں تو بتاؤ۔" بڑے بھائی کا انداز بہت عام سا تھا۔

"میں نے کہا تو تھا، ایسا کچھ نہیں ہے۔" میں اس بار چپ نہیں رہ سکا اور چڑ کر کہا۔

"ارے تو شکل کے زاویے درست کرو۔ ہم لڑکی رخصت کروا کے لا رہے ہیں۔ تمہیں رخصت نہیں کیے دے رہے۔" بڑی بھابی نے ہنس کر کہا۔

میں نے آخری مرتبہ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ چہرے پر ناراضگی کے تاثرات تھے۔

"ماشاء اللہ، اچھے لگ رہے ہو۔" بڑی بھابی نے ہنس کر کہا۔

"ارے بھئی کچھ پڑھ وڑھ کے پھونک دیں۔ نظر نہ لگ جائے میرے بھائی کو۔" بڑے بھائی نے شرارت سے کہا۔

"جب تک آپ کے بھائی کے face expressions یہی رہیں گے، نظر کسی صورت لگ ہی نہیں سکتی۔" بڑی بھابی نے مسکرا کر کہا۔ بڑے بھائی بھی ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بھابی کے کہنے پر میں نے شکل کے زاویے درست کرنے کی بڑی کوشش کی۔ پتا نہیں کس حد تک کامیابی ہوئی۔

شاندار طریقے سے سجی سجائی گاڑی کے سامنے کھڑے ہو کر مجھے یاد آیا کہ بڑے بھائی سے دن پہلے ہی میری خاصی بحث ہوئی تھی۔ بڑے بھائی کا کہنا تھا سرکاری گاڑی سجنے کے

لے جائے گی۔ میں نے صاف منع کر دیا تھا۔

''سرکاری گاڑی مجھے اس لیے نہیں ملی کہ اپنی بارات اس میں لے کر جاؤں میں۔''

''میرے خیال سے ہر روز تو تمہاری بارات جائے گی بھی نہیں۔'' بڑے بھائی نے قدرے برا مان کر کہا۔ ''اتنی شاندار سی دو دو گاڑیاں تم کو حکومت پاکستان نے دی ہیں۔ ایک دن ایک سرکاری گاڑی اس واسطے اگر استعمال ہو جائے گی تو کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی۔''

''غلط کام ایک دن کے لیے بھی کیوں کیا جائے۔ خواہ مخواہ آدمی دوسروں کی نظروں میں بھی آئے۔''

''تمہاری ہر منطق نرالی ہے۔''

بڑے بھائی نے بڑبڑا کر کہتے ہوئے اپنی گاڑی سجنے کے لیے بھجوا دی تھی اور اس وقت وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

''کیسی لگ رہی ہے؟''

''بس ٹھیک ہے۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''صرف ٹھیک؟'' بڑے بھائی نے استعجاب سے دہرایا۔ ''یار یہ تو زیادتی ہے۔''

میں نے طویل سانس لے کر ارد گرد دیکھا۔ دو بسیں بھر بھر کے روانگی کے لیے تیار تھیں۔ درجنوں گاڑیاں اس کے علاوہ تھیں۔ بہت سارے لوگوں نے ڈائریکٹ بھی مقررہ مقام تک پہنچنے کے لیے کہا تھا۔

اتنے سارے باراتی...... سجی ہوئی گاڑی...... دولہا بنا ہوا میں...... پھر بھی کوئی جذبات نہیں...... کوئی احساسات نہیں...... میں جیسے کوئی روبوٹ تھا۔ ہر کام آٹومیشن کے تحت کر رہا تھا۔ بے زاری ایسی تھی کہ چہرے سے ظاہر تھی۔ اس کے باوجود سب لوگ کہہ رہے تھے کہ دولہا بہت اسمارٹ لگ رہا ہے۔ میرے اسمارٹ لگنے میں میرے مطابق میرا کوئی کمال نہیں تھا لہٰذا مجھے کوئی کمنٹ خوشی نہیں دے رہا تھا۔

بارات کی روانگی جیسے ہی عمل میں آئی مجھ پر پھر Idiopatic depression کا phase آ گیا۔ بہر حال ہم مقررہ جگہ پر طے شدہ وقت کے مطابق پہنچ گئے تھے۔ [illegible] شاندار استقبال ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد نکاح شروع ہوا۔ قاضی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

''افنان عادل ابن عادل محمود! تمہیں جواہر ہشام بنت ہشام احمد سے بعوض [illegible] مہر نکاح قبول ہے؟''

اور مجھ پر اس نکاح کو قبول کرنے کے لیے کسی نے زبردستی تو نہیں کی تھی مگر میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے یہ نکاح قبول نہ بھی ہوتا تو مجھے قبول ہے کہنا ہی تھا۔ قاضی صاحب نے دو مرتبہ اور پوچھا تھا۔ میں نے دونوں مرتبہ ''قبول ہے!'' کہہ دیا تھا۔ پھر مبارک بادیوں کا تبادلہ ہوا۔ میں مبارک بادیاں وصول کرتے ہوئے ہر کسی سے گلے ملتے ملتے تھک گیا۔

کچھ دیر یہ ڈراما جاری رہنے کے بعد میری بیوی جواہر ہشام کو جواب جواہر افنان تھی' میرے برابر لا کر بٹھا دیا گیا۔ میں بے حس' بے حس اور کسی ٹھنڈی لاش کی طرح ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ ایک آدھ مرتبہ جواہر کے گود میں رکھے شفاف' بے داغ ہاتھوں پر بھی نگاہ پڑی تھی۔ ان شفاف بے داغ ہاتھوں پر پانی کے قطرے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مجھے یہ بھی محسوس ہو جاتا تھا کہ ہاتھ میں پکڑا ہوا خستہ حال ٹشو پیپر کافی دیر سے ناک رگڑنے کے کام آرہا ہو گا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ ہاں شادی کے موقع پر تو لڑکیاں روتی ہی ہیں۔ میں نے بے پروائی سے سوچا تھا۔

پھر ابو' بڑے بھائی' چھوٹے بھائی' خلدون ابراہیم میرے سسر وغیرہ مختلف لوگوں سے میرا تعارف کرواتے رہے۔ زیادہ تر شہر کی ممتاز شخصیات کے علاوہ وفاق کی اور صوبائی سطح کی معروف ہستیاں تھیں۔ بہت سارے لوگوں کو میں جانتا تھا اور کچھ لوگوں کو نہیں بھی جانتا تھا۔ بہر حال جبڑے بھینچے بھینچے سر کے اشارے سے سب کو سلام کرتا رہا۔ نہ کسی سے ملا۔ نہ کسی سے بات کی۔ ایک دو مرتبہ ابو نے بالکل قریب آکر ٹوکا بھی۔

''افنان! تمہاری تمیز' تہذیب' شائستگی' اخلاق وغیرہ کہاں رخصت ہو گیا ہے سب؟''

ابو کے کہنے پر میں بیٹھے بیٹھے ہی تعارف ہونے والے لوگوں سے ہاتھ ملاتا جا رہا تھا۔ ابو نے ایک مرتبہ کہا دو مرتبہ کہا۔ ظاہر ہے وہ بار بار تو مجھ کو ٹوک نہیں سکتے تھے۔ وہ وقت اور جگہ ہی کچھ ایسی تھی۔

ایک موقع پر بڑے بھائی نے میرے بالکل قریب ہو کر سرگوشی کی۔

''افنان' جب کسی سے تعارف کروایا جاتا ہے تو اخلاق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی اٹھ کر سلام دعا حال احوال پوچھ لیتا ہے از راہ مروت۔ تم اتنے خُس کیوں ہو گئے ہو؟''

بڑے بھائی کے کہنے کے باوجود میری پوزیشن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں [illegible] ہی بیٹھا رہا۔

بالآخر رخصتی کا وقت آ گیا۔ گاڑی میں بھی جواہر پورے راستے روتی رہی تھی اور مجھے اس کے رونے سے کوفت ہو رہی تھی۔ لڑکیوں کو چین کسی طرح بھی نہیں ہوتا۔ شادی نہیں ہوتی تب روتی ہیں۔ شادی جب ہو جاتی ہے تب روتی ہیں۔ جواہر کے اس رونے دھونے کو محسوس کر کے میری بے زاری میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک ہی کے رونے کا مجھے اتنا تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ مجھے اب ہر روتی ہوئی عورت زہر لگتی تھی۔ اس وقت بھی میرا ایسا ہی دل چاہ رہا تھا کہ زوردار انداز میں دہاڑ کر ایک ہی دفعہ اس کو چپ کرا دوں مگر میں سارے راستے سختی سے ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا۔

جب ہم گھر واپس آئے تو اس وقت ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ دونوں بھابیوں کی چھیڑ چھاڑ مستقل جاری تھی۔ میں چھیڑ چھاڑ کے جواب میں کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ بالکل بے حس بنا ہوا تھا۔ امی اور بھابیوں نے جواہر کو کمرے میں پہنچا دیا پھر مجھے باہر ہی روک لیا۔

''اب دیکھو، دیور جی۔'' بڑی بھابی نے میرے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے میں اس کے آگے کھڑے ہوتے ہوئے شہادت کی انگلی اٹھا کر مجھے متوجہ کیا۔ ''دو تین باتیں تم اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔'' میں ان کے اس طرح کہنے پر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ہر رسم کو منع کر دیا اور تم نے دیکھ لیا، ہم نے کوئی رسم نہیں کی۔ جواہر کے گھر والوں نے بھی تمہارے مزاج کو دیکھتے ہوئے اور تمہارے سختی سے کہنے پر کوئی بھی رسم کرنے سے احتراز کیا۔ یوں بھی جواہر کی بہنیں تو تھیں نہیں جو تم سے لڑتی جھگڑتیں۔ لہٰذا وہاں پر بھی تم رسموں کی مد میں رقم خرچ کرنے سے صاف بچ گئے۔ اب تمہاری بہنیں تو ہیں نہیں کہ جو تم سے جھگڑا کریں گی نیگ کے لیے۔ ہم ہی تمہاری بھابی بھی ہیں اور بہنیں بھی۔'' بڑی بھابی سانس لینے کے لیے چند لمحے کے لیے رکیں۔ ''اس لیے اندر جانے کا ٹیکس تو ہم ضرور لیں گے اور آپ کو ہمیں دینا پڑے گا۔''

''ٹیکس لیے بغیر آپ لوگ مجھے اندر نہیں جانے دیں گے؟'' میں نے قدرے مطمئن ہو کر پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' دونوں بھابیوں کی طرف سے بیک وقت جواب ملا۔

''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''بے شک پوری رات روک کے رکھیں، میری طرف سے پوری اجازت ہے۔'' میں یہ کہہ کر آرام سے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے تم کیسے لڑکے ہو۔'' بڑی بھابی نے استعجاب سے مجھے دیکھ کر کہا۔

''بس میں ایسا ہی ہوں۔'' میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''دیکھو دیور جی۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری جان ایسے ہی بخش دی جائے گی تو بھول جاؤ۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اب شرافت سے جیب ڈھیلی کرو۔'' میرے سامنے داہنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے چھوٹی بھابی نے کہا اور ساتھ ہی رقم بتائی۔

میں نے بڑی حیرت سے رقم دہرائی۔

''ہاں بس اس سے ایک بھی پیسہ کم نہیں۔'' بڑی بھابی نے جلدی سے کہا۔

میں نے بہت آرام سے کہا۔ ''اتنے پیسے تو ہیں ہی نہیں میرے پاس۔''

''ارے سنیے گا۔'' بڑی بھابی نے فوراً سامنے سے آتے بڑے بھائی کو پکارا۔ ''اسے دیکھیے۔''

''ہاں۔'' بڑے بھائی رک کر مجھے دیکھنے لگے۔ ''ماشاء اللہ اچھا لگ رہا ہے۔''

''بڑے بھائی رقم کی بات کر رہی ہیں بڑی بھابی۔'' چھوٹی بھابی نے گویا سر پیٹ کر کہا۔

''بھئی یہ آپ دیور بھابی کے آپس کا معاملہ ہے۔ مجھے اس میں انوالو نہ کیا جائے۔'' بڑے بھائی نے آتی ہوئی طویل جماہی روک کر کہا۔ ''میں تو سونے جا رہا ہوں۔ پچھلے تین دنوں کا تھکا ہوا ہوں۔ کل ولیمے کے سارے انتظامات بھی مجھ ہی کو کروانے ہیں۔ آپ کا بھی جھگڑا نمٹ چکے تو آ جایئے گا۔'' بڑے بھائی نے کہہ کر سارے بچوں کو ساتھ لیا اور چلے گئے۔

''ہاں بھئی رقم کتنی ہے؟'' چھوٹے بھائی نے رواداری میں پوچھ لیا۔

''آپ کی آدھی تنخواہ کے برابر رقم ہے۔'' میں نے اطمینان سے بتایا۔

''یہ تو زیادتی ہے بھئی۔ ذرا کم پہ آؤ تو آدمی کچھ Consider بھی کرے۔'' چھوٹے بھائی نے بھابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس معاملے پر کوئی Consideration نہیں ہوگی۔'' چھوٹی بھابی نے فوراً جواب دیا۔

''اب آپ خود دیکھیں ناں۔ کتنی بچت ہوئی ہے ان کی ہر معاملے میں۔ ابھی بھی ان کو ایسے ہی چھوڑ دیں؟ یہ تو ہم نہیں کرنے والے۔''

چھوٹے بھائی نے مزید کوئی بحث نہیں کی۔ کندھے اچکا کر آگے چل دیئے۔ اب تو

پہلے ہی جا چکے تھے۔ امی دیگر مہمانوں کے ساتھ تھیں۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ یونہی نکل گیا۔ مطالبہ شدت اختیار کر گیا۔

''افنان تم تو بہت تنگ کر رہے ہو۔'' بڑی بھابی نے روہانسی ہو کر کہا۔ چھوٹی بھابی اتنی دیر میں امی کو کھینچ کر لے آئی تھیں۔

''افنان ختم کرو اس قصے کو۔ وہ بے چاری کب تک انتظار کرے گی تمہارا۔'' امی نے فوری مداخلت کی۔ ''کچھ دے دلا کر معاملہ نمٹاؤ۔''

''ہاں جتنا ہم کہہ رہے ہیں اتنا دو۔'' بڑی بھابی نے رعب سے کہا۔

''اتنی بڑی رقم کیش میں نہیں ہے میرے پاس۔'' میں جواب بالکل بے زار ہو گیا تھا، بے زاری سے ہی کہا۔ ''چیک دینا پڑے گا۔''

''چیک، کیش، کریڈٹ کارڈ کچھ بھی چلے گا۔'' دونوں بھابیوں نے جلدی سے کہا۔

مجھے بالآخر چیک لکھ کر دونوں کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ تب دونوں مسکراتی ہوئی دروازے کے سامنے سے ہٹ گئیں اور مجھے اندر دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا۔

''چلو بھئی سب اب سونے کی کرو۔ بہت رات ہو گئی۔'' باہر سے آنے والی امی کی آواز میں بخوبی سن سکتا تھا۔

''آج تو بہت بڑا معرکہ ہوا ہے۔ ورنہ افنان کی جیب سے تو پیسے نکلتے ہی نہیں ہیں۔'' چھوٹی بھابی کی کھلکھلاتی ہوئی سی آواز آئی۔

''افنان کنجوس تو نہیں ہے۔ بڑا فیاض ہے۔ مگر آج اتنی حجت پر حیرت ہو رہی تھی مجھے۔''

بڑی بھابی کی جواباً آواز سنائی دی۔ چھوٹی بھابی نے غالباً کوئی جواب تھا مگر اس بار دور ہوتی ہوئی آواز کے باعث میں صحیح طور سے سن نہ سکا۔ پھر آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔

میں دیر تک یونہی خاموشی سے کھڑا رہا۔ مجھے اپنی کیفیات سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کیونکہ کوئی کیفیت تھی ہی نہیں۔

میں نے شیروانی کے بٹن کھول کر گردن سہلائی۔ پھر اسے اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ کرتے کی جیب سے میں نے ویلوٹ کا خوب صورت چھوٹا سا باکس برآمد کیا۔ یہ ڈائمنڈ nose pin تھی جو چھوٹی بھابی نے کل ہی مجھے لا کر دی تھی۔

میں سست روی سے چلتا جواہر تک پہنچا اور ایک بار پھر رک کر کافی دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے اسے مخاطب کس طرح کرنا چاہیے۔ پھر ایک دم کہا۔

''یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ۔'' ساتھ ہی میں نے گھونگھٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے خود ہی گھونگھٹ الٹ دیا۔ میں جو اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ ایک دم بدک کر یوں پیچھے ہٹا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور اس نے وحشت زدگی کے عالم میں ''تم......'' کہا تھا۔

میرے ہاتھ سے مخملیں باکس چھوٹ کر نیچے جا پڑا۔ ''نہیں۔'' میں سر جھٹکتا ہوا دو قدم مزید پیچھے ہٹ گیا۔

چند لمحے بعد تیز سرگوشی کی مانند اس کے منہ سے نکلا تھا۔ ''افنان!''

میں اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ بڑی بے یقینی سے میں نے اس کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی عالم میں مجھ کو دیکھ رہی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو بے یقینی کے عالم میں تکتے رہے۔

پھر میں تکلیف کے عالم میں ''نہیں......نہیں......نہیں'' کہتا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

اور ماما نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ ''الماس تم پوچھو گی نہیں کس کے ساتھ ہم تمہاری شادی کر رہے ہیں۔'' تو میرے دل میں کوئی حسرت نہیں جاگی۔ کوئی تمنا نہیں ہوئی کہ جس آدمی سے میری شادی ہو رہی ہے، اسے ایک نظر تو دیکھ لوں۔ اس کے بارے میں تھوڑا سا تو جان لوں اور نہ میں نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ مجھے خوف ہی کچھ اس طرح کا تھا، سو میں نے ماما کو خوف کے مارے صاف منع کر دیا تھا۔

''ماما کیا ضرورت ہے پوچھنے کی۔'' ہاں میں نے البتہ دل میں ضرور سوچا تھا کہ شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے، یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ شادی ہو رہی ہے اور اب کی بار خیریت سے ہو جائے بس۔

''چلو تم نہ پوچھو میں تم کو خود ہی بتا دیتا ہوں۔'' ماما کہہ رہے تھے۔ ''بہت قابل آدمی ہے وہ۔ بہت اچھا ہے۔ ہر لحاظ سے۔ وہ انجینئر ہے۔ انگلینڈ سے ایم ایس کیا ہے۔ واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہے۔''

ماما بتا رہے تھے ان کے لہجے میں فخر تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لوں۔ مجھے کچھ مت بتائیں۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔

''اچھا تم اس کو دیکھو گی بھی نہیں؟'' ماما نے اتنا کچھ بتا دینے کے بعد مجھ سے

پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ اس سے پہلے بھی میں نے دو کو دیکھ رکھا تھا۔ اب میں چاہتی ہوں بس اس ایک کو ساری زندگی دیکھوں...... یہ جملہ میں ماما سے کہہ تو نہیں سکتی تھی، دل میں سوچا تھا۔

"بہرحال۔" ماما نے گہری سانس لے کر کہا۔ "دیکھ لو تو بہت اچھا ہے۔" ماما نے ایک بند خاکی لفافہ میری طرف بڑھا دیا تھا۔ "اس لفافے میں اس کی تصویر ہے۔"

میں ماما کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ لے کر ڈرائنگ ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیا تھا۔

ماما کے چلے جانے کے بعد مجھے بے حد رونا آیا تھا۔ خوف کے مارے، ڈر کے مارے......

جب ان لوگوں کی طرف سے بری آئی تو خالہ بتاتی رہی تھیں کہ ہر جوڑا اور سارا دیگر سامان قیمتی ہے۔ سونا ڈھیروں ڈھیر ہے۔ ویسے کا فیروزی کلر کا خاصے نفیس مگر بھاری گولڈن کام والا شرارہ سوٹ ہے۔ نکاح کا blood red غرارہ سوٹ ہے۔

اور blood red کلر کا سن کر ہی مجھ سے سانس لینا دوبھر ہو گئی تھی۔ میرا دل چاہا تھا کہ یہ غرارہ سوٹ ان لوگوں کو واپس بھجوا دوں اور کہوں ایکس وائی زیڈ کسی بھی کلر کا بھجوائیں مگر سرخ مت بھجوائیں اس رنگ سے مجھے خوف آتا ہے۔ لگتا ہے کسی کے ارمانوں کا خون ہو گیا ہو۔ یورپین دلہنیں بالکل اچھا کرتی ہیں کہ ان کی شادی کا سوٹ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ سفید رنگ امن و آشتی کا نشان ہوتا ہے۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ سفید رنگ کے سوٹ کے لیے کہہ دوں مگر میں نے ہونٹوں پر بڑے بڑے قفل ڈال لیے تھے۔ اس بار مہندی کا سرخ رنگ بھی مجھے ڈرا رہا تھا۔ بری کے سامان کی کسی چیز کو میں نے ایک نظر دیکھا تک نہیں تھا۔ ان بے جان چیزوں سے مجھے کیا لینا دینا تھا۔ پہلے بھی یہ بے جان چیزیں میرے لیے آئی تھیں مگر ان کی ایک چیز بھی خوشی سے برتنی مجھے نصیب نہیں ہوئی تھی اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس بار کیا ہونے والا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے ناں...... انسان کیسے اندھوں کی طرح زندگی گزارتا ہے......

کتنی مزے کی بات ہے ناں...... کہ ماضی بدل دینے پر اس کا اختیار نہیں ہوتا......

حال میں وہ بس ہاتھ پیر مار رہا ہوتا ہے اور اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو اس بات پر قادر نہیں ہوتا کہ اپنے ہاتھ پیر مارنے کی صحیح سمت کا تعین ہی کر لے۔

اور مستقبل اس نے دیکھا نہیں ہوتا۔ آگے کیا ہے، مکمل طور سے بلیک آؤٹ، ایک دم تاریکی...... بالکل اندھیرا...... کچھ پتا نہیں کہ اس کا اگلا قدم اسے کسی کھائی میں دھکیل دے گا یا کنویں میں گرا دے گا...... سو مجھے بھی یہ پتا نہیں تھا کہ میرا اگلا قدم کہاں پڑنے والا ہے اور آیا کہ میں کھائی میں جا گروں گی یا کنویں میں......

عجب ہی وقت آن پڑا تھا مجھ پر...... بعض اوقات دوسروں کی خوشی سلامت رہ جانے اور سلامت دیکھنے کے لیے بھی رونا پڑتا ہے۔ میں بھی اپنے ماں باپ کی خوشی برقرار رہ جانے کے لیے رو رہی تھی۔ دعائیں کر رہی تھی۔ میں نے بہت چاہا تھا کہ میں اپنے تمام معاملات کلی طور سے "اس" کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاؤں۔ اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں ہو پا رہا تھا۔ خوف تھا کہ مجھے جکڑے جا رہا تھا۔ اوہام تھے کہ ستائے جا رہے تھے۔ حالانکہ میں نے بہت چاہا تھا کہ میں سارے اوہام کو دل سے نکال دوں۔ سارے خدشات کو ذہن سے جھٹک دوں۔ خوف کو دل میں جگہ نہ لینے دوں مگر میں ایسا کرنے میں بالکل ناکام تھی۔ میں اپنے ایمان کو مضبوط رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ایمان کمزور ہوتا لگ رہا تھا مجھے......

اور یہ کیفیت اس کیفیت سے بدتر تھی جب میرے گھر والے سزا کے طور پر میری شادی کر رہے تھے مگر تب میں اور اب میں فرق صرف اتنا ہی تھا کہ تب ہر دعا میں "شادی رک جانے" کے لیے کر رہی تھی۔

ماما تیاریوں کے سلسلے میں اکثر آتے رہتے تھے اور ایک دن ماما نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ "الماس! کیا بات ہے، تم خوش نہیں ہو؟"

"ماما، اس میں خوشی کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟" میں نے گویا سسکی لے کر پوچھا۔

"کیوں؟" انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔ "شادی ہو رہی ہے تمہاری۔"

"وہ تو پچھلی بار بھی ہو رہی تھی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"الماس!" ماما چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ دعا کرتی رہو۔"

اور میں نے دل میں سوچا تھا۔ اس کے علاوہ میں کر کیا رہی ہوں مگر خوف نہیں جا رہا میرے دل سے۔ یہ ڈر اور خوف کا عالم صرف مجھ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ گھر بھر ڈرا ہوا تھا۔ اس بار ابو نے کارڈ وغیرہ چھپوانے کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا۔ ابو کا اس بار زیادہ لوگوں کو بلانے کا خیال بھی نہیں تھا۔ گنتی کے چند لوگوں کو، جن کو وہ ضروری سمجھ رہے تھے

ابو نے فون پر ہی دعوت دے دی تھی۔ ابو نے اس بار کسی میرج ہال یا لان کی بکنگ نہیں
کروائی تھی بلکہ ماما کے ایک کلائنٹ نے ماما کو میری شادی کے لیے تحفے کے طور پر اپنی
بالکل نئی تعمیر شدہ کوٹھی کا لان پیش کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر انتظامات وغیرہ بھی انہوں
نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ تب تک مجھے پتا نہیں تھا کہ میرے ماما شہرت یافتہ قسم کے
آدمی ہیں اور پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ماما کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔

امی اس بار تیاری کے لیے مجھے کسی بیوٹیشن کے پاس بھجوانے کے لیے تیار نہیں
تھیں۔ خالہ بھی حیرانگی سے امی کو تکنے لگیں۔

''پچھلی مرتبہ میری بیٹی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اسے کسی کی نظر لگ گئی تب
سے...... اب کی بار اسے گھر پر تیار کرا دو۔ سات پردوں میں چھپا دو۔ تب تک جب تک
خیریت سے نکاح نہیں ہو جاتا۔ عافیت سے رخصتی نہیں ہو جاتی۔'' امی نے نہایت وہم
سے کہا تھا۔

مہر خالہ خاموش سی ہو گئی تھیں۔

پھر مہر خالہ نے اپنی دوست سے مجھے گھر پر تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے
علاوہ امی، مہر خالہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دعائیں کر رہی تھیں۔ نانی نے مستقل جا۔
نماز پکڑ لی تھی۔

ایسے میں ماما واحد آدمی تھے جو ذرا بھی ڈرے ہوئے اور فکر مند نہیں تھے۔ بلکہ وہ تو
ابو، امی اور مہر خالہ کو تسلیاں دیتے پھر رہے تھے۔

''ارے کچھ تو خوف کر لیجیے آپ لوگ۔ اللہ تعالیٰ پر سب چھوڑ دینے کے باوجود ڈر
رہے ہیں۔ اتنا کمزور ایمان ہو گیا آپ لوگوں کا؟'' ماما کو میں نے بارہا امی ابو سے کہتے
سنا تھا۔

''خلدون، اللہ تعالیٰ پر تو ایمان مضبوط ہے۔ اس کے بندوں پر سے بالکل بھروسہ
اٹھ گیا ہے۔'' ایک دن ابو نے رنجیدگی سے ماما کی باتوں کے جواب میں کہا۔

''ہشام بھائی! اللہ کے بندے! اس کی مرضی کے خلاف نہیں کر سکتے۔ بھروسہ
رکھیے۔ ان شاء اللہ، اس بار سب بخیر وخوبی ہو جائے گا۔'' ماما کے لہجے میں بہت یقین
تھا۔

ماما کے علاوہ نانا وہ دوسرے آدمی تھے جو بالکل بے فکر تھے اور مجھے بڑی حیرت تھی
کہ ایسا کیوں کر ہے۔

ان لوگوں کی طرف سے تیاری کے لیے دیا گیا وقت ایک مہینہ نہیں تھا بلکہ وہ تیس
دن تھے۔ سات سو بیس گھنٹے تھے۔ تینتالیس ہزار دو سو منٹ تھے۔ پچیس لاکھ بانوے ہزار
سیکنڈ تھے اور یہ پچیس لاکھ بانوے ہزار لمحے، لمحے نہیں تھے۔ خوف تھے...... ڈر تھے......

یہ تینتالیس ہزار دو سو منٹ، منٹ نہیں تھے دھڑکے تھے...... خدشے تھے......

سات سو بیس گھنٹے نہیں تھے...... وہم تھے...... بے یقینی تھے......

تیس دن، دن نہیں تھے، مشکل تھے...... مصیبت تھے...... اذیت تھے......

نکاح سے ایک رات پہلے یہ کیفیت شدید تھی اور شادی والے دن صبح سے میری
حالت خستہ تھی۔ لگ رہا تھا آج شادی نہیں ہے میری بلکہ پھانسی دی جانے والی ہے۔
لگ رہا تھا میری ٹانگوں میں دم نہیں ہے۔ جسم میں جان نہیں ہے۔ آنکھیں بہت زیادہ
رونے کے باعث سوج گئی تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ مہر خالہ کی دوست مجھے تیار کرنے کے
لیے آئیں تو مجھے دیکھ کر حیرانگی سے پوچھنے لگیں۔

''مہر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟''

مہر خالہ نے ایک نظر بغور مجھے دیکھا۔ ''الماس تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری طبیعت
واقعی ٹھیک نہیں لگ رہی۔''

''میں ٹھیک ہوں، مہر خالہ۔'' میں نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔

''اچھا۔'' مہر خالہ نے کچھ بے یقینی سے کہا۔ پھر اپنی دوست کی طرف مڑیں۔
''صباحت! تو پھر دیر مت کرو۔'' کہتی ہوئی مہر خالہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

صباحت آنٹی مجھے تیار کرنے لگیں۔

''شادی تمہاری مرضی سے ہو رہی ہے ناں۔'' تیاری کے دوران انہوں نے مجھ
سے پوچھا۔

''جی!'' میں نے بہ مشکل جواب دیا تھا۔ ''آپ نے کیوں پوچھا؟''

''بہت دلہنیں میں نے تیار کی ہیں مگر تمہارے چہرے پر وہ شگفتگی، وہ تازگی، وہ
رونق ہے ہی نہیں جو دلہنوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔''

میں نے ان کی بات سن کر دل میں سوچا تھا کہ تازگی، رونق اور شگفتگی ساری خوف
نے نچوڑ لی ہے۔ چہرے پر بچے گی بھی کیا۔

بہر حال صباحت آنٹی نے مجھے وقت سے پہلے تیار کرا کے بٹھا دیا تھا۔ مہر خالہ سے
فیس لینے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"مہر، اپنی زندگی میں درجنوں دلہنیں میں نے تیار کی ہیں مگر اس لڑکی میں جانے کیا خاص بات ہے حالانکہ مجھے اس پر اپنا زیادہ ہنر آزمانے کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ ہی میرا کوئی زیادہ وقت صرف ہوا ہے۔ نہ محنت، پھر بھی اس سے پیاری دلہن میں نے آج تک تیار نہیں کی۔ میں نے جتنی تھوڑی بہت محنت اس پر کی ہے، اسی پر مجھے پیار آ رہا ہے۔"

مہر خالہ نے گہری سانس لے کر مجھے دیکھا۔ پھر لمبا سا سرخ زرتار دوپٹہ میرے سر پر ڈال دیا جو میری گردن، کندھوں اور بازوؤں سے بھی کچھ نیچے ہی جا رہا تھا اور مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔

گھر سے مقررہ جگہ پر روانہ ہونے سے پہلے ابو نے دس مرتبہ میری متوقع سسرال فون کر کے ان لوگوں سے پوچھا تھا۔

"آپ لوگ کب نکل رہے ہیں؟ کتنی دیر میں پہنچیں گے؟ اور بالآخر گیارہویں مرتبہ حسب منشا جواب ملنے پر ابو نے چلنے کے لیے کہا تھا۔

میری متوقع سسرال والے بھی وقت کے بڑے پابند تھے۔ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اطلاع ملی کہ بارات آ گئی ہے۔ اس خبر پر میں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا تھا مگر اصل مرحلہ ابھی بھی باقی تھا۔ جب تک نکاح ہو نہیں جاتا، میرا دم حلق میں ہی اٹکا رہتا تھا۔

نکاح سے تھوڑی دیر پہلے ماما میرے پاس آئے اور کمرے میں موجود خواتین سے کہا کہ وہ کمرا خالی کر دیں۔ مجھ سے وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں ڈری ہوئی تو تھی، مزید ڈر گئی۔ پتا نہیں ماما مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہے ہیں۔

ماما چند لمحے مجھے خاموش کھڑے دیکھتے رہے جیسے سوچ رہے ہوں بات کہاں سے شروع کریں اور اتنی لمبی خاموشی پر میں نے گھبرا کر زرتار دوپٹے کا گھونگھٹ سمیٹ لیا تھا۔ اس کی آڑ سے مجھے ماما کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی اور اب میں منتظر نگاہوں، غیر معمولی رفتار سے دھڑکتے دل کے ساتھ ماما کو دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھ سے اکثر سوال کیا کرتی تھیں ناں کہ میں تم سے ناراض تو نہیں ہوں اور یہ کہ میں نے تم کو معاف کر دیا ہے یا نہیں۔"

وہ مجھ سے کہہ رہے تھے اور میں ان کے ابتدائی الفاظ سن کر پتھر کی بن گئی تھی۔

"مجھے احساس ہے کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے۔ برا ہوا ہے۔ اس پر مجھے

بے حد افسوس ہے۔ بہت دکھ ہے۔ ماما اتنا کہہ کر رک گئے اور مجھ سے سانس لینا محال ہو گیا۔ ماما کا اس وقت یوں رک جانا میری سماعتوں پر گراں گزرا تھا اور ماما کہہ رہے تھے۔

"جو ہو چکا ہے، اسے انسان چاہے اللہ کی مرضی سمجھ لے، اس کی مصلحت سمجھ لے، اپنی قسمت کا لکھا سمجھ لے۔ بہرحال تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہونا تھا اور اسی طرح ہونا تھا اور انہونی پر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ سارے فیصلے اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتے ہیں مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی برداشت سے بڑھ کر اس پر بار نہیں ڈالتا۔"

ماما کہے جا رہے تھے اور میں بت بنی سن رہی تھی۔

"مجھے اس بات کا بالکل اندازہ ہے کہ اس ایک واقعے سے تم نے بہت ذہنی اذیت کی ہے۔ بہت نقصان بھی ہوا ہے تمہارا اور تم نے سزا بھی بہت اٹھائی ہے اور میرا خیال ہے تم کو کافی سے زیادہ سزا مل گئی ہے۔"

ماما کی اس بات پر بے اختیار مجھے رونا آنے لگا۔ میں بے آواز رونے لگی۔ ماما مزید کہہ رہے تھے۔ "وہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو پکڑ لینے کا ارادہ کر لے مگر یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ کسی بھی قصور کی پاداش میں انسان ہمیشہ سزا ہی اٹھاتا رہے اور یہ بھی بالکل ضروری نہیں ہے کہ ہر غلطی ہر قصور کا انجام سزا ہی کی صورت میں سامنے آئے۔ تم بھی یہ مت سمجھ بیٹھنا۔"

ماما نے یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور میرے رونے میں شدت آ گئی تھی۔ میں ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ جسم لرز رہا تھا۔

"ان شاء اللہ، اب سے تھوڑی دیر بعد نکاح ہو جائے گا اور......"

ابھی ماما کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ابو انہیں ڈھونڈتے ہوئے چلے آئے۔

"ارے بھئی ظلدون، تم ادھر ہو۔ وہاں نکاح کو دیر ہو رہی ہے۔" ابو نے تیزی سے

"میں آ ہی رہا تھا بس۔" ماما نے دھیمے سے کہا۔

"ابو۔" میں نے بے اختیار سسکیوں کے درمیان انہیں پکارتے ہوئے بچوں کی طرح ان کی قمیض کی آستین پکڑ لی تھی۔

"بیٹا، ابھی کچھ نہیں۔" انہوں نے آہستگی سے اپنی آستین چھڑائی۔ "میں بہت جلدی میں ہوں۔" ان کے لہجے میں پریشانی سے زیادہ تھکن اور بے بسی تھی اور میرے ابو کے اس انداز پر بہت کچھ ہونے لگا تھا۔ مجھے رونا آئے جا رہا تھا۔

''بیٹا خیریت سے نکاح ہو جانے دو۔ پھر کچھ بھی کہنا۔''
ابو نے بہت عاجزی سے کہہ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انہوں نے ہولے سے میرا ہاتھ تھپکا۔
''اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں ابھی تمہاری نانی اور خالہ کو بھیجتا ہوں۔'' ابو نے مجھے تسلی دی۔ پھر ماما سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چلو خلدون مزید دیر مت کرو۔'' ماما اور ابو چلے گئے۔ میں رونے کے لیے اکیلی رہ گئی۔
میں ان کے ایک ایک جملے ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ ماما کی بہت ساری باتیں وضاحت طلب تھیں۔ ماما کے کچھ جملوں میں ابہام تھا اور اتنی لمبی تقریر کا کیا مقصد تھا۔ ماما آخر مجھے بتانا کیا چاہ رہے تھے۔ سمجھانا کیا چاہ رہے تھے۔ ابھی میں انہی سوالوں میں الجھی تھی کہ نانی اور مہر خالہ چلی آئی تھیں۔
آتے ہی مہر خالہ نے خاصے شگفتہ لہجے میں اطلاع دی تھی۔ ''قاضی صاحب ابھی آتے ہی ہوں گے۔''
''الماس بیٹا رو کر بدشگونی مت کرو۔'' نانی نے نرمی سے مجھے سمجھایا تھا۔
تبھی قاضی صاحب، ماما، ابو اور نانا کے ساتھ چلے آئے تھے۔ خالہ نے ایک بار سمٹا ہوا گھونگھٹ برابر کر دیا۔
پھر قاضی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ''جواہر ہشام بنت ہشام احمد ... افنان......''
اور افنان نام سن کر ہی ایک دم مجھے دھکا سا لگا تھا۔ ایک دم مجھے لگا جیسے کئی پہاڑ ایک ساتھ میرے اوپر آن گرے ہوں۔ قاضی صاحب کے باقی الفاظ پر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میرا تو دھیان ہی ایک افنان نام میں اٹک گیا تھا۔ اس کے نام کو سننے کے بعد ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اس ایک افنان نام کی زد میں تو سکتے میں آ گئی تھی۔ قاضی صاحب ایک مرتبہ پوچھ کر چپ ہو گئے تھے اور تب میں نے بے یقینی کے عالم میں سوچا تھا۔ مجھے سننے میں یقیناً دھوکا ہوا ہوگا۔ انہوں نے کچھ اور کہا ہوگا مگر کم از کم افنان نہیں کہا ہوگا۔
قاضی صاحب دوسری بار نکاح کے الفاظ دہرا رہے تھے اور اس بار میں نے بڑے غور سے، بڑے دھیان سے سنا تھا۔ انہوں نے افنان ہی کہا تھا۔ عادل اور عادل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ ایک اسی نام کی ...

میری دنیا میں تباہی آئی تھی اور اب دوبارہ بھی نام سن کر مجھے اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ زمین آسمان نظروں کے سامنے ایک ہونے لگے تھے...... تو مجھے سننے میں دھوکا نہیں ہوا تھا۔ میں نے خاصے صدمے کے عالم میں سوچا تھا۔
افنان...... افنان...... افنان یہ نام میری سماعتوں پر پتھروں کی طرح برسنے لگا اور میں بت ہی کی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی۔
میرے برابر میں بیٹھی ہوئی نانی نے خوف زدہ ہو کر مجھے ہلا دیا تھا۔ ''الماس...... ہاں کہو بیٹا۔''
ہاں...... میرے حلق میں اٹک گئی تھی۔ نہ...... میں کہہ نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بھی زیادہ وقت نہیں تھا۔ جھکی گردن اور لمبے گھونگھٹ کے باوجود میں اندازہ کر سکتی تھی کہ سب کی امید اور آس بھری نگاہیں مجھ پر ہی ہیں۔ میں اتنے لوگوں کی آس توڑ سکتی تھی۔ میرے گھر والوں کی سانسیں میری ہاں میں ہی اٹکی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

At least then, I had no option other than yes

''ہاں۔'' بڑی مشکلوں سے میرے حلق سے برآمد ہوا تھا اور یہ بہت غنیمت تھا کہ اس لمحے میرے سر پر گھونگھٹ پڑا ہوا تھا۔ ورنہ میں محسوس کر سکتی تھی کہ اس وقت میرے چہرے پر زلزلے کے آثار ہوں گے اور یہ آثار دیکھ کر سبھی کو دھچکا ہی لگتا۔
نکاح نامے پر سائن کرتے وقت بھی میرا دماغ سن تھا۔ میرے ہاتھ بارہا کانپے تھے۔ نظر دھندلا گئی تھی۔ ہر چیز پانی پانی ہونے لگی تھی۔ اسی عالم میں، میں نے سائن کیے تھے۔ حالانکہ اب سے کچھ عرصے پہلے تک میں شدت سے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتی رہی تھی کہ ''اللہ تعالیٰ! وہ جیسا بھی ہے، جو بھی ہے، اسے میرا نصیب بنا دے۔'' اور اب جب وہ ''کوئی'' میرا نصیب بن گیا تھا تو میں خوف میں مبتلا تھی۔ یہ کیفیت اس کیفیت سے برعکس تھی جو اب سے تھوڑی دیر پہلے تک مجھ پر طاری تھی۔
ماما کے الفاظ اور نکاح کے الفاظ مجھے آپس میں mix ہوتے ہوئے لگ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ماما کی باتوں اور نکاح کے main نام کے درمیان کچھ تو کنکشن ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا مگر یہ کیسا کنکشن ہو سکتا ہے۔ کسی بجلی کے جھماکے کی طرح یہ سوچ میرے ذہن میں آئی تھی۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ یہ وہی ہو...... میں نے خاصے یقین سے سوچا تھا۔ اس سوچ نے میرے دل کو تھوڑی تسلی

دی تھی۔ پھر مجھے اچانک یہ بھی یاد آیا تھا کہ ماما جس دن مجھے اس آدمی کے متعلق تفصیلات بتا رہے تھے، اس دن انہوں نے اس کی خاصی تعریفیں بھی کی تھیں اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ ماما کبھی اس افنان کی تعریف کرتے، جس پر وہ اتنے غصے تھے کہ مار دینے کے ہی درپے تھے۔

یہ سوچ کر مجھے مزید تسلی ہوئی۔ نام کا کیا ہے۔ کوئی اتنا خاص نام بھی نہیں ہے۔ افنان اسی نام کے دنیا میں اور بھی بہت سارے لوگ موجود ہوں گے۔ اس سوچ سے دل کو اچھا خاصا اطمینان ہوا تھا۔ مگر پتا نہیں کیوں ہلکا پھلکا ڈر اور خوف سا بدستور دل میں تھا۔

ابھی میں یہ خوف دور کرنے کے لیے مزید امکانات پر بھی غور کرتی کہ نانی اور خالہ مجھے اسٹیج پر بٹھانے کے لیے لے جانے آ گئیں۔ پھر انہوں نے افنان کے برابر میں مجھے بٹھا دیا۔

اس آدمی کے برابر میں بیٹھتے ہوئے میری ساری حسیات جیسے جم سی گئی تھیں۔ میرے دل میں کوئی ارمان نہیں جاگا۔ کوئی آرزو کوئی حسرت نہیں ہوئی۔ میرا دل مر گیا تھا۔ اس شخص کے علاوہ، ہلکے ہلکے خوف کے میرے دل میں کوئی جذبات نہیں تھے اور آدمی بھی تو ایک دم برف کا تودہ ثابت ہو رہا تھا۔ بالکل ساکت، جامد اور گم سم بیٹھا تھا۔ اتنے عرصے میں میں نے ایک بار بھی اسے بولتے ہوئے نہیں سنا تھا اور نہ ہی [illegible] ہوئے محسوس کیا تھا۔ ابھی مجھے اس بات پر مزید غور و فکر کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ ماما میرے برابر میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

"بہت مبارک ہو۔"

سرگوشی اتنی دھیمی تھی کہ صرف میں ہی سن سکتی تھی اور میرا دل رو دینے کو چاہا تھا۔ اس میں مبارکباد کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔ میں کہنا چاہ رہی تھی اور ماما نے گویا میری سوچ پڑھ لی تھی۔

"شش..... چپ۔" ماما کی سرگوشی پہلے سے بھی کہیں زیادہ دھیمی تھی۔

"امانتیں بالآخر اس کے اصل تک پہنچ جایا کرتی ہیں۔ تم بھی جس کی تھیں، تم کو اسی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔"

ماما کے اس جملے پر ایک دم میرا دل ڈوبنے لگا۔ خود کو اب سے پہلے تک دی ہوئی ہر تسلی بے کار لگی مجھے۔ میں نے گھبرا کر ماما کو دیکھنا چاہا مگر سر پر پڑا لمبا سا گھونگھٹ آڑے آ گیا۔

"ہائے، کس کی تھی میں....." میں نے نہایت صدمے کے سے عالم میں سوچا تھا۔

"کس کے حوالے مجھے کر دیا گیا ہے....." نہایت ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ میں نے سوچا تھا اور اپنے برابر میں بیٹھے آدمی سے مجھے ایک دم گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ بے اختیار مجھے رونا آنے لگا۔ میرے آنسو بے آواز گرنے لگے۔ ماما کی باتوں اور نکاح کے مین نام کے درمیان اب مجھے لگ رہا تھا کوئی نہ کوئی کنکشن ضرور ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ وہی افنان ہے، بڑی تکلیف دہ سوچ تھی یہ..... میرا دم حلق میں آ گیا تھا یہ سوچ کر ہی.....

اب مجھے پچھتاوے ہونے لگے تھے۔ کاش اس آدمی کے متعلق میں نے تھوڑا سا جان ہی لیا ہوتا۔ کاش اس کی تصویر میں نے دیکھ ہی لی ہوتی۔ مجھے بار بار اپنی رائٹنگ ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا وہ خاکی لفافہ یاد آ رہا تھا جسے ایک مرتبہ بھی میں نے کھول کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی اور اب میرا ایسا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھاگ کر جاؤں اور کم سے کم ایک نظر تو اس تصویر کو دیکھ کر آ جاؤں۔

تبھی ایک دم رخصتی کا شور مچ گیا تھا اور میں اپنی جگہ پر ایسے جم کر بیٹھی تھی گویا ادھر سے ہلوں گی بھی نہیں۔ امی، نانی اور خالہ نے جب پکڑ کر مجھے اٹھایا تو مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ میری ٹانگیں کچھ ایسی ہی بے جان ہو رہی تھیں اگر میں نے امی اور نانی کو کس کے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو میں یقیناً گر گئی ہوتی۔ کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑی گاڑی تک پہنچتے پہنچتے میرے قدم لرز رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا پلٹ کر واپس بھاگ جاؤں..... میرا دل چاہ رہا تھا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ میرا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر کہوں مجھے نہیں جانا اس آدمی کے ساتھ..... اس آدمی سے ڈر لگ رہا ہے پتا نہیں یہ کون سا افنان ہے۔

"یا اللہ تعالیٰ" میں نے بڑی عاجزی سے اسے پکارا تھا۔ اس وقت جب کہ روانگی [illegible] آ گئی تھی۔ یہ کوئی بھی ایکس وائی زیڈ افنان ہو مگر وہ افنان نہ ہو.....

راستہ کیسے کٹا، مجھے کچھ خبر نہیں کیونکہ میں تو پورے راستے دعائیں کرتی رہی تھی۔ بے آواز روتی رہی تھی۔ ہولتی اور خوف زدہ سی ہوتی رہی تھی۔ راستے بھر ماما کے الفاظ میرے کانوں کے آس پاس گونجتے رہے تھے اور مجھے پچھلا سارا وقت آتا یاد آ رہا تھا۔ میں اگرچہ کچھ پچھلا سوچنا چاہ نہیں رہی تھی مگر میں خود کو سوچنے سے باز بھی نہیں رہی تھی۔ راستے بھر میں نے سوچا تھا کہ کاش زندگی کے وی سی آر کا ریموٹ

کنٹرول میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں پچھلے سارے اذیت میں مبتلا کر دینے والے مناظر نکال دیتی، forward کر دیتی۔ میں افنان سے ہونے والی پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک سب erase کر دیتی۔ میں اس منحوس تاریک رات کو delete کر دیتی جو میری زندگی پر محیط ہو کر رہ گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے پہلے بھی بہت بھگتنا پڑا تھا اور اب تک بہت کچھ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ میں ان دو ماہ سولہ دنوں کو اپنی زندگی سے skip کر دیتی جن میں میں لمحہ لمحہ مری تھی اور آج کا وقت بھی کچھ ایسا ہی تھا......

میرے برابر میں بیٹھا افنان ایک دم ساکت اور بے حس و حرکت بیٹھا تھا اس کو بھلا میری کیفیت کی خبر ہو بھی کیسے سکتی تھی۔

بالآخر گاڑی رک گئی تھی اور گاڑی رکتے ہی افنان صاحب تو چھلانگ مار کر گاڑی سے اترے تھے اور مجھے چند خواتین نے سہارا دے کر گاڑی سے اتارا تھا۔ کوئی رسم وسم نہیں ادا کی گئی اور بڑے امن و عافیت سے مجھے اندر لے جا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

''آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ بہو۔'' مہربان نرم آواز نے مجھ سے کہا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میری ساس ہیں۔ وہ مزید کہہ رہی تھیں۔ ''دل تو بہت چاہ رہا ہے دیکھوں کہ میرے افنان کی دلہن کیسی لگ رہی ہو گی۔ رسموں کے بہانے ایسا ہو بھی جاتا مگر خیر چلو......'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''تم کو کچھ چاہیے ہو تو بتا دینا، ویسے افنان بس آتا ہی ہو گا ابھی۔'' انہوں نے میرا سر تھپکا تھا۔

اس کے بعد کمرے میں خاموشی ہو گئی تھی۔ میں سر جھکائے چپ چاپ باہر سے آنے والی آوازوں کو سن رہی تھی۔ جو واضح بھی نہیں تھیں۔ میرے تو اب آنسو بھی رک چکے تھے اور اتنا سوچنے کے بعد ذہن ایک دم خالی ہو گیا تھا۔ سارے احساسات مر گئے تھے، جذبات پر برف پڑ گئی تھی۔ جانے کتنی ہی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز میں نے سنی تھی۔ خوف ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ وہ شاید مسہری سے خاصے فاصلے پر دیر تک کھڑا رہا تھا۔ بغیر کچھ بولے، بغیر کچھ کہے۔ مجھے اس کی خاموشی سے خوف آ رہا تھا۔ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خود ہی گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھ لوں کم از کم اپنا ڈر تو دور کر لوں مگر میں ایسا کرنے سے بھی ڈر رہی تھی۔ اگر یہ وہی ہوا تو کیا کر لوں گی۔ بڑی وحشت زدہ کر دینے والی سوچ تھی یہ......

وہ ابھی تک بے حس و حرکت کھڑا تھا اور میرا خوف اور تھکن کے مارے برا حال تھا۔ بیٹھے بیٹھے مجھے لگ رہا تھا جیسے میں گر کر اسی طرح رہ جاؤں گی۔ جھکی ہوئی...

وہ تھوڑا قریب آیا اور میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میرا حال بالکل اس شتر مرغ کی طرح تھا جو خطرہ محسوس کر کے اپنا سر ریت میں دبا لیتا ہے۔ اسی وقت اس نے مجھ سے کہا تھا میں نے الفاظ پر زیادہ غور نہیں کیا۔ آواز البتہ کچھ شناسا سی لگی مجھے۔ میرا دم حلق میں آ گیا......

ساڑھے تیرہ سال بعد سنی جانے والی آواز اب ایسی بھی نہ تھی کہ میں اسے پہچان نہ پاتی۔ یہ اس ''افنان'' کے علاوہ کسی اور افنان کی آواز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ تو یعنی میرا نکاح...... سر پر پڑے اس گز بھر لمبے گھونگھٹ سے یکایک مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ بے یقینی کے عالم میں اللہ تعالیٰ...... نہیں نہیں...... نہیں کا کلمہ دل میں پڑھتے ہوئے میں نے ہاتھ مار کر گھونگھٹ اٹھا دیا۔

میرے سامنے وہی افنان کھڑا تھا۔

وہ بھی مجھے دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔ ایک دم پتھر...... اور میں نے تو دل ہی دل میں نہیں...... نہیں کہا تھا۔ وہ با آواز بلند نہیں کہتا ایک دم کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی مجھ پر رونے کا دورہ پڑ گیا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس پر بھی جو اب تک ہو چکا تھا اور اس پر بھی جو ابھی ہوا تھا۔ مجھے اپنے نصیب سے ٹھیک ہی ڈر لگ رہا تھا......

اللہ! یہ کیسا وقت تھا جو مجھے دیکھنا پڑ رہا تھا......

اللہ! اور ابھی کیا کیا زندگی میں مزید دیکھنا رہ گیا ہے۔

افنان عادل نے اس کے بعد پھر پلٹ کر کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا اور اچھا کیا تھا جو اس نے ایسا کیا تھا کیونکہ اس رات اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں بالکل ہمت نہیں تھی۔ اس رات واقعی اس کو اپنے روبرو پا کر اسے برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں تھی۔ کیونکہ افنان عادل مجھے بس ایک رات کی بات یاد دلاتا تھا اور وہ میں یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جو میں بھول جانا چاہتی تھی، مگر بھولنا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔

وہ جو میں نے چاہا کہ erase کر دوں......

skip کر دوں......

delete کر دوں......

forward کر دوں......

میں نے چاہا تھا کہ زندگی کے وی سی آر کا ریموٹ کنٹرول میرے ہاتھ میں ہوتا تو

میں ایسا ہی کرتی لیکن یہ میری قسمت تھی۔ سب pause still ہو گیا تھا۔

اللہ...... مرضی...... مصلحت...... قسمت کا لکھا...... ماما کے سب الفاظ آپس میں mix ہو رہے تھے۔ ماما کا کہا ہر ہر لفظ مجھے یاد آ رہا تھا۔ ماما کی ہر بات میں ابہام ہونے اور ہر جملہ وضاحت طلب ہونے کے باوجود ماما کی ہر بات کا مطلب بالکل صاف اور واضح تھا۔ ماما نے کہا تھا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان اپنے قصور کی پاداش میں سزا اٹھاتا رہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر غلطی کا نتیجہ ہمیشہ سزا کی صورت میں سامنے آئے۔"

تو...... یہ کیا ہے پھر؟

ماما نے مجھ سے کہا تھا۔ "تم بھی یہ مت سمجھ بیٹھنا۔"

تو پھر...... اسے کیا سمجھوں میں؟

اف ا...... مجھے ڈر لگنے لگا، خوف آنے لگا اور یہ ڈر اور خوف ہر خوف سے ہٹ کر ہی تھا کیونکہ اگر وہ کسی کو پکڑ لینے کا ارادہ کر لے تو اس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ پھر آدمی کی بچت کے امکانات نہیں ہوتے۔

"اف......" مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس خیال کے مارے میں نیم جان سی ہو گئی۔ شدت سے رونے لگی۔ دعائیں کرنے لگی۔

اور اس رات اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہوئے میرے آنسو نہیں رکے تھے۔ میں روتی رہی تھی۔ آہوں سے...... آنسوؤں سے...... سسکیوں سے...... ہچکیوں سے......

فجر کی اذانوں کے قریب بالآخر مجھے ذرا کچھ ہوش آیا اور جب میں اٹھی تو میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے، کھڑا ہونا تک دشوار ہو رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ نہایت مرمرے کے چالی ہوئی میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ مسلسل رونے کی وجہ سے میری آنکھیں سرخ تھیں۔ پپوٹے سوج گئے تھے۔ چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے بے دردی سے سارے زیورات اتارے۔ میک اپ تو پہلے ہی رونے کی وجہ سے صاف ہو چکا تھا جو رہا سہا تھا وہ میں نے رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ بھاری عروسی جوڑے کو اتار کر نہایت ناقدری سے ایک طرف ڈال دیا اور سادہ سا کاٹن کا سوٹ پہن لیا۔ اسی عالم میں، میں نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ یہ اور بات کہ آنسوؤں کے مارے مجھ سے کچھ بھی پڑھنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔

نماز کے بعد بہت رو رو کر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی تھیں۔ وہ بہت ساری دعائیں جو کبھی میں نے اس وقت کی تھیں، جب میرے گھر والے میری زندگی......

رہے تھے۔

صبح میری ساس مجھے دیکھ کر ٹھٹھکیں۔

"کیا ہوا بیٹا! خیریت تو ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" تشویش سے انہوں نے پوچھا۔

میں کیا کہتی بھلا۔ جواب دینے کے لیے میرے پاس تھا کیا۔ میری دونوں جٹھانیاں بھی پوچھنے لگیں۔

"روتی رہیں۔ رات بھر کیا؟"

"افنان نے کچھ کہا؟" انہوں نے اب کی بار قدرے خفگی سے پوچھا تھا۔

میں انہیں کیا بتاتی کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے تھا کیا۔ جو وہ کچھ کہتا۔ میرے پاس سننے کے لیے کیا تھا جو میں سنتی......

"اس سے تو میں سمجھ لوں گی۔"

بہت ناراضگی سے افنان کی والدہ نے کہا تھا۔ میں اس پر بھی کچھ نہیں بولی تھی۔

"گھر والے یاد آ رہے ہیں؟" بڑی جٹھانی نے پوچھا تو نہ جانے کیسے میرا سر اثبات میں ہل گیا تھا۔

"اوہ، کوئی بات نہیں۔" چھوٹی جیٹھانی تسلی دینے لگیں۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے وہ لوگ بھی ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

اور میں نے ان کی آخری بات نہیں سنی تھی۔ بلکہ میں سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں اب کچھ ٹھیک بھی ہو گا۔ سب گڑبڑ ہو گیا۔ سب اپ سیٹ ہو گیا۔

پتا نہیں کب میرے گھر والے ناشتہ لے کر آ گئے تھے۔ ساتھ میں مہر خالہ، مامی اور صالحہ بھی تھے۔ صالحہ کی معصوم مسکراہٹ اور اس کی دلچسپ حرکتیں بھی مجھے خوشی نہ دے سکیں۔ میں چپ اور گم صم تھی۔

"اچھا ہوا۔ آپ لوگ آ گئے جلدی۔" میری ساس نے ہنس کر کہا۔ "ہماری بہو ایک ہی رات میں اداس ہو گئی۔ آپ لوگوں کے بغیر۔"

مہر خالہ مسکرانے لگیں۔ "پچھلی رات سے، ہمارے اس پر سارے اختیارات ختم ہو گئے۔ اب یہ ہماری بیٹی کم اور آپ کی بہو زیادہ ہے۔ ہماری تو یہ عادی ہے۔ آپ لوگ اسے اپنا اتنا عادی بنا لیں کہ یہ ایک رات میں آپ لوگوں کے لیے اداس ہو جائے۔"

مہر خالہ کی اس بات پر میرا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہنے لگا تھا۔ جب کہ

افنان کی والدہ مسکراتی رہیں۔

"بے شک...... بے شک ایسا ہی ہوگا، ان شاء اللہ۔ آپ یقین رکھیں۔ میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی بہو ہے۔ آخر مجھے سب سے پیارا ہے وہ۔"

مہر خالہ نے کچھ کہا نہیں مسکرائے گئیں۔ "اچھا تو پھر ولیمے میں ملاقات ہو رہی ہے۔" بالآخر مہر خالہ یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں۔

"ضرور...... ضرور......" میری ساس نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔

"چلو...... الماس......" مہر خالہ نے مجھ سے کہا۔

اور میں ان لوگوں کے ساتھ گھر آ گئی۔ گھر پہنچتے ہی میری بے چین نظر نے ماما کو بہت تلاش کیا۔ مجھے اس وقت ماما کی بہت ضرورت تھی۔ میں ان سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، پوچھنا چاہتی تھی مگر یوں ہوا کہ تلاش بالآخر تلاش ہی رہی۔ مجھے ماما نظر نہیں آئے۔ ابو ای مجھ سے ایک ہی سوال پوچھتے رہے۔

"الماس تم خوش تو ہو؟"

اور میرے پاس آہستگی سے "جی" کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پایا تھا۔

آج رات میں ولیمہ تھا اور میں ولیمے کی دلہن تھی۔

سب کہتے ہیں کہ ولیمے والی دلہن زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ میں ایسی دلہن تھی جو شکل ہی سے تھکی تھکی، افسردہ اور مضمحل لگ رہی ہوں گی۔ کم از کم اس وقت اسٹیج پر بیٹھے ہوئے مجھ سے چہرے کے تاثرات پر قابو پانا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ پورے وقت میں نظر جھکائے سر جھکائے اسٹیج پر بیٹھی رہی۔ میرے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر دل ابھی تک رو رہا تھا۔ افنان عادل صرف ایک آدھ مرتبہ ہی میرے پاس آکر بیٹھا تھا وہ بھی تب جب اس سے تصویریں کھنچوانے کے لیے بہت ہی اصرار کیا گیا تھا۔

"تم خوش تو ہو ناں الماس؟" ماما جو پورے دن مجھے نظر نہیں آئے تھے اس وقت جب انہوں نے یہ سوال کیا مجھے دیکھ کر تو میری آنکھیں چھلکنے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔

"ماما...... آپ نے تو کہا تھا......" بے اختیار میں نے سسکی لے کر کہنا چاہا تھا۔

"آں...... ہاں...... کچھ بھی سمجھنے میں جلدی مت کرنا۔" ماما نے آہستگی سے کہا۔ "میری باتوں پر سکون سے، تسلی سے بیٹھ کر غور کرنا۔ سب سمجھ میں آجائے گا۔"

اور میں ماما سے کہنا چاہ رہی تھی کہ سکون اب زندگی میں کہاں...... میری زندگی

سل تو رخصت ہو گئی ہے۔ مزید غور کرنے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔

مگر میری یہ سوچ صرف سوچ ہی رہ گئی۔ دوسرے چند لوگوں کے آجانے کی وجہ سے میری ماما سے دوبارہ بات نہیں ہو سکتی تھی اور میں جانتی تھی، میری ماما سے تفصیلاً اس موضوع پر تو کیا، کسی موضوع پر بھی اب کبھی بات ہو نہیں سکے گی۔

☆=======☆=======☆

ایک بار مارتھا ایوانز کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے پتا چلا تھا کہ پیروں کے نیچے سے زمین نکلنا کسے کہتے ہیں اور اس رات الماس کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے یہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ سر سے آسمان کھینچ لیا جانا کیا ہوتا ہے...... نہ صرف میرے پیروں کے نیچے زمین تھی۔ نہ سر پر آسمان تھا۔ میں ہوا میں معلق تھا۔

میں اس رات اپنے کمرے سے نکل کر اندھا دھند بھاگا تھا اور لان میں پہنچ کر ہانپنے لگا تھا۔ میرے سارے گھر والے اپنے اپنے کمروں میں مزے کی نیند سو رہے تھے اور ایک میں تھا...... میں اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ میں نے ابھی الماس کو ہی دیکھا ہے۔ مجھے لگا جیسے اس دن مارتھا ایوانز پر مجھے الماس کا دھوکا ہوا تھا۔ اس وقت بھی مجھے ایسا ہی دھوکا ہوا ہوگا۔

میں ایسا کیوں نہ سمجھتا جب کہ میں تو انگلینڈ سے واپس آتے وقت دعائیں مانگ کر آیا تھا اور میری نیت بہت خالص تھی۔ میں نے بہت صدق دل سے ہر دعا مانگی تھی، مگر...... ہر ہر موقع پر مانگی جانے والی کوئی ایک بھی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ اگر قبول ہو جاتی تو یہ وقت کیوں دیکھنا پڑتا مجھے...... ! میں نے سخت تکلیف کے عالم میں سوچا تھا اور مجھے لان کی فضا میں یکایک گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے مارتھا ایوانز سے بچ کر نکل جانے پر شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ شکر کے سجدے کیے تھے......

تو کیا اسے میرا کوئی بھی عمل پسند نہیں آیا تھا......

یہ کیسی سزا دی گئی تھی مجھے......

حالانکہ میں نے تو اس سے اپنے قصور کی کس قدر معافی مانگی تھی۔

......اور...... ساڑھے تیرہ سال سے میں کرتا کیا رہا تھا پھر......

خاصی اذیت سے میں نے سوچا تھا۔

گھٹن کا احساس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ مجھ سے سانس لینی دشوار ہو گئی۔ خاصی وحشت اور تکلیف کے عالم میں، میں گھر سے باہر نکل آیا۔

کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں گناہوں کی معافی نہیں ہے؟

مگر گناہوں کی معافی کیوں نہیں ہے۔ وہ تو بڑا رحیم ہے۔ وہ کریم بھی ہے۔ وہ مہربان بھی ہے۔ وہ رحمٰن ہے۔ ساری اچھائیاں اس سے وابستہ ہیں۔ وہ بندوں کو ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے۔ میری ماں نے تو مجھے معاف کر دیا تھا اور اس ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والے نے......

میں نے جھلملاتی آنکھوں سے اپنے سجے سجائے برقی قمقموں سے روشن گھر کی طرف دیکھا۔ مجھے روشنیاں دھندلی لگیں۔ میں نے بے اختیار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں' مجھ سے زیادہ دیر آسمان کی طرف دیکھا نہ جا سکا۔ میری نظر دھندلا گئی۔

میں حیرت زدہ تھا۔ کمال ہے...... پکڑ یوں بھی ہوتی ہو گی کسی کی...... میں سوچ رہا تھا کہ لوگ تو کیا کچھ نہیں کر جاتے۔ قتل کر دیتے ہیں' چوریاں کرتے ہیں' ڈاکے ڈالتے ہیں۔ یتیموں کی پوری جائیداد ہڑپ کر جاتے ہیں۔ حکمران ملک ہضم کر جاتے ہیں' لوگ شراب پیتے ہیں' جوا کھیلتے ہیں' حرام کماتے ہیں' اپنے بچوں کو حرام کھلاتے ہیں' ہر ناجائز کام کرتے ہیں' اپنی عورتوں کو غیر مردوں کے سامنے چارہ بنا کر ڈال دیتے ہیں۔ لوگوں کے قول وفعل میں تضاد ہوتا ہے۔ لوگ کہتے کچھ ہیں' کرتے کچھ ہیں۔ لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ وعدے کر کے مکر جاتے ہیں۔ لوگ انسانوں کی خرید وفروخت بھی کرتے ہیں۔ بازار میں اپنی راتیں سیاہ کرتے ہیں۔ قحبہ گری کو فروغ دیتے ہیں۔

لوگ تو کیا کچھ کر جاتے ہیں' ان کی تو کبھی پکڑ نہیں ہوتی۔ ان کے اعمال اور افعال پر تو کہیں چیک اینڈ بیلنس کا سوال نہیں اٹھتا۔ ان کا تو کبھی احتساب نہیں ہوتا۔ ان کے گناہوں پر تو کبھی مواخذہ بھی نہیں ہوتا...... اور...... میں...... اللہ تعالیٰ......

میں نے سسکی لے کر ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے ایسا کیا کر دیا...... میں مانتا ہوں' مجھ سے قصور ہوا تھا۔ میں مجرم ہوں۔ میں مانتا ہوں' لوگ اتنے بڑے بڑے گناہ کر کے بھی صاف بچ نکلتے ہیں اور میں نے...... قصور کیا...... میری فوراً پکڑ ہو گئی۔ سزا بھی فوری مل گئی۔ پھر بھی معافی نہ ملی...... اللہ تعالیٰ...... قصور معاف نہ ہوا میرا...... ساڑھے تیرہ سال سے میں مستقل سزا اٹھا رہا ہوں اور ابھی بھی میری سزا ختم نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ۔ اگر ختم ہو گئی ہوتی تو رونا کیوں پڑ رہا ہوتا مجھے......

میں سر پکڑ کر بے اختیار زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ مجھے یاد آ رہا تھا...... تو بڑے بھائی اس لیے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں اس رات الماس کے پاس کیوں گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ خلدون ابراہیم کے بارے میں پوچھتے ہوئے بڑے بھائی کا لہجہ اتنا عجیب سا کیوں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ خلدون ابراہیم جب پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے تھے تو ان سے تعارف کرواتے وقت بڑے بھائی کے ہونٹوں پر بڑی مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ نہ صرف بڑے بھائی بلکہ ابو اور چھوٹے بھائی کا رویہ بھی ناقابل فہم تھا۔ میں نے محسوس ضرور کیا تھا مگر کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ جب خلدون ابراہیم کے پہلی مرتبہ ہمارے گھر آنے پر میں نے جب ان سے ہاتھ ملایا تھا تو ان کی گرفت بہت مضبوط تھی اور مصافحہ بہت پُرجوش تھا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ تھی۔ جب بڑے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ ''جواہر'' کے ماموں ہیں' تو میرے ذہن کے کسی کونے میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ اصل میں ''الماس'' کے ''ماما'' ہیں۔ میرے ذہن میں خیال آ بھی کیسے سکتا تھا جب کہ میں ''جواہر'' نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے یاد آیا' تو اسی لیے اس دن بڑے بھائی مجھے جواہر کا نام بتا کر کہہ رہے تھے کہ واقعی نام میں کچھ نہیں رکھا؟ مجھے کیا پتا تھا کہ جواہر اور الماس ایک ہی شخصیت کے دو نام ہوں گے۔ جب بڑے بھائی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کسی کو پسند تو نہیں کر آئے انگلینڈ میں...... اور جب میرے ذہن میں مارتھا ایوانز اور الماس کا خیال آیا تھا تو میں نے خود کو کس قدر گالیاں دی تھیں۔ ہر ہر موقع پر میں نے سوچا تھا۔ الماس بھی نہیں......

بڑے بھائی نے مجھ سے بہت کہا تھا کہ تم ایک نظر تو اس لڑکی کو دیکھ لو جس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے......

اور اب مجھے پچھتاوے ہو رہے تھے...... کاش...... کاش......

میں آستین میں منہ چھپا کر بے تحاشہ سسکیاں لینے لگا۔ میری آنکھوں سے نمکین پانی بہنے لگا۔ میں بالکل بے اختیار تھا اس پانی کو روک نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا اس سے پہلے اس دن بڑے بھائی نے مجھے دعائیں دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''اللہ کرے تمہیں جو تم چاہو' وہ تم کو ملے۔ تمہیں کسی چیز کے لیے رونا نہ پڑے۔''

آہ میں نے کیا چاہا تھا اور مجھے کیا ملا تھا...... میں نے تو کبھی الماس کے ساتھ کی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ میں اس کے ساتھ کی دعا کر بھی کیسے سکتا تھا۔ میں تو الماس جیسی شے

سے بھاگ کر اس سے پیچھا چھڑا کر آ رہا تھا۔ تو میں اپنے لیے خود یہ سزا کیسے تجویز کر لیتا کہ زندگی بھر الماس کا سامنا کروں۔ میں اس کی محبت میں اس کے ماما کے ہاتھوں ذلیل ہو جاتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ افسوس تو یہ تھا کہ میں اپنی حرکت کے ہاتھوں ذلیل ہوا تھا۔ میں یہ کیسے گوارا کر لیتا پھر کہ میں ساری زندگی بے بسی' شرمندگی' خفت' ذلت جیسے احساسات سے دوچار رہوں۔ ان احساسات کے مارے میری نگاہ ہمیشہ نیچی رہے۔

میں سوچتا رہا اور نمکین پانی میرا گرتا بھگوتا رہا۔

میں مارتھا ایوانز سے بھاگ کر آیا تھا اور مجھے پھر وہی سزا دے دی گئی تھی۔ الماس کو میرے سامنے کر دیا گیا تھا۔ میں نے تو انگلینڈ سے واپس آتے وقت بڑے دل سے سوچا تھا' It is over now, so it is not over yet!

تو مارتھا ایوانز کے ساتھ گزرا ہوا وقت کیا تھا؟ کیا وہ Brief Account تھا اور Detailed account اب شروع ہوا ہے۔

مجھے ہنسی آ رہی تھی یا شاید مزید رونا آ رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ Wedding Night تھی ...... یا Judgement day تھا...... Doom's day تھا اور اگر یہ Doom's day تھا تو وہ رات کیا تھی پھر......؟

میں فیصلہ نہ کر پایا کیونکہ Judgement day جزا اور سزا کے دن کو کہتے ہیں اور Doom's day قیامت کے دن کو کہتے ہیں تو کیا جزا اور سزا کا فیصلہ ابھی سے کر دیا گیا تھا میرے لیے......

میری سسکیاں تیز ہو گئیں۔ مجھ سے اپنی کیفیت پر قابو پانا دشوار ہوا جا رہا تھا۔

رات کے سناٹے میں کبھی کبھی کہیں سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ لگتی تھیں۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ بھی میرے ساتھ سسکیاں لے رہے ہوں۔

مجھے خبر نہ ہو سکی کب فجر کی اذانیں ہو گئیں۔ پہلی اذان پر ہی جیسے میری سسکیاں ختم سی گئیں۔ آہیں دل میں دفن ہو گئیں۔ پانی آنکھوں میں جم گیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور شکستہ قدموں سے مسجد کی جانب چل پڑا۔ میں نے نماز پڑھی اور پھر سجدے میں گر گیا۔

''افنان...... !تم جانتے ہو' تمہارا ایک غلط اٹھا ہوا قدم ہم سب کو کسی گہری کھائی میں دھکیل دے گا اور تم خود جہنم میں جا گرو گے......''

آج سے ساڑھے تیرہ سال پہلے بڑے بھائی کا کہا ہوا ہر ہر لفظ یاد

تھے...... میں ایک مرتبہ پہلے اپنے گھر والوں کو کھائی میں دھکیل چکا تھا اور اب خود دوسری مرتبہ جہنم میں جا گرا تھا۔

ہاں فیصلہ ہو چکا تھا اور میں جہنم میں دھکیل دیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کی جہنم ہو گی' اس کا عذاب بہت شدید ہو گا اور یہ ادنیٰ درجے کی جہنم تھی مگر اس کا عذاب بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں اس جہنم کی سزا میں' عذاب میں تخفیف نہیں ہو گی اور یہاں اس جہنم سے نجات کے لیے دعا کی جا سکتی تھی۔ اس بات سے بالکل لاعلم ہو کر کہ رد کر دی جاتی یا قبول کر لی جاتی۔ میں پچھلی بار کی طرح اس کے وجود پر شک کرنے کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا' سو اس کے سامنے روتا رہا' گڑگڑاتا رہا۔ آگ میں تخفیف کی دعا کرتا رہا۔ رحم کی درخواست کرتا رہا۔ اس کا فضل مانگتا رہا۔ کرم کی نگاہ ڈھونڈتا رہا۔

جب دل تھوڑا مطمئن ہوا تو اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ گھر میں ابھی تک زندگی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ گھر والے ہنوز محو خواب تھے اور میں لان کے بیچوں بیچ کھڑا بے توجہی سے گھاس پر گرے شبنمی قطروں کو دیکھ رہا تھا جو سورج کی کرنیں پڑنے پر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پھر جانے کیا سوچ کر میں ڈرائنگ روم میں آیا۔ شوکیبنٹ کی دراز کھولی۔ وہاں ایک بند خاکی لفافہ ابھی بھی موجود تھا' میں نے لفافہ الٹ دیا۔ میرے سامنے الماس کی تصویر تھی۔ میں تصویر دیکھ کر ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔ مجھے اس بار دھوکا نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس بار الماس کو پہچاننے میں بالکل غلطی نہیں کی تھی۔ میں پہلے ہی اس تصویر کو دیکھنے کی زحمت کر لیتا۔

مجھے ایک بار پھر رونا آنے لگا تھا۔ تصویر اسی طرح رکھ کر میں ایک بار پھر لان میں آیا۔ عجیب خالی الذہنی کا سا عالم تھا۔ میں گم صم سا بس کھڑا ہوا تھا۔ اخبار والا اخبار ڈال کر گیا تو میں چونکا۔ اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے میرا دھیان خبروں پر نہ تھا بلکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میں اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گا اور سوئے اتفاق' سامنا بڑے بھائی سے کرنا پڑ گیا۔ وہ شاید اخبار کی تلاش میں باہر آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔

''ارے افنان...... !تم اتنی جلدی کیسے جاگ گئے؟'' حیرانی سے انہوں نے پوچھا بھی تھا۔

میں چند لمحے انہیں کھڑا یونہی دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''میں جلدی جاگتا نہیں ہوں

کیا؟"

بڑے بھائی مسکرائے۔ "ارے بھئی میں نے تو یوں پوچھا کہ دولہا بننا خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ کل تھک گئے ہو گے۔"

میں نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ نظریں جھکائے اخبار کو گھورتا دل میں سوچتا رہا۔ ہاں واقعی میں کل سے لے کر آج تک بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں نے پتھر کوٹے ہیں یا اینٹیں ڈھوئی ہیں۔ کڑی مشقت کی ہے۔

"رات کیسی گزری؟"

میں نے نظر اٹھا کر بڑے بھائی کو دیکھا۔ نہایت شریر سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تھی۔ وہ خیر مجھ سے اس حد تک تو بے تکلف تھے کہ ایسا سوال کر بھی سکتے تھے' سو اس وقت وہ مجھے چھیڑ رہے تھے۔

"کیسی گزرنی چاہیے تھی؟" میں نے الٹا ان سے سوال کیا۔

"میرے حساب سے تو اچھی ہی گزرنی چاہیے تھی۔" بڑے بھائی کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔

"بس گزر گئی۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"سرپرائز کیسا لگا؟" بڑے بھائی پوچھ رہے تھے اور میرے آنسو میرے حلق میں گرنے لگے۔

"واقعی سرپرائزڈ ہو گیا میں۔" میں نے بہ مشکل اپنی کراہوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہو گئے ناں؟ میں جانتا تھا۔" بڑے بھائی نے جیسے خوش ہو کر جواب دیا تھا۔ "بھئی' تم نے اسے دیکھا نہیں تھا ناں' اس لیے تمہارے لیے تو سرپرائز ہی تھا۔ اب یہ تو تم ہی بتا سکو گے کہ سرپرائز اچھا تھا یا برا؟"

اور میں یہ سوچ رہا تھا یہ سرپرائز ایسا تھا کہ میں تو مر گیا اور اگر مرا نہیں ہوں تو مرنے کے قریب ضرور ہو گیا ہوں مگر میں بڑے بھائی سے یہ بات کہہ نہ سکا۔

"کیا بات ہے افنان' تم خوش تو ہو؟" اب کی بار بڑے بھائی نے قدرے چونک کر پوچھا تھا۔

اور میرا دل چاہا تھا ان سے پوچھوں' اس میں خوشی کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔ [illegible]

بھائی اتنی بس [illegible] نگاہوں سے بڑے بھائی کو دیکھ کر رہ گیا۔

"کیا روتے رہے رات بھر؟" اب کی بار انہوں نے مجھے بغور دیکھ کر سوال کیا تھا۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ "تم خیریت سے لگتے نہیں مجھے؟" بڑے بھائی کا لہجہ فکرمندی لیے ہوئے تھا۔ "You seem to be in shock! Am I right?"

"آپ جانتے تھے کہ خلدون ابراہیم' الماس کے ماما ہیں؟" میں نے بڑے بھائی کا سوال سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا سوال جڑ دیا۔

"الماس! کون الماس؟" بڑے بھائی نے حیرت سے دہرایا۔ "خلدون ابراہیم کی بھانجی کا نام تو جواہر ہے۔"

میں نے گہری سانس اندر کھینچی۔ ہاں میں بھی یہ بات نہیں جانتا تھا۔

"اچھا مجھے اتنا بتا دیں بڑے بھائی' اس سے میری شادی کا فیصلہ کس کا تھا؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"ابو کا تھا۔" انہوں نے بلاتاخیر جواب دیا۔ "مرضی میری تھی۔"

میں چند لمحے ان کو تکتا رہا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

"ابو اب تک ناراض ہیں مجھ سے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں' ناراضگی کیسی؟" بڑے بھائی نے بہت نارمل سے انداز میں کہا۔

میں نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔ "میں نے تو معافی مانگ لی تھی ان سے [illegible] مرتبہ مانگی تھی اور کتنی مرتبہ مانگوں؟ کیا کروں؟ ان کا دل صاف نہیں ہوا۔ میری [illegible] سے ابھی تک' جو انہوں نے اس طرح کیا ہے۔" میں نے بہت بے چارگی سے کہا [illegible]

[illegible] بھائی نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "افنان' ابو تم سے ناراض [illegible] انہوں نے وہی کیا جو تقدیر میں لکھا تھا اور تقدیر کا لکھا حق ہے۔"

[illegible] مجھ سے کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ ہاں واقعی سزا حق ہے۔ جنم حق [illegible]

[illegible] گھر میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ لوگ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ تبھی [illegible] پاس آئیں۔

[illegible] کیا کہہ دیا تم نے دلہن کو جو وہ صبح ہم کو روتی ہوئی ملی؟" امی نہایت خفگی سے

ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ کمال ہے' ایک وہ لڑکی جسے ابھی اس گھر میں آئے ہوئے اٹھتیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے اس کا رونا امی کو نظر آ گیا اور ایک وہ لڑکا جسے اس گھر میں رہتے ہوئے اٹھتیس سال ہو گئے ہیں اور جو اتفاق سے ان کا بیٹا بھی ہے' اس کا دکھ انہیں دکھائی نہیں دیا؟

"مجھے اسے کیا کہنا تھا امی!" میں نے بہت تھکے تھکے سے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے کیا پتا' وہ آپ کو کیوں صبح روتی ہوئی ملی؟"

میں فی الحال اپنی جان چھڑانا چاہ رہا تھا جب کہ امی پوری طرح سے میرے درپے تھیں۔

"تمہارے ہوتے ہوئے اسے اپنے گھر والے یاد آ رہے ہیں۔ اب تو تم ہی اس کے گھر والے ہو۔ اگر ابھی بھی اسے تمہارے آگے اپنے گھر والے یاد رہ جائیں تو تمہارا فائدہ کیا ہے؟"

امی کی بات سن کر میرا دل چاہا زور سے قہقہے لگاؤں مگر میں بے بسی سے امی کو دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ آخر میرا فائدہ کیا ہے؟"

امی نے میری بات پر زیادہ غور نہیں کیا اور نہ میرے لہجے کی طرف دھیان دیا۔ وہ بڑی بھابی کے پکارنے پر ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں' پھر میری طرف مڑ کر کہا۔ "اچھا چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہارے سسرال والے ناشتہ لے کر آتے ہی ہوں گے ابھی۔"

"تو ناشتہ کرنے کے لئے تیار ہونا ضروری ہے کیا؟" میں نے بے زاری سے پوچھا۔ "اور ہم لوگ مہمان ہیں کیا جو ناشتہ کہیں اور سے آ رہا ہے؟"

"توبہ' جب بولے گا' کفن پھاڑ کے ہی بولے گا۔ ارے ایسا ہی ہوتا ہے۔" امی نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اونہہ' بے کار کی باتیں۔ جب میں نے منع کر دیا تھا' تو پھر یہ سب کیا ہے؟" میں نے چڑ کر پوچھا تھا۔

"ارے افنان' کیا ہو گیا؟" بڑے بھائی مجھے امی سے بحث کرتا دیکھ کر فوراً ادھر ہی چلے آئے تھے۔

"کچھ نہیں۔" میں بے زاری سے کہہ کر ادھر سے ہٹ آیا۔

پھر وہ لوگ ناشتہ لے کر آ گئے تھے اور میری تو بھوک پیاس ہی جیسے مر گئی تھی۔ حالانکہ پچھلی رات بھی مجھ سے ایک دو نوالوں سے زیادہ کھایا نہیں گیا تھا اور ابھی بھی میرا کھانے کو دیکھنے تک کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے الماس اور اس کے گھر والوں کا سامنا کرنا عذاب لگ رہا تھا۔ ان کے سامنے میں نے خاصی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے کسی کو مجھ سے الٹا سیدھا کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔

بالآخر ناشتہ ہو چکنے اور ان لوگوں کے الماس کے ساتھ چلے جانے پر میں نے بہت شکر کا سانس لیا تھا' مگر میرا یہ بہت شکر کا سانس عارضی ہی تھا کیونکہ آج ولیمہ بھی تھا اور میرا تو دل بھی جیسے مر سا گیا تھا۔ نفاست اور سلیقے سے تیار الماس کو میں نے ایک نظر تو کیا آدھی نظر تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ سارا وقت بھاری بھرکم سا دوپٹہ سر پر لیے سر جھکائے اسٹیج پر رکھے صوفے پر بیٹھی رہی تھی اور میں Main entrance پر کھڑا مہمانوں کو ریسیو کرتا رہا تھا۔ ظاہر ہے بڑے بڑے لوگوں کو آنا تھا جن میں کچھ ٹاپ گورنمنٹ آفیشلز بھی تھے۔

خلدون ابراہیم کو جب میں نے آتا دیکھا تو میرا دل چاہا' اس آدمی کو اٹھا کر کہیں پھینک دوں جب کہ میرے خیالات کے برعکس انہوں نے خاصی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ میں چند لمحے کاٹ دار نگاہوں سے ان کو دیکھتا رہا' پھر نہایت اکھڑ لہجے میں ان سے کہا تھا۔ "میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کرو۔" انہوں نے میرے لہجے کا برا منائے بغیر مسکراتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے دعوت دی تھی۔

ابھی میں کچھ کہنے کے لیے منہ بھی نہ کھول پایا تھا کہ سامنے سے بڑے بھائی آتے دکھائی دیے۔ خلدون ابراہیم کو دیکھ کر وہ لپک کر ان کے پاس آئے تھے۔

"ارے خلدون صاحب' آپ نے تو بہت راہ دکھائی۔" گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بڑے بھائی نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ جواباً خلدون ابراہیم نے ان سے کہیں زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس صاحب' کیا کیجئے۔ ہماری چھوٹی بیٹی نے دیر کرا دی۔ تھوڑی طبیعت ناساز ہے آج کل صاحب زادی کی!"

"ارے خدا خیر کرے' کیا ہوا؟" بڑے بھائی کے لہجے میں تشویش تھی۔

''معمولی سا نزلہ زکام ہے۔ کھانسی نے پریشان کر کے رکھا ہوا ہے۔''

''کسی کو دکھایا آپ نے؟''

''جی ہاں' مرجان اسپتال کے فاؤنڈر اور چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹر توفیق زمان۔ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ انہی کو دکھایا تھا۔''

''اوہ' ڈاکٹر توفیق زمان ہی تو ہمارے بچوں کے فیملی ڈاکٹر بھی ہیں۔''

بڑے بھائی نے خاصا خوش ہو کر کہا تھا اور ان دونوں کی گفتگو میں' میں خود کو نہایت غیر اہم اور بالکل غیر ضروری محسوس کر رہا تھا۔ وہ دونوں بچوں کی باتیں کرتے کرتے دوسرے امور پر گفتگو کرنے لگے۔ خلدون ابراہیم' بڑے بھائی کو ان کے آفس کی تعمیر میں لگنے والے میٹریل کے بارے میں تفصیل سے بتا رہے تھے اور میں نہایت غیر دلچسپی بلکہ قدرے بوریت کے عالم میں کھڑا مہمانوں کو ریسیو کرتا رہا اور اس وقت میرا کسی کو ریسیو کرنے کا تو کیا' مسکرانے کا تصور تک کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ طوعاً' کرہاً' جبراً ہونٹوں کو زبردستی پھیلا کر میں نہایت بے زاری سے کھڑا مہمانوں کو ریسیو کرتا رہا۔

جب کہ بڑے بھائی اور خلدون ابراہیم کو ملتا دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ وہ دونوں بہت بے تکلف ہیں۔ ایک دوسرے سے...... ایسی بے تکلفی جو صرف قریبی دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔

''چلیے...... آیئے...... کھانا لگ گیا ہے۔''

اب بڑے بھائی خلدون ابراہیم کو کھانے کی دعوت دے رہے تھے اور خلدون ابراہیم مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ ہو لیے تھے' پھر جب اسٹیج پر رکھے صوفوں کے آگے میز پر کھانا چنا گیا اور جب مجھ سے کھانے کے لیے کہا گیا تو میں نے ''دل نہیں چاہ رہا۔'' کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا۔

ابو' امی' بڑی بھابی' چھوٹے بھائی' چھوٹی بھابی نے مجھ سے کہا۔

''افنان' کیا ہو گیا ہے تم کو۔ دو منٹ سکون کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھو بھی۔''

''ارے' تو کیا دلہن ہوں میں جو اسٹیج پر بیٹھوں۔ جس کو بیٹھنا چاہیے' وہ بیٹھی تو ہے۔''

آٹھویں' نویں مرتبہ کی اس تلقین پر میں نے چڑ کر کہا۔ رہ گئے بڑے بھائی تو وہ خلدون ابراہیم کے ساتھ ایسے بزی تھے جیسے آج کے بعد دونوں کو موقع پھر کبھی ملنے کا ہی نہیں۔

''ہاں ٹھیک تو ہے۔ آدمی کو پھانسی ایک ہی روز تو ہوتی ہے' روز روز تو نہیں۔''

پھر بالآخر بڑی بھابی کے بلانے پر بڑے بھائی ان سے معذرت کر کے آگے بڑھ گئے تو خلدون ابراہیم خود میرے پاس آئے۔

''تم کچھ بات کرنا چاہتے تھے مجھ سے۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ آرام سے بات ہو سکے گی ورنہ یہاں پر تو آتے جاتے کوئی نہ کوئی ڈسٹرب کرتا ہی رہے گا۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا بازو پکڑ کر باہر لے جانا چاہا تو میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

''راستے کا مجھے بھی پتا ہے' آپ کو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' نہایت غیر مہذبانہ لہجے میں' میں نے ان سے کہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا مگر فوراً انہوں نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ میں اور وہ باہر چلے آئے۔

''ہاں کہو۔'' انہوں نے مختصراً مجھ سے کہا تھا۔

''آپ جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔'' بغیر کوئی تمہید باندھے میں نے بڑے تیکھے لہجے میں ان سے سوال کیا تھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں تب تک نہیں جانتا تھا جب تک تمہارے بڑے بھائی سے نہیں ملا تھا۔''

''اس کے بعد تو جان گئے تھے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' انہوں نے مختصراً کہا۔

''اس کے باوجود آپ نے اپنی بھانجی کی شادی مجھ سے کروا دی؟'' اب کی بار میں نے انہیں طعنہ دیا تھا۔

''ہاں۔'' ان کا جواب اب کی بار بھی مختصر تھا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کیوں؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''کیوں کہ میں نے تم کو اس کا اہل پایا تھا۔'' انہوں نے تحمل سے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے طنز سے کہا۔ ''میں کتنا اہل تھا' یہ بات تو آپ اس رات جان چکے تھے۔''

''نہیں' تم ایک شریف آدمی ہو۔'' انہوں نے رسانیت سے جواب دیا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

"نہیں..... صرف اس رات تمہاری شرافت تمہاری تابع نہیں رہ گئی تھی۔ تم بہک گئے تھے' بھٹک گئے تھے۔"

"آپ نے غلط کہا۔ اس رات میں بہکا نہیں تھا بلکہ آدمیت کے مرتبے سے گر گیا تھا۔" میں نے طنز سے کہا تھا۔

"چلو یہی سہی!" انہوں نے اعتراض کیے بغیر کہا۔ "آدمی اس مرتبے سے گرتا بھی تب ہے جب اس کا ایمان کمزور پڑ جائے۔ جب اس کا ایمان کمزور پڑ جاتا ہے تو وہ خود کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس رات تم کمزور پڑ گئے تھے۔ تم سمجھ نہیں سکے تھے ان دو راستوں کا فرق' جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دینے کے ساتھ اسے دیے ہیں۔ ایک حرام..... دوسرا حلال..... حرام راستے پر چل کر کسی چیز کو حاصل کرنے جاؤ گے تو نہ اس میں برکت ہو گی نہ راحت قلب۔ پکڑ لیے جانے اور دھر لیے جانے کا احساس رہے گا سو الگ..... یہاں بھی اور وہاں بھی۔ حلال راستے سے کسی چیز کو حاصل کرنے جاؤ گے تو اس میں برکت بھی ہو گی اور اطمینان قلب بھی۔ مزے کی بات یہ کہ ثواب بھی ملے گا۔ تم حرام راستے پر چل کر کچھ حاصل کرنے جا رہے تھے' سو پکڑ لیے گئے۔"

وہ کہہ رہے تھے اور میں قطعی غیر دلچسپی سے ان کی بات سن رہا تھا بلکہ سننے کی اداکاری کیا ہے۔ میں تو کلب کی روشنیوں کی وجہ سے گاڑیوں کے شیشوں پر پڑنے والے عکس دیکھ رہا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ وہ کہے جا رہے تھے۔

"حالانکہ میں نے تم کو جب دیکھا' ایماندار آدمی پایا۔ جب تمہارے بارے میں سنا' تو پتا چلا تم غلط اور ناجائز کام نہیں کرتے۔ رزق حلال عین عبادت ہے۔ تم اس پر بھی یقین رکھتے ہو۔ حالانکہ جتنی اونچی پوسٹ ہوتی ہے پیسہ آنے کے ذرائع اسی قدر روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تم جس پوسٹ پر ہو وہاں بھی پیسہ بنانے کے بڑے امکانات ہیں مگر تم اپنی پوسٹ کا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہیں کرتے۔ پھر مجھے حیرت ہے اس رات تم حلال سے حرام پر کیسے آ گئے تھے؟ آدمی کام وہ کیوں کرے جس میں پکڑے جانے کے کوئی امکانات ہی نہ ہوں۔ صاف ستھرا راستہ اختیار کرے۔ ہر چیز اچھی لگتی ہے مگر اپنی جائز حد میں۔ تب کچھ جائز نہ ہوتا' اب سب جائز ہے۔"

بالآخر میرے ضبط کی حد ہو گئی۔

"آپ..... بند کریں اس لیکچر کو....." میں نے ایسے ہی کہا تھا جیسے کہہ رہا ہوں

بند کرو اس بکواس کو۔ "میں یہاں آپ کا لیکچر سننے کے لیے نہیں آیا۔" میں نے نہایت ترشی سے کہا۔ "اس لیے بہتر ہو گا آپ یہ سب مجھے نہ بتائیں۔ میں نے آپ سے صرف یہ پوچھا تھا۔"

انہوں نے ایک دم میری بات کاٹ دی۔ "اور میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔ اب مزید میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہوں گا۔" انہوں نے قطعی انداز میں کہا۔

"آپ کے چاہنے نہ چاہنے کی پروا کون کرتا ہے۔" میں نے خاصا چیخ کر بیر پٹخ کر کہا۔

"دیکھو اس رات کیا ہوا تھا۔ تم یہ سب مت سوچنا۔ یہ ایسا ہے کہ رات گئی بات گئی۔" انہوں نے نہایت تحمل سے کہا۔ ان کی اس بات پر میں کھول گیا کر رہ گیا۔

"کس نے کہہ دیا کہ رات گئی بات گئی؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

انہوں نے اب کی بار بھی میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔

"بہر حال اب یہ قصہ آج ادھر ختم ہو جانا چاہیے۔" انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہ قصہ میرے حساب سے کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔" میرا لہجہ بے لچک تھا۔

"تم خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے ہو۔ میں نے تم سے کہا ناں اب کبھی دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں ہو گی۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہہ کر اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

مجھے ان کے یوں چلے جانے پر ٹھیک ٹھاک غصہ آیا تھا۔ گلے میں پڑے اکلوتے ہار کو بے دردی سے کھینچ کر میں نے اتارا اور سارے پھول نوچ کر وہیں پھینک کر پیر پٹختا ہوا میں اندر چلا آیا تھا۔ اندر میری ڈھونڈ مچ چکی تھی۔

"کہاں چلے گئے افنان؟" ہر ایک نے مجھے پکڑ پکڑ کے پوچھا تھا۔

"کہاں جانا تھا مجھے۔ کہاں جا سکتا تھا میں۔ ذرا باہر تک گیا تھا۔ کسی نے مجھے اغوا نہیں کر لیا تھا۔ مسجدوں میں میری گمشدگی کے اعلانات کروا دیے ہوتے آپ لوگوں نے۔"

پانچویں چھٹی مرتبہ کے اس سوال پر میں نے بہت چڑ کر کہا تھا۔

"ارے' دماغ تو درست ہے تمہارا؟" ابو نے مجھے موقع' جگہ دیکھے بغیر وہیں ٹھیک ٹھاک طریقے سے لتاڑ دیا تھا۔ "اب تمہیں بڑوں سے گفتگو کرنے کے آداب بھی سکھانے پڑیں گے۔ بات کرنے کی تمیز بھی بھولتے جا رہے ہو کیا؟"

میرا موڈ مزید آف ہو گیا۔ مزاج پر جھنجلاہٹ ٹھیک ٹھاک طرح …
گئی۔

"ابو پلیز کم از کم آج کے دن تو......" بڑے بھائی نے لجاجت سے کہا۔

"ارے تو غیر ذمہ داری کی بھی کوئی حد ہو۔ بغیر کسی اطلاع … صاحب زادے گھنٹے بھر سے دنیا پوچھ رہی ہے۔ زور شور سے اور … دولہے صاحب کا کچھ اتا پتہ نہیں۔" ابو نے جھلا کر کہا تھا۔

میں چڑ گیا۔ میرا دل چاہا ابو سے کہوں۔ تو دنیا پر ایسی کیا آفت آن … دولہے کو تلاش کر رہی ہے۔ دولہا نہ ہوا نمائش کے لئے رکھا ہوا شو پیس ہو گیا … کر سوچتا رہا لیکن اس وقت کچھ کہنا ابو سے مزید سننے کو دعوت دینا تھا … سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"ہم اصل میں تصویریں کھنچوانے کے لئے تم کو ڈھونڈ رہے … نے نرمی سے کہا۔

"اور کیا' دیکھو ناں' مووی کے لیے تو تم نے منع کر دیا تھا۔ … نے رکھا بھی نہیں۔ کم از کم تصویریں تو......" بڑی بھابی نے … دی۔

"ہاں آؤ ناں بیٹا' تمہارے سسرالی عزیز اسی وجہ سے رکے ہوئے … امی نے مجھ سے کہا۔

پھر بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی نے مجھے پکڑ کر اسٹیج پر رکھے صوفے پر …

"ارے' اتنا پھیل کر مت بیٹھو۔ چلو ادھر کھسکو۔"

بڑی بھابی نے بالکل مجھے الماس میں ٹھنسا دیا مجھے کوفت ہونے لگی … سا بیٹھا رہا اور میرا چہرہ تو بالکل دل کا آئینہ ہے۔ چہرے پر صاف … بغیر کسی دقت کے پڑھی جا سکتی تھی۔

"ارے شکل درست کرو اپنی۔ کسی نے پیٹا ہے کیا۔" بڑے بھائی نے … تھا' پھر چونک کر پوچھا۔ "وہ تمہارا ہار کیا ہوا؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ولیمے والا دولہا تو کہیں سے نہیں لگ رہا۔" چھوٹی بھابی نے کہا۔

"کیوں' ولیمے والے دولہا کی دم نکل آتی ہے کیا؟" اس بار میں … اور بہت چڑ کر میں نے پوچھا تھا۔

… مگر طرف سے زبردست قہقہے پڑے تھے۔
… حاضر جواب ہے۔"

… چپ کا دورہ پڑ گیا۔ میں پورے فوٹو سیشن کے دوران خاموش بیٹھا … سکتا رہا۔ خلدون ابراہیم نے بھی اپنی فیملی سمیت میرے اور الماس کے … کھنچی اور یہ بہت غنیمت تھا کہ وہ تصویر کھنچواتے وقت الماس کے ساتھ … میرے ساتھ بیٹھے ہوتے تو میں یقیناً انہیں صوفے پر سے دھکا دے …

… کے مطابق انہوں نے اس موضوع پر کیا۔ کسی اور موضوع پر بھی کوئی … جملہ' کوئی ایک لفظ بھی مزید نہیں کہا تھا۔

… کے فوٹو سیشن ختم ہوا۔ مہمان گھروں کو لوٹنے شروع ہو گئے۔ میں نے … ایک بوریت سے بھرپور تقریب کا اختتام ہوا۔ بالآخر گھر واپسی ہو گئی۔ … ی بھابی' چھوٹی بھابی اور امی نے کمرے میں پہنچا دیا۔ میں یونہی … کر بیٹھ گیا۔

… غالباً کوئی چیز رکھنے ڈرائنگ روم میں آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک …

… کیوں بیٹھ گئے؟"

… سستی کے عالم میں بیٹھا تھا' ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

… نہیں۔" میرا لہجہ خود بخود بے قرار سا ہو گیا۔

… تمہیں جا رہے؟" وہ اب حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

… جاؤں گا۔" میں نے اسی انداز میں جواب دیا تو بڑے بھائی میرے …

… ہے افنان؟" میں چپ رہا۔

… خاموشی سے مجھے کچھ دیر دیکھتے رہے' پھر میرے کندھے پر ہاتھ …

"Afnan! I can understand how do you feel"

"No, No one can understand how do I feel"

… میں سوچا تھا' مگر بڑے بھائی سے کچھ نہ کہا۔

… کچھ یاد نہیں ہے' تم بھی بھول جاؤ سب۔" بڑے بھائی نے سرگوشی

کرنے کے سے انداز میں مجھ سے کہا۔ ''دیکھو یہ زندگی بہت چھوٹی ہے۔ ہمارے پاس جو وقت ہے' بہت غنیمت ہے۔ اس وقت کو ضائع مت کرو پچھلی باتیں سوچ کر۔''

میں چپ چاپ بڑے بھائی کو دیکھتا رہا۔ پھر بڑی عاجزی سے ان سے کہا۔

''بڑے بھائی' آپ میری فکر مت کیجئے۔ بس مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے۔''

بڑے بھائی نے دائیں ابرو چڑھا کر مجھے دیکھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم کو اکیلا چھوڑ دینے سے سب ٹھیک ہو جائے گا؟''

''ہاں۔''

''اچھا۔'' بڑے بھائی کوئی تعرض کئے بغیر پلٹ گئے۔

میں ان کے جانے کے بعد ساکت و جامد سا صوفے پر بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔

لوگ کتنی آسانی سے ہر بات کہہ دیا کرتے ہیں۔ بڑے بھائی نے کتنے آرام سے کہہ دیا بھول جاؤ سب۔ بڑے بھائی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ بھولنے کے لئے مجھے کرنا کیا ہو گا۔ خلدون ابراہیم نے کس درجے سکون سے کہہ دیا تھا۔ ''رات گئی۔ بات گئی۔'' اونہہ رات کہاں گئی...... رات تو سر پر کھڑی ہے۔ ایک ہی رات میری زندگی پر مسلط ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کیا فرق ہے ہر رات میں؟

اونہہ...... خلدون ابراہیم مجھ پر حرام حلال کا فرق واضح کر رہے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ ہر چیز اپنی جائز حد میں اچھی لگتی ہے...... مجھے ہنسی آنے لگی۔ میرا دل چاہا خلدون ابراہیم کا خوب مذاق اڑاؤں...... یہ جائز حد کیا ہوتی ہے...... کیا اب یہ جائز حد' ناجائز حد کو کراس کرنے والی شرمندگی کے احساس کو کم کر دے گی؟ یا کسی کے سامنے اٹھائی جانے والی ذلت کا احساس ختم ہو جائے گا؟ بے آبرو ہونے کا احساس مر جائے گا؟

الماس تو ہمیشہ الماس ہی رہے گی ناں۔ افنان ہمیشہ افنان ہی رہے گا...... تو پھر؟

اور پھر اس 'تو پھر' کے آگے میری ہر سوچ ختم ہو گئی۔ میں چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے' میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میری آئندہ زندگی کیسی گزرے گی۔

میں بے آواز چلتا اپنے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔ کوئی احساس نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔

اندر آتے ہی سب سے پہلے میری نظر الماس پر پڑی تھی۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی

جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ الماری کھول کر اس میں سے اپنا سلیپنگ سوٹ نکالا۔ واش روم جا کر چینج کیا۔ برش کیا۔ جب باہر آیا تو الماس اسی پوزیشن میں بیٹھی ملی اس کی طرف دھیان دیے بغیر میں نے بستر پر سے چادر اٹھائی اور فرش پر بچھانے لگا۔ الماس ایک دم چھلانگ مار کر بستر سے اتر گئی تھی۔

''تم ادھر آ جاؤ۔ میں یہاں سو جاتی ہوں۔''

کل کے بعد یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے کوئی جواب دیے بغیر صوفے پر سے کشن اٹھایا اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔'' الماس منمنانے لگی۔

میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے کچھ غیر معمولی سا محسوس کر کے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے پر مجھے پتا چلا کہ الماس میرے سرہانے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر خاصی کوفت سے اسے دیکھا۔ پھر بڑی ناگواری سے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

''تم اوپر سو جاؤ۔'' الماس نے آہستگی سے کہا۔

''تمہیں میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے خاصی ترشی سے کہا۔

وہ چند لمحے مجھے چپ چاپ دیکھتی رہی پھر نظر جھکا کر کہا۔ ''میں نے تمہیں تمہاری جگہ سے بے دخل کر دیا۔ میری وجہ سے تمہیں......''

میں نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔ ''میں سونا چاہتا ہوں۔''

میرے قطعی انداز میں کہہ دینے کے باوجود وہ یونہی میرے سامنے نظریں جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی' پھر نہایت بے بسی سے کہا۔

''افنان' ہم اجنبی تو نہیں ہیں؟''

''ہاں' مگر یہ احساس کہ شناسا ہیں' بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک ہے۔''

میں نے تلخی سے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک بار پھر آنکھوں پر دایاں بازو رکھ لیا۔ چادر جو آدھی زمین پر بچھائی تھی' باقی آدھی رہ جانے والی اوڑھ لی۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوتا رہا تھا کہ الماس ابھی تک وہیں بیٹھی ہے۔ میرا ایک لمحے کو دل چاہا اس سے کہوں میرے سر پر سوار مت رہو' مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے نہیں پتا وہ کب وہاں سے گئی اور گئی تو کہاں گئی' مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے یہ بھی

نہیں پتا کہ میں تھکا ہوا ہونے کے باوجود کب تک جاگتا رہا تھا اور کب میری آنکھ لگی تھی یا کہ لگی بھی تھی یا نہیں لگی تھی کیونکہ فجر کی اذانیں میں نے بہرحال پورے ہوش و حواس میں سنی تھیں۔ میں پہلی اذان کے ساتھ ہی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے دیکھا تو بستر بے شکن تھا اور لائٹ جل رہی تھی۔ شاید رات بھر جلتی رہی تھی۔ باہر نکلتے وقت لمحے بھر کو بھی میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ آخر الماس کدھر گئی؟

جب میں نماز پڑھ کے واپس آیا تو بستر ہنوز خالی تھا۔ لائٹ بدستور جل رہی تھی۔ میں کوئی دھیان دیے بغیر کپڑے لینے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی الماری کی طرف آیا تو دیکھا بیڈ سے تھوڑے فاصلے پر الماس بھی فرش پر ہی داہنی کروٹ کے بل لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔ داہنا ہاتھ سر کے نیچے تھا' بایاں زمین پر۔ اس نے اپنے دوپٹے کو ہی چادر کی طرح اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا دوپٹہ بھی تو گز گز بھر لمبا تھا اور جو اس وقت آدھا نیچے پڑا تھا اور آدھا اس پر۔ میں نے گہری سانس لے کر کپڑے لینے کا ارادہ ترک کیا اور شیو کرنے واش روم چلا آیا۔ شیو کرنے کے بعد ہک پر لٹکے کرتے شلوار کا انتخاب کیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا شاور لیا۔ باہر آکر گیلا تولیہ رائٹنگ ٹیبل کے پاس رکھی کرسی پر ڈالا۔ ہیئر برش لینے کے ارادے سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آیا تو الماس کے سونے کی پوزیشن میں فرق آچکا تھا۔ اب وہ سیدھی لیٹی تھی۔ لمحے بھر کو میرے قدم تھم سے گئے۔ وہ اچھی ہی اتنی لگ رہی تھی۔

اس کی رنگت بہت صاف تھی۔ لمبی گھنی پلکوں کا عکس گالوں پر پڑ رہا تھا۔ اس کے گالوں پر سے ڈمپلز حیرت انگیز طور پر سے بالکل غائب ہو گئے تھے۔ ناک میں ایک نگ والی کیل چمک رہی تھی اور یہ واحد زیور تھا جو اس وقت اس نے پہن رکھا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں کا کٹاؤ بہت جاذب نظر اور قابل توجہ تھا۔ ساڑھے تیرہ سال پہلے جب میں اس سے ملا تھا تو اس کے بال بمشکل کندھے تک آتے تھے اور اب...... میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس کے بالوں کی لمبائی کتنی تھی۔

مجھے یاد آیا...... بڑی بھابی جب پہلی مرتبہ میرے سسرال سے ہو کر آئی تھیں تو الماس کی دیگر خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بے حد رشک سے کہا تھا۔ "اس کے بال بہت خوب صورت ہیں افنان! بے حد لمبے اور خاصے چمکیلے۔"

اور اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا بڑی بھابی نے ٹھیک کہا تھا۔ اس کے بال واقعی خوب صورت تھے۔ گھونگھریالے گولڈن براؤن بال اس کے سر کے اردگرد یوں بکھرے تھے

جیسے...... بادلوں کے نرغے میں چاند......!

فی الحال سب سے مناسب تشبیہ یہی تھی جو مجھے سوجھی تھی۔ ایک لمحے کو میرا دل چاہا اس کے بال ہاتھ میں لے کر محسوس کر کے دیکھوں تو...... اصلی بھی ہیں یا...... مگر میں ساکت سا کھڑا اسے تکتا رہا۔ ایسے جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کوئی منتر پڑھ کے پھونک دیا ہو! میں مسحور سا کھڑا بس ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ اس کا سادہ سا Narrow neck اور اس میں سے جھانکتی Collar bone کا Sternal end...... کل سے لے کر آج تک میں نے سوٹ کی رنگت پر بھی پہلی مرتبہ غور کیا تھا۔ سادہ سا گرے کلر کا سوٹ اس پر اچھا بھی لگ رہا تھا۔ دراز قد تو خیر وہ تھی ہی۔ اس کا سراپا متناسب تھا۔

کمال ہے' اتنا ڈھیر سارا۔ معصوم اور بے خبر حسن میرے کمرے میں بکھرا پڑا تھا اور میں اب تک کتنا بے خبر تھا۔ پرسوں سے لے کر آج تک یہ پہلی مرتبہ تھا جو میں نے اسے اتنے غور سے دیکھا تھا اور اسے اب دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی لفظ آ رہا تھا۔

قیامت...... قیامت......

سوتے سوتے میں ایک دم اس نے ہونٹ بھینچے تھے اور گالوں میں پڑنے والے ڈمپلز نمایاں ہو گئے ایک دم......

ساڑھے تیرہ سال بعد بھی اس کے گالوں میں اتنے ہی گہرے ڈمپلز پڑتے تھے' جتنے ساڑھے تیرہ سال پہلے پڑتے تھے۔

میری سحر زدگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک دم میرا دل چاہا تھا کہ اس کے گال پر انگلی رکھ کر ان ڈمپلز کی گہرائی کو محسوس کروں۔ مجھے یاد آیا کہ ساڑھے تیرہ سال پہلے بھی میں نے ایسی ہی خواہش کی تھی اور یہ خواہش آج ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھی۔ میں سحر زدہ سا اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس بڑھنے کے پیچھے ذہن کے کسی کونے کھدرے میں یہ خیال بھی تھا کہ اس عورت کے ساتھ میرا نکاح ہو چکا ہے۔

میں بے اختیار اس پر جھکا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی' کون ہے یہاں......؟"

یہ للکار میرے اعصاب ہلا دینے کے لئے کافی تھی۔ سحر ایک دم ٹوٹ گیا تھا۔

اف...... میں بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔

مجھے لگا جیسے ابھی دو مضبوط ہاتھ مجھے گریبان سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیں گے اور پھر

تھپڑوں' لاتوں اور گھونسوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ میں خوف زدہ سا ہو کر پیچھے ہٹا تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول سے الجھ کر گرا۔ لکڑی کی الماری میں ابھری ہوئی تو کیلی کیل جسے میں ہر بار دیکھتا تھا مگر ٹھونک کر اندر کرنا ہر بار بھول جاتا تھا۔ اس نے پنڈلی پر گہرا اور لمبا کٹ ڈال دیا تھا مگر مجھے تکلیف کا احساس تک نہ ہوا۔ الماس ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔

''ماما' بس کریں' ماما بس کریں۔''

اف شور تھا' ہنگامہ تھا' بے بسی تھی' بے آبرو ہونے کا' تذلیل کا احساس تھا' شرمندگی تھی۔

یہ الماس تھی یا مارتھا ایوانز تھی' مجھے اندازہ نہ ہو سکا...... پھر میں تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ آوازوں نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا تھا اور میں بے اختیار کانوں پر ہاتھ رکھ کر دہاڑا تھا۔

''خاموش......!''

ایک دم سناٹا ہو گیا۔ سکوت ہو گیا۔ خاموشی ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو اندازہ ہوا' مین روڈ پر کھڑا ہوں۔ کیا عجب تھا کہ مجھے احساس تک نہ ہوا تھا کہ میں کدھر کا کدھر نکل آیا ہوں۔ چونکہ صبح ہی صبح کا وقت تھا' سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ نہیں تو میں جس کیفیت میں بھاگا تھا' اس کے حساب سے تو میں یقیناً کسی گاڑی کے نیچے آ گیا ہوتا۔

مجھے اپنی کیفیت سے ڈر سا لگنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا اگر Illusion کا یہی عالم رہا تو میں تو بہت جلد پاگل ہو جاؤں گا۔ خاصی وحشت سے میں نے سوچا تھا اور اس لمحے خلدون ابراہیم سے شدید نفرت اور چڑ محسوس ہوئی تھی۔ میرا دل چاہا اس آدمی کا گلا گھونٹ دوں' اگر ناحق کسی کو جان سے مارنے کی ممانعت نہ ہوتی تو خلدون ابراہیم میرے ہاتھوں مرنے والا دوسرا شخص ہوتا۔ میں نفرت کے عالم میں الٹا سیدھا سوچتا رہا۔ اس وقت میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں گھر واپس جاؤں۔ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ الماس کو دوبارہ دیکھوں' میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں الماس سے دور بھاگ جاؤں یا الماس کو کہیں غائب کر دوں۔ اسے کہیں پھینک دوں۔ کہیں بھیج دوں۔ میں مستقل الماس کا سامنا کیسے کروں گا۔ مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یہ ویسی ہی کیفیت تھی جو مارتھا ایوانز کو پہلی بار اپنے سامنے دیکھ کر میری ہوئی تھی۔ اس صورت حال سے تو پھر بھی میرا کے' طوعاً کرہاً جبراً کسی طور نمٹ لیا گیا تھا۔

صورت حال سے نمٹنے کا طریقہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں خاصی دیر تک بے مقصد سڑک کے کنارے کھڑا لاتعلقی سے گزرتے ٹریفک کو دیکھتا رہا۔ پھر بالآخر تھکے تھکے قدموں سے گھر چل دیا۔

گھر میں زندگی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے اور میں شکر کر رہا تھا کہ مجھے اس عالم میں میرے گھر والوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد جب سب اٹھ کر چلے گئے تو ابو نے مجھ سے پوچھا۔

''تفریح کے لیے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

میں چند لمحے تو ان کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر مجھ پر بے بسی سی طاری ہو گئی۔ تفریح...... وہ کسے کہتے ہیں؟ اتنا جو کچھ ہو چکا ہے' اس کے بعد تفریح کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔ میں سوچ گیا۔

''ابو کا مطلب ہے' گھومنے پھرنے کہاں جانا چاہو گے؟'' بڑے بھائی نے وضاحت کی۔

''کہیں نہیں۔'' میرے منہ سے ایک دم نکلا تھا۔

''کیا مطلب؟'' ابو اور بڑے بھائی دونوں سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''میرا مطلب ہے' میں ابھی کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے آفس جوائن کرنا ہے آج سے۔'' میں نے بغیر اٹکے ہموار لہجے میں کہا تھا۔ پتا نہیں کیسے بروقت یہ بات مجھے سوجھی تھی۔

ابو میرے اوپر خفا ہونے لگے۔ ''عجیب آدمی ہو' مہینے بھر کی تو چھٹی لی ہوتی۔ آگے مہمان آ رہی ہیں۔ لوگ ملنے آتے رہیں گے۔''

''میں ان دنوں جس پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں' وہ بہت اہم ہے۔ میں فی الحال [illegible] نہیں کر سکتا اور مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ دعوتوں کو منع کر دیں۔'' ایک ہی سانس میں یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ آیا۔

ابو میرے اٹھتے ہی مجھ پر خفا ہونے لگے تھے اور مجھے اندازہ تھا' میرے جانے کے بعد بھی خاصی دیر تک مجھ پر بولتے ہی رہے ہوں گے۔ بہرحال میں نے پروا نہیں کی۔ امی کو پتا چلا تو وہ بھی بے حد ناراض ہوئیں۔ ''ہاں ایک تم اکیلے ہی تو ذمہ دار اور عقلمند آدمی ہو' پورے شہر میں۔ وزیر اعظم سے بھی کہو ناں کہ اپنی کرسی تمہارے لیے خالی کر دے...... کم سے کم ملک کی قسمت تو سنور ہی جائے گی۔''

میں نے کان لپیٹ کر امی کی بات سنی تھی۔ بلکہ امی کی کیا گھر بھر کی سنی تھی اور میں کیا کرتا پھر۔ فی الحال تو میں کسی طور الماس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ میں نے چھٹیاں پندرہ دن کی لی تھیں مگر مجھے تو دو ہی دن بھاری پڑ گئے تھے۔ پندرہ دن اگر یونہی گزرتے تو میں تو بچ بچ پاگل ہو جاتا اور اس وقت آفس سے اچھی اور سائیٹ سے بہتر پیچھا چھڑانے کی جگہ اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔ یوں بھی میں نے اپنے گھر والوں سے جھوٹ کب بولا تھا۔ میں واقعی ایک اہم پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ سائیٹ پر میری موجودگی ضروری ہوتی تھی۔ سو میں چپ چاپ تیار ہو کر سائیٹ چلا آیا تھا۔

میرے ماتحت بھی مجھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کل ہی تو انہوں نے میرا ولیمہ اٹینڈ کیا تھا۔ اب مجھے ولیمے پر ہنسی آ رہی تھی۔ ہاہ......ولیمہ......!

پورا دن آفس میں گزار کر آٹھ بجے رات گھر جاتے ہوئے بھی میرا دل چاہ رہا تھا' کاش کہ آفس میں ہی کہیں الگ سے سونے کا کمرہ ہوتا تو میں رات بھی وہیں رہ جاتا۔ مگر ہر خواہش پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتی۔ مجھے گھر جانا ہی تھا اور اس رات جب کہ میں نے کل کے پہننے والے کپڑے نکالنے کی غرض سے الماری کھولی تو الماس بھی ادھر ہی موجود تھی۔ میں نے اس پر دھیان دیے بغیر کپڑے نکالے۔

"استری کرنا ہیں؟" الماس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے اسے بغیر کوئی جواب دیے استری کا پلگ لگایا۔

الماس میرے برابر میں آن کھڑی ہوئی۔ "میں کر دوں؟"

"نہیں۔" دو ٹوک انداز میں جواب دے کر میں استری کرنے لگا۔

وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر پوچھا۔ "تم نے آج سے آفس جوائن کر لیا؟"

میں اس بار خاموش رہا۔

"کل سے تم کتنے بجے جایا کرو گے؟"

اس کے سوالات ختم نہیں ہو رہے تھے اور میں جھنجلا گیا تھا۔

"میں تم کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

پھر اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے ایک طرف ہو گئی۔ میں کپڑوں پر استری کرتا رہا۔ سیاہ ڈریس پینٹ اور سیاہ اسٹرائپس سفید زمین والی شرٹ سلیقے سے استری کر کے میں نے ہینگ کر دی۔ برش کیا۔ کل کی طرح چادر بچھائی اور آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

الماس نے بھی مجھ سے کوئی اور بات نہیں کی۔ میں تو خیر اس سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس کو حتی الامکان Avoid کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے مارتھا ایوانز کو Avoid کرتا تھا مگر مارتھا ایوانز کچھ گھنٹے میرے سامنے رہتی تھی جب کہ الماس کو اب چوبیس گھنٹے میرے ہی گھر میں رہنا تھا۔ مارتھا ایوانز بس دن کے کچھ گھنٹے میں میری جان جلاتی تھی اور الماس دن اور رات کے ہر حصے میں میرا خون جلاتی تھی۔ مارتھا ایوانز کو میں جھلاہٹ میں بدتمیزی سے جھاڑ بھی دیا کرتا تھا۔ الماس کے لئے بھی دوسری رات سے یہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

شادی والی رات اور ولیمے والے دن اچھی طرح سے رو دھو چکنے کے بعد میں نے خود کو بہت تسلی سے سمجھا لیا تھا کہ میں چاہے مر جاؤں۔ چاہے خودکشی کر لوں۔ چاہے بے ہوشی خود پر سوار کر لوں۔ یہ بہر حال ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ افنان عادل اب میرا شوہر ہے اور میرے آنکھیں بند کر لینے سے' ابھی تک یقین نہ ہونے سے' میرے اب انکاری ہونے سے' دل سے ابھی تک تسلیم نہ کرنے کے باوجود یہ حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ ہونی ہر حال ہو چکی ہے اور میرے پاس اس ہونی کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ہر انسان اپنا نصیب اللہ تعالیٰ کے یہاں سے لکھوا کر لاتا ہے۔ اب اگر افنان عادل کو میرا نصیب بننا ہی تھا تو اسے کوئی مٹا نہیں سکتا تھا۔ بجز اللہ تعالیٰ کے ہی اور اب جب کہ یہ لکھ ہی دیا گیا ہے تو پھر کیسا رونا......اب تو جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے۔ اگر افنان عادل میرا نصیب بن ہی گیا ہے تو مجھے اپنے نصیب پر صبر کر لینا چاہئے یہی سوچ کر میں نے ہر معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن شاید افنان عادل ایسا نہ کر سکا تھا۔ وہ ابھی تک شاک میں تھا شاید......اس بات کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ اس سچائی کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔

شادی والی رات تو وہ مجھے چھوڑ کر گیا ہی تھا' ولیمے والی رات بھی بڑی بھابی' چھوٹے بھائی اور امی کے کمرے سے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ گھڑی کی سوئیوں پر میری نظر جم سی گئی تھی اور ٹائم تھا کہ تھم تھم کر گزر رہا تھا۔ بارہ سے ایک بجے ایک سے دو اور دو سے ڈھائی بج گئے۔ میں بھی افنان عادل کا انتظار کرتے کرتے تھک سی گئی۔ بالآخر میں نے تھک کر زیورات اتارنے شروع کر دیے۔ میک اپ صاف کیا۔ ولیمے کا بھاری کام والا غرارہ سوٹ اتار کر سادہ سا لان کا گرے

سوٹ پہن لیا۔ یہ سارے کام کرنے میں بھی مجھے آدھا گھنٹہ تو لگا ہی تھا اور افنان عادل کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ میں سر تھام کر بستر پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔ میری آئندہ زندگی کیسے اور کیسی گزرے گی۔ تبھی میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میں وہیں ساکت ہو گئی۔ افنان عادل میری طرف متوجہ ہوئے بغیر مسہری کے بالکل سامنے رکھی الماری کی طرف آیا۔ الماری کھول کر خاصی دیر تک کھڑا رہا' پھر غالباً اپنا سلیپنگ سوٹ نکالا تھا۔ میں چوری چوری اس کی ہر حرکت کو Observe کرتی رہی۔ وہ چینج کر کے آیا۔ تو مجھ سے خاصے فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے اوڑھنے والی چادر اٹھائی' میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسے بچھا کر لیٹ بھی گیا۔ مجھے بہت زیادہ برا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی فالتو چیز ہوں جو زبردستی اس کے کمرے میں دھکیل دی گئی ہوں۔ مسلط کردی گئی ہوں اس پر...... مجھے یہ بھی برا لگ رہا تھا کہ اتنے آرام دہ بستر کے ہوتے ہوئے وہ زمین پر لیٹے۔ تبھی میں نے اس سے اوپر لیٹ جانے کو کہا تھا مگر وہ میری بات پر توجہ دیے بغیر یونہی لیٹا رہا۔ لیٹنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سویا تو نہ ہوگا' سو میں اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھی۔ میں نے اسے آج اتنے عرصے بعد پہلی مرتبہ بغور دیکھا تھا۔ اس کا صاف سانولا رنگ' کشادہ پیشانی' پیشانی پر بے ترتیبی سے گرے گہرے سیاہ بال۔ اس کا قد زبردست تھا۔ Built تو اس کی پہلے بھی اچھی ہی تھی۔ اب تو اس کی Built اور شاندار ہو گئی تھی۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ بازوؤں پر گھنا رواں بہت پرکشش لگ رہا تھا۔ اس کی چوڑی مضبوط ہتھیلی' لمبی آرٹسٹک انگلیاں......نیم وا ہونٹ اور ان میں سے دکھتے موتیوں جیسے شفاف دانت......! افنان عادل کتنا شاندار تھا۔

میں محویت سے اسے تکتی رہی۔ تبھی اس نے ایک دم مجھے دیکھا اور میں بڑبڑا سی گئی تھی۔ اس کے بعد میرے بات کرنے پر اس نے مجھے ہر بار بڑی تندی' بدتمیزی اور بدتہذیبی سے جواب دیا تھا۔ میرے پاس برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا اور اس کے آخری جملوں نے تو بالخصوص مجھے بڑی تکلیف دی تھی۔

اس نے تو اپنی بات کہہ کر چادر سے منہ ڈھک لیا تھا اور مجھے رونا آنے لگا تھا۔ خاصی دیر تک تو کمرے کے عین وسط میں کھڑی میں سوچتی رہی کہ میں کہاں سوؤں کیونکہ میں یہ کیسے گوارا کر لیتی کہ میں خود اوپر مسہری پر جا لیٹوں اور وہ زمین پر پڑا لیٹے...... جبکہ کمرہ بھی اسی کا تھا اور مسہری بھی۔ میں تو بس یونہی آگئی تھی اس کمرے میں......

بالآخر میں نے بھی نیچے ہی بیڈ شیٹ بچھائی اور دوپٹہ اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں افنان عادل کے بارے میں سوچتی رہی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سو گیا تھا یا اب تک جاگ رہا تھا۔ بہرحال اسے پکار کر کچھ کہنے یا پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی میری۔

رات کے نہ جانے کس پہر مجھے نیند آئی اور بہت بے خبر آئی۔ آنکھ میری کسی چیز کے زوردار گرنے کی آواز پر کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دیکھا تو افنان عادل مجھ سے ذرا ہی سے فاصلے پر بیٹھا تھا اور قریب ہی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھا ہوا اسٹول الٹا پڑا تھا۔ غالباً افنان عادل اسی سے الجھ کر گرا تھا۔ وہ مجھے تکے جا رہا تھا۔ اس کی نظر میں وارفتگی نہیں تھی۔ بے خودی بھی نہیں تھی۔ نہ محبت اور نہ ہی پسندیدگی تھی۔ اس کی نگاہ میں تو کوئی اور ہی کیفیت تھی۔ میں خوف زدہ سی ہو گئی۔

''افنان کیا ہو گیا ہے تم کو؟'' ڈر کر میں نے پوچھا تھا۔

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے تکے گیا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ ایک دم آنکھیں بند کرلیں۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ قسم سے میں نے کچھ نہیں کیا۔''

وہ آنکھیں بند کیے ہی کہتا رہا۔ میں کچھ اور خائف ہو گئی۔

''تم نے کیا کیا ہے افنان؟'' میں نے ایک دم اسے جھنجوڑ دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اسی کیفیت میں مجھے دیکھے گیا۔ میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک دم میری نظر اس کی پنڈلی پر پڑی۔ زخم خاصا گہرا تھا۔ گوشت ادھڑ گیا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' میرے پوچھنے پر کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے جھک کر اس کا زخم دیکھنا چاہا۔

''نہ' مجھے ہاتھ نہ لگانا۔'' اس نے کہہ کر ایک دم اپنی ٹانگ کھینچ لی۔

مجھے شدید خفت کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''ٹھہرو' میں دوا تو لگا دوں۔''

مگر اسے نہ جانے کیا ہوا کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد اس نے پلٹ کر کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ میں منتظر ہی رہی وہ اب آئے تب آئے۔ مگر وہ آیا ہی نہیں۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ پتا نہیں کس عالم میں کہاں کو جا نکلا ہو۔ میں بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی رہی پھر مجھے بوریت سی ہونے لگی۔ اسی عالم میں' کمرے سے باہر نکل آئی۔ مجھے اس گھر میں آج تیسرا دن تھا اور گھر کے محل وقوع

سے بھی میں واقف نہیں تھی۔ اس گھر میں بے حد کمرے تھے اور بیشتر کمرے اس وقت بند تھے۔ میں پاگلوں کی طرح سے کونا کونا جھانکتی پھری اور چکراتے چکراتے بالآخر کچن میں جا پہنچی۔ یہ غالباً چھوٹی بھابی تھیں۔ جو اس وقت ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔

''ارے......تم......!'' انہوں نے مجھے قدرے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے شرمندہ سی ہو کر انہیں سلام کیا۔

''اتنی جلدی اٹھ گئیں۔'' سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''جی!'' میں اس کے علاوہ انہیں کیا جواب دیتی۔

''اور اٹھنے کے ساتھ ہی کچن میں......'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں بہت پہلے کی جاگی ہوئی ہوں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''اچھا' نماز پڑھنے کے لیے اٹھی ہوں گی۔'' انہوں نے میرے بولنے سے پہلے ہی بات جاری رکھی۔ ''آج ہماری تو آنکھ کھل نہیں سکی فجر پر گھر بھر سوتا رہ گیا۔ اصل میں اس قسم کی تقریبات جب گھر میں ہوتی ہیں ناں' تو روٹین اپ سیٹ ہو ہی جاتا ہے۔'' پھر خود ہی کہنے لگیں۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن میں سب سیٹ ہو جائے گا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکیں۔ پھر ایک دم پوچھا۔ ''افنان جاگ گیا کیا جواہر؟''

میں ان کے اس اچانک سوال پر سٹپٹا سی گئی تھی۔ دوسرے کسی بالکل غیر کے منہ سے اپنا اصل نام سننا عجیب سا لگا مجھے۔ میں الماس نام ہی کی عادی تھی۔

''جی!'' خاصی عجلت کے عالم میں میرے منہ سے نکلا تھا۔

''اچھا' تو پھر تم چلو' ناشتہ میں تمہارے کمرے میں ہی بھیج رہی ہوں۔''

چھوٹی بھابی نے شکر ہے کوئی مزید سوالات نہیں کیے تھے ورنہ میرے لیے مشکل ہو جاتی۔ میں ان کو جواب کیا دیتی؟

''میں آپ کے ساتھ کچھ ہیلپ کروا دوں؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ کمرے میں واپس جانے کا تصور ہی میرا دل برا کر دینے والا تھا۔

''چ......کیسی باتیں کرتی ہو جواہر!'' انہوں نے خفگی سے مجھے دیکھا۔ تبھی بڑی بھابی بھی چلی آئی تھیں۔

''صفیہ' آج تو صبح ہی صبح کچن میں بڑی رونق ہے۔'' مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

''بڑی بھابی' اب تو کچن میں رونق رہا ہی کرے گی۔'' چھوٹی بھابی نے ہلکے سے قہقہے کے بعد جواب دیا۔

''کیوں جواہر' افنان کمرے میں ہی ہے؟'' بڑی بھابی اب مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ تب تک میں خود کو ہر قسم کے سوال کے لیے تیار کر چکی تھی' سو آہستگی سے کہا۔ ''باہر گیا ہے۔''

''اچھا' جاگنگ کے لیے گیا ہو گا۔'' بڑی بھابی نے سر ہلا کر کہا۔ ''یہ سب اس کے روٹین کا حصہ ہے۔ کچھ بھی ہو جانے سے اس کے روٹین پر فرق نہیں پڑتا۔ اس نے تم کو بتایا تو ہو گا' اس بارے میں۔''

''جی!'' کہنے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ارے لو' تو بتا بھی نہیں رہیں۔ کب سے کمرے میں ناشتہ بھجوانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ میں بھی آ گیا ہو گا اب تک۔'' چھوٹی بھابی نے کہا۔

''ہاں' آج کچھ دیر ہو گئی اسے۔'' بڑی بھابی نے تبصرہ کیا۔

ابھی وہ کچھ اور بھی کہتیں کہ امی آ گئیں۔ ''ارے بہو' تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا اور ابھی میں انہیں کوئی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ وہ چھوٹی بھابی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ ''چھوٹی بہو ناشتہ تیار نہیں ہوا ابھی۔''

''بس امی! ابھی تیار ہوا جاتا ہے۔ افنان تو ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔'' چھوٹی بھابی نے جواب دیا۔

''ہاں' آ لینے دو اسے۔'' کہتے ہوئے افنان کی امی مجھے بغور دیکھ رہی تھیں۔ ایک دم کہنے لگیں۔ ''یہ کیا بہو' چوڑیاں کدھر گئیں تمہاری؟ اور...... دوپٹہ ہٹاؤ سر سے۔''

''کیا ہوا......آن......ام......می......؟'' میں نے خاصا بوکھلا کر پوچھا تھا۔ اسی بوکھلاہٹ میں مجھے فوری طور سے یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ افنان کی امی کو کیا کہوں۔ آنٹی یا امی اسی لیے کچھ ملا جلا سا لفظ نکلا تھا۔

''چ......بہو' سب زیور کیا ہوئے تمہارے......؟'' وہ خفگی سے پوچھ رہی تھیں۔ ''اور کیا سادہ سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ آج تیسرا دن ہے تمہاری شادی کو۔ ابھی بہو گی' اوروں کی نہیں' تو کب ایسا کرو گی؟''

وہ کہہ رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی' کس کے لئے سب کچھ کروں۔ میرا شوہر تو مجھ پر ایک نظر کیا' آدھی نظر بھی نہیں ڈالتا۔ پھر کسی چیز کا بھی کیا فائدہ ہے۔

''معاف کرنا بہو' تم کو برا تو لگا ہو گا۔''

مجھے خاموش پا کر ان کو یہی کہنا تھا۔

"نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے قدرے شرمندگی سے کہا تھا۔

"تو پھر جاؤ بیٹا! تیار ہو کر آؤ۔ کچھ تو پہنو کہ دلہن لگو۔"

ان کے کہنے پر میں چپ چاپ کمرے میں چلی آئی۔ افنان ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے بہر حال ہلکے کام والا سوٹ پہنا اور تھوڑا زیور بھی پہن لیا۔ افنان کی والدہ کے کہنے کے مطابق تیار ہو کر میں جب باہر آئی تو وہ مجھے دیکھ کر ایک دم بہت خوش ہو گئیں۔

"ہاں اب دلہن لگ رہی ہو ناں۔"

انہوں نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ مجھے اس لمحے بہت اچھا لگا۔ اتنی محبت پر میری آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

"سچ کہنا بہو!" اب کی بار وہ بڑی رازداری سے پوچھ رہی تھیں۔ "کیا افنان نے تم سے کہا ہے کہ تم یونہی سادہ رہو۔"

مجھے ان کی سادگی پر ترس آیا اور ساتھ ہی ایک دم یہ خیال بھی آیا کہ اگر میں نے ہاں میں جواب دیا تو افنان خواہ مخواہ خفا ہونے لگے۔ اس لئے مجھے تو اس کا دفاع کرنا تھا۔ اپنا دفاع کرنے کے لئے..... سو میں نے کہا۔

"نہیں امی! اسے بھلا کیا کہنا تھا۔ مجھے خود ہی سادہ رہنا پسند ہے۔"

وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ "ارے کیسی لڑکی ہو تم' لڑکیوں کو تو سجنے سنورنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔"

میں نے ان کا تبصرہ خاموش رہ کر سنا۔ میں ان سے کہہ نہ سکی۔ سجنا سنورنا تو کسی کے لئے اچھا لگتا ہے۔ جب سراہنے والی نظر ہی نہ ہو تو کوئی سج سنور کے کیا کرے گا۔

"جاؤ بہو' تم اپنے کمرے میں چلو۔ افنان آتا ہی ہو گا۔"

ان کے کہنے پر میں خاموشی سے کمرے میں چلی آئی۔ حالانکہ کمرے میں آ کر بوریت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونا تھا۔ میں کچھ دیر تک تو یونہی بے وقوفوں کی طرح کمرے کے عین وسط میں کھڑی رہی۔ پھر کمرے کی ہیئت پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اس عروسی کمرے کی سجاوٹ خاصی شاندار تھی۔ کمرے میں سامان اتنا زیادہ نہیں تھا مگر جو بھی تھا' کمرے کے مکین کی نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ شمالی دیوار کے ساتھ رکھی مسہری تھی۔ مغربی دیوار کے ساتھ لگا صوفہ اور بیچ میں سینٹر ٹیبل۔ مشرقی دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل اور اس کے برابر میں لکڑی کی الماری تھی۔ مشرقی اور جنوبی دیوار کے کونے میں

رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ اسٹول اور رائٹنگ ٹیبل کے بالکل برابر میں رکھا آئرن اسٹینڈ' رائٹنگ ٹیبل کے اوپر ہی بک شیلف تھا جس میں سلیقے سے کتابیں سجی تھیں۔

اس کمرے میں سارا سامان افنان عادل کا تھا۔ اس کمرے میں میری کوئی چیز اگر تھی تو صرف الماری کے برابر میں رکھی اٹیچی تھی۔ اتنا تفصیلی ہر چیز پر غور کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہاں میرے جہیز کی ایک بھی چیز موجود نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ افنان عادل کے اس کمرے میں نہ میرے سامان کے لیے کوئی جگہ تھی اور نہ میرے لیے۔ اور خیر' اس کے دل میں تو میرے لئے کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔

میں نے بڑی بد دلی سے سوچا تھا' پھر دل پر بڑا جبر کر کے میں افنان عادل کا انتظار کرتی رہی تھی۔ چھوٹی بھابی نے جو ناشتہ کمرے میں پہنچایا تھا' وہ پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا' مگر کسی ایک چیز کو بھی میرا دیکھنے کو دل نہیں چاہا۔ افنان عادل کو نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا۔ تب میں نے جل بھن کے ٹرے اٹھائی اور جا کر باورچی خانے میں رکھ آئی۔ باہر نکلتے ہوئے بڑی بھابی سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔

"ہاں' اب لگ رہا ہے ناں کہ دلہن ہو۔" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی تعریفی لہجے میں کہا۔ "ماشاء اللہ اچھی لگ رہی ہو۔"

میں جھینپ سی گئی تھی۔ "جی ہاں امی نے مجھ سے کہا تھا۔" میں کہتے کہتے رک سی گئی۔

"ہاں' ٹھیک کہا ناں' اب دلہن بھی دلہن نہیں لگے گی تو کیا لگے گی پھر۔" وہ کہہ کر چند لمحے کو رکیں پھر کہا۔ "ویسے افنان اس وقت ٹیبل پر موجود ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو بس......"

میں بڑی بھابی کی بات پوری سن نہیں سکی۔ میں حیرت زدہ تھی۔ افنان عادل گھر پر تھا اور مجھے پتا نہیں تھا۔ مجھے افنان عادل پر غصہ آ رہا تھا۔ بڑی بھابی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

"آہم...... ویسے افنان نے تم کو بتایا تو ہو گا کہ وہ تفریح کے لئے تم کو کہاں لے کر جا رہا ہے۔"

اور ابھی میں نے بڑی بھابی کو جواب دینے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے کی کوشش بھی شروع نہیں کی تھی کہ جواب بڑے بھائی کی طرف سے آیا تھا۔

"افنان تفریح کے لئے کہیں نہیں جا رہا...... وہ آفس جا چکا ہے۔" بڑے سپاٹ لہجے میں انہوں نے اطلاع دی تھی۔ مجھے سن کر ہی دھچکا لگا تھا۔

''ہیں......! کیا کہہ رہے ہیں آپ......؟'' بڑی بھابی نے ایسے پوچھا تھا جیسے انہیں سننے میں دھوکا ہوا ہو اور سننے میں دھوکا تو مجھے بھی ہوا تھا۔

''جواہر! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' بڑے بھائی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں خاموشی سے افنان کے کمرے میں آ گئی تھی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہوتا ہو گا کوئی شوہر ایسا جو تیسرے ہی دن اپنی بیوی کو چھوڑ کر خود آفس چل دے...... ہاں، میرا شوہر ہے ناں۔ یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ بڑا شاندار شوہر تھا میرا۔ وہ کب گھر آیا تھا اور کب آفس چلا گیا تھا، مجھے خبر نہیں ہو سکی تھی۔ مجھے افنان عادل پر شدید غصہ آ رہا تھا اور غصے کے مارے مجھے رونا بھی آ رہا تھا۔ افنان عادل کا سجا سجایا کمرہ مجھے ایک دم زہر لگنے لگا تھا اور اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا پورے کمرے کو تہس نہس کر دوں۔ مجھے اتنا شدید غصہ آتا نہیں تھا مگر اس وقت آ رہا تھا۔ مارے غصے کے میں نے مسہری تک آنے والی گلاب کے پھولوں کی لڑیاں اکھاڑ دیں۔ اسٹول پر چڑھ کر چھت سے لٹکتی اور بندھی ہوئی تمام موتیے کی کلیاں اور گلاب کے پھول نوچ دیے۔ ہر ہر سجاوٹ کی چیز کو ڈسٹ بن کی نذر کرتے ہوئے مجھے رونا آ رہا تھا۔ میں فرش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد افنان کی والدہ، بڑی بھابی، چھوٹی بھابی کمرے میں آ گئیں اور اس وقت تک میں رو دھو کے چپ ہو چکی تھی۔ تینوں خاصی دیر تک یونہی چپ بیٹھی رہیں۔ پھر امی نے نہایت تاسف سے کہا۔

''میں تم سے کیا کہوں بہو! بہت شرمندہ ہوں۔ میرا بیٹا بہت نالائق ہے۔ بتاؤ، کوئی تیسرے دن کی دلہن کو چھوڑ کر آفس جاتا ہے؟'' وہ خفگی سے پوچھ رہی تھیں اور میری آنکھیں ایک بار پھر برسنے کے لئے تیار تھیں مگر مجھے خود پر بڑا ضبط کرنا پڑا تھا اور پتا نہیں کیسے بلا ارادہ ہی میرے منہ سے پھسل پڑا تھا۔

''یقیناً کوئی اہم کام رہا ہو گا۔''

میں نہ جانے کیوں افنان عادل کا دفاع کر رہی تھی۔ شاید میں لاشعوری طور سے خود کو بری کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ افنان کی امی نے مجھے بغور دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں۔ خاموشی سے کمرے کا جائزہ لیتی رہی تھیں، پھر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا مگر ہونٹ بھینچ لیے۔

''بڑی بہو......! بہو کو گھر تو دکھاؤ۔'' چند لمحے بعد گہری سانس کھینچ کر تھکے تھکے انداز میں انہوں نے کہا۔

''کیوں نہیں امی!'' کہہ کر بڑی بھابی نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ''آؤ جواہر!'' اور مجھے کمرے سے باہر لے آئیں۔

پھر دونوں مجھے گھر کے مختلف حصے دکھاتی رہیں۔ دو منزلہ اس گھر کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ہر پہلو اور ہر ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے۔ طرز تعمیر میں سادگی کے ساتھ نفاست اور خوب صورتی کے ساتھ کشش بھی تھی۔ بیس منٹ (Basement) خاصی کشادہ اور چھت وسیع و عریض تھی۔ چھت پر کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔

''کسی بھی بچے کو جب سکون سے اسٹڈی کرنی ہوتی ہے تو انہی کمروں کا رخ کرتے ہیں۔'' بڑی بھابی کمروں کا لاک کھولتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''افنان تو ادھر ہی اسٹڈی کیا کرتا تھا۔'' بڑی بھابی مزید بتا رہی تھیں۔

کمرے میں گھستے ہی مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا تھا۔ میرا سارا جہیز کا سامان ادھر رکھا تھا۔

''ارے بڑی بھابی! یہ جواہر کا جہیز بڑے بھائی نے بھجوایا نہیں تھا جواہر کے یہاں۔'' چھوٹی بھابی پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں، شادی کی مصروفیات میں یہ بات دھیان سے ہی نکل گئی۔'' بڑی بھابی نے جواب دیا۔

''بڑی بھابی یہ تو برا ہوا۔ افنان کی نظر بھی اگر پڑ گئی یہاں تو ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ آپ کو یاد نہیں جب جواہر کے جہیز کا ٹرک ادھر آ کر رکا تھا تب ہی افنان کس قدر بولا تھا کہ جب ہر فضول رسم کو میں نے منع کیا تھا تو اس میں جہیز بھی آتا تھا۔ جب یہ سب چیزیں میرے گھر میں موجود ہیں تو کسی سے کیوں لوں میں جہیز کے نام پر۔ بڑے بھائی نے بھی کہہ کر اسے ٹھنڈا کیا کہ ابھی تو آ گیا ہے مگر ہم واپس بھجوا دیں گے۔''

''صفیہ! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج کاشان آ جائیں تو ان کو یاد دلاتی ہوں میں۔''

دونوں بھابیاں آپس میں گفتگو کرتے ہوئے غالباً یہ بھول گئی تھیں کہ میں بھی ادھر موجود ہوں اور اتنا تو مجھے پہلے بھی پتا چل ہی گیا تھا کہ دولہا نے ہر رسم کو منع کر دیا ہے مگر جہیز سے متعلق یہ انکشاف میرے لئے بالکل نیا تھا۔ مجھے ایک دم ڈر سا لگا۔ افنان کے کمرے میں میرے اور میرے سامان کے لئے جگہ نہیں تھی تو کیا افنان کے گھر میں بھی میرے سامان کے لئے جگہ نہیں تھی؟ تو کیا افنان کے گھر میں میرے لئے جگہ تھی......؟

میری حالت غیر ہونے لگی۔

''تن..... نہیں..... ابھی..... کچھ مت..... کہیں بجوائیے گا۔'' ڈر کر ایک دم ہی میرے منہ سے نکلا تھا۔

بڑی بھابی' چھوٹی بھابی چونک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

''آؤ نیچے چلیں۔'' بے تاثر لہجے میں بڑی بھابی نے کمرہ لاک کر دیا۔ میں طویل سانس لے کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

''اور سب سے آخری جگہ بلکہ پہلی بھی۔'' کچن کے پاس آ کر چھوٹی بھابی نے کہا۔

''ہاں جواہر' کچن تو تم نے دیکھ ہی لیا ہو گا۔'' میں نے سر ہلا دیا۔

''میرا بیٹا فاران تو اس کو امی کا کمرہ بھی کہتا ہے۔'' بڑی بھابی نے مسکرا کر کہا۔

''بڑی بھابی' وہ ٹھیک تو کہتا ہے۔ تقریباً آدھا دن ہم ادھر ہی تو گزارتے ہیں۔ فاران بڑا ذہین ہے ماشاء اللہ۔'' چھوٹی بھابی نے ہنس کر کہا۔

بڑی بھابی مسکرائے گئیں۔ ''فاران بہت ضدی بھی ہے۔ آج صبح اتنی مشکلوں سے میں نے اسے اسکول جانے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ عفان تو پھر بغیر چوں چرا کیے تیار ہو گیا تھا مگر فاران اڑ گیا تھا کہ آج تو اسکول نہیں جاؤں گا۔ چچی سے باتیں کروں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ ''کاشان بتاتے ہیں' فاران بالکل افنان کی طرح ہے۔ ضدی اور شریر..... ویسے اب افنان نہ اتنا ضدی رہ گیا ہے نہ شریر..... بہت سنجیدہ اور ریزرو ہو گیا ہے۔'' وہ افنان کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ میں نے خاموشی سے سنا تھا۔

''مجھے تو لگ ہی نہیں رہا' اس گھر میں دو دن پہلے تک شادی کے ہنگامے جاگ رہے تھے اور اب کتنا سناٹا ہے ناں بڑی بھابی۔'' چھوٹی بھابی کہہ رہی تھیں۔

''ہاں' مہمانوں کے تو ٹھہرنے کا کوئی سلسلہ تھا ہی نہیں۔ دولہے صاحب آفس نال دیے۔'' کاشان نے کہا۔ ''جب دولہے میاں خود ہی آفس جا رہے ہیں تو ہم رک کر کیا کریں گے۔'' بڑی بھابی کہہ رہی تھیں۔

''آپ نے بچوں کو بھی اسکول بھیجنے میں اس قدر جلدی دکھائی۔'' چھوٹی بھابی نے شکایت کرنے کے سے انداز میں کہا۔

''ارے' دو دن سے Loss ہو رہا تھا' اسی لیے کاشان نے آج ڈانٹ کر دونوں کو اسکول بھیج دیا۔''

''بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی سعدان بھی کہنے لگے۔ ریحان اور آمنہ کو بھی بھیج دو' بچے ہی ہوتے گھر میں تو کچھ رونق رہتی۔ شور شرابا لگا ہوتا۔ ذرا تو پتا چلتا کہ.....

میں ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔''

دونوں بھابیاں ایک بار پھر آپس میں گفتگو میں مصروف ہو کر مجھے بھول ہی گئی تھیں۔ تبھی ایک دم بڑی بھابی مجھے دیکھ کر چونک سی گئی تھیں۔

''چلو چھوڑو صفیہ' ان باتوں کو۔ جواہر' تم بتاؤ' آج کھانے میں کیا بنائیں؟''

''بڑی بھابی' آج افنان کی پسند کا کھانا نہ بنا لیں۔'' چھوٹی بھابی نے ایک دم کہا تھا۔

''ارے' میں نے جواہر سے پوچھا تھا۔'' بڑی بھابی نے چھوٹی بھابی کو قدرے خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر ان کی نظر مجھ پر آن ٹھہری۔

''وہی بنا لیں جو افنان کو پسند ہے۔'' میں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا۔

''ارے' یہ کیا بات ہوئی۔ میں نے تمہاری پسند پوچھی ہے۔''

''بڑی بھابی' اچھی بیویوں کی وہی پسند جو ان کے شوہروں کی پسند..... کیا خیال ہے جواہر؟''

چھوٹی بھابی کے کہنے پر بے اختیار میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا' تم پوچھو گی نہیں افنان کو کیا پسند ہے؟''

''آپ خود ہی بتا دیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور جواباً بڑی بھابی اس کی پسند بتانے لگیں۔ اس کی چوائس بہت Selective تھی مگر بقول بڑی بھابی کے' وہ کسی بھی معاملے میں نخرہ نہیں کیا کرتا تھا۔

''مگر بھابی' اب دوپہر کے کھانے پر تو افنان کی پسند کا کھانا بنانا بے کار ہی ہے۔ کیونکہ وہ اب شام سے پہلے تو نہیں آتا۔''

چھوٹی بھابی کی اس بات پر میں گرتے گرتے بچی تھی۔ ''شام تک.....'' خاصی وحشت سے میں نے دل میں دہرایا تھا۔ اتنی دیر تک میں کروں گی کیا؟ ویسے تو وہ اگر ہوتا تب بھی میں کیا کر لیتی..... مگر شام تک۔

''ہاں صفیہ' بات تو ٹھیک ہے۔'' بڑی بھابی نے سر ہلایا۔ ''اپنی جواہر تو بور ہو جائے گی تب تک۔''

''بوریت کا علاج ہے میرے پاس۔'' چھوٹی بھابی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ ڈائجسٹ!'' بڑی بھابی بے اختیار ہنسیں' پھر میری طرف دیکھا۔ ''کیوں جواہر' پڑھتی ہو کیا؟''

''نہیں بڑی بھابی!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آج تک میں نے صرف اپنی کورس

کی کتابیں پڑھی ہیں۔ ڈائجسٹ مجھ سے بھی نہیں پڑھے جاتے۔ مجھے تو اخبارات' رسائل وغیرہ سے بھی بالکل دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے جلدی جلدی کہا۔

''لو دیکھو لو تمہارے جیسا انٹینا ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔'' بڑی بھابی نے مسکرا کر چھوٹی بھابی سے کہا۔

''میں آپ کے ساتھ کچھ ہیلپ کروا دیتی ہوں ناں۔'' میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''نہیں جواہر' تم تیسرے دن کی دلہن ہو۔'' بڑی بھابی نے نرمی سے کہا۔ ''جانتی ہو' میں جب اس گھر میں آئی تھی تو امی نے مہینے بھر تک مجھے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔''

''ہاں' اور بڑی بھابی نے دو مہینے تک مجھے کچھ نہیں کرنے دیا تھا۔'' چھوٹی بھابی نے ہنس کر کہا۔ ''تو ہم تم کو کم سے کم تین مہینے تک کچھ نہیں کرنے دیں گے۔''

''کاموں کا کیا ہے' وہ تو ہو ہی جاتے ہیں اور پھر ہم کو مل بانٹ کر ہی کرنے ہیں بعد میں مگر کم از کم ابھی تو......'' بڑی بھابی نے کہا تھا۔

''بڑی بھابی' مجھے آرام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ فالتو میں بیٹھ نہیں سکتی۔ تین مہینے تک تو میں بالکل پاگل ہو جاؤں گی۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں' میں اس کا بندوبست کروا دوں گی۔ کاشان سے کہوں گی کہ ان دونوں کو ناردرن ایریاز بھجوانے کی کریں۔ افنان' کاشان کی بات ٹالتا نہیں ہے۔'' بڑی بھابی نے آرام سے کہا۔

''پھر بھی بڑی بھابی' تین مہینے بہت سے بھی بہت ہیں۔''

دونوں بھابیاں میری بات سن کر بڑی زور سے ہنسیں۔

اس کے بعد بڑی بھابی میرے ساتھ باتیں کرتی رہی تھیں۔ چھوٹی بھابی ڈسٹنگ وغیرہ کرنے کے لئے چلی گئیں۔ امی کا وہاں سے گزر ہوا تو بڑی بھابی کو تلقین کی کہ مجھے بور نہ ہونے دیں۔ بڑی بھابی نے امی کو یقین دہانی کروائی تھی۔

وہ دن بس کسی نہ کسی طرح سے گزر ہی گیا تھا۔ افنان عادل آٹھ بجے گھر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے اطلاع دی تھی۔ ''نماز پڑھ کے آ کر کھانا کھاؤں گا۔''

''کھانا تمہارے کمرے میں بھجوا دوں؟'' بڑی بھابی نے خاصی شرارت سے پوچھا تھا۔

''نہیں' سب کے ساتھ کھاؤں گا۔'' دبیز سنجیدگی کے ساتھ جواب آیا تھا۔ پھر میرا اس سے سامنا کھانے کی میز پر ہی ہوا تھا۔ وہ کھانا کم کھا رہا تھا۔ سوچ زیادہ رہا تھا۔ خیر سے کھانا تو مجھے بھی کیا ہی کھانا تھا' اتنے لوگوں کی موجودگی میں جھجک بھی ہو رہی تھی۔

اجنبی ہونے کا احساس بھی تھا اور فطری حجاب بھی تھا۔ میں افنان عادل کو چوری چوری دیکھتی رہی۔ اسی کو سوچتی رہی۔ وہ اٹھ کر سب سے پہلے چلا گیا۔ میں بے بسی کا احساس لیے وہیں بیٹھی رہی۔ مارے حجاب کے اس کے پیچھے اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسی بے بسی تھی کہ میں کسی سے مارے غیرت کے کچھ ڈسکس بھی نہیں کر سکتی تھی۔

سب کے اٹھ جانے کے بعد میں تھکے تھکے قدموں سے اٹھی اور کمرے میں آئی تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ خاصی کوفت کے عالم میں' میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ خاصی دیر بعد جب وہ آیا تو مجھ پر نظر ڈالے بغیر کپڑے نکالے۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپ کر چاہا کہ اس کے ہاتھ سے کپڑے لے لوں اور میں خود استری کر کے اسے دے دوں' لیکن اس کا رویہ اس قدر روکھا تھا کہ مزید کوئی پیشکش اسے کرنے کی میری ہمت نہیں ہو سکی۔ مجھے اس کے رویے نے گھٹن میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے اپنا آپ ایک دم فالتو اور بے کار لگ رہا تھا۔ وہ سونے کے لئے لیٹ چکا تھا اور اپنی ناقدری پر مجھے رونا آ رہا تھا۔ میں رونے لگی تھی۔ رات بھر گھٹ گھٹ کر میں سسکیاں لیتی رہی۔ اسی عالم میں پتا نہیں کب سو گئی۔

صبح قدرے دیر سے آنکھ کھلی۔ افنان عادل جا چکا تھا۔ مجھے بہت غصہ بھی آیا۔ تکلیف بھی پہنچی اور شدید بے بسی کا احساس بھی ہوا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ میں خواہ مخواہ اور زبردستی اس پر مسلط کر دی گئی ہوں۔ ٹھونس دی گئی ہوں۔ بہت برے احساسات لیے میں باہر آئی تھی۔

''اچھا ہوا جواہر' تم خود اٹھ گئیں۔ میں تم کو ناشتے کے لئے جگانے آ ہی رہی تھی۔'' ناشتے کی ٹیبل پر بڑی بھابی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''میں نے ہی منع کر دیا۔'' امی نے رنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے کہا کہ اچھا ہے تھوڑی دیر اور آرام کر لینے دو۔''

میں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔

''امی' آج جواہر کے یہاں دعوت بھی تو ہے۔''

بڑی بھابی کہہ رہی تھیں اور ان کی اس بات پر نوالے میرے حلق میں اٹکنے لگے۔ یہ بات تو میرے دھیان سے بالکل نکل ہی گئی تھی کہ آج سے دعوتوں کا سلسلہ شروع تھا اور آج میرے والدین کے یہاں میرے سسرال بھر کی دعوت تھی۔ کل نانا نانی کے یہاں دعوت تھی۔

''افنان نے تو دعوتوں کے لئے صاف منع کر دیا ہے۔'' افنان کی والدہ نے فکرمند لہجے میں کہا۔

ان کی اس بات پر میں ناشتہ کرنا بھول گئی۔

''یہی بات تو مجھے پتا چلی تھی کاشان سے' امی اسی لئے تو پوچھ رہی ہوں۔ اب کیا کیا جائے گا؟''

''بڑی بہو! کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے کل رات ہی میں نے جواہر کے والدین کے یہاں فون کر کے ان سے معذرت کر لی تھی۔''

افنان کی والدہ کے کہنے پر میں ان کی صورت دیکھنے لگی۔ اتنی بڑی بات ہو گئی تھی اور اس بارے میں مجھے پتا بھی نہیں تھا؟ اس گھر میں اتنی بڑی بڑی باتیں ہو جاتی تھیں اور مجھے اتنی دیر میں پتا چلتا تھا۔ افنان کی امی کہہ رہی تھیں۔

''اب بتاؤ' جس کے اعزاز میں دعوت دی جا رہی ہو' وہ غائب ہو اور ہم لوگ پہنچ جائیں..... کتنا عجیب لگے گا۔''

''تو امی! آپ نے ان لوگوں سے کیا کہہ کر معذرت کی؟'' چھوٹی بھابی نے گویا میرے دل کا سوال کیا تھا۔

''میں نے ان کو سچ ہی بتایا ہے' کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ وہی کچھ کہا ہے جس بنا پر افنان نے ہم کو منع کیا تھا۔''

میں نے افنان کی والدہ کی بات سن کر طویل سانس لی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ افنان نے اپنے گھر والوں کے سامنے کیا کہہ کر اپنی جان چھڑائی تھی۔

''بہت شرمندگی کی بات ہے۔'' بڑی بھابی نے کہا۔

''ظاہر ہے شرمندگی کی بات تو ہے۔ آخر کس کس سے کیا کیا بہانے بناتے پھریں گے ہم۔ ٹھیک ہے' ہو گا اس کا وہ پراجیکٹ اہم جس پر وہ کام کر رہا ہے۔ یہ بات تو ہم جانتے ہیں۔ یقین کس کس کو دلاتے پھریں گے؟'' افنان کی والدہ رنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ ''افنان ایک نمبر کا نالائق اور گدھا ہے۔'' وہ ایک دم جیسے جلال میں آ گئی تھیں۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا اس کا مسئلہ کیا ہے۔ جواہر کو کہیں لے جانے سے اس نے انکار کر دیا۔ ہر دعوت کو صاف منع کر دیا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ ابھی کیا اہم ہے۔ جو وہ کر رہا ہو گا وہ اسے اہم لگے گا ہمیشہ۔'' امی اس سے بہت خفا لگتی تھیں۔ ''اس لڑکے سے کوئی بھی عقل کی بات بعید از قیاس ہے۔ شادی میں تمام رسموں کو اس نے منع کر دیا' یہ کہہ کر کہ

کوئی فضول حرکت میں برداشت نہیں کروں گا۔ جیسے یہ ایک نرالا لڑکا تھا۔ دنیا میں جس کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی سے پہلے بھی پورے وقت بے زار اور بری شکل بنائے گھومتا رہا تھا۔ چڑچڑاہٹ اتنی کہ ہر سیدھے سوال کا بھی الٹا جواب دے۔ کچھ پوچھو تو بتاتا نہیں..... میری تو سمجھ میں اس کا رویہ نہیں آ رہا۔''

امی کہہ رہی تھیں اور میں حیرت سے ان کو تکنے لگی..... تو یعنی شادی اس کے لئے زبردستی کا سودا تھی۔ وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''حالانکہ شادی کے لئے تو ہم اس سے تب بھی کہہ رہے تھے جب اس کی پہلی مرتبہ جاب ہوئی تھی اور تب بھی جب انگلینڈ سے واپسی پر اس نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کی تھی۔ دونوں مرتبہ اس نے صاف منع کر دیا تھا۔ ہم نے بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا مگر اس بار کسی نے اس پر زبردستی نہیں کی تھی۔ نہ ہم نے اس پر اپنی مرضی ٹھونسی تھی۔ اس نے خود ہی آمادگی ظاہر کی تھی۔''

امی کے کہنے پر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ بات یقیناً یہی تھی کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور کسی کمزوری کے تحت اس نے آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

''کاشان نے بہت پوچھا بھی تھا کہ کسی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔ اس پر امی اس نے یہی کہا تھا کہ اس کی کوئی پسند نہیں ہے۔'' بڑی بھابی بتا رہی تھیں۔

''ارے بڑی بہو! اس کی تو کسی بھی معاملے میں کوئی پسند ہی نہیں تھی۔ ہر چیز بڑے بھائی اور باپ پر یوں چھوڑ رکھی تھی کہ جیسے شادی اس کی نہیں بلکہ ان کی ہو رہی ہو۔ کارڈ پسند کرنے کے معاملے سے لے کر شادی ولیمے کے کپڑوں تک..... اس نے خود کیا کیا ہے؟''

''اور امی! آپ کو یاد نہیں اس نے تو رونمائی تک کا تحفہ خود پسند نہیں کیا۔ اس کے لیے مجھے تھما دیے تھے کہ خود پسند کر کے لے آؤں۔''

چھوٹی بھابی بتا رہی تھیں اور مجھ پر تو جیسے آج انکشافات ہو رہے تھے۔

''مجھ سے باہر ہے کہ یہ لڑکا آخر چاہتا کیا ہے؟'' افنان کی والدہ نے نہایت خفگی سے کہا۔ پھر ایک دم مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''معاف کرنا بہو! میں تمہارے سامنے یہ سب باتیں کر رہی ہوں۔ کوئی ماں ایسی نہیں ہوتی کہ اپنے بیٹے کی برائیاں کسی کے سامنے کرے اور وہ بھی اپنی بہو کے سامنے..... مگر صرف اس لئے کہ تم کو سب کچھ پتا ہو' اس لئے کہ اب تم اس گھر کی فرد ہو۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہ ہو۔ تم سے کچھ چھپا کر ہم کو ملے گا

بھی کیا۔"

آخری جملہ کہتے کہتے ان کے لہجے میں تھکن اتر آئی۔

"خیر' تم پریشان مت ہو' آج تمہارے سسر آتے ہیں ناں تو میں ان سے بات کرتی ہوں وہی افنان کو کس سکتے ہیں۔ ان سے ٹھیک بھی رہتا ہے وہ۔"

"امی! مگر آپ بتا رہی تھیں کہ آج تو ابو دیر سے آئیں گے۔" بڑی بھابی نے گویا انہیں یاد دلایا تھا۔

"ارے ہاں!" وہ قدرے فکرمند ہوئیں۔ "مجھے تو دھیان نہیں رہا اس بات کا..... کوئی بات نہیں...... میں کل بات کرلوں پھر۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔ "زیادتی مجھ سے کسی کے ساتھ برداشت نہیں ہوتی خواہ زیادتی کرنے والا میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ کہہ رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی۔ میں اپنے طور پر آج افنان سے ضرور بات کروں گی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ آخر اس کے دل میں کیا ہے؟ آج میں خود اس سے ضرور پوچھوں گی کہ وہ چاہتا کیا ہے؟

میں کچھ اسی طرح کی باتیں سوچتی ہوئی افنان کے کمرے میں آ گئی۔

☆======☆======☆

میں نے چوتھے دن سے باقاعدہ آفس جوائن کرلیا تھا۔ اپنی چھٹیاں کینسل کروادی تھیں۔ اسی رات جب کہ میں اپنے کل کے پہننے والے کپڑوں پر استری کررہا تھا تو الماس میرے برابر میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں کوئی دھیان دیے بغیر مصروف رہا۔

"یہ سلسلہ اور کتنا لمبا چلے گا افنان!"

سوال ہی ایسا تھا کہ پینٹ کی کریز پر ہاتھ جماتے ہوئے میرے ہاتھ ساکت ہو گئے تاہم میں سنی ان سنی کیے دوبارہ مصروف ہوگیا۔

"میں تم سے بات کررہی ہوں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

میں اس بار بھی چپ رہا۔

"تم مجھ سے بات نہیں کرتے۔ خود کچھ پوچھو تو جواب نہیں دیتے' کیوں؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میں بدستور چپ تھا۔ وہ مزید کہہ رہی تھی۔ "تم نے مجھے گھر سے نہیں اٹھوایا۔ تم مجھے کہیں سے بھگا کر نہیں لائے' نہ ہی مجھ سے خفیہ شادی کی ہے۔ [illegible] لوگوں کے سامنے تم نے مجھ سے نکاح کیا ہے۔ تم بیوی بنا کر لائے ہو مجھے۔"

میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم بیوی سمجھتے نہیں مجھے۔ بیوی والا رتبہ نہیں دیتے۔"

بات ہی ایسی تھی کہ میں سن کر سکتے میں آ گیا تھا۔ میرے ہوش وحواس جواب دینے لگے۔ کافی دیر تک تو میں کچھ بولنے کے قابل نہیں ہوسکا پھر میں نے نہایت تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے تم خود بھی سمجھتے ہو گے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "تم مجھے قبول کیوں نہیں کرلیتے؟" اس نے پرسکون انداز میں سوال کیا۔

"میں تم کو قبول نہیں کرسکتا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تو پھر تم سے کس نے کہا تھا کہ مجھ سے نکاح کرو۔"

وہ استعجاب سے سوال کررہی تھی اور مجھے اس کے سوالات سے اب جھنجلاہٹ ہورہی تھی۔

"کیونکہ بڑے بھائی نے مجھ سے کہا تھا۔" میں پھٹ پڑا تھا۔

"تو تم نے بڑے بھائی کو منع کردیا ہوتا۔"

"یہ بھی تم مجھ کو بتاؤ گی کہ میں نے کیا کیا ہوتا اور کیا نہیں؟"

"تم جانتے تھے تمہارا نکاح مجھ سے ہورہا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں جانتا ہوتا تو آج تم کو مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔ میں الماس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"تم کو میرے نام سے دھوکا ہوا ہے؟"

"مجھے دھوکا ہوا نہیں ہے' مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

الماس چپ چاپ میری شکل دیکھ رہی تھی۔ "تمہاری مراد مجھ سے ہے۔" بہت استعجاب سے اس نے پوچھا تھا۔

"کیا نہیں ہونی چاہیے؟" میں نے چبا چبا کر پوچھا۔ "تم نے مجھے کب اپنا اصل نام بتایا تھا؟"

"اصل نام تو اب میرا صرف ڈاکیومنٹس تک محدود رہ گیا ہے۔ میرے گھر والے الماس نام کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اصل نام تو اب انہیں بھی یاد نہیں رہ گیا ہے۔"

اس نے آہستگی سے بتایا۔

''میں تو مر گیا ناں۔'' میں نے سلگ کر کہا۔
''تصویر تو تم کو بجوائی گئی ہوگی۔'' وہ اپنا دفاع کرنے کے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔
''میری حماقت تھی کہ میں تصویر نہ دیکھ سکا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔
''دیکھ لیتے تو شادی سے انکار کر دیتے؟''
''ہاں۔'' بلا توقف میں نے جواب دیا۔
''اور میری مجبوری یہ تھی کہ اگر میں جانتی بھی ہوتی کہ میری تم سے شادی ہو رہی ہے تو بھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔''
''کیوں؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔
''کیونکہ میں اپنے گھر والوں کی امیدوں پر پانی نہیں پھیر سکتی تھی۔ میرے گھر والے پہلے ہی میری طرف سے بہت پریشان تھے اور میں گلٹی فیل کرتی تھی کہ اتنے سارے لوگوں کی پریشانیوں کی ذمہ دار میں ہوں۔ میں اتنے لوگوں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کیسے کر سکتی تھی۔ میرے ساتھ پہلے ہی اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اب کی بار میں خود سے ''نہ'' تو کسی صورت کر ہی نہیں سکتی تھی۔'' اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔
''کیوں تمہارے اوپر ایسی کیا آفتیں ٹوٹ پڑی تھیں؟'' میں نے بہت چڑ کر پوچھا تھا۔
''ہاں یہ بھی میری قسمت ہے کہ آج تم کو مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''نہیں تو میری شادی تو بہت عرصے پہلے ہو گئی ہوتی مگر یہ بھی میری قسمت ہے کہ عین شادی والے دن وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔''
میں ایک دم چونک پڑا تھا۔ ''کیا...... کیا کہا تم نے؟''
''ہاں جس دن میری اس سے شادی ہوئی تھی' اسی رات وہ انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کی تحریر بھی کوریئر سروس سے ملی تھی۔''
وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ میرا دم حلق میں آ گیا تھا۔
''کون...... کون تھا وہ؟''
میں نے بہت ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ میرے ذہن میں سوائے ایک [illegible] کے کوئی دوسرا نام نہ تھا۔
''بلال مرتضیٰ!'' بلا توقف وہی نام بطور جواب آیا تھا اور میں نے بے [illegible] مضبوطی سے آئرن اسٹینڈ کو پکڑ لیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً نیچے گر جاتا کیونکہ اس سے آگے کی کہانی سے میں بخوبی واقف تھا۔ بلال مرتضیٰ وہ شخص تھا جس کے ساتھ [illegible]

میں میں نے اتنا عرصہ گزارا تھا اور میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ جس لڑکی کو وہ چھوڑ کر آیا ہے' وہ الماس بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد تھا کہ کتنی ہمدردی ہوئی تھی مجھے اس لڑکی سے جس کے ساتھ وہ ایسا سلوک کر کے آ رہا تھا۔ اگر مجھے ذرہ برابر بھی پتا ہوتا کہ بلال مرتضیٰ کسے اپنے پیچھے چھوڑ کر آیا ہے تو میں اس کو خوب گالیاں دیتا۔ کھری کھری سناتا۔ اگر وہ شادی کر لیتا الماس سے تو آج مجھ کو یہ وقت تو نہ دیکھنا پڑتا۔
الماس کہہ رہی تھی۔
''ایک ایسی لڑکی جس کی کسی سے شادی ہو رہی ہو اور کوئی اس طرح اسے چھوڑ کر چلا جائے تو تم جانتے ہو ناں' وہ لڑکی کیا کہلاتی ہے؟''
وہ پوچھ رہی تھی اور میں شدید کھولن کا شکار تھا۔ وہ مجھ سے اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی اور مجھے خلدون ابراہیم پر شدید غصہ آ رہا تھا۔
''پھر اس صورت میں میرے پاس ہاں کہنے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ میرے گھر والے تو پہلے ہی میرے لئے اتنا Suffer کر چکے تھے۔''
وہ کہہ رہی تھی اور مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا پھر میں اسے بہت کچھ کہہ کر غصے میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں اسی عالم میں لان میں ٹہلتا رہا۔ پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ مین روڈ کراس کر کے میں سامنے واقع آئس کریم پارلر میں جا گھسا۔ ایسی شدت کی جلن دل میں مچ رہی تھی کہ میں نے آئس کریم کا لارج کپ منگوایا اور ٹھنڈی برف آئس کریم معدے میں اتارتا رہا۔ جب اس نے بھی جلن کو کم نہیں کیا تو میں نے Apple Sidra چڑھا گیا۔ دراصل اس وقت شدید غصے کے مارے میرا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا Apple Sidra کا گلاس۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تو میں نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو خاصی مشتعل نظروں سے دیکھا اور شدید غصے کے عالم میں گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ زور دار گونج ہوئی۔ گلاس ریزہ ریزہ ہو گیا۔ پارلر میں اس وقت تو ویسے ہی لوگ کم تھے اور جو بیٹھے تھے ان کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہاں کام کرنے والے لڑکے اور کاؤنٹر پر بیٹھا شخص لپک کر میرے پاس آئے تھے۔
''اینی تھنگ رانگ سر؟'' کاؤنٹر پر بیٹھنے والے شخص نے سوال کیا۔
میں بغیر کچھ کہے تیزی سے اٹھا۔ پینٹ کی جیب سے والٹ نکالا۔ بغیر گنے جتنی رقم

ہاتھ آئی۔ ٹیبل پر رکھ کر خاصے غصے کے عالم میں جلتا بھنتا باہر نکل آیا۔
خاصی دیر تک سڑک کے کنارے میں یونہی ٹہلتا رہا۔ میرا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ایک بج رہا تھا مگر گھر واپس جانے کے خیال سے مجھے نفرت ہو رہی تھی۔
آدھ ایک گھنٹہ مزید ٹہلنے میں وقت برباد کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تو بادل نخواستہ میں گھر روانہ ہو گیا۔ میں نے کھولن، جلن، غصہ کم کرنے کے لیے وضو کرنا شروع کر دیا۔ اس نے بھی کوئی کام نہیں دیا تو ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ میں نے غصہ کم کرنے کا یہ طریقہ انگلینڈ میں سیکھا تھا اور یہ کچھ نہ کچھ تو کام آیا ہی کرتا تھا۔ اس وقت بھی میرے حواس کچھ قابو میں آئے تھے۔ تب پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔
الماس صوفے سے کمر ٹکائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ مجھے اسے دیکھ کر سرے سے غصہ آنے لگا۔ میں نے اس رات اس سے بے حساب بدتمیزی کی تھی۔ بالکل ویسے ہی جس طرح میں مارتھا ایوانز کے ساتھ بدتمیزی اور بدتہذیبی سے پیش آیا کرتا تھا۔ وہ تو اگر میں نے خود پر کنٹرول نہ رکھا ہوتا تو شاید ایک آدھ زوردار تھپڑ بھی میں اسے ہی دیتا۔ فی الواقع مجھے اسی قدر غصہ آ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے جو کچھ بھی میں نے نہایت غیر دلچسپی اور لاتعلقی سے سنا تھا۔ مجھے اس کی داستان سن کر کوئی نہیں ہوئی تھی البتہ خلدون ابراہیم کے خلاف میرا غصہ بڑھ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں اس آدمی کو قتل کر دوں۔ میں جتنا سوچ رہا تھا، خلدون ابراہیم کے لئے میری کھولن اور جلن میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں، میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات الٹی سیدھی سوچوں کے مارے مجھے نیند نہ آسکی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سے سورج کو پکڑ کر لے آؤں اور صبح ہو جائے۔ فجر ہونے پر میں نے شکر ادا کیا نہایت برے موڈ میں، میں آفس جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ اسی موڈ کے ساتھ کمرے سے نکلا تو لامحالہ مجھے ناشتے کی ٹیبل کے پاس سے گزرنا پڑا۔ سب لوگ موجود تھے۔ بڑی بھابی نے فوراً پیچھے سے مجھے آواز دے ڈالی۔
''افنان، ناشتہ کر کے جانا۔''
''مجھے نہیں کرنا۔'' بغیر پلٹے میں نے خاصی ترشی سے کہہ کر آگے قدم بڑھا دیا۔
''ارے..... اِسے بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔'' ابو نے دبے دبے کہا۔ ''ناشتہ کرنے کو کہا جا رہا ہے زہر کھانے کو تو نہیں۔''

میرے قدم لمحے بھر کو رک گئے۔ ابو کی بات سخت بری لگی تھی مجھے۔ اس لمحے میرا دل چاہا ان سے کہوں دے دیں مجھے زہر، اچھا ہے ایک ہی مرتبہ میں مر جاؤں..... جب کہ ابو مزید کہہ رہے تھے۔
''اسی رزق کے لئے آدمی مارا مارا پھرتا ہے۔ پورے دن خوار ہوتا ہے اور جب اسے مل رہا ہوتا ہے تو ان صاحب زادے کے تیور دیکھیے۔ ملتی ہوئی نعمت کی ناقدری کرنا کوئی اس سے سیکھے۔''
ابو کی یہ بات مجھے سخت زہر لگتی تھی کہ وہ کسی کی بھی (خاص طور سے میری) عزت اب کرنی ہوتی تھی تو بیچ بازار میں سب کے سامنے کرتے تھے۔ ناشتے کی ٹیبل پر گھر کے بڑے سے لے کر چھوٹے تک، الماس کے علاوہ ہر فرد موجود تھا۔ بڑوں کے سامنے تو خیر تھی مگر چھوٹوں کے سامنے، اپنے بھتیجوں بھتیجی کے آگے یہ عزت تھی میری..... سو اس وقت مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ میرا دل چاہا پلٹ کر کوئی کرارا اور سنگین سا جواب تو آج ابو کو دے ہی دوں۔ ابو جب کوئی خیال نہیں کرتے میرا تو میں کیوں کروں مگر اس سے پہلے کہ میں ان کو جواب دیتا، ان کا احترام آڑے آ گیا پھر صبح ہی صبح کا وقت تھا۔ میں نے نہیں چاہا کوئی بدمزگی ہو، سو کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کر کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔
''چ..... آپ بھی حد کرتے ہیں بھی بھی۔'' میں نے سنا امی کہہ رہی تھیں۔
''میں نے کیا حد کر دی۔ حدود کا احترام تو آپ کے صاحب زادے پر بالکل حرام ہے۔''
ابو کا چٹختا ہوا جواب مجھے سنا گیا تھا۔ پیچھے سے بڑے بھائی لجاجت سے کہہ رہے تھے۔
''ابو پلیز!'' ساتھ ہی انہوں نے مجھے آواز بھی دی تھی۔ ''افنان!'' مگر میں سنی ان سنی کر کے چلتا ہی گیا۔
''بے کار ہے کاشان۔ اس لڑکے سے کسی بھی سیدھے کام کی توقع فضول ہے۔ ہر کام اس سے کروا لو۔''
ابو کا آخری جملہ سن کر میں مزید کھول گیا۔ کیا مراد تھی ابو کی اس بات سے۔ آخر میں نے ایسے کتنے الٹے کام کر دیے تھے اور اگر کبھی زندگی میں صرف ایک الٹا کام میں نے کر ہی دیا تھا تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہر وقت میں سنتا ہی رہوں..... زندگی میں پہلی بار نہایت باغی ہو کر میں نے سوچا تھا اور جلتا بھنتا گھر سے سائٹ پر جانے کے لئے ذرا دیر وہاں کام کی رفتار کا جائزہ لے کر اس کے بعد آفس روانہ ہو گیا تھا۔
اس دن آفس میں بھی میرا موڈ خراب ہی رہا۔ اپنے ایک ماتحت اختر حسین کو میں

نے نہایت کرختگی سے ڈانٹ دیا تھا۔ حالانکہ میرے بارے میں میرے ماتحتوں میں یہ بات مشہور تھی کہ افنان صاحب کو غصہ نہیں آتا۔ آتا بھی ہے تو اسٹاف پر نہیں نکالتے اور میرا کہنا بھی یہی تھا کہ خواہ مخواہ کی ڈانٹ پھٹکار کیوں کی جائے۔ جب نرمی سے کام نکل سکتا ہے تو کیوں نہ نکالا جائے البتہ جب میں یہ دیکھتا کہ میرے ماتحت میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے ہیں تو ان کو سیدھا کرنے کے لئے ایک مرتبہ سخت اور کڑک لہجے میں کہہ دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ سامنے والے کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ افنان صاحب کی برداشت کی آخری حد ہے۔ اس کے بعد نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ پچھلے تین سالوں کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے کسی ماتحت کو یوں بغیر لحاظ کیے جھاڑا تھا۔ تبھی خاصی دیر تک تو وہ پریشانی اور بے یقینی کے عالم میں میری شکل دیکھتا رہا پھر ایک دم

''آئی ایم سوری سر!'' کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

اس کے یوں چلے جانے پر مجھے اور بھی غصہ آیا تھا۔ خاصا کھولتے ہوئے میں نے خلدون ابراہیم کا نمبر ملوایا۔ صرف یہ جاننے کے لئے کہ وہ آفس میں موجود ہیں یا نہیں اور معلوم ہونے پر ان کے آفس روانہ ہوگیا تھا۔

یہ پہلی مرتبہ تھا جو میں ان کی طرف جا رہا تھا ورنہ آج سے پہلے ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ ان کے آفس کے بارے میں میں نے بس سنا ہی سنا تھا۔ راستے بھر میں کھولتا رہا تھا۔ خلدون ابراہیم پر مختلف وجوہات کی بناء پر مجھے شدید غصہ آتا رہا تھا اور ان کے آفس کی لوکیشن دیکھ کر مجھے شدید ترین غصہ آیا تھا۔ دستک دیے بغیر بدتمیزی سے دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے پر میں نے خلدون ابراہیم کو اپنے آفس میں اکیلا ہی پایا تھا۔

''آپ تو بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ خلدون ابراہیم!'' ان کو سامنے دیکھ کر ساری تمیز تہذیب' آداب' القاب بالائے طاق رکھ کر میں پھٹ ہی پڑا تھا۔ ''مسجد کے احاطے میں اپنا آفس کھول کر بیٹھے ہیں۔ اتنی بڑی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ لوگ آپ کو درویش صفت آدمی کہتے ہیں اور کتنے منافق ہیں آپ...... کتنے بڑے دھوکے باز' فراڈ' چیٹر ہیں۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''اونہہ' ایسے ہوتے ہیں درویش'' میں نے بڑی بدتہذیبی سے ان سے کہا تھا اور ان کے چہرے کا لمحہ بہ لمحہ بدلتا رنگ اس بات کی دلیل تھا کہ وہ بہت ضبط کر رہے ہیں۔

''داڑھی رکھنا یا مسجد کے احاطے میں آفس کھولنا' یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ لوگ مجھے

درویش کہتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں نے کسی سے کہا نہیں ہے کہ کوئی مجھے درویش سمجھے یا کہے۔ تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ۔'' انہوں نے بڑے تحمل سے پوچھا تھا۔

''اس دن تو آپ مجھ سے میری اہلیت کا بڑا رونا رو رہے تھے۔ آپ نے مجھ کو یہ کب بتایا تھا کہ آپ کی بھانجی کی دو مرتبہ شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔'' میں نے نہایت کھردرے لہجے میں ان سے سوال کیا۔

''میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ جس بات کا تذکرہ تم مجھ سے کر رہے ہو' اس بارے میں تمہارے والد اور بڑے بھائی کو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے یہ بات۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کا یہ فرض تھا کہ وہ تم کو بتا دیتے۔ حیرت ہے انہوں نے تم کو یہ بات نہیں بتائی۔''

''شادی میرے والد صاحب اور بڑے بھائی کو کرنی تھی؟'' میں نے طنز سے ان سے پوچھا۔ ''میرے والد صاحب اور بھائی پر الزامات لگانے کی بجائے صاف کیوں نہیں کہتے آپ کہ آپ کی بھانجی کی کہیں اور شادی ہو نہیں رہی تھی۔ ظاہری بات ہے' ایک لیبل شدہ لڑکی سے کون شادی کرتا بھلا' اور آپ کو کسی گدھے کی تلاش تھی۔ اسی لئے میری صورت دیکھتے ہی آپ نے ذرا سی بھی دیر کیے بغیر اسے میرے سر تھوپ دیا۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' انہوں نے بہت ضبط سے کہا۔ ''تمہارے بڑے بھائی نے خود میرے سامنے یہ پروپوزل رکھا تھا' میں خود اپنی بھانجی کا رشتہ مانگنے ان کے پاس نہیں گیا تھا اور اگر ابھی اس وقت میں تم کو تمہارے والد صاحب کے الفاظ بتا دوں کہ انہوں نے کیا کہہ کر رشتہ دیا تھا تو تم ادھر ہی گر پڑو۔''

''میرے بڑے بھائی کی تو آپ جانے دیجئے۔ کسی دن تو وہ مجھے یہ بھی کہہ دیں گے کہ افنان مر جاؤ اور مجھے مر جانا پڑے گا۔ میرے والد صاحب کی بھی رہنے دیجئے۔ وہ میرے والد ہیں مجھے جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔ آپ اپنی کہیے۔ دو مرتبہ کی ریجیکٹڈ لڑکی کو ٹھکانے لگانے کا اس سے اچھا موقع آپ کو کل بھی کیسے ملتا تھا۔''

''تم بھول رہے ہو یہ بات کہ اس دو مرتبہ کی ریجیکٹڈ کو سب سے پہلے تم سلیکٹ کر چکے تھے۔'' ان کے تبسم آمیز لہجے نے مجھے اشتعال دلا دیا تھا۔

''میں نے اس کو کبھی سلیکٹ نہیں کیا تھا۔'' میں نے بھڑک کر کہا۔ ''اور اس رات کے بعد میرے لئے ایسا سوچنا بھی حرام تھا۔''

''میں نے تم سے اس وقت بھی کہا تھا۔ اب بھی کہہ رہا ہوں۔ جو ہوا' سو ہوا۔ بھول

جاؤ سب۔" انہوں نے تحمل سے کہا۔

"بھول جاؤں؟" میں نے انہیں ایسے دیکھا جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔ "آپ مجھے بتا دیں' میں کیا کیا بھول جاؤں؟ اونہہ خلدون ابراہیم! بھول پاتا اگر میں کچھ تو ساڑھے تیرہ سال بہت ہوتے ہیں بھولنے کے لئے۔" میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"تو تم اس ایک رات کو لے کر ساری زندگی روتے رہو گے؟" انہوں نے قدرے طنز سے پوچھا تھا۔

"ساری زندگی؟" میں نے تلخی سے دہرایا۔ "اور ابھی ساری زندگی رونے میں کیا رہ گئی ہے۔ ساڑھے تیرہ سال سے تو رو رہا ہوں میں۔"

"دیکھو میں نے الماس کو بھی سمجھایا تھا......"

انہوں نے کہنا چاہا اور میں نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"الماس کو سمجھایا ہوا آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔ اس کو آپ نے جو سمجھایا ہو' مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے آپ کی کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے۔ آپ جامع مسجد کے خطیب نہیں ہیں اور نہ میں جمعے کا خطبہ سننے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ آپ بھاڑ میں جائیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ الماس جہنم میں جائے۔ مجھے کوئی پروا......"

ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے درشتی سے میری بات کاٹ دی تھی۔

"تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گے؟"

"نہیں تو کیا ہو جائے گا؟" میں نے بھڑک کر پوچھا۔ "ماریں گے آپ مجھے؟" میں نے استہزائیہ انداز میں سوال کیا۔ "مار کے دکھایئے۔" اب کی بار میں نے چیلنج کرتی ہوئی نگاہ سے انہیں دیکھا تھا۔ "اس رات کی بات اور تھی' ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔"

"اپنا مسئلہ بھی تو بتاؤ مجھے۔" انہوں نے بہت تحمل سے پوچھا تھا۔

"سارا مسئلہ تو آپ کی بھانجی کا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا تھا۔

"میں تم سے ریکویسٹ کرتا ہوں۔ تم بھولنے کی کوشش کرو افنان۔"

انہوں نے اب کی بار تھکن زدہ لہجے میں کہا تھا اور ان کی اس کیفیت نے خاصا الجھا دیا تھا مجھے۔

"تم خوش رہنے کی کوشش کرو افنان' تم خوش رہو گے تو الماس سکھی رہے گی۔ وہ میری اکلوتی بھانجی ہے۔ اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے مجھے وہ۔"

"اوہ ہو! الماس آپ کو اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔" میں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "اور...... اولاد کا دکھ اپنا دکھ ہوتا ہے۔"

میں نے کہہ کر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہے۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کی سی کیفیت میں مجھے دیکھ رہے تھے۔

"تب تو ٹھیک ہے پھر۔ میں اسے طلاق دے دیتا ہوں۔" میں نے مزا لیتے ہوئے کہہ کر ان کا چہرہ دیکھا جو اس بار ایک دم فق ہو گیا تھا۔

......اف...... مجھے اپنے دل میں ٹھنڈک سی پڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" بالآخر ٹھٹھرتے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا تھا۔

میرا دل چاہا تھا قہقہہ مار کے ہنسوں۔

"آپ جانتے کیا ہیں میرے بارے میں۔ میں کوئی بھی حرکت کر سکتا ہوں۔ ایک حرکت کا مظاہرہ تو آپ اس رات دیکھ ہی چکے ہیں۔"

وہ چند لمحے ہونٹ بھینچے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر تاسف سے انہوں نے کہا۔ "تمہارے بڑے بھائی واقعی ایک Sensible آدمی ہیں۔"

"جی ہاں آپ سے انتخاب میں غلطی ہو گئی...... چہ...... چہ...... چہ......" میں نے دل جلانے والے لہجے میں کہا۔ "اپنے گھر میں سب سے زیادہ Insensible میں ہی ہوں اور میں Insensible ضرور ہوں مگر Fool ہرگز نہیں ہوں۔ الماس آپ کو اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس کو طلاق دینے سے آپ کو تکلیف ہو گی؟"

میں نے اپنی بات مکمل کر کے ایک بار پھر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ تکلیف کے آثار ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔

"......اور...... مجھے نہایت خوشی ہو گی۔" نہایت سفاکی سے کہہ کر میں نے باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" انہوں نے اب کی بار بے یقینی سے پیچھے سے پکار کر کہا۔

"......اور...... ایسا کرنے سے کون روکے گا مجھے؟" پیچھے پلٹ کر میں نے پیشانی پر بل ڈال کر سوال کیا تھا۔

"تم...... مگر...... تم انٹرسٹڈ تھے الماس میں...... تمہارے بڑے بھائی نے...... خود بتایا...... تھا......" انہوں نے اٹک اٹک کر بے یقینی سے کہا تھا۔

''میں الماس میں کبھی انٹرسٹڈ نہیں تھا۔ مجھے الماس کبھی بھی نہیں چاہیے تھی۔'' دانت کچکچا کر میں نے کہا۔

''مگر...... یہ فیصلے...... اللہ تعالیٰ کے......'' انہوں نے کہنا چاہا۔

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''اوہ...... اوہ...... اوہ...... اب یہ مت کہیے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہوتے ہیں۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا نام دیتے ہوئے لحاظ بھی نہیں آتا آپ کو......؟'' میں نے چیخ کر کہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' انہوں نے اب کی بار جیسے ہتھیار ڈال دینے کے سے انداز میں کہا تھا۔ ''جو کرنا چاہو کرو' جیسا الماس کا نصیب...... جیسی اللہ تعالیٰ کی لکھی تقدیر...... کیا ہی کیا جاسکتا ہے......''

میں نے اس بات پر استہزائیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''ہاں...... جب ہماری اپنی تدبیریں فیل ہو جاتی ہیں تو اس کو ہم اللہ تعالیٰ کی لکھی تقدیر کا نام دے دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کو بیچ میں کیوں لے آتے ہیں آپ لوگ؟''

خلدون ابراہیم نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ ان کے چہرے پر بہت سکون نظر آنے لگا تھا۔ اور یہ دیکھ کر میں بے سکونی میں جتلا ہو گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ میری جلن کچھ کم ہوتی' مزید بڑھ گئی تھی۔

☆=======☆=======☆

اس رات افنان معمول کے مطابق بہت دیر سے کمرے میں آیا تھا۔ میں تو خیر ویسے بھی اس کے انتظار میں جاگتی ہی تھی۔ آج تو پھر مجھے اس سے بات کرنی تھی لہٰذا کوئی دیر بھی کیے بغیر میں اس معاملے کو آج ہی کلیئر کر لینا چاہتی تھی۔

افنان عادل کا رویہ اتنا rude تھا کہ شروع شروع میں تو اس نے میری کسی بات کا جواب دیا ہی نہیں۔ پچھلی دونوں مرتبہ کی طرح اس بار میں اس کے حوصلہ شکن رویے سے تھک کر ایک طرف نہیں ہونا چاہتی تھی۔ جان بوجھ کر میں نے ایسی بات کہہ دی تھی جس پر اس کو کچھ بولنا ہی پڑتا۔ میں نے بات ہی ایسی pin کر دینے والی کہی تھی۔ افنان عادل کو بیچ پا ہونا ہی تھا۔ بس پھر یہ بات کہہ کر میں نے گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا۔ پھر تو وہ مجھ سے سوال جواب پر اتر آیا تھا۔

مجھے اس کو کسی بات کی صفائی دینا ضروری تو نہیں تھی مگر مجھے اس سے نکاح کے

وقت اپنی ''ہاں'' کا جواز دینا پڑ رہا تھا۔ لاشعوری طور سے میں اپنا دفاع کر رہی تھی۔ مجھے اپنا دفاع کرنا پڑ رہا تھا اور ایسا کرتے ہوئے مجھے خاصا صدمہ بھی ہو رہا تھا۔ کیونکہ مجھے پچھلا وقت یاد آرہا تھا۔

''تو پھر اس صورت میں میرے پاس ہاں کہنے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ میرے گھر والے تو پہلے ہی میرے لئے اتنا suffer کر چکے تھے۔ تم سمجھ نہیں سکتے۔ میں اپنے گھر والوں سے کس قدر شرمندہ تھی۔ میری تکلیف کا...... اذیت کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

میں کہہ رہی تھی اور بس کہے جا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر یہ دیکھے بغیر کہ سامنے والا میری سن بھی رہا ہے یا نہیں۔ میں شاید اپنے آپ میں نہیں تھی۔

''دراصل اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ۔'' میں کہتے کہتے ایک دم رک سی گئی تھی۔ ''مگر خیر اس وقت بات دوسری تھی۔ میرے گھر والے مجھ سے ناراض تھے۔ ماں ناراض' باپ ناراض' ماما ناراض۔''

اور ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ جیسے بلبلا کر چیخ پڑا تھا۔

''Keep quiet! I say.''

وہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے تھے۔

''ایک گھنٹے سے اپنے گھر والوں کو روئے چلی جارہی ہو۔ اب تم نے اپنے ماما کو رونا شروع کر دیا۔''

وہ دھاڑنے لگا تھا اور مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں آنکھوں میں آنسو لیے حیرانگی اور دہشت سے اسے تک رہی تھی۔ ماما کا ذکر تو میں نے پہلی مرتبہ کیا تھا۔ وہ ایک دم غضب ناک تو ایسے ہو گیا تھا جیسے میں بہت پہلے سے ان کا نام لے رہی تھی۔

افنان عادل کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کس قدر غصے میں ہے۔ میں نے اتنے خوفناک موڈ میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سو لرزنے لگی تھی۔

''افنان' آہستہ۔'' میں نے دھیرے سے اسے ٹوکا بھی تھا۔ وہ چیخ ہی اتنی زور سے رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ اس کی آواز یقیناً باہر تک جارہی ہوگی۔ برابر میں ابو اور امی کا کمرہ تھا۔

''کیا...... آہستہ......'' اس نے پہلے سے کہیں زیادہ بلند آواز میں کہا تھا۔ ''میرے باپ سے زیادہ ناراض رہے ہوں گے تمہارے ماما؟ میرا باپ تو ابھی تک ناراض ہے مجھ سے۔'' وہ چنگھاڑ رہا تھا۔ ''جانتی ہو تم' میں تو ابھی تک منا نہیں پایا اپنے باپ کو۔ میرا

باپ جس کے وجود کا میں حصہ ہوں' اسے ابھی تک اعتبار نہیں ہے مجھ پر' ابھی تک مجرم سمجھتا ہے وہ مجھے۔ میری ہر خوبی' ہر اچھائی پر وہ ایک منحوس رات محیط ہے۔ اس کے آگے ہر چیز ختم ہے۔ میں گرا تو ایک بار تھا ناں۔ میں کب انکار کر رہا ہوں اس بات سے...... مگر میرے باپ کو میرا اس کے بعد کا کردار نظر نہیں آ رہا۔ وہ ابھی تک خفا ہے مجھ سے۔ پھر تمہارے ماما کی ناراضگی کیا معنی رکھتی تھی۔ باپ کے رشتے سے بھی قریبی کوئی رشتہ ہوگا؟ ماما کی بات کرتی ہو' اونہہ' بھاڑ میں جائیں تمہارے ماما۔'' وہ بہت حقارت سے کہہ رہا تھا۔

''تم خفا کیوں ہو رہے ہو۔ میں نے تو پہلی بار ہی نام لیا تھا اپنے ماما کا۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''نام بھی مت لو تم اپنے ماما کا۔ تمہارے ماما نے اور میرے گھر والوں نے پھنسوا دیا ہے مجھے۔'' وہ بہت اشتعال سے کہہ رہا تھا۔

''نہیں افنان' کسی نے کسی کو نہیں پھنسوایا۔'' میں نے تحمل سے کہنا چاہا تھا۔ ''ہم اپنے ہی ہاتھوں پھنس گئے تھے۔ مجھے بتاؤ' تمہیں اس رات کیا ہو گیا تھا؟''

''اور تم بھی احمق تھیں کیا جو میرے بلانے پر فوراً باہر چلی آئیں۔'' اس نے ترشی سے پوچھا تھا۔

''اس رات تم نے مجھ کو نہیں بلایا تھا افنان بلکہ میری شامت نے میری بدبختی نے مجھ کو آواز دی تھی۔'' میں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے سسکی لے کر کہا تھا۔

''اس رات کے بعد میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری شادی تم سے ہی ہوگی کیونکہ اس رات ریوالور لے کر ماما......'' میں نے سسکی لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''کیونکہ میں سمجھی تھی......''

اس بار اس نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

''بدقسمتی سے میں بچ گیا تھا اس رات۔'' نہایت تلخی سے اس نے کہا تھا۔

''تو ماما نے کچھ نہیں کیا؟'' آنسوؤں کے مارے میری آواز بھاری ہو گئی تھی۔

''میں کب کہتا ہوں۔ ماما نے کچھ کیا ہے۔ سب کچھ میں نے ہی تو کیا ہے۔ ہاں ہاں سزا ملنی ہی چاہیے مجھے۔ پتھر مارو مجھے۔ کوڑے برساؤ۔ آگ میں جلا دو مجھے۔ [illegible] کردو۔'' وہ وحشت کے عالم میں بولتا ہوا دھڑاک سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں وہیں بیٹھ کر شدت سے رونے لگی۔ میں نے کیا کیا ہے جو وہ اپنا سارا غصہ مجھ پر اتار کر گیا ہے۔ میں نے ایسا کیا کہا تھا جو وہ [illegible]

ناراض ہو کر گیا ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ماما کو اتنا dislike کرتا ہے۔ ان سے اس قدر نفرت کرتا ہے۔ ان سے اس قدر چڑتا ہے۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں اس کے سامنے ماما کا ذکر بھی نہ کرتی اور پھر اس سارے معاملے میں ان کا قصور بھی کیا تھا۔ انہوں نے وہ کیا جو مناسب سمجھا۔ قصور میں نے کیا تھا۔ مجھے سزا مل رہی تھی۔ قصور اس نے کیا تھا' اسے سزا مل رہی تھی۔ حالانکہ ماما نے اس رات مجھ سے کہا تھا۔ ''یہ ضروری نہیں کہ کسی قصور کی پاداش میں آدمی ہمیشہ سزا ہی اٹھاتا رہے۔''

ماما نے مجھے منع کر دیا تھا کہ میں کبھی یہ نہ سمجھ بیٹھوں مگر کوئی مجھے یہ بتاتا کہ سزا اس کے سوا بھی کچھ ہوتی ہے...... کہ ہم ساتھ رہ ضرور رہے تھے...... مگر وہ میرا شوہر ہوتے ہوئے بھی میرا شوہر نہ تھا اور میں اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اس کی بیوی نہ تھی۔ اگرچہ دنیا نے ہمارے رشتے کو Legalize تو کر دیا تھا نکاح کی صورت...... مگر سچ تو یہ تھا کہ ہم آج بھی اتنے ہی غیر تھے جتنے شادی سے پہلے تھے اور بے شک ہم دونوں ایک رات کے قصوروار ضرور تھے...... مگر گناہ گار نہیں تھے پھر بھی اس قصور پر بھی اگر اس نے پکڑ لینے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو وہ جبار یعنی زبردست بھی ہے اور قہار بھی...... پھر ایسا کیسے ممکن تھا کہ ہم اس کی پکڑ سے بچ جاتے...... اور اگر اب بھی قدرت سزا دینے پر تلی ہوئی ہی تھی تو آدمی بے بس ہے۔ سزا اٹھانی ہی تھی۔ میں پیچھے بھی آخر سزا اٹھا کر ہی آئی تھی اور اگر اب بھی کچھ باقی رہ گئی تھی تو اس سلسلے میں اتنا ہی کیا جا سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے سزا میں تخفیف کی دعا اور رحم کی درخواست کر لی جاتی کیونکہ وہ رحیم یعنی رحم کرنے والا بھی ہے اور غفار یعنی بہت درگزر کرنے والا بھی ہے۔

یہ سوچ کر مجھے خاصی تسلی ہوئی۔ دل کو کچھ اطمینان ہونے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی ہے۔ میں اطمینان سے اٹھی' جا کر وضو کیا اور جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہوئی تو ایک دم افنان عادل کا خیال آیا۔ پھر تو مجھ سے نماز پڑھنی دوبھر ہو گئی۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ وہ بہت غصے کے عالم میں گھر سے نکلا ہے' نجانے کہاں گیا ہوگا۔ اسے کچھ ہو نہ جائے' وہ کچھ کر نہ بیٹھے...... اس سوچ نے مجھے پریشانی میں بلکہ اچھی خاصی فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس وقت مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کرنا کیا چاہیے۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا کہ گھر کے کسی بڑے کو بتاؤں کہ افنان عادل ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ یہ سوچ کر میں کمرے سے باہر نکلی۔ میرا خیال تھا کہ بڑے بھائی کو ساری صورتِ حال

بتاؤں گی۔ بڑے بھائی کا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ان کے کمرے کے پاس پہنچ کر دستک دینے کے لئے جونہی میں نے ہاتھ بڑھایا تو ایک دم مجھے خیال آیا۔ بڑے بھائی نے افنان کے ناراض ہو کر جانے کی وجہ پوچھی تو میں ان کو کیا بتاؤں گی۔ یہ سوچ کر مجھے حیا سی آ گئی۔ یہ تو اپنا جرم اپنا آپ کھول دینے کے مترادف تھا۔ مجھے غیرت سی آئی۔ افنان عادل کا لحاظ آ گیا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں واپس پلٹ آئی۔ میں نے بے اختیار اللہ سے دعائیں کرنی شروع کر دیں۔ سب ٹھیک رہے' سب خیریت سے ہو' افنان عادل صحیح سلامت واپس آ جائے......

گھڑی میں وقت دیکھا سوا ایک ہو رہے تھے۔ میں نے پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا پھر جب تھک گئی تو بالآخر بیٹھ گئی۔ کوئی سوا دو ڈھائی بجے کے قریب میں نے دروازہ کھلنے کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا اور افنان عادل کو سامنے پا کر بے اختیار شکر کی سانس اندر کھینچ کر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ اندر آتے ہی بے حد ترشی سے بولا تھا۔

''اب تم کیوں اس طرح بیٹھی ہو؟ میں کہہ تو رہا ہوں سارا قصور میرا ہے۔''

''نہیں افنان!'' میں نے فوراً اسے ٹوکا۔ ''تم اکیلے قصور وار نہیں ہو۔ اس رات قصور وار میں بھی تھی۔''

''اونہہ' تم خوامخواہ خود کو الزام مت دو۔ غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے۔ میں مجرم ہوں۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''نہیں افنان' اگر تم اس رات پچاس فیصد قصور وار تھے تو پچاس فیصد قصور وار میں بھی تھی۔ تم نے ٹھیک کہا ضروری تو نہیں تھا کہ مجھ سے اس رات تم کوئی فرمائش کرتے اور میں احمقوں کی طرح اسے پورا کرنے تمہارے ساتھ چل دیتی۔''

''Keep your mouth shut! تمہیں مجھے کچھ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے بے حد اشتعال سے کہا تھا۔

''میں تم کو کچھ یاد نہیں دلا رہی افنان!'' میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ اس رات جو ہوا برا ہوا۔''

''محترمہ الماس میں تمہارے خیال سے بالکل متفق نہیں ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔ ''اس رات جو ہوا' لفظ برا اس کی تشریح کرنے کے لئے بالکل کافی نہیں ہے۔''

''واقعہ جو ہوا' سو ہوا۔'' میں نے اس وقت کی تکلیف محسوس کر کے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''تم چپ نہیں رہ سکتیں۔''

وہ بلبلا کر چیخ سا پڑا تھا مگر میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔

''اس واقعے کے consequences بدترین تھے۔''

''ہاہ consequences......'' اس کا لہجہ تلخ تھا۔ ''تم جانتی بھی ہو consequences کہتے کسے ہیں؟'' اس نے گویا طنز کیا تھا۔

''ہاں جانوں گی کیوں نہیں۔ میں بھگت کے آ رہی ہوں۔'' میں ٹرانس کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔ ''تم نے ابھی مجھ سے کہا کہ تمہارے باپ جن کے تم وجود کا حصہ ہو' وہ تم کو مجرم سمجھتے ہیں۔ تمہارے والد صاحب کو شاید سب کچھ پتا ہو گا۔ میرے باپ کو تو اصل واقعے کا علم نہ تھا۔ کسی نے انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔'' میں نے دانستہ طور سے ماما کا نام لینے سے احتراز ہی کیا تھا۔ کہیں وہ پھر مشتعل ہو جائے۔ ''اس کے باوجود افنان' میں جن کے وجود کا حصہ تھی وہ بالکل Firm Rigid اور پتھر ہو گئے تھے۔ ان دنوں...... اعتبار کرنا تو دور کی بات وہ تو میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے دفن کرنے جا رہے تھے۔ مجھے ان سے شکوہ تھا مگر مجھے یہ حق نہیں تھا کہ میں ان سے شکوہ کرتی۔ وہ میری شادی کرنے جا رہے تھے۔ "At that time I was only 13 and a half."

''کیا......کیا......کیا؟'' وہ بے یقینی کے عالم میں چیخ سا پڑا تھا۔

''ہاں اس وقت میں نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا اس کے حساب سے تو انہیں یہ پورا حق تھا کہ وہ جو سلوک چاہتے کرتے میرے ساتھ...... اور واقعی اس کے بعد تو جو بھی نہ ہو جاتا کم تھا۔''

میں آنکھیں بند کیے ہی کہہ رہی تھی اور مجھے اس عالم میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ افنان عادل بے یقینی سے مجھے دیکھے جا رہا ہے۔

''لیکن اس وقت شادی کا تصور بھی میرے لئے بہت ہولناک تھا۔ یہ خیال ہی میرے لئے بہت اذیت ناک تھا کہ میرے گھر والے میری شادی بطور سزا کر رہے ہیں۔ ساڑھے تیرہ سال کی عمر ہوتی ہی کتنی ہے۔ میں مر جانا چاہتی تھی اس وقت...... مگر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تب میں نے بہت دعائیں کی تھیں۔ جس طرح حضرت آدم

علیہ السلام نے اپنا مقدمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھ دیا تھا' میں نے بھی ان کی دعا اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھ دی تھی۔ اے رب! ہم نے اپنی جانوں پر بہت ظلم کیا اگر تُو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

وہ وقت یاد کر کے بے آواز آنسو میری آنکھوں سے گرنے لگے تھے۔

"میں نے حضرت یونسؑ کی اس وقت کی مانگی ہوئی دعا کی جب وہ بہت تکلیف میں تھے۔ وہ رسول تھے اور میں ایک ذرہ بھی نہیں...... مگر میں تکلیف میں تھی۔ بڑی مشکل میں تھی۔ میں کہہ رہی تھی کہ "کوئی معبود نہیں ہے سوائے تیرے تُو پاک ہے۔ بے شک میں ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔" میں نے حضرت موسیٰؑ کی کی ہوئی دعا کی تھی کہ "اے رب اس وقت تو" تُو جو بھی خیر مجھ پر نازل کر دے میں اس کی محتاج ہوں۔" مجھے اس وقت خیر کی بہت ضرورت تھی۔ افنان' حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی تھے۔ انہیں کسی دوسرے خیر کی ضرورت تھی اور میں ان کی دھول بھی نہیں...... میرے لئے اس وقت سب سے بڑا خیر یہ تھا کہ میری شادی نہ ہو۔

میں نے نبیوں کے سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھ دی کہ "اے زندہ رہنے والے! اے قائم رہنے والے! تیری رحمت سے استغاثہ چاہتی ہوں۔"

اس وقت مجھے صرف اسی کی رحمت کا انتظار تھا۔ تقدیر کو کوئی نہیں بدل سکتا' بجز دعاؤں کے اور اللہ تعالیٰ رحیم ہے۔ مجھ پر رحم کر دیا گیا تھا اور عین ایک ہفتے پہلے جب کہ سب کچھ ہو چکا تھا فرنیچر خریدا جا چکا تھا۔ سارا زیور تیار تھا۔ کارڈز آدھے بٹ چکے تھے۔ شادی ہال کی بکنگ ہو چکی تھی' وہاں سے انکار ہو گیا۔ میں نہیں جانتی کہ ایسا کیونکر ہوا مگر افنان اللہ تعالیٰ سنتا ہے۔ سن لی گئی تھی میری۔"

ٹرانس کے عالم میں کہتے کہتے میں نے ایک دم افنان عادل کو دیکھا۔ وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس سے نہیں دیواروں سے بول رہی ہوں۔

"اب اگر آپ بولنے سے شوق فرما چکی ہوں تو میں ذرا سونے کی کوشش کر لوں۔" اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے اس نے تلخی سے مجھ سے کہا۔

میں... نے بڑے تاسف سے اسے دیکھا۔

"افنان' میں تمہاری تصویر دیکھ لیتی' تمہارا پورا نام جانتی ہوتی' میں تم سے بے شک شادی سے انکار کر دیتی' میں چاہے لاکھ پیر پٹخ لیتی' سر پٹخ لیتی' سب کچھ پٹخ لیتی۔ اس کے باوجود بھی اگر میری قسمت میں تم سے شادی ہونی لکھی ہوتی تو وہ ہو کر رہتی۔" میں نے جھکے لہجے میں کہا۔ "تم نے ماما کو اتنا کچھ کہہ دیا۔ ممکن ہے۔ تم اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ شاید تم جس چیز کو جس نظر سے دیکھ رہے ہو' وہ تم کو ٹھیک لگے اور میں جس چیز کو جس نظر سے دیکھ رہی ہوں' وہ مجھے ٹھیک لگ رہی ہے۔ جو چیز تم دیکھ سکتے ہو' میں وہ نہیں دیکھ سکتی اور جو چیز میں دیکھ کر آئی ہوں' تم اس کو سوچ بھی نہیں سکتے۔"

اور افنان عادل کا آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہتا ہو۔ "بکے جاؤ۔"

میں بھی بالآخر طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری سمجھ میں اس کا رویہ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے جو حادثہ گزرا تھا' وہ شدید تھا۔ میں نے بھی اس کا بہت اثر لیا تھا۔ تبدیلیاں میرے اندر بھی آئی تھیں۔ مجھے بھی سنبھلنے میں وقت لگا تھا مگر میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ مجھے خود کو سنبھالنا پڑا تھا۔ مجھے تقدیر سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ مجھے وہ ملا تھا جس کی میں حق دار تھی۔ اللہ تعالیٰ کسی کی استطاعت سے بڑھ کر اس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ انسان جو کماتا ہے' کا بدلہ اسے ملتا ہے۔ اب چاہے نیکی کمائے یا گناہ...... میں نہیں جانتی تھی کہ افنان عادل مجھے کسی نیکی کی کمائی کے بدلے میں ملا تھا یا گناہ کی کمائی کے بدلے میں...... اس کے باوجود میں نے افنان عادل کو کسی تلخ سچائی کی طرح قبول کیا تھا۔ یہ سمجھ کر قبول کیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ میرا مفصل ایمان ہے کہ تقدیر میں خیر یا شر کے سارے فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ میں نے افنان عادل کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کیا [illegible] شوہر کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ مجھ کو بحیثیت بیوی قبول کرنے کا [illegible] نہیں تھا۔ ایسی کیا بات تھی آخر جس نے اس کو بے چین کر رکھا تھا۔

میں نے تو افنان عادل سے اس وقت جو کہا تھا حق تھا۔ جو مانگا تھا حق تھا مگر اس رات افنان عادل سے بات کر کے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس سے اس سلسلے میں مزید کوئی گفتگو کرنا بالکل بے کار ہے بلکہ نری حماقت ہے۔ ایک محتاج دوسرے محتاج سے بھلا حاجت روائی کی امید بھی کیسے رکھ سکتا ہے اور میں اس دنیا کی سب سے بڑی احمق تھی کہ افنان عادل سے ایسی امید رکھ رہی تھی۔ جب کہ حاجتوں کو پورا کرنے والا اوپر بیٹھا ہے' میں اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اطمینان سے سو گئی تھی۔

اگلے دن جب میری آنکھ کھلی تو وہ آفس روانہ ہو چکا تھا اور میں بڑے بھائی کے پاس پہنچ گئی۔ اس وقت بڑے بھائی کمرے میں اکیلے تھے اور ایک کرسی پر متفکر سے بیٹھے تھے مجھے دیکھ کر حیران سے ہو گئے۔

''کیا بات ہے جواہر' تم صبح صبح یہاں! اور ابھی ابھی افغان.....''

وہ کہتے کہتے رک سے گئے۔ میرے کان کھڑے ہو گئے مگر بڑے بھائی نے جملہ مکمل نہیں کیا۔ میں منتظر رہی۔ بڑے بھائی سوالیہ نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ ایک دم میرے منہ سے نکلا تھا۔

''آپ آج آفس نہیں جا رہے بڑے بھائی؟'' اس وقت سب سے اچھا سوال یہی لگا تھا پوچھنے کو۔

''ہاں میں جاؤں گا آفس مگر ذرا دیر میں جاؤں گا۔ تم کہو خیر سے تو آئی ہو؟'' وہ قدرے مشکوک انداز میں پوچھ رہے تھے۔

''مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے بڑے بھائی!'' میں نے نظر جھکا کر کہا۔

''کہو جواہر' تم کو اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

''بڑے بھائی افغان.....'' میری سمجھ میں نہیں آیا' بات کس طرح شروع کروں؟

''کیا ہوا افغان کو؟ کیا کر دیا افغان نے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں۔ وہ تمہارے ساتھ اچھا تو ہے ناں؟'' بڑے بھائی نے ایک ساتھ بہت سارے سوالات کر ڈالے' ان کا لہجہ پریشان بھی لگا مجھے۔

''ب..... بہت.....'' میں ہکلانے لگی۔

''اوہ اچھا۔'' وہ قدرے طمانیت سے بولے۔ ''میں سمجھا افغان نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے شاید اور تم اس کی شکایت کرنے کے لیے آئی ہو۔''

میں نے ان کی اس بات پر گہری سانس لی۔ تو کل رات کا غصہ یعنی ابھی تک [illegible] نہیں تھا۔

''ن..... نہیں تو..... شکایت کیسی۔'' میں نہ جانے کیوں ان سے بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

''ویسے تم شکایت کرو تو تم کو حق بھی ہے اس کا۔ گھر بھر کو بھی اس کے تیور [illegible] سے آفس جوائن کر لینے پر نہ صرف شکایت ہے بلکہ حیرانی بھی ہے۔''

[illegible] کے علاوہ میں اور کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

''افغان کا موڈ آج کل کچھ ٹھیک نہیں رہتا۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہے۔ آج صبح بھی اس کا موڈ خراب تھا۔ جب وہ آفس جانے کے لئے نکلا مگر اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں وہ تھوڑا ڈسٹرب ہے۔ اگر تم اس کے ساتھ تھوڑا تعاون کرو گی تو وہ نارمل ہو جائے گا۔''

بڑے بھائی کے کہنے پر میں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''کیا آپ نے زبردستی اس کی شادی مجھ سے کروائی ہے؟''

میرے سوال پر وہ چونکے ضرور تاہم سکون سے کہا۔ ''نہیں کسی نے اس پر زبردستی نہیں کی۔ میں نے تو صرف اس سے پوچھا تھا۔ اس نے مجھے منع نہیں کیا تھا۔ وہ اگر راضی نہیں ہوتا تو مجھے منع کر دیتا۔ جیسے اور سب کو منع کرتا رہا تھا۔''

ایک لمحے کو میرا دل چاہا ان سے کہوں آپ نے اسے سمجھنے میں غلطی کر دی۔ جب کہ وہ کہہ رہے تھے۔

''دراصل ابھی بے تمہاری شادی کا فیصلہ ابو کا ہی تھا۔ میں نے تو صرف ان کا فیصلہ اس تک پہنچایا تھا۔''

''تو یہ آپ کا فیصلہ نہ تھا؟''

''یہ دراصل ایسا ہے کہ مرضی تو میری بھی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ افغان کی شادی تم سے ہی ہو۔ فرسٹ ٹائم افغان نے تمہارے بارے میں مجھے ہی بتایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ افغان تم میں انوالوڈ ہے۔ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ پھر تمہارے ماما کے سامنے میں نے یہ پروپوزل رکھا۔ ان کے سامنے یہ پروپوزل رکھتے ہوئے میں ڈر رہا تھا' کہیں طیش میں آ کر انکار ہی نہ کر دیں کیونکہ جو کچھ ہو چکا تھا' اس میں افغان کے ساتھ ہمارا پورا خاندان ماسوائے امی کے' اور تمہارے ماما بھی انوالوڈ تھے مگر تمہارے ماما بہت Reasonable اور Sensible آدمی ہیں۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تمہارے والدین پر بات چھوڑ دی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ افغان کے حق میں وہ انہیں راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔ تمہارے گھر والوں کو اعتراض نہ ہوا۔'' انہوں نے مجھے ساری تفصیل خاصی سنجیدگی سے بتائی۔

''ابو نے ناراض ہو کر افغان کی شادی مجھ سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تم سے کس نے کہا؟'' انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''ایسا تو کچھ نہیں ہے۔''

"تو ابو کیا خفا ہیں افنان سے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں تو وہ بھلا کیوں خفا ہوتے؟" بڑے بھائی نے اچنبھے سے مجھے دیکھا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں بڑے بھائی؟" میں نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

"ارے تمہیں یقین نہیں آتا تو خود پوچھ لو ابو سے۔" وہ روانی میں کہتے کہتے ایک دم ٹھٹک سے گئے۔ "ایک منٹ رکو۔ یہ سب تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا افنان نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں افنان نے کچھ نہیں کہا۔" میں نے سادگی سے بتایا۔

وہ چند لمحے مجھے دیکھتے رہے پھر گہری سانس لے کر کہا۔ "تم ہی سے نہیں کہے گا تو اور کس سے کہے گا۔"

"وہ آپ سے بہت قریب ہے بڑے بھائی!" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" انہوں نے حسب سابق گہری سانس لے کر کہا۔ "بہت فرمانبردار اور لائق ہے میرا بھائی۔ وہ سب سے چھوٹا ہے ناں۔ مجھے بہت عزیز ہے اور بہت پیارا ہے۔ بلکہ اس سے وابستہ ہر چیز مجھے پیاری ہے۔ مجھے تم بھی بہت عزیز ہو۔ بڑے دل سے اور بڑی چاہ سے اس کی بیوی بنا کر لایا ہوں تم کو۔ جواہر میرے بھائی کا خیال رکھنا۔ اسے جو بھی تکلیف ہے' مشکل ہے' پریشانی ہے' اس سے شیئر کرنے کی کوشش کرو۔ میں بھی اس سے بات کروں گا۔" بڑے بھائی نے مجھے تسلی دی۔

میں چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔ مجھے خیال آیا' مجھے ابو سے بھی ضرور بات کرنی چاہئے۔ ان کے خیالات بھی افنان سے متعلق مجھے پتا ہونے چاہئے۔ یہی سوچ کر میں ابو کے پاس چلی گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئے۔

"آؤ.... آؤ بہو' یہاں بیٹھو۔" وہ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فوراً ایک طرف ہو کر مجھے جگہ دی۔ "سارہ' بہو ہمارے کمرے میں پہلی مرتبہ آئی ہے تو اس کے لئے کچھ لانا چاہئے۔" انہوں نے امی سے نہایت خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

"جو آپ کی مرضی ہو۔" امی نے سنجیدگی سے کہا پھر یہ کہہ کر اٹھ گئیں۔ "میں ابھی آتی ہوں۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

ان کے جانے کے بعد ابو نے والٹ سے پیسے نکالے اور مجھے دینے چاہے۔

"نہیں.... نہیں ابو' یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" میں پزل سی ہو گئی۔ "مجھے تو صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔" میں نے قطعی انکار کر دیا۔

"بھئی' آخر کو اس گھر کی سب سے چھوٹی بہو ہو تم۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "دعائیں تو ہم تم کو اٹھتے بیٹھتے دیتے ہیں۔"

میں نے آہستگی سے ان سے پوچھا۔ "اور افنان کو؟"

وہ لمحے بھر کے لئے خاموش سے ہو گئے۔ پھر کہا۔ "افنان کو بھی۔"

"آپ افنان سے ناراض ہیں؟" میں نے فوراً پوچھا۔

انہوں نے کچھ دیر تک تو کچھ نہ کہا پھر مسکرا دیے۔ "نہیں' اب تم آگئی ہو تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

"یعنی میرے آنے سے پہلے تک آپ افنان سے ناراض تھے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں' تھوڑا بہت۔" انہوں نے قدرے تاخیر سے مگر صاف گوئی سے جواب دیا۔

"میں وجہ آپ سے پوچھوں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟" میں نے گویا ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

وہ ایک دم مسکرائے۔ "نہیں' میں ناراض نہیں ہوں گا مگر تم کیوں گڑے مردے اکھاڑنا چاہتی ہو؟ جو گزر گیا' سو گزر گیا۔"

میں نے غور سے ان کی بات سنی۔

"آپ.... آپ.... سب جانتے ہیں ابو!" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "اکیلا وہ ہی قصوروار نہ تھا' میں بھی تھی۔"

میں نے بڑی دقتوں سے یہ بات کہی تھی اور یہ چند الفاظ کہنے میں ہی مجھے پسینے آگئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کسی کو کسی الزام سے بری کرنا' کسی کی صفائی میں کچھ کہنا' اپنے جرم کا اعتراف کرنا کتنا دشوار گزار کام ہوتا ہے۔ کسی بھی وہ جو آپ کا شوہر ہو.... اور جس کے سامنے جرم کا اعتراف کیا جا رہا ہو وہ شوہر کا باپ ہو......

ابو چند لمحے مجھے بغور دیکھتے رہے پھر کہا۔ "تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اب اچھی طرح جانتا ہوں کہ کون قصوروار تھا اور کون نہیں۔"

"وہ آپ سے بہت شرمندہ ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ بات وہ بھی مجھ سے کہہ سکتا تھا۔" وہ اب کی بار قدرے خفگی سے بولے۔

"تو یعنی آپ واقعی خفا ہیں اس سے؟"

میرے پوچھنے پر وہ چپ سے ہو گئے اور مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی افنان ٹھیک کہہ رہا تھا۔

''آپ...... آپ...... والد ہیں اس کے......'' میں نے جھجک کر کہنا شروع کیا۔

''ویسے تو یہ آپ کا اور اس کا معاملہ ہے۔ میں یہ حق تو نہیں رکھتی کہ آپ دونوں کے بیچ میں دخل اندازی کروں مگر میں آپ سے درخواست تو کر سکتی ہوں کہ آپ پلیز اسے معاف کر دیجئے۔'' میں ان سے اسی قدر کہہ سکی۔ وہ بے اختیار مسکرائے۔

''مجھے افنان سے کوئی شکایت نہیں ہے اگر تھی بھی تو اب نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا۔ تم کو اسی گھر میں آنا تھا' سو تم آ گئیں۔ افنان نے تم کو پسند کر کے زندگی میں پہلا اچھا کام کیا ہے۔''

میں ابو کے آخر کے الفاظ صحیح طرح سے سن نہیں سکی۔ میرا دھیان تو ان کے شروع کے جملوں میں ہی اٹک گیا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔

''اور دوسرا اچھا کام یہ ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے۔ وہ کچھ جو کبھی کسی وقت غلط ہونے جا بھی رہا تھا ایک اس فیصلے سے بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ تم اپنے دل پر کوئی بوجھ مت رکھو۔ مطمئن ہو کر جاؤ۔''

ان کا ہاتھ میرے سر پر ٹھہر گیا تھا۔ میں خاصی الجھن کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ باہر آتے ہوئے بار بار ابو کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

یہ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا......

تم کو اسی گھر میں آنا تھا......

مجھے واقعی اسی گھر میں آنا تھا؟ میں نے بڑی حیرت سے سوچا تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا...... کیا سب کچھ......؟

میں افنان عادل کے کمرے میں آ کر بڑی الجھن سے سوچ رہی تھی اور اپنے ساتھ گزرا ہوا ہر ہر واقعہ مجھے یاد آ رہا تھا۔ پہلی بار شادی ہوتے ہوتے رہ جانا...... شادی کی عین رات بلال مرتضیٰ کا مجھے چھوڑ کر چلے جانا...... اس کے بعد پھر لمبا انتظار ساری دعائیں...... پھر افنان عادل کے گھر والوں کا اچانک آ جانا۔ فٹافٹ بات طے ہو جانا......

تو کیا میں اتنے عرصے تک دعاؤں میں افنان عادل کو مانگتی رہی تھی؟ میں نے خاصی وحشت سے سوچا تھا۔

نہیں...... نہیں...... میں نے کبھی افنان عادل کو نہیں مانگا تھا۔ میں اس رات کے بعد افنان عادل کو مانگ بھی کیسے سکتی تھی۔ میں نے تو اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہ دعا کی

وہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے' اسے میرا نصیب بنا دے۔

تو افنان عادل بہت پہلے سے میرا نصیب تھا...... اسے مجھے دینے کا فیصلہ بہت پہلے کیا جا چکا تھا...... تبھی پہلا شخص نہیں...... بلال مرتضیٰ بھی نہیں...... اتنی ذہنی تکلیف' طویل تھکا دینے والے انتظار کے بعد سیدھا سیدھا افنان عادل اور نکاح کے وقت ماما کے الفاظ......''امانتیں بالآخر اس کے اصل تک پہنچ جایا کرتی ہیں۔ تم بھی جس کی تھیں۔''

تب میں نے بڑی حیرت سے سوچا تھا۔ میں کس کی تھی؟ یہ اب مجھے سمجھ میں آ رہا تھا اور نکاح کے وقت مجھے افنان نام ہی سن کر کیسا شاک لگا تھا۔ تب میں نے کس قدر دعائیں کی تھیں کہ یہ وہ افنان نہ ہو جس کو میں جانتی ہوں مگر میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہی افنان نکلا تھا جس کو میں جانتی تھی۔ یہ ایک اور حیرت انگیز بات تھی کہ کل جب میں افنان عادل کو اپنے ساتھ نکاح کی Justification دے رہی تھی تو میں نے یہ تو اس سے کہا تھا ''اگر میری قسمت میں تم سے شادی ہونا لکھی ہوتی تو وہ ہو کر رہتی۔'' اور میں نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری قسمت میں تم ہی سے شادی ہونا لکھی تھی......

میں سابقہ دونوں اشخاص میں سے کسی کی نہیں تھی۔ میں تو ازل سے افنان عادل کی ہی تھی۔ مجھے کسی کے لئے نہیں رکھا گیا تھا۔ افنان عادل کے لئے رکھا گیا تھا۔

شادی کی رات سے لے کر پچھلی رات تک میں نے افنان عادل کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کیا تھا۔ میں نے اب تک یہ سوچا تھا کہ تقدیر پر تو صبر ہی کیا جا سکتا ہے' سو میں نے صبر کر لیا تھا۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ جس شخص کے ساتھ اس رات میرے معاملات خراب ہونے جا رہے تھے' میرا نکاح اسی سے کروا کے میرے معاملات اچھے کروا دیے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ واقعی رحیم ہے۔ مجھ پر رحم کیا گیا تھا۔ میں اپنے نصیب پر شاکر کب رہی تھی۔ حالانکہ بندگی تو یہی ہے کہ بندہ ہر حالت میں راضی بہ رضا رہے۔ صبر کرے اور ساتھ میں شکر بھی......

بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ شکر کے مارے......

میں نے اب تک یہ سمجھا تھا کہ تقدیر میں خیر اور شر کے سارے فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ میں نے تب یہ نہیں سوچا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کبھی شر کا فیصلہ نہیں کرتا۔ ہم جس کو شر سمجھ رہے ہوتے ہیں' وہ بھی اس کا خیر ہی ہوتا ہے۔ ہم اس بات کو جانتے نہیں ہیں۔

افنان عادل میرے لئے خیر تھا۔ میں سمجھ نہیں سکی تھی اس بات کو اور اب جب سمجھ

گئی تھی تو مجھے بے حساب رونا آرہا تھا۔ میں رو رہی تھی۔

افنان عادل کو مجھے دے کر میری پکڑ نہیں کی گئی تھی......

افنان عادل کی صورت مجھے سزا نہیں دی گئی تھی...... مجھ پر احسان کیا گیا تھا۔

میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں ادا کیا تھا۔

مجھ پر واجب تھا کہ میں اس کا شکر کرتی۔

میں وضو کے لئے اٹھ گئی تھی۔

☆======☆======☆

''اس دن بہت جل بھن کر میں خلدون ابراہیم کے آفس سے نکلا تھا۔ سید صابر بیرسٹر نادر آفتاب کے پاس پہنچا اور ان سے طلاق کے کاغذات تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ مجھے طلاق سے متعلق قانونی نکتے بتاتے رہے تھے اور میں بغیر دلچسپی اور لاتعلقی سے سنتا رہا تھا۔

''بس آج رات تک پیپرز تیار کروا کے مجھے دے دیجئے آپ۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''افنان صاحب' اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔'' انہوں نے تحمل سے کہا۔

''نہیں لگنا چاہیے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں آپ کو بیوی پے منٹ کروں گا۔ بلکہ آپ جتنا کہیں گے میں آپ کو پے کروں گا۔''

''بات پے منٹ کی نہیں ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں پے منٹ کرنا آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ میں جتنی پے منٹ کرنے کو کہوں گا' آپ کریں گے مگر تھوڑی Requirements پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ بہر حال جیسے ہی پیپرز تیار ہو جائیں گے' میں آپ کو کال کر دوں گا۔''

ان کے حتمی انداز پر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ویسے آپ نے سوچ لیا ہے ناں اچھی طرح۔'' مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''طلاق' حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔''

میں نے نہایت بے توجہی سے ان کی بات سنی تھی البتہ باہر آتے ہوئے سوچا تھا کہ حلال تو ہے ناں۔ بس ختم بات۔

بیرسٹر نادر آفتاب کے ہاں سے نکلنے کے بعد میرا دوبارہ آفس جانے کو دل نہ چاہا۔

میں بلا مقصد سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسی ذہنی انتشار کے عالم میں مختلف اوقات میں اذانیں ہونے پر رک کر میں نے نمازیں بھی پڑھی تھیں۔ گھر جانے کا مگر میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

بالآخر ساڑھے آٹھ نو بجے کے قریب میں گھر پہنچا اور سامنے لان میں ہی الماس کو دیکھ کر میرا منہ کڑوا ہو گیا۔ اس نے مجھ پر سلامتی بھیجی تھی۔ میں نے جواباً اس پر سلامتی بھیجنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔

گھر میں غیر معمولی سناٹا تھا جب کہ ہمارے گھر میں تو بڑی رونق رہا کرتی تھی' اس وقت تک مجھے یہ سب کچھ ابنارمل سا لگا۔

''کہاں ہیں سب؟'' بہت دل کڑا کر کے اس کی طرف دیکھے بغیر مجھے پوچھنا ہی پڑا۔

''اسپتال میں۔'' اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تمہارے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔''

میرے ہاتھ سے گاڑی کی چابی، بریف کیس سب چھوٹ کر زمین پر جا گرے۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ مجھے لگا میرے پیروں کے نیچے زمین نہیں ہے۔ مجھے لگا کہ آسمان میرے سر پر گر پڑا ہو...... مجھے لگا میں بھی ابھی نیچے جا گروں گا۔

''نہیں۔'' خاصی بے یقینی کے عالم میں مَیں نے کہا تھا۔

''اس وقت وہ سی سی یو میں ہیں۔ سب ہاسپٹل میں ہی ہیں۔''

وہ کہہ رہی تھی اور میں بے یقینی' صدمے' افسوس' دکھ' رنج' تکلیف' اذیت کے عالم میں اسے دیکھے جا رہے تھا۔

''میں نے تمہارے آفس کئی فون کیے۔ تم آفس میں نہیں ملے۔''

میں سوچ رہا تھا میں آفس میں تھا کب جو وہاں ملتا...... وہ کہہ رہی تھی۔

''بڑے بھائی نے تمہارے موبائل پر بہت کالز کیں۔ کئی میسجز دیے۔ تم نے اس کا بھی جواب نہیں دیا۔''

وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اور مجھے یاد آیا کہ خلدون ابراہیم کی طرف جاتے ہوئے میں موبائل تو وہیں آفس کی ٹیبل پر بھول آیا تھا۔

میں وحشت کے عالم میں بے تحاشا پلٹ کر بھاگا تھا اور وہ پیچھے سے مجھے ہاسپٹل کا نام بتا رہی تھی۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر میں ہانپنے لگا تھا۔ دروازہ کھولنے کے لیے

ہاتھ بڑھایا تو خیال آیا۔ چابی تو وہیں گر پڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر پلٹنے کا ارادہ کیا۔ تبھی کسی نے چابی میری طرف بڑھائی تھی اور یہ الماس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے چابی لی۔ بہ عجلت گاڑی اسٹارٹ کر کے بہت تیزی سے میں گاڑی نکال کر مین روڈ تک لایا تھا۔ اس رات میں نے اپنی ہی تیز رفتاری اور Carelessness کے تمام ریکارڈ برابر کر دیے تھے۔ متعلقہ ہاسپٹل سے میرے گھر کا فاصلہ آدھے گھنٹے کا تھا جسے میں دس منٹ میں طے کرتے ہوئے ہاسپٹل تک پہنچا تھا۔ حالانکہ الماس میرے ساتھ ہی تھی مگر اس لمحے مجھے صرف ایک خیال کے علاوہ کچھ اور بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاسپٹل کے پارکنگ ایریا میں جیسے تیسے گاڑی پارک کر کے میں تقریباً بھاگتا ہوا سی سی یو پہنچا تھا۔ امی بڑے بھائی' چھوٹی بھابی' بڑی بھابی سب سی سی یو کے باہر موجود تھے۔ بڑے بھائی مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری طرف آئے تھے۔

''افنان' تم صبح سے کدھر تھے؟''

وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں گلاس ڈور کے پار مختلف Devices سے Connected ابو کو لاچاری کے عالم میں پڑا دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے بھائی ابو کے پاس بیٹھے تھے۔ بڑے بھائی کہہ رہے تھے۔

''اصل میں ابو کو ہائپر ٹینشن کی شکایت تو کچھ سالوں سے تھی مگر وہ دوائیں باقاعدگی سے لیتے تھے مگر آج تو......'' بڑے بھائی کہتے کہتے رک گئے تھے۔

میں نے بے حد چونک کر بڑے بھائی کو دیکھا تھا۔ ''ابو کب سے ہائپر ٹینشن کے مریض بن گئے تھے؟''

''یہ تمہارے انگلینڈ جانے کے کچھ ہی عرصے بعد کی بات ہے۔''

بڑے بھائی مجھے بتا رہے تھے اور میں شاک میں تھا۔ کتنی بڑی بات مجھے پتا نہیں تھی۔ وہ مجھے اٹیک کا وقت بتا رہے تھے اور مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس وقت تو میں کھڑا خلدون ابراہیم سے جھگڑ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی آئی۔ تھوڑے فاصلے پر پڑی بنچ پر میں امی کو بیٹھے روتے دیکھ رہا تھا۔ بڑے بھائی' بھابی' چھوٹی بھابی امی کو تسلیاں دے رہے تھے اور میں ان کو تسلی کیا دیتا مجھے تو خود تسلی کی ضرورت تھی۔ تبھی الماس نے میرے پاس آ کر آہستگی سے کہا تھا۔

''تم پریشان مت ہو افنان' انشاء اللہ' ابو ٹھیک ہو جائیں گے۔''

اور میری آنکھیں آنے والی نمی کے باعث دھندلا سی گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ نمی

گالوں پر پھسلتی' میں نے بڑی عاجزی سے الماس سے کہا تھا۔ "الماس پلیز' تم چلی جاؤ یہاں سے۔"

مجھے تسلی کی ضرورت ضرور تھی مگر کم از کم الماس کی نہیں......

الماس مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ میں وہیں گلاس ڈور سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سسٹر کے باہر آنے پر میں نے اس سے بہت عاجزی سے کہا تھا۔ "پلیز ایک بار میں انہیں اندر جا کر دیکھ آؤں۔"

"سی سی یو میں تو کسی کو Allow ہی نہیں کرنا چاہیے۔ شکر کریں ہم ایک کو Allow کر رہے ہیں۔" سسٹر بے دردی سے کہتی ہوئی چلی گئی تھی۔

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے کہا۔ "یہاں رش نہ لگائیں۔" گھر بھر کو اس نے واپس جانے اور صرف کسی ایک کو رکنے کے لیے کہا تھا۔ میرا اس سے ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا تھا۔

"افنان' تم خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہو۔" بڑے بھائی نے تھکے تھکے سے انداز میں مجھے سمجھایا۔

"یہاں کیوں لے آئے انہیں۔ کارڈیو ویسکولر کیوں نہیں لے کر گئے۔" میں نے بے بسی لے کر کہا۔ "اتنے سال سے میں گورنمنٹ کو سرو کر رہا ہوں۔ اب کیا گورنمنٹ اتنا بھی نہیں کر سکتی تھی میرے لیے۔" میں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

"افنان ہم کہیں بھی جاتے اسی صورت حال سے واسطہ پڑتا۔ میرا ابو کو وہیں لے جانے کا ارادہ تھا لیکن ابو کی حالت دیکھ کر میں ڈر گیا۔ اتنا دور جانا میں افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ پہلا سب سے قریبی ہاسپٹل یہی تھا۔"

بڑے بھائی ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ چھوٹے بھائی اندر سے اٹھ کر آ گئے۔

"اللہ کے شکر سے بڑے بھائی' ابو ٹھیک ہیں اب۔ میری ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی۔ سب نارملائز ہو گیا ہے۔"

"شکر الحمدللہ!" بڑے بھائی نے بلاتوقف کہا۔

اور میری نظر بے اختیار گلاس ڈور کے اس پار بھٹکنے لگی۔ ابو کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس لینے کی رفتار کا اندازہ میں ادھر کھڑے کھڑے ہی کر سکتا تھا۔ میں نے خاصی بے یقینی سے چھوٹے بھائی کو دیکھا تھا۔ میری آنکھیں نمی کے باعث دھندلا گئیں۔

"کیا واقعی۔ سب نارملائز ہو گیا ہے؟"

بڑے بھائی چھوٹے بھائی سے کہہ رہے تھے۔ "سمعان یہاں رش لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا کرو تم سب کو گھر لے جاؤ۔ میں ادھر ہوں۔" پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

کہا۔ "جاؤ افنان تم بھی جاؤ۔"

"نہیں۔" میں نے پتھریلے لہجے میں کہا۔ "آپ سب جائیں مجھے رہنے دیں۔"

"افنان ضد مت کرو۔" بڑے بھائی نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ کب سے یہاں ہیں۔ میں تو ابھی آیا ہوں اور ابھی میں گھر چلا جاؤں۔ پلیز مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے رقت سے کہا۔ "آپ لوگ جائیں سب۔ پلیز' مجھے رہنے دیں یہیں۔"

میں نے منت کرنے والے انداز میں کہہ کر بڑی مشکلوں سے ان لوگوں کو راضی کر کے انہیں جانے پر آمادہ کیا۔ بڑے بھائی نے چلتے ہوئے اپنا موبائل مجھے دیا تھا۔

"دیکھو کوئی بھی مسئلہ ہو۔ مجھے فوراً کال کرنا۔" وہ جاتے جاتے ہوئے بھی مجھے سمجھا کر گئے تھے۔ "افنان تم فکر مت کرنا' ابو کو انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔"

اور میری آنکھوں میں نمی بھر بھر کے آتی رہی تھی۔ میں سوچتا رہا تھا ابو کو کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ بس ابو کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

اور ابھی میں نے سی سی یو کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ وہاں پر موجود اسٹاف اور ڈاکٹرز کو ایک دم ایکٹیو ہوتے دیکھا۔ میں ڈر سا گیا۔

"کیا ہوا ہے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے خاصی وحشت کے عالم میں پوچھا تھا۔

"دوسرا اٹیک ہوا ہے۔" ڈاکٹر نے مصروف سے انداز میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

میں نے ایک دم دیوار کو تھاما' میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ دم حلق میں اٹک گیا تھا۔

"مم...... مگر ابھی تو...... آپ لوگوں...... نے کہا تھا......" میں بے یقینی کے مارے اپنی بات مکمل نہیں کر سکا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ ہی ول بی آل رائٹ۔" ڈاکٹر نے ایک بار پھر مجھے تسلی دی تھی۔

میں پریشانی کے عالم میں حواس باختہ سا کھڑا رہا تھا۔ بے بسی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ دعائیں کر رہا تھا۔ میرے آنسو خاموشی سے میرے گال گیلے کر رہے تھے۔

مسلسل کچھ گھنٹوں کی کوشش کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا۔ "اب سب ٹھیک ہے۔"

میرا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔ خاموشی سے میں ابو کے پاس جا کر بیٹھ گیا تھا۔

مجھے ابو کی حالت دیکھ کر ڈر لگ رہا تھا۔ ابو ہوش میں نہیں تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا میں انہیں جھنجوڑ کر اٹھا دوں۔ ابو اٹھیں' آپ بے شک مجھے ڈانٹ لیں۔ جھاڑ دیں مگر اٹھ جائیں مگر ابو اس وقت میری کسی بھی کیفیت سے بے خبر تھے۔ ایسے لاچار تھے کہ ان کی لاچاری مجھے لاچاری میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ اس عالم میں وہ اگر سانس بھی ذرا تیز لینے لگتے تو میری سانس بند ہونے لگتی تھی۔ میں وہاں کے اسٹاف کو ایک دم الرٹ کر دیتا۔ مجھے لگتا ابو کی سانس کے ساتھ میری سانس کا کنکشن ہے۔ ابو کو کچھ ہو گیا خدانخواستہ تو مجھے بھی کچھ ہو جائے گا۔

مجھے ایک دم آج صبح کا واقعہ یاد آ گیا تھا۔ اچھا ہوا تھا۔ میں نے ابو کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی ابو کتنا بولے تھے مجھ پر۔ میں نے ان کو صبح جواب دے دیا ہوتا۔ تو ابھی پچھتا ہی رہا ہوتا۔ ابو تو پہلے ہی خفا تھے مجھ سے' وہ مجھ سے خوش کب تھے۔ ناراض ہی رہتے تھے۔ خدانخواستہ اللہ نہ کرے ناراض ہی چلے گئے مجھ سے تو میں کیا کروں گا۔ میں تو کہیں کا نہیں رہ جاؤں گا۔ میری دنیا برباد...... میری آخرت برباد...... میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟

یہ سوچ مجھے مار دینے کے لیے کافی تھی۔ یہ سوچ مجھے مار دیتی تھی۔ میں ڈر جاتا۔ دعائیں کرتا رہتا۔

پوری رات میں ابو کے قریب بیٹھا رہا تھا۔ انہیں دیکھتا رہا تھا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محسوس کرتے ہوئے روتے ہوئے دعائیں کرتے ہوئے خود کو یقین دلاتا رہا تھا۔

''آپ کو کچھ نہیں ہو گا ابو انشاء اللہ' آپ ٹھیک ہو جائیں گے......''

وہ رات اتنی بھاری تھی مجھ پر کہ وہ سات راتیں بھی کچھ نہیں تھیں جو اس ایک منحوس رات کے بعد میں نے گزاری تھیں۔

یہ رات اکیلی ہر رات پر بھاری تھی۔

بے بس کر دینے والی تھی۔

میں مارے بے بسی کے رو رو پڑا تھا۔

مجھے پتا نہیں فجر کیسے ہوئی البتہ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔ اطمینان کی سانس لی تھی۔ فجر میں نے وہیں پڑھی تھی اور اس دوران بھی میرا سارا دھیان ابو کی

طرف تھا۔ صبح ہی صبح بڑے بھائی۔ چھوٹے بھائی اور امی چلے آئے تھے۔ ان لوگوں کے پوچھنے پر میں نے مختصراً سب کچھ بتا دیا تھا۔ دوسرے اٹیک کا میں نے امی کے سامنے دانستہ بتانے سے گریز کیا تھا۔ خواہ مخواہ امی پریشان ہوتیں۔

''افنان تم اب گھر جاؤ۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ہو۔ تھوڑا آرام کر لو۔'' امی کے کہنے پر میں نے انہیں صاف منع کر دیا تھا۔

''آپ لوگ میری فکر مت کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

بہت ضد بحث کے بعد چھوٹے بھائی نے بالآخر کہا تھا۔ ''اچھا شام میں آئیں گے ہم۔''

میں مزید کچھ کہے سنے بغیر ایک بار پھر ابو کے پاس جا بیٹھا تھا۔

شام میں بڑے بھائی آئے تو انہوں نے کہا۔ ''افنان' جب میں گھر سے نکل رہا تھا تو بیرسٹر نادر آفتاب کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ افنان صاحب نے جو پیپرز تیار کروانے کے لیے کہے تھے' وہ تیار ہیں۔ تم نے کیسے پیپرز تیار کروانے کے لیے کہا تھا ان سے؟''

بڑے بھائی پوچھ رہے تھے اور میری آنکھوں میں نمی جم سی گئی تھی۔ پچھلی رات اور آج کا دن اتنی اذیت' تکلیف اور بے بسی کے عالم میں گزرا تھا کہ مجھے اس بات کا تو کیا' کسی بات کا ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ حالانکہ میں تو بڑے غصے سے' بڑی رعونت سے اس دن ابراہیم سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ اور کون روک لے گا مجھے......

اور اب میں یہ سوچ رہا تھا ہم کیا ہوتے ہیں اور ہمارے دعوے کیا ہوتے ہیں...... میں بھی یہ دعویٰ کرتے ہوئے یہ بات بھول گیا تھا کہ ایک Supreme Authority اوپر بیٹھی ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔

کوئی اور مجھے نہیں روکے گا تو وہ روک دینے پر قادر ہے۔

میں روک لیا جاؤں گا۔ میں روک دیا گیا تھا......

میں عرش سے فرش پر پھینک دیا گیا تھا......

مجھے میری اوقات یاد دلا دی گئی کہ بندے ہو بندے بن کے رہو۔ فرعون مت ہو...... فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔

میں اس لمحے کانپ کر رہ گیا تھا مجھے ایک دم بہت خوف آیا تھا اس کی ذات سے...... اور اس وقت میرا صرف سجدے میں گر کر توبہ کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بے حد و حساب رونے کو دل چاہ رہا تھا...... جب کہ...... بڑے بھائی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ

رہے تھے۔

"وہ کچھ آفیشل ٹائپ کے پیپرز تھے۔" بالآخر جب میں بولا تو آنسوؤں سے میری آواز بھاری ہو گئی۔ "اب انہیں منع کر دیجیے۔"

میں نے بمشکل کہا تھا پھر بڑے بھائی سے ابھی آتا ہوں کہہ کر میں بے تحاشا قریبی مسجد کی طرف بھاگا تھا۔ مسلسل اس کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے روتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ کیسا ہوتا ہے ناں...... ہم کتنی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ باتیں ہماری Surrounding میں موجود رہتی ہیں۔ ہمارے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت فضا میں رہتی ہے اور کبھی بھی کسی بھی موقع پر ہماری باتیں' ہمارے کہے ہوئے الفاظ ہمارے منہ پر زناٹے دار تھپڑ کی طرح ہمارے منہ پر پڑ جاتے ہیں......

میں بھی تو خلدون ابراہیم سے کہہ کر آیا تھا کہ ہم اپنی تدبیروں کے Failure کو اللہ تعالیٰ کی لکھی تقدیر کا نام دے دیتے ہیں......

میں اس بات کو کیا کہتا......

یہ میری تدبیر کا Failure تھی......

یا...... تقدیر کے سوا بھی کچھ اور تھی......

میں وہاں خاصی دیر تک اسی عالم میں رہنے کے بعد تبھی اٹھا تھا جب دل ذرا ہلکا ہوا تھا۔ میں واپس آیا تو خاندان بھر وہاں موجود تھا۔

اس رات بھی میں ابو کے ساتھ رکا تھا۔ اگلے دن ابو کی کنڈیشن اسی قدر بہتر ہوئی تھی کہ وہ خاصے خاصے لمبے عرصے بعد آنکھیں کھول کر سیکنڈ دو سیکنڈ تک سامنے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ابھی بھی وہ مکمل طور سے ہوش میں نہیں تھے۔ بہرحال اتنا ہی ہونے پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔

اسی دن چھوٹے بھائی سے مجھے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پڑی تھی۔ وہ مجھے گھر جانے اور خود رکنے کے لیے کہہ رہے تھے اور میں رکنے پر مصر تھا۔

"تم تو ایسے کر رہے ہو افنان' جیسے ابو کا خیال صرف تم کو ہے۔ مجھے اور بڑے بھائی کو تو ہے ہی نہیں۔"

چھوٹے بھائی غصے کے ہمیشہ سے تیز تھے اس وقت بھی انہوں نے بہت غصے سے کہا تھا اور میں ان سے کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ میں ان سے کہتا کیا میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ ہارے ہوئے بے بسی کے میری آنکھوں میں صرف آنسو آئے تھے۔

"سمعان' بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو۔ پریشان ہم سب ہیں۔ ہم سب کی پریشانی ایک برابر ہے۔" بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو جھاڑ دیا تھا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ نہیں میری پریشانی آپ سب کی پریشانی سے بڑھ کر ہے...... مگر میں بڑے بھائی سے کچھ کہہ نہ سکا۔

چھوٹے بھائی کا ایک دم موڈ آف ہو گیا تھا۔ "اسے کیوں نہیں سمجھاتے آپ۔" ناراضگی سے انہوں نے کہا۔ "ہمیشہ اپنی کرتا ہے۔"

"سمجھا رہا ہوں' تم تو منہ بند کرو اپنا۔" چھوٹے بھائی سے کہہ کر وہ میری طرف مڑے۔ "افنان' تم چلو گھر جاؤ' ہم یہاں ہیں۔"

بڑے بھائی کا انداز حکمیہ تھا اور خیر سے وہ مجھے حکم دے بھی سکتے تھے۔ میں نے خاصی بے بسی سے انہیں دیکھا تھا مگر ان کے چہرے پر اس قدر سختی اور انداز اتنا اٹل تھا کہ میں کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا اور چپ چاپ بے بسی کے عالم میں گھر چلا آیا۔ امی' بڑی بھابی' چھوٹی بھابی مجھے دیکھ کر مجھ سے ابو کی حالت پوچھتی رہیں۔ الماس بھی وہیں موجود تھی۔ میں غائب دماغی کے عالم میں انہیں سب بتاتا رہا۔ میرا دھیان تو وہیں اٹکا تھا۔

"تم کچھ کھا کر تھوڑا آرام کر لو افنان' کئی دن کے تھکے ہوئے ہو گے۔"

امی نے محبت سے کہا تھا اور میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ فرش پر بیٹھتے ہوئے میں نے صوفے کے ساتھ کمر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا۔ الماس اندر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

"افنان' کچھ کھا لو۔ پھر لیٹ جانا۔"

نرمی سے کہہ کر اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی تھی اور اب کی بار میں اس سے کہہ نہ سکا تھا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ شاید اتنا کچھ ہو جانے پر میرا دل نرم اور موم کی طرح پگھلا ہوا سا تھا۔

"تم نے ناحق تکلیف کی۔" میں نے بہت تکلف سے کہا۔

"اس میں تکلیف کیسی؟" وہ حیرانگی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے اب کی بار بھی بہت انسانیت سے مگر بے دلی سے اسے جواب دیا تھا۔

''ایسے کیسے کام چلے گا۔ صحت دیکھو تم اپنی۔'' اس نے تاسف سے کہا۔
''صحت کو کچھ نہیں ہوا میری۔'' میں نے لاتعلقی سے کہا۔
''تم اپنا خیال نہیں رکھو گے تو ابو کا کیسے رکھ سکو گے۔''
''تم بے فکر رہو میں مروں گا نہیں۔ میں تو جب نہیں مرا جب مر جانا چاہیے تھا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔
''ایسی بات مت کرو افنان۔'' اس نے دکھ سے کہا۔
''میرے نہ ہونے سے تم پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اپنے ماما سے کہنا کہ کسی ڈھنگ کے آدمی سے تمہاری شادی کرا دیں۔'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔
''تم سے ڈھنگ کا آدمی مجھے اور کہاں ملے گا افنان۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔
''تم بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' میں نے تلخ ہو کر کہا۔ ''میں خوب اچھی طرح سے جانتا ہوں میں کیسا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں' کسی اچھے سے آدمی سے شادی کر لینا۔''
''میرے خیال میں تم کو پتا نہیں ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔''
''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' بالکل ہوش وحواس میں کہہ رہا ہوں۔''
''پھر تم غالباً دنیا کے پہلے شوہر ہو گے جو اپنی بیوی سے اس قسم کی بات کر رہے ہو۔'' الماس نے طنز سے کہا۔
میں نے تب بہت عاجزی سے اس سے کہا تھا۔ ''الماس پلیز میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں مجھے مزید پریشان مت کرو۔''
الماس چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر کچھ کہے بغیر چلی گئی۔
مجھ سے زیادہ دیر مزید گھر میں رکا نہیں گیا۔ میں ایک بار پھر ہاسپٹل چلا آیا تھا۔
''ارے یار' تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔'' بڑے بھائی نے مجھے اتنی جلدی واپس دیکھ کر حیرانی سے پوچھا تھا۔
''مجھ سے گھر پر نہیں رکا جا رہا بڑے بھائی!'' میں نے بہت بے بسی سے ان سے کہا تھا۔
''ارے تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' بڑے بھائی حیرت زدہ تھے۔
''آپ نہیں جانتے بڑے بھائی!'' کہہ کر میں نے انہیں دوسرے اٹیک کے بارے میں بتایا تھا۔
''ہاں' یہ بات پتا تھی مجھے۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا تھا۔ ''میں تمہارے آنے

سے بہت پہلے ابو کی کنڈیشن کے بارے میں ڈاکٹرز سے ڈسکس کر چکا تھا۔''
''ڈاکٹر نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ تھرڈ اٹیک کڈ بی فیٹل (تیسرا اٹیک جان لیوا بھی ہو سکتا ہے)
''تیسرا اٹیک عموماً Fatal ہی ہوا کرتا ہے۔'' بڑے بھائی نے بے تاثر لہجے میں کہا۔
''تو پھر؟'' میں تکلیف کے عالم میں انہیں دیکھنے لگا۔
''تو پھر کچھ نہیں۔''
''کچھ نہیں؟''
''دیکھو افنان' ہماری دل سے دعا ہے کہ ابو کو کچھ نہ ہو۔ ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے اور اس کے لیے جو ہمارے بس میں ہو گا ہم کریں گے۔ چاہے دعا' چاہے دم درود' چاہے دوا۔ چاہے صدقہ خیرات مگر دیکھو تقدیر کے آگے آدمی بے بس ہے۔ یہ بات بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو ہم نہ چاہیں' وہ ہو جائے اور یہ بھی بالکل ضروری نہیں ہے جو ہم چاہیں' وہ ہو بھی جائے۔ تقدیر کا لکھا بہرحال ٹالا نہیں جا سکتا۔''
بڑے بھائی کہہ رہے تھے اور میں ساکت جامد سا ہو گیا تھا۔ یہاں پر بھی تقدیر آ گئی تھی۔
تو کیا لکھا تھا تقدیر میں......
اچھا ہونا لکھا تھا......
یا برا ہونا لکھا تھا......
آہ کیا بے بسی تھی......
کچھ پتا نہ تھا...... میں کچھ جانتا نہ تھا۔
ہائے کتنی تاریکی تھی' کتنا اندھیرا تھا' کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔
کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔
اف میرا دم گھٹنے لگا۔ نہیں...... نہیں اللہ نہ کرے جو برا ہو۔ اللہ نہ کرے جو ابو کو کچھ ہو۔ میں نے خوف کے مارے جھرجھری لی تھی۔ تکلیف کے مارے میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ آنسو آنکھوں میں جم سے گئے تھے۔
''بڑے بھائی' آپ لوگ پلیز جائیں' مجھے ابو کے پاس رہنے دیں۔'' میں نے بڑی عاجزی سے بڑے بھائی سے کہا تھا۔
''افنان گھر میں بھی تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری ابھی شادی ہوئی ہے۔ تم کچھ تو خیال کرو۔'' چھوٹے بھائی نے اب کی بار نرمی سے مجھے سمجھایا تھا۔

"چھوٹے بھائی میں خیال ہی کر رہا ہوں۔" میں نے بڑی رقت سے کہا تھا۔

"بڑے بھائی یہ اتنا پاگل کیوں ہے۔" چھوٹے بھائی کے لئے زیادہ دیر غصے پر قابو پانا مشکل ہی ہوتا تھا سو اس وقت بھی وہ بڑے بھائی سے قدرے غصے سے ہی کہہ رہے تھے۔

"اسے کچھ نہ کہو سمعان' یہ جیسا بھی ہے' ہمارا بھائی ہے۔" بڑے بھائی تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ "ہم چلتے ہیں پھر۔"

چھوٹے بھائی جاتے ہوئے بھی غصے میں لگ رہے تھے۔

"شام میں سب آئیں گے۔" بڑے بھائی نے چلتے چلتے کہا تھا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو کال کر دینا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" لاتعلقی سے کہہ کر میں ابو کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

اگلے نو دنوں تک ابو سی سی یو میں Semi-conscious state میں رہے تھے اور یہ نو دن میری زندگی کے بدترین دنوں میں سے تھے۔ ان نو دنوں میں مجھے آفس وافس سب بھول گیا تھا۔ مجھے تو اپنا آپ تک بھول گیا تھا۔ میرا کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا' سونا جاگنا' بولنا بات کرنا سب حرام ہو گیا تھا۔ ان نو دنوں کے دو سو سولہ گھنٹوں' بارہ ہزار نو سو ساٹھ منٹوں اور سات لاکھ ستتر ہزار چھ سو سیکنڈوں میں کا ہر وقت مسلسل تکلیف تھا۔ خوف تھا اور کچھ نہیں......

ان نو دنوں میں' میں نے کسی کو ابو کے پاس رکنے نہیں دیا تھا اور خود مسلسل ان کے ساتھ تھا۔ ان کے پاس تھا۔ پریشان تو ابو کے لیے گھر بھر تھا مگر میری پریشانی سب سے سوا تھی۔

ان نو دنوں میں' میں مستقل روتا رہا تھا۔ مسلسل توبہ کی تھی۔ میں نے بہت دعائیں کی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ ابو کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہوں۔ نہ میں ارادہ کرتا کہ الماس کو......

ان نو دنوں میں ابو کی یادداشت کا عجب عالم تھا۔ وہ پرانے پرانے قصے دہراتے۔ ذہن کے کونوں کھدروں میں دبی یادداشتیں کھنگالتے تھے۔

ان نو دنوں میں ابو دل دہلا دینے والی باتیں کرتے رہے تھے۔ وصیت لکھنے جانے کی' اثاثے تقسیم کرنے کی' جائیداد چھوڑنے کی...... مرنے کی...... قبر کی...... آخری وقت آنے کی...... قیامت کی......

میں ابو کی یہ باتیں سن کر لرز لرز جاتا تھا۔ میرے آنسو بے قابو ہو جاتے۔

"آپ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے ابو! آپ ٹھیک ہو جائیں بس آپ اچھے ہو جائیں۔" میں ہچکیوں کے درمیان کہتا ان کو تسلی اور خود کو حوصلے دیتا۔

ان نو دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑے بھائی ابو کے کس قدر قریب تھے بلکہ چھوٹے بھائی بھی ابو سے قریب تھے اور میں ان سے کتنا دور تھا۔

ان نو دنوں میں ابو مجھ کو کاشان' سمعان سمجھتے رہے تھے کاشان کو آواز دیتے رہے تھے۔

"کاشان کدھر ہے بھئی۔" پھر مجھے سامنے دیکھ کر کہتے۔ "ارے لو یہ سامنے ہی تو کھڑا ہے۔"

جب پہلی مرتبہ ابو نے مجھے کاشان سمجھ کر آواز دی تھی تو مجھے عظیم دھچکا لگا تھا۔ میں نے بڑی تکلیف سے سوچا تھا۔ کیا عجب بات ہے کہ کاشان یا سمعان جو ابو کے پاس نہیں تھے' وہ ان کو یاد تھے اور میں جو ان کے پاس تھا اس کو وہ پہچانتے نہ تھے۔

میں نے فوراً ان کی یہ کنڈیشن ڈاکٹر سے ڈسکس کی تھی۔ ڈاکٹر نے خاصی تسلی سے کہا تھا کہ یہ وقتی حالت ہے' کمپلیٹ ریکوری کے ساتھ ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس کے بعد جتنی بار بھی ابو مجھے کاشان یا سمعان سمجھ کر آواز دیتے تھے تو ہر بار مجھے اچھا لگتا۔ ہر بار میں خود کو بڑے حوصلے' بڑی تسلی سے سمجھاتا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اس بات سے چاہے وہ کاشان ہو' سمعان ہو یا افنان ہو' ہم ہیں تو ایک ہی۔ خود کو یہ سمجھانے کے باوجود میں آنکھوں اور گالوں کو گیلا کرنے والی نمی کو کسی طور قابو نہ کر پاتا۔

ان نو دنوں میں مارے خوف کے میں نے سونا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی اونگھ بھی میرے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی۔ کیونکہ اس دوران مجھے بہت برے برے خواب آتے تھے۔ خوف لاشعور میں ایسا بیٹھ گیا تھا کہ ہر منظر بدترین دکھائی دیتا۔ کبھی میں یہ دیکھتا کہ ابو کی آخری رسومات ادا کر رہا ہوں۔ کبھی ابو کو کفن میں لپٹا دیکھتا۔ کبھی ان کو غسل دیتے دیکھتا۔ کبھی جنازہ پڑھتے دیکھتا۔ کبھی جنازے کو کندھا دیتے دیکھتا۔ کبھی قبر میں اتارتے دیکھتا۔ نیند کے سے عالم میں بھی میں خود کو سسکتا پاتا۔ یہ کہتا پاتا۔ "نہیں' نہیں آپ مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ آپ مجھے اس تکلیف اس اذیت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ مجھ سے ناراض مت جائیں۔ مجھے معاف کر دیں۔" میں ہڑبڑا کر جاگ جاگ جاتا۔ گالوں کو گیلا پاتا' ہونٹوں پر سسکیاں پاتا۔

مارے خوف کے میں ابو کو چھو کر دیکھتا رہتا۔ ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کرتا رہتا۔ ابو کو پہروں تکتا رہتا۔ مسلسل جاگ جاگ کر میری حالت تباہ ہو

گئی تھی۔

ان تو دنوں میں، میں نے سی سی یو میں دو اموات دیکھی تھیں۔ ان دو اموات نے میرے خوف میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ پھر تو میں ابو کو لمحے بھر کے لیے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہ رہا تھا۔ ایسے جیسے میں نے انہیں آدھے لمحے کے لیے بھی اکیلا چھوڑ دیا تو پتا نہیں کیا سے کیا ہو جائے گا۔ جب بھی مجھے کسی ضروری کام سے ابو کے پاس سے ہٹنا پڑ جاتا تھا تو میرا دھیان ابو میں ہی اٹکا رہتا تھا۔ میں جلد از جلد کام نمٹا کر بھاگنے کی کرتا تھا۔

ان تو دنوں میں میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں ابو کو تقدیر سے چھین کر لے آؤں، قسمت کی برائی سے بچا کر لے جاؤں۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں ہر مسجد میں ہر نماز کے بعد ابو کی صحت یابی کے لیے دعائیں کروا دوں۔ اعلانات کروا دوں۔ میری نہ سہی کسی کی دعا تو لگے میرے باپ کو......

ان تو دنوں میں الماس کے والدین کئی بار ابو کو دیکھنے آئے تھے اور خلدون ابراہیم بھی بار بار دیکھنے آتے رہے تھے۔ خلدون ابراہیم کو دیکھ کر مجھے ان پر غصہ نہیں آتا تھا، نہ ہی انہیں دیکھ کر میں ان سے نفرت سے منہ پھیر لیتا تھا بلکہ مجھے انہیں دیکھ کر کسی قسم کا خیال نہیں آتا تھا۔ خلدون ابراہیم نے جبکہ ہر بار مجھے بہت تسلی دی تھی۔ باوجود اس کے کہ میں نے ان سے بہت بدتمیزی کی تھی۔

بالآخر ابو کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ڈاکٹر نے البتہ بہت ساری ہدایات دی تھیں۔ جن پر سختی سے عمل کروانا لازمی تھا اور یہ ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی تھی۔ ابو نے ریکور تو جلدی کر لیا تھا مگر بیماری کے After Effects خاصے دیرپا تھے۔ انہی نے ڈیڑھ مہینہ آرام سے کھینچ دیا تھا۔

ان ڈیڑھ مہینوں میں میرا ابو کے پاس سے ہلنے تک کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ الماس نے چھٹیاں میں نے شادی کے لیے لی بھی تھیں تو کینسل کرا دی تھیں مگر ابو کے لیے میں نے چھٹیاں لے لی تھیں۔ میں جانتا تھا واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہونے کی وجہ سے مجھ پر ذمہ داریاں ہیں۔ ایک مرتبہ اگر میں ان میں الجھ گیا تو الجھتا ہی چلا جاؤں گا اور وہی ہوا تھا۔ میں آفس کی ذمہ داریوں میں الجھتا جا رہا تھا اور الماس غیر محسوس طریقے سے ابو کی وہ ذمے داری جو میں نے لے رکھی تھی، وہ مجھ سے بڑی خاموشی سے لیتی جا رہی تھی۔

مجھے الماس سے حسد ہونے لگا تھا۔ اس نے میرے باپ پر قبضہ جما لیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ابو اس سے بہت خوش تھے۔ اس کی بہت سنتے تھے۔ وہ ایک بات جو میں [illegible]

رہا ہوتا تھا نہیں مانتے تھے مگر وہی بات اگر الماس ان سے کہتی تھی تو فوراً مان لیتے تھے۔

یہ سب دیکھ کر میں لاشعوری طور سے اور بھی کنارے ہوتا چلا گیا۔ اکثر مجھے الماس سے چڑ ہوتی۔ جو کام میں اس رات کے بعد تیرہ سال سات ماہ میں بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ الماس نے آ کر دو مہینے میں ہی کر دیا تھا۔ میں مانتا تھا اس بات کو۔ الماس کی ابو کے سلسلے میں خدمتوں کا مجھے اعتراف بھی تھا۔ پھر بھی الماس دل سے تسلیم نہیں تھی مجھے۔ اتنا وقت ساتھ گزارنے کے باوجود بھی ہم ایک دوسرے کے لیے اتنے ہی شناسا تھے کہ ایک ہی چھت تلے مسافروں کی طرح وقت گزارتے تھے اور بس...... مسافروں کی ہی طرح ہم میں کوئی بات ہو گئی تو ہو گئی ورنہ یہ نوبت بھی کم ہی آتی تھی۔ میں پہلے بھی الماس کی طرف سے لاتعلق تھا اور اب بھی میں اس کو Avoid کر رہا تھا۔

دن کے وقت آفس مجھے نعمت اور سائٹ بہت غنیمت لگتے تھے۔ یہ میرے لیے ایک واحد راہِ فرار بھی تھی جو الماس سے بھاگنے میں مجھے مدد دیتی تھی۔ ابو کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد میں نے وہی روش اختیار کر لی تھی۔ آٹھ بجے سے پہلے میں گھر واپس نہیں آتا تھا اور آٹھ بجے کے بعد بھی گھر آتے ہوئے میں بے بسی سے سوچتا تھا کہ میں مارتھا ایوانز کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے دور بھاگ سکتا تھا۔ میں مارتھا ایوانز سے بھاگ بھی جاتا تھا مگر میں الماس سے کہیں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر حال میں الماس کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مارتھا ایوانز سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا اور الماس سے میرا کیا رشتہ تھا مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔ مارتھا ایوانز کی طرح میں نے اسے کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پانچویں رات کے علاوہ میں نے اسے کوئی شکایت کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی۔ علاوہ ایک مرتبہ کے جب اس نے مجھے فجر کی نماز پر اٹھانے کے لیے کہا تھا۔ میں جانتا نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے کیسے وقت گزارتی ہے بہرحال رات میں تو وہ میری ہی طرح سے تھک کر مزدوروں کی طرح سے زمین پر گری ہوتی تھی۔

دن کا بیشتر وقت باہر گزارنے اور اتنا تھوڑا عرصہ گھر پر گزارنے کے باوجود بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک گھر بھر الماس سے بے حد متاثر ہے۔ مجھے اکثر حیرت بھی ہوتی تھی کہ الماس کے پاس آخر ایسا کون سا منتر ہے جو سب اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ مجھے اس میں کوئی خوبی نظر تو نہیں آتی تھی یا شاید میں دل سے

دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اب ذرا ذرا یہ بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ گھر بھر کو الماس سے ہمدردی بھی ہے۔ ابو کی بیماری کی وجہ سے سب کا دھیان ابو کی طرف چلا گیا تھا لیکن اب جبکہ ماشاء اللہ ابو مکمل طور سے صحت یاب تھے تو مجھے تھوڑا تھوڑا ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں ایسا وقت نہ آجائے جب میرے گھر والے ڈنڈے لے کر مجھ سے الماس کے سلسلے میں سوال جواب کرنے کھڑے ہو جائیں۔

مجھے اس طرح کے حساب کتاب سے نفرت تھی۔ میں اپنے گھر والوں کو ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا جس سے میرے پھنسنے کے پورے پورے امکانات ہوں۔ میرے گھر والوں کو پہلے بھی میرے جاب آورز پر اعتراض رہتا تھا اور اب یہ اعتراض مزید بڑھ گیا تھا اور تنگ آ کر مجھے یہ بہانہ بنانا ہی پڑا تھا کہ ڈیوٹی ٹائمز کے بعد میں آج کل کنسٹرکشن آرکیٹیکچر اور ڈیزائننگ کی طرف بھی توجہ دے رہا ہوں۔ شام میں اپنے دوست کے ساتھ ہوتا ہوں اور جب مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ ''کیا خلدون ابراہیم کے ساتھ۔'' تو اس بات پر میں نے خاموشی اختیار کی تھی۔

میں گھر پر رکتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ کام آخری مراحل میں چل رہا تھا۔ اسی لیے بھلا ہفتوں سے تو چھٹی والے دن بھی سائیٹ کی نذر ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہ ابو کے اسٹرکٹ آرڈرز تھے کہ چھٹی والا دن کوئی باہر نہیں گزارے گا اور سب گھر پر رہیں گے۔ میرا پاس سائیٹ پر کام چلنے اور میری موجودگی وہاں ضروری ہونے کا بہانہ بڑا اچھا تھا۔ کیونکہ اللہ کے شکر سے اور میری خوش قسمتی سے میرا عہدہ ہی کچھ ایسا تھا۔

☆======☆======☆

ہاسپٹل میں افنان عادل کا ایک نیا روپ میرے سامنے آیا۔ جب ابو CCU میں تھے تو گلاس ڈور کے اس پار ان کے پاس بیٹھے ہوئے کبھی ابو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کبھی ان کے ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے چومتے ہوئے کبھی آنکھوں سے لگاتے ہوئے میں نے افنان عادل کو اس اونچے لمبے مرد کو بااختیار آفیسر کو بچوں کی طرح باقاعدہ آنسوؤں سے روتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے خود اپنی کیفیت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اپنے جذبات پر اختیار نہیں ہوتا تھا۔

اور یہ سب دیکھتے ہوئے میں گھبرا کر بوکھلا کر وحشت کے عالم میں بہت گڑگڑا کر دعائیں کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ابو کو کچھ نہ ہو...... انہیں کچھ ہو گیا تو یہ تو میری کسی بات کا یقین ہی نہیں کرے گا۔ آخری وقت میں میری ابو سے بات ہوئی تھی۔ بتا اے

بتاؤں گی کہ وہ اس سے ناراض نہیں تھے۔ اس کو تو یقین ہی نہیں آئے گا۔ جانے والا چلا جائے گا حقیقت کا پتا صرف اسے تھا' مجھے تھا' یا اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ بے چارہ تو بے موت مر جائے گا۔ اس خیال سے کہ اس کا باپ اس سے ناراض ہی چلا گیا ہے۔

ان تو دنوں میں افنان عادل ایک بار بھی گھر نہیں آیا تھا۔ وہ کسی کو ہاسپٹل میں رکنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ چھوٹے بھائی تو اس بات پر خاصے غصے میں تھے۔ چھوٹے بھائی کو ذرہ برابر بھی پتا نہیں تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ میں جانتی تھی یا وہ خود جانتا تھا اور اللہ تعالیٰ......

اس دن افنان عادل آدھے گھنٹے کے لیے بھی پتا نہیں کس کے کہنے پر گھر آیا تھا تو اس کی حالت دیکھ کر میں ڈر سی گئی تھی۔ اپنے آپ سے بے پروا اپنے حلیے سے بے خبر۔ اپنی صحت سے بے فکر۔ غائب دماغی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اسے واقعی اپنا کچھ ہوش نہ تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس پر رحم بھی آیا مگر میری ہمت نہیں پڑی کہ اسے کوئی تسلی دے سکوں۔ پچھلی مرتبہ کا واقعہ مجھے بھولا نہیں تھا پھر بھی میں اس کی طرف سے لاپروائی اختیار نہیں کر سکی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اس کے لیے کھانے کی ٹرے لگائی اور جب کمرے میں آئی تو اسے زمین پر صوفے سے کمر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے دیکھ کر مجھے خاصی تکلیف ہوئی۔ میرا بے اختیار دل چاہا تھا کہ اس کی ساری پریشانیاں اپنے سر لے لوں' اسے ہر پریشانی سے آزاد کر دوں اور وہ بھی خلاف توقع میری باتوں کا بڑی نرمی سے انسانیت سے' بڑی تمیز سے جواب دے رہا تھا البتہ اس سے آخر میں ہونے والی گفتگو پر مجھے بہت غصہ بھی آیا تھا اور بہت افسوس بھی ہوا تھا۔ وہ دنیا کا عظیم ترین اور خوب صورت شوہر تھا جو اپنی بیوی کو یعنی مجھے کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا اور ابھی کوئی اور وقت ہوتا تو میرا ابھی دل چاہتا کہ تھپڑ مار کر اس کا جبڑا ہی توڑ دوں مگر اس وقت اس کی ذہنی حالت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ ابو کی وجہ سے وہ گہرے صدمے میں لگتا تھا بمشکل آدھے گھنٹے ہی وہ گھر میں رکا ہو گا پھر دوبارہ ہاسپٹل چلا گیا تھا۔

ان دنوں میں' میں پورے وقت گھر پر رہی تھی اور میں نے دیکھا تھا کہ صرف ایک ابو کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے گھر بھر تلپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر شخص پریشان تھا۔ ابو کی وہاں ہاسپٹل میں طبیعت خراب تھی۔ امی کی گھر میں طبیعت خراب تھی۔ بڑے بھائی گھر کے اندر' گھر کے باہر کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے علاوہ ہاسپٹل میں بھی ابو کو کسی طور

کلی طور سے افنان کے اوپر چھوڑ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چھوٹے بھائی کو ان کی کمپنی والے کچھ دنوں کے لیے چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ نتیجتاً ان کا ایک پیر آفس میں دوسرا ہاسپٹل میں ہوتا تھا۔ بڑی بھابی، چھوٹی بھابی، کچن، گھر، بچوں کی ذمہ داریاں جو وہ بہت ٹینشن فری ماحول میں پوری کرتی تھیں اب Under stress پوری کر رہی تھیں۔ ہاسپٹل آنا جانا، امی کو تسلیاں دینا، ان کی تیمارداری کرنا اس کے علاوہ تھا۔

اور میں بڑی بھابی، چھوٹی بھابی کے ساتھ ان کی ذمہ داریاں آہستہ آہستہ شیئر کرتی جا رہی تھی۔ امی اکثر مجھے بہت تاسف سے دیکھتیں۔

''بہو ابھی تو تمہاری مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی۔ ابھی تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔''

اور میں ان کو تسلی دیتی۔ ''تو کیا ہوا امی، اچھے دنوں میں تو ہر کوئی ساتھ دیتا ہے۔ کوئی آڑے وقتوں میں کسی کا کتنا ساتھ دیتا ہے۔ پتا تو تب چلتا ہے اور میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔'' امی فقط آہ بھر کر رہ جاتیں۔

بڑی بھابی، چھوٹی بھابی مجھ سے کوئی بھی کام کہتے کہتے بہت مرتبہ جھجکتی تھیں۔

''جواہر میں نے اور صفیہ نے تو سوچا تھا......'' بڑی بھابی اس دن بہت تاسف سے کہتے کہتے رک گئی تھیں۔

''کوئی بات نہیں بڑی بھابی!'' میں نے خندہ پیشانی سے کہا تھا۔ ''ضروری نہیں جو آدمی سوچے وہ ہو بھی جائے۔''

بڑی بھابی صرف گہری سانس لے کر رہ گئی تھیں۔

بالآخر ابو ہاسپٹل سے گھر آگئے تھے اور ان کے گھر آجانے پر سبھی گھر والوں نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ ابو کے گھر آتے ہی افنان نے ان کی دیکھ بھال اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور تمام دیگر لوگوں یعنی امی، بڑے بھائی، چھوٹے بھائی کو ابو کی Care سے بری کر دیا تھا۔ ابو کو دواؤں کی پابندی کروانا، کھانے میں احتیاط کروانا، واک کی پابندی کروانا غرض ابو کا ہر چھوٹا بڑا کام افنان نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ آفس سے بھی مستقل چھٹی لے کر گھر بیٹھ جائے۔ وہ ایسا یقیناً کر بھی لیتا مگر گھر پر بھی اس کے فون آتے رہتے تھے۔ دن کے بیشتر وقت موبائل اس کے کان سے چپکا رہتا۔ اکثر وہ فون پر ہی اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے دیتا تھا۔ بیشتر اسے خود جانا پڑ جاتا تھا اور جب وہ کسی سے یہ کہتا تھا۔ اچھا میں آ رہا ہوں تو ایسے میں اس کی شکل دیکھنے والی [illegible]

صاف پتا چل جاتا تھا کہ یہ جبر و اکراہ ایسا ہے۔ یہی دیکھ کر آہستہ آہستہ میں یہ کرنے لگی تھی کہ ابو کے بیشتر کام اس کے کرنے سے پہلے ہی کر دیتی تھی اور تب مجھے بڑا مزا آتا تھا۔ جب وہ ابو سے کسی کام کو پوچھتا اور ابو کہتے۔ ''ہاں یہ تو ہو بھی گیا۔ ابھی بہو نے ہی تو کیا......''

وہ بس سرسری سی نگاہ مجھ پر پھینک کر رہ جاتا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا مگر کبھی کبھی اس کی نگاہ میں ممنونیت بھی ہوتی تھی۔ میرے لیے فی الحال اس کا اس طرح دیکھ لینا ہی بہت غنیمت تھا۔ اب تو واک وغیرہ پر بھی میں ہی ابو کو لے جانے لگی تھی۔ ابو بھی میرے بہت عادی ہو گئے تھے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ابو مجھے آوازیں دیتے۔ بالکل ویسے ہی جیسے میرے ابو دیتے تھے۔ مجھے بھی ان کا کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ اکثر مجھے اپنے ابو اور افنان عادل کے ابو میں کوئی فرق نہیں لگتا تھا۔

ایک دن افنان کے ابو نے مجھ سے کہا تھا۔ ''میری کوئی بیٹی نہیں ہے اگر ہوتی تو بالکل تمہاری طرح ہوتی۔'' پھر ایک دم وہ چپ سے ہو گئے۔ ''لیکن اگر وہ میری بیٹی ہوتی تو افنان کی دلہن کیسے بنتی۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''خیر چلو جو ہوا اچھا ہوا۔ تم میری بہو ہو مگر میں تو تم کو بیٹی ہی سمجھتا ہوں۔''

''میں آپ کی بیٹی ہی ہوں ابو!'' میں نے آہستگی سے انہیں یقین دلایا۔ ان کا ہاتھ بے اختیار میرے سر پر ٹھہر گیا۔

ابو تیزی سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ اس کی وجہ کافی حد تک وہ Restrictions بھی تھیں جو افنان نے ان پر لگا رکھی تھیں۔ ان کے نہ کرنے والے کاموں کی لمبی فہرست وہ جاری کر دیتا تھا۔ مسلسل علاج اور توجہ کی وجہ سے صحت میں خاصی حد تک بہتری آجانے کے بعد اب ابو گھر میں رہتے رہتے اکتا سے گئے تھے۔ مجھ سے خاصی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ وہ اب آفس جوائن کرلینا چاہتے ہیں۔ میں ہر بار خاموش ہو جاتی کیونکہ ظاہر ہے یہ افنان عادل کے فیصلے تھے اور اس معاملے میں، میں کچھ بولتی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے ایک دو مرتبہ انہوں نے افنان کے سامنے بھی کہہ دیا تھا اس نے بھی سن کر ادھر اُدھر کر دیا تھا۔ اس دن بھی وہ بہت برے موڈ میں افنان کی موجودگی میں ہی مجھ سے کہنے لگے۔

''تم لوگوں نے تو مجھے سچ مچ کا مریض بنا کر بستر پر ڈال دیا ہے۔ میں تھک گیا ہوں گھر میں پڑے پڑے۔''

میں ان کی بات سن کر چپ ہو رہی۔ افنان نے بھی کچھ نہیں کہا۔

''ارے میں تم لوگوں ہی سے کچھ کہہ رہا ہوں۔'' اپنی بات کو Unnoticed جاتا دیکھ کر انہوں نے دہاڑ کر کہا تھا۔

''ابو! آہستہ' غصہ آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔'' بالآخر افنان کو کہنا ہی پڑا تھا۔

''بھاڑ میں گئی میری صحت۔'' انہوں نے بھنا کر کہا۔ ''اب کل کو مجھے تم سے یہ بھی سننا پڑے گا کہ آپ چلنا پھرنا بھی چھوڑ دیں۔''

''آپ کو چلنے پھرنے سے منع کس نے کیا ہے۔ چلیے پھریے مگر حد میں رہ کر۔'' افنان نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

''ارے تو آخر ایسا کیا ہو گیا ہے مجھے۔ ذرا ایک ہارٹ اٹیک ہی تو ہوا تھا۔ اب تو سب ٹھیک ہے۔'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

''وہ صرف ایک ہارٹ اٹیک نہیں تھا بلکہ میرے لیے......'' افنان کہتے کہتے رک گیا تھا پھر اس نے نرمی سے کہتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''آپ تھوڑے دن اور آرام کر لیجیے۔''

''ارے تو اور کتنا آرام کروں آخر' گھر میں مصروف رہنے کا بہانہ بھی تو ہو۔ وہ تو اس بچی کا دم غنیمت ہے۔''

انہوں نے ایک دم میری طرف اشارہ کیا۔ افنان عادل نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ میں اپنی جگہ خفیف سی ہو گئی۔

''ورنہ تو مجھے آفس بھی نہیں جانے دیا جا رہا۔ دیکھنا کسی دن میں ایسا کروں گا کہ کسی کو بغیر بتائے گھر سے نکل جاؤں گا۔'' ابو نے مزید کہا تھا۔

''آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔'' افنان کے لہجے میں سختی آ گئی۔

''مجھے کچھ بھی کرنے کے لیے تمہاری اجازت یا تمہاری مرضی درکار نہیں ہے۔'' انہوں نے اس بار قدرے جھنجلا کر کہا۔ افنان عادل بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''ابو! ٹھیک تو ہے۔'' اب کی بار میں خاموش نہیں رہ سکی۔ ''اور آپ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ .Prevention is better than cure آپ آفس جائیں گے جاب کی علیحدہ سے اپنی ٹینشن ہوتی ہے۔ پھر آپ کا تو Designation اور پوسٹ بھی ایسی ہے اس وقت آپ تھوڑی احتیاط کر لیجیے۔''

میرے کہنے پر ابو نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ افنان نے بڑی حیرت سے

دیکھا تھا اور حیرت تو مجھے بھی تھی کہ وہ اس کی سن نہیں رہے تھے۔ میری مان بھی لی تھی۔ دو تین مرتبہ اور اسی طرح ہوا تھا کہ افنان نے جس بات کو کہا تھا انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ میری سنی بھی تھی اور مانی بھی تھی اور جہاں تک میں افنان کے ابو کی Nature کو سمجھ پائی تھی تو وہ ایسی تھی کہ ابو جس سے خوش ہوتے تو اس قدر خوش ہوتے کہ اسے ساتویں آسمان سے بھی اوپر بٹھا دیتے۔ اس کی بڑی سے بڑی خامی بھی نظر انداز کر دیتے مگر ایک مرتبہ کسی سے ناخوش ہو جاتے تو اس کو زمین کی ساتویں پرت میں دھکیل دیتے پھر اس کی کوئی خوبی بھی ابو کو نظر نہیں آتی تھی۔ ایسے لوگ بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ کوئی بھی ایک واقعہ آدمی کو ان کی نظر سے گرا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے اور ایک بار گر کر اٹھنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔

افنان عادل کے ساتھ یہی واقعہ ہوا تھا۔ ہر بار جب افنان عادل کے سامنے ابو میری بات رکھتے تھے تو میں سمجھ جاتی تھی۔ افنان یقیناً چڑ گیا ہوگا' اس کے چہرے سے پتا چل جاتا تھا کہ اسے برا لگا ہے' تاہم وہ کچھ کہتا نہیں تھا اور اس کے بعد تو اس نے جب یہ دیکھ لیا تھا تو ابو اور میرے بیچ میں بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

وہ تقریباً ابو کی فکر سے آزاد ہی ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر وہ آفس اور سائٹ میں مصروف ہو گیا تھا اور پرانی روش اختیار کر لی تھی۔ ہاں آخر کو وہ ایک ایمان دار اور ذمہ دار افسر جو تھا۔ مگر مجھے جہاں تک سمجھ میں آتا تھا تو یہ کوئی اور معاملہ بھی تھا۔

افنان اب ابو کو اپنی مصروفیات کے باعث زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا جبکہ میں اب گھر کی ذمہ داریوں کے باعث ابو کو دینے کے لیے باقاعدہ وقت نکالتی تھی۔ میں نے بڑی بھابی چھوٹی بھابی کے ساتھ ان کی ذمہ داریاں شیئر کرنی کیا شروع کی تھیں کہ اب میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی جو مجھ سے کسی بھی کام کو کہتے ہوئے سو مرتبہ جھجکتی تھیں' اب بلا تکلف کوئی بھی کام کہہ کر ایک طرف ہو جاتیں۔ میں بھی کسی کام سے انکار نہیں کرتی تھی۔ اس گھر میں کرنے والے کام بہت تھے اکثر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ نرالا گھر ہے۔ چار چار بڑے عہدے والے آفیسروں والے اس گھر میں ایک بھی ملازم نہیں ہے حالانکہ یہ لوگ بڑے آرام سے ملازم افورڈ کر سکتے تھے۔ یہ بات میں نے بڑی بھابی سے کہی بھی تھی۔ بڑی بھابی نے آرام سے کہا تھا۔ ''کاشان نے تو یہ بات پہلے ہی دن مجھے بتا دی تھی کہ یہاں میرے گھر میں سب کچھ خود ہی کرنا پڑے گا۔ امی نوکروں پر اعتماد نہیں کرتیں۔''

اور مجھے یاد آ گیا تھا۔ افنان عادل کئی سال پہلے یہ بات مجھے بتا چکا تھا۔ میں نے پھر کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کیا' سو میں اب ایک ذمہ دار بہو تھی۔ تابعدار دیورانی تھی اور خیال رکھنے والی چچی تھی۔ بڑے مجھ سے خوش تھے' بچے مجھ سے مانوس تھے۔ اسی چکر میں یکے بعد دیگرے مجھ پر ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں اور میں چپ کر کے انہیں اپنے اوپر لیتی جا رہی تھی۔

مجھے افنان عادل کے گھر والوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ ذمہ داریوں کی صورت مصروفیت میرے لیے نعمت تھی۔ ورنہ ذرا بھی ذہن آزاد ہونے پر افنان عادل کے رویے کی وجہ سے میں مستقل جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا تو دور کی بات' میری طرف دیکھتا تک نہیں تھا۔ میں نے کئی بار اسے فجر کی نماز کے لیے اٹھتا دیکھا تھا۔ اس سے یہ تک نہیں ہوتا تھا کہ مجھے بھی نماز کے لیے آواز ہی دے دیا کرے۔ اس کے جانے کے بعد میں خود ہی اٹھ جاتی تھی۔ ایک دن مجھ سے ضبط نہیں ہو سکا اور عین اس وقت جب کہ وہ وضو کر کے نکل ہی رہا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا۔

''تم روزانہ فجر کے لیے اٹھتے ہو' مجھے بھی اٹھا دیا کرو۔''

اس نے جواباً بڑے استعجاب سے مجھے دیکھا تھا۔ ''تم نماز پڑھتی ہو؟''

اس سوال پر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا۔ دل چاہا تھا' نمکین اور کرارا سا جواب دوں مگر صبح ہی صبح میں کوئی بدمزگی چاہتی نہیں تھی لہٰذا بہت خفگی سے الٹا میں نے اس سے سوال کیا تھا۔

''کیوں؟ کیا میں عیسائی ہوں' یا ہندو ہوں اور مسلمان نہیں ہوں؟''

اس پر وہ قدرے شرمندہ نظر آنے لگا۔ ''نہیں' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ابھی تم اٹھ گئی ہو تو نماز پڑھ لو۔ آئندہ میں اٹھا دیا کروں گا۔''

اس دن کے بعد سے وہ مجھے ایسے اٹھاتا تھا' ''الماس' میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ تم بھی اٹھ جاؤ اور نماز پڑھ لو۔''

میں اٹھ تو اس کی ایک آواز پر ہی جاتی تھی مگر اس طریقے اور اس انداز پر میری جان ضرور جلتی تھی۔

میں گھر بھر کے کام کیا کرتی تھی اور وہ اپنے کسی بھی کام کو مجھے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا تھا اور ایک رات جبکہ وہ اپنے کپڑوں پر استری کر رہا تھا تو میں نے اس سے کہا بھی تھا۔

''افنان! تم مجھے اپنی بیوی نہیں سمجھتے تو کم سے کم ملازمہ ہی سمجھ لیا کرو۔''

افنان عادل ہاتھ روک کر مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں ملازمہ کیسے سمجھ سکتا ہوں جب کہ میرے گھر والے تم کو میری بیوی بنا کر اس گھر میں لائے ہیں۔''

افنان عادل کی اس بات پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ شکر ہے اس کو یہ تو تسلیم تھا کہ وہ نہ سہی مگر اس کے گھر والے تو مجھے اس گھر میں اس کی بیوی بنا کر لائے تھے۔

''تو پھر تم مجھ کو اپنے کسی کام کو ہاتھ کیوں نہیں لگانے دیتے؟''

''مجھے شروع سے اپنا ہر کام خود کرنے کی عادت ہے۔ یہ بات بہت پہلے سے جانتی ہو تم۔''

''ہاں میں جانتی ہوں اور مجھے حیرت ہے تم اتنے بڑے آفیسر ہو......''

افنان عادل نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔ ''آفیسر میں آفس میں ہوں۔ یہاں اس گھر میں' میں گھر کا ایک فرد ہوں اور بحیثیت فرد مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ مجھے اپنے کام خود کر کے کبھی شرمندگی نہیں ہوتی۔''

''مگر مجھے تو ہوتی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے......'' اس نے اس بار بھی مجھے اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔

''آدمی کو ایسی عادتیں ڈالنی ہی نہیں چاہئیں جس سے اسے بعد میں پریشانی اٹھانی پڑے۔ میں بھی اپنی عادتیں بگاڑنا نہیں چاہتا۔''

افنان عادل کے اس دوٹوک انداز پر میں چپ ہو گئی تھی۔ اس سے مزید بحث نہیں کر سکی۔

اس دن کے بعد سے میں ہر رات اسے اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتا دیکھتی۔ کپڑوں پر استری کرنا' جوتے پالش کرنا' رومال' موزے نکالنا حتیٰ کہ آفس سے واپسی پر کپڑے دھونا بھی' اپنے کپڑوں کے معاملے میں افنان عادل خبطی تھا' بلا کا جامہ زیب' خوش لباس' کلاسیکل سوٹنگ کیا کرتا تھا۔ بے انتہا سادے کپڑے پہنتا مگر اس کا میچنگ سینس بہت اعلیٰ تھا۔ ہر لباس اس پر جچ جاتا تھا۔ نفاست اس پر ختم تھی۔ اپنے کپڑوں پر جما جما کر استری کرنے میں اسے اگر گھنٹہ بھر بھی لگتا تو وہ لگا دیتا تھا۔ ظاہری بات ہے پھر ایسے لوگوں کو کسی دوسرے کے ہاتھ کا کیا ہوا کام پسند آ بھی کیسے سکتا تھا۔ افنان عادل نے ممکن ہے اسی وجہ سے مجھے منع کر دیا ہو۔

ہر صبح میں افنان عادل کو بڑی نک سک سے تیار ہوتا دیکھتی تھی۔ ویسے تو وہ ہر

حالت میں شاندار لگتا تھا مگر آفس جاتے ہوئے اس کی تیاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور رات میں اس کی واپسی اسی حالت میں ہوتی تھی جس حالت میں وہ صبح روانہ ہوتا تھا۔ پرفیومز کا استعمال کرتے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف آفٹر شیو لوشن استعمال کرتا تھا اور اس کی دھیمی مسحور کن مخصوص خوشبو پاگل کر دینے والی ہوتی تھی۔ اس کے جانے کا پتہ دیتی تھی کہ ہاں افنان عادل ابھی یہاں سے گیا ہے اور اس کے آنے کا بتاتی تھی کہ ہاں اب وہ کمرے میں آچکا ہے۔ واپسی پر بھی اس کا لباس اتنا ہی بے شکن اور بے داغ ہوتا تھا۔ جتنا صبح ہوتا تھا۔ میں نے اسے کبھی ٹائی لگائے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور قمیض کی فل سلیوز ہمیشہ فولڈ کی ہوئی دیکھی تھیں۔ ایک دن جب کہ وہ اپنی سلیوز فولڈ کر رہا تھا تو میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا۔

"جب تم کو سلیوز فولڈ ہی کرنی ہوتی ہیں افنان‘ تو ہاف سلیوز والی شرٹ کیوں نہیں پہن لیتے؟"

ایک لمحے کو اس کا ہاتھ تھم سا گیا۔

"میں نے کبھی غور نہیں کیا اس بات پر۔"

دھیمے لہجے میں کہہ کر اس نے سلیوز فولڈ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور کف کے بٹن بند کر لیے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی تھی پتا نہیں کس دھن میں اس نے میری بات کو Consider کر لیا تھا۔

اس دن صبح میں اسے تیار ہوتا دیکھ کر ناشتے کی تیاریاں دیکھنے چلی گئی۔ صبح ناشتہ بنانے کی ذمہ داری چھوٹی بھابی کی تھی ابو کی طبیعت کی خرابی کے باعث گھر میں سناٹے رہتے تھے مگر ابو کی صحت یابی کے ساتھ ہی رونقیں بحال ہو گئی تھیں۔ ناشتے کی تیاری کے دوران بڑے مزے مزے کے تماشے دیکھنے کو ملتے۔ چھوٹی بھابی کا ایک پیر کچن میں اور ایک اپنے کمرے میں ہوتا تھا۔ چھوٹے بھائی ذرا ذرا سی بات کے لیے بھابی کو آوازیں دیتے اور وہ کچن سے ہی ان کی آوازوں کے جوابات دیتیں۔ اس دن بھی چھوٹے بھائی کی پکار پر وہ کچن ہی سے آوازیں لگا رہی تھیں۔

"والٹ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں‘ رومال پینٹ کی جیب میں‘ موزے الماری کی نچلی دراز میں‘ گاڑی کی چابی ڈریسنگ ٹیبل پر۔"

پھر بھی چھوٹے بھائی ہر پانچ منٹ بعد کچن کے دروازے پر آن موجود ہوتے اور

"نہیں ملا۔" [illegible] مصنوعیت سے وہ کہتے۔

"اب کیا نہیں ملا؟" چھوٹی بھابی پیشانی پر ہاتھ مار کر پوچھتیں۔

"آؤ...... تو بتاؤں۔"

چھوٹے بھائی کی وہ مسکراہٹ مجھے بڑی اچھی لگتی تھی جو بھابی کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر آتی تھی۔ دل چاہتا تھا انہیں بس دیکھتی رہوں۔ اس وقت بھی میں انہیں ہی دیکھ رہی تھی اور مجھے اس طرح انہیں دیکھتے ہوئے احساس ہو رہا تھا کہ افنان عادل اور ان کی شکل میں حیرت انگیز طور سے بڑی مشابہت تھی۔ مگر مزاج دونوں کا مختلف تھا۔ چھوٹے بھائی ذرا موڈی آدمی تھے۔ ان کے ہر انداز میں شرارت اور شوخی ہوتی تھی ابو کی پریشانی کی وجہ سے ہنسنا مسکرانا بھول گئے تھے۔ اب ان کی طبیعت کی شوخیاں واپس آ گئی تھیں اور اس وقت تو خیر وہ تھے بھی چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں......

بھابی مصروف سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ "دیکھیے اگر ناشتہ کیے بغیر آفس جانے کا پروگرام ہے تو مجھے ابھی بتا دیجیے۔"

"بھئی جواہر! میں تو ان سے کہہ رہا تھا کہ ریحان کو ناشتہ نہیں ملا۔" انہوں نے مسلسل مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر کہا۔

اچانک مخاطب کیے جانے پر میں بھی کچھ بڑبڑا سی گئی تھی سرعت سے میں نے نظریں جھکا کر بمشکل جی کہا اور یہ بھی شکر تھا کہ چھوٹی بھابی مصروف ہی تھیں۔ میں خود کو ملامت کر رہی تھی۔ توبہ ہے ایسی بھی کیا بے خودی جب کہ چھوٹی بھابی کہہ رہی تھیں۔

"ریحان کے والد صاحب کو ناشتہ مل جائے گا تو ریحان کو بھی ناشتہ مل جائے گا۔"

"اچھا مت آؤ۔" چھوٹے بھائی قدرے ناراضگی سے کہہ کر پلٹ گئے تھے۔

"اف! آتی ہوں۔" چھوٹی بھابی نے فوراً ان کے پیچھے بھاگنے کی کی تھی۔ "جواہر ذرا دودھ کا دھیان رکھنا‘ ابل نہ جائے۔ میں ابھی آئی۔"

جاتے جاتے بھی وہ ہدایات دینا نہیں بھولی تھیں۔ میں چپ چاپ چولہے پر چڑھی پتیلی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"اف میں ناشتہ بنانے کی ڈیوٹی سے دست بردار ہونے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" واپس آ کر انہوں نے اعلان کیا تھا۔ "ساری تیاری رات کو کر کے رکھتی ہوں۔ صبح بچوں کی طرح بہت تنگ کرتے ہیں۔" ان کے ہونٹوں پر بڑی جاذب نظر مسکراہٹ تھی۔ "اب دیکھو میرے آنے سے پہلے بھی تو اپنے سارے کام یہ خود کرتے تھے۔" انہوں نے گویا شکایت کی تھی۔

''اب میں سدھر گیا ہوں۔'' چھوٹے بھائی نے نہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر فوراً کہا تھا۔

''بالکل غلط' اب آپ بگڑ گئے ہیں۔'' بھابی نے اصرار کیا۔

''چلو بھی سہی' ایسی بگاڑ تو اچھی لگتی ہے۔'' چھوٹے بھائی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھے۔

میں نے دونوں کی نوک جھونک بڑے رشک اور حسرت سے دیکھی تھی۔ تب میں لاشعوری طور سے افنان عادل اور چھوٹے بھائی کا موازنہ کرنے لگی۔ دونوں بھائیوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ چھوٹے بھائی کے ہر انداز سے چھلکتا تھا کہ وہ چھوٹی بھابی کے لیے کس قدر کیئرنگ ہیں اور ایک افنان عادل تھا اس کو تو پتا بھی نہیں ہو گا کہ کیئر کی اسپیلنگ کیا ہے اگر بالفرض کیئر کی اسپیلنگ پتہ بھی ہو گی تو اس کے معنی اس کو پتا نہیں ہوں گے۔ چھوٹے بھائی کا مزاج بڑے بھائی سے بھی مختلف تھا۔ بڑے بھائی بھی بڑی بھابی کے لیے کیئرنگ تھے۔ لوگ بھی ہوں گے مگر ان کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا۔ بڑے بھائی اور بھابی کے درمیان جو کچھ بھی تھا' کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا اور چھوٹے بھائی کی چھوٹی بھابی کے لیے بے تابیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ اس وقت بھی دونوں آپس کی گفتگو میں ایسے مگن تھے کہ انہیں یہ بھی خیال نہیں تھا کہ کوئی تیسرا بھی وہاں موجود ہے اور مجھے وہاں اپنا وجود ایک دم بے کار اور فالتو سا لگا۔

مجھے ایک دم چھوٹی بھابی پر رشک سا آیا۔ غیر ارادی طور سے میں ان کا اور اپنا موازنہ کرنے لگی۔ بہت سارے احساسات ایک دم ہی مزاج پر حملہ آور ہو گئے (اکثر ہو ہی جاتے تھے) بے زاری جھنجلاہٹ اور چڑچڑاہٹ بھی...... اور اس وقت مجھے شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ نہایت جل بھن کر اور بدمزا ہی ہو کر میں واپس کمرے میں آئی افنان عادل سے یہ کہنے کہ ''تیار ہو چکے ہو تو ناشتہ تیار ہے۔'' مگر اندر آ کر میں نے دیکھا افنان عادل ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھا ایک ہاتھ میں شرٹ اور دوسرے میں سوئی دھاگہ لیے پریشان نظروں سے دونوں چیزوں کو تک رہا تھا۔ یہ وہی شرٹ تھی جو کل رات اس نے پہننے کے لیے استری کی تھی۔ اس وقت اس نے کاٹن کی پینٹ کے ساتھ ہاف سلیوز والا بنیان پہن رکھا تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں دیکھا تو چہرے پر سرخی آ گئی۔ تیزی سے بیڈ شیٹ کھینچ کر اس نے خود پر لپیٹی۔

مجھے اس کی یہ حرکت دیکھ کر ہنسی آنے لگی جسے میں نے بڑی مشکل سے روکا

کر اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا افنان؟''

اس نے ایک دم شرٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور ہکلانے لگا۔ ''کک...... کچھ ن...... نہیں......''

سوئی دھاگہ ہاتھ سے گر گیا جسے برق رفتاری سے اس نے جھک کر اٹھایا۔ میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے قمیض کھینچ لی۔

''کیا ہوا اسے؟'' سرسری سے انداز میں' میں نے پوچھا۔

''وہ...... یہ...... میں...... پہننے لگا تو...... آستین کی...... سلائی نکل گئی......'' اٹک اٹک کر اس نے شرمندگی سے بتایا۔

''لاؤ میں سی دوں۔''

سوئی دھاگے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہچکچا رہا تھا اس لیے مجھے نہیں دیا۔ میں نے خود ہی اس کے ہاتھ سے سوئی دھاگہ لے لیا۔ دھاگا دیکھا تو سیاہ تھا شرٹ پنک تھی اور اس پر کاہی رنگ کے چیک بنے تھے۔

''یہ تو نہیں چلے گا۔ ہلکے رنگ کی شرٹ ہے تمہاری' سیاہ دھاگا نظر آئے گا تو برا لگے گا۔ ٹھہرو میں پنک کلر کا دھاگا لے کر آتی ہوں۔''

''بہت ٹائم لگ جائے گا۔ مجھے آٹھ بجے تک پہنچنا ہے۔'' اس نے بے بسی سے بتایا۔ ''اسی سے سی دو۔''

''زیادہ دیر نہیں لگے گی' صرف دو منٹ۔''

پنک دھاگا لے کر میں بجلی کی سی رفتار سے کمرے میں واپس آئی' افنان عادل سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھے آتا دیکھا تو سیدھا ہو بیٹھا۔

''میں دوسرے کپڑے استری کر لیتا مگر اس میں گھنٹہ بھر تو لگے گا مجھے۔ دیر ہو جائے گی۔'' وہ خود ہی بتا رہا تھا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ''اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی افنان۔'' جلدی جلدی سیتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا۔

''اصل میں اس پینٹ کے ساتھ پہننے کے لیے میرے پاس دو ہی شرٹس ہیں۔ ایک یہ دوسری پر کل میں نے آدھی استری کر لی تو پتا چلا کہ اس کی جیب ادھڑ رہی ہے اور آج یہ......'' وہ روہانسا ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''حالانکہ میں اپنے کپڑوں کو بہت احتیاط اور نفاست سے رکھتا ہوں اور یہ شرٹ تو میں نے زیادہ پہنی بھی نہیں ہے پھر بھی......''

آج افنان عادل خود ہی بولنے پر آمادہ تھا اور اب مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں افنان' ہو جاتا ہے کبھی کبھی.....'' میں نے رسانیت سے کہا۔

''ویسے اس پینٹ کے ساتھ تم وہائٹ شرٹ بھی پہن سکتے تھے۔''

''مجھے پاکستان کا جھنڈا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس وقت خاص طور سے جب چودہ اگست بھی نہ ہو۔'' اس نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

''اس کے ساتھ لائٹ گرین شرٹ بھی اچھی لگتی۔''

''وہ میں نے کل ہی تو دھو کر ڈالی ہے۔ بلیک پینٹ کے ساتھ پہنی تھی۔''

اس کے کہنے پر میں نے اس کو مزید کوئی Suggestion نہیں دی اور میں Suggestion دے کس کو رہی تھی جو خود لباس کے معاملے میں اعلیٰ ذوق اور سمجھ رکھتا تھا جب کہ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مجھے سینا نہیں آتا۔ آتا ہوتا تو تمہیں تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔''

میری مسکراہٹ بے اختیار تھی۔

''مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے۔ شکر ہے تمہیں کچھ تو نہیں آتا اور مجھے تمہارا کام کرتے ہوئے تکلیف بالکل نہیں ہو رہی۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ لاتعلقی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا پھر مجھ سے کہا۔

''تم نے اپنے کپڑے ابھی تک اٹیچی میں کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ میری الماری میں رکھ لو۔''

آج واقعی حیرتوں کا دن تھا اور میں بھی افنان عادل کی فراخ دلانہ آفر پر حیران ہوئی تھی۔ افنان عادل اور اتنا Considerate۔ میں اس کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ میری ابھی کی خدمات کو احسان سمجھ کر بدلہ ابھی کا ابھی ہی اتارنا چاہ رہا تھا۔

''رکھ لیتی ہوں۔''

میں نے پھر بھی کوئی بحث کیے بغیر کہا اور اس کی شرٹ سی کر میں نے تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ قمیص کی استری خراب ہو گئی تھی۔ میں نے استری کا پلگ لگایا، جلدی سے استری کر کے شرٹ اسے دے دی۔ دس منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے۔

''تھینکس۔'' اس نے نہایت تکلف سے کہا۔

''کس بات کا۔'' میرے سنجیدگی سے پوچھنے پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا

میری طرف سے رخ پھیر کر شرٹ پہننے لگا۔

میں نے طویل سانس لی۔

''ناشتہ کر کے جانا۔'' اس سے کہہ کر باہر آ گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اس کے سارے کپڑے دیکھے جو سینے والے تھے' سی کر رکھ دیے۔ میں نے اپنے کپڑے بھی اس کی الماری میں شفٹ کر دیے۔

اس کے بعد میں نے سمجھا تھا کہ افنان عادل شاید اب ٹھیک ہو جائے مگر وہ تو ایک بار پھر اجنبی بن گیا تھا۔ ایک دم غیر..... نامحرم.....

مجھے سخت غصہ تھا۔ بے بسی' جھنجلاہٹ' مایوسی تھی۔ میری کوئی ایک کیفیت نہیں تھی۔ میں انسان ہی تھی آخر احساسات تو تھے میرے پاس..... اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینے کے باوجود ان احساسات کو خود سے الگ کر دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بدقسمتی سے میں آخر عورت تھی۔ میں بہادر بننا چاہتی تھی مگر کمزوری غالب آ ہی جاتی تھی۔ مجھے رونا آتا تھا۔ میں خوب سارا روتی تھی اور میرا رونا دھونا نیچرل تھا۔ البتہ کسی کے سامنے رونا میری غیرت گوارا نہیں کرتی تھی۔ حتیٰ کہ افنان عادل کے سامنے بھی مجھے کبھی رونا نہیں آیا تھا اور نہ میں اس کے سامنے رونا چاہتی تھی۔ میں تو بس اسی کے سامنے روتی تھی جس کے سامنے رونا حق تھا۔ وہاں مجھے یقین رہتا تھا کہ میرا پردہ رکھا جائے گا اور بات دنیا بھر میں نشر نہیں ہو جائے گی..... مگر افنان عادل کے گھر والے بڑے ذہین تھے' سمجھ گئے تھے کہ ادھر کچھ نہ کچھ تو مسئلہ ہے۔ جب تک ابو کی طبیعت خراب تھی سب کا دھیان انہی کی طرف تھا مگر اب ان کی صحت یابی کے بعد مجھے گھر بھر کی توجہ خود پر اور افنان عادل پر مرتکز ہوتی لگتی تھی۔

اتنے لوگوں کی نگاہوں کا ایک دنیا کا سامنا کرنا خاصا مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ وہ ایک دنیا کی نگاہیں ٹٹولنے والی بھی ہوں..... ان میں شک کے ساتھ ساتھ سوال بھی ہوں اور سوال زبان پر آ بھی جائیں.....

''تم دونوں کے سفارتی تعلقات تو ٹھیک ہیں ناں؟'' گھر میں سے تقریباً ہر کوئی مجھے پکڑ پکڑ کر یہ پوچھ چکا تھا۔

''افنان' تمہارے ساتھ ٹھیک تو ہے ناں؟''

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ کوئی افنان سے یہ کیوں نہیں پوچھتا تھا کہ افنان تم [illegible]ے ساتھ ٹھیک تو ہو ناں؟ کوئی افنان سے یہ سوال کر بھی کیسے سکتا تھا کہ بہرحال یہ

میری سسرال ہی تھی۔ بے شک سب میرے لیے کیئرنگ تھے سب مجھ سے بہت خوش تھے۔ سب میری عزت بھی کرتے تھے مگر میں بہرحال غیر تھی' افنان ان کا بیٹا تھا۔ دوسرے وہ زیادہ تر وقت گھر پر موجود ہوتا ہی نہیں تھا بلکہ کچھ ہفتوں سے تو وہ چھٹی والے دن بھی باہر ہی گزارتا تھا اور جہاں تک میری سمجھ میں آتا تھا۔ افنان عادل دراصل ایک دنیا کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اسی لیے فرار ہو جاتا تھا۔ ہاں میری نظر میں تو یہ فرار ہی تھا اپنے گھر والوں اور مجھ سے...... اسے آفس کے بہانے گھر سے فرار کا اچھا راستہ ملا ہوا تھا اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا عہدہ بھی ایسا تھا لیکن میں اسے محض ذمہ داری کہنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے کوئی سرکاری افسر اتنا Efficient نہیں دیکھا تھا۔ جو صبح کا آفس گیارات میں گھر آتا تھا۔ دن کے کئی گھنٹوں تک وہ مفرور رہتا تھا اور میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں گھر سے فرار نہیں ہو سکتی تھی میں کہیں بھاگ نہیں سکتی تھی مجھے تو اسی گھر میں رہنا تھا ایک دنیا کا سامنا کرنا تھا۔

زندگی میں' میں نے بہت بری بری سچویشنز کا سامنا کیا تھا۔ جس میں یہ سچویشن بدترین تھی جس میں جو خود پر گزر رہی ہو' آدمی دوسروں کے پوچھنے پر بھی کسی سے کچھ نہ کہہ سکے' اپنی کیفیت کسی کو بتا نہ سکے۔ ایسی صورت حال کسی سے ڈسکس نہ کر سکے اور جب کوئی آپ کے شوہر کے متعلق الٹی سیدھی بات کرے تو آپ کو اسے Defend کرنا ہو...... ابو اس کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ امی کہتی ہی رہتی تھیں۔ میں اس معاملے میں چپ رہتی کہ ماں بیٹے کا آپس کا معاملہ ہے۔ شوہر بیوی کے معاملے پر البتہ مجھ سے چپ نہیں رہا جاتا تھا۔ بڑی بھابی چھوٹی بھابی اگر افنان کی مصروفیت سے متعلق کچھ کہتی تھیں تو مجھے ماما کا حوالہ دینا پڑتا تھا کہ "میرے ماما بھی انجینئر ہیں۔ میں جانتی ہوں انجینئرز کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں۔ افنان واقعی مصروف ہو گا۔" اس پر وہ دونوں مجھے افنان کے حوالے سے چھیڑتی تھیں۔ یہ چھیڑ چھاڑ مجھے پسند نہیں تھی مگر میں ان کو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ خواہ مخواہ کی بدمزگی ہوتی اور ابھی اس گھر میں مجھے آئے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔

کیسا ہوتا ہے ناں اکثر کچھ باتیں آپ کو کوفت میں مبتلا کر رہی ہوں اور آپ کو ان پر ٹیگ بھی لگانا ہو...... ماتھے پر لیبل بھی چپکانا ہو...... ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو...... اور ساتھ میں حکمرانوں کی طرح گانا ہو۔ سب ٹھیک ہے...... سب اچھا ہے...... سب سیٹ ہے...... چاہے خاک ٹھیک ہوتا...... چاہے اچھا ہوتا...... سب اچھا ہوتا......

پھر بھی یہ بہت غنیمت تھا کہ گھر کی مصروفیات کی وجہ سے مجھے فضول اور بے کار کی سوچوں سے نجات ملی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ رات کو بستر پر لیٹتے وقت بھی کوئی جلانے کڑھانے والی سوچ میرے آس پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ میں اتنی تھکی ہوتی تھی کہ اپنی جگہ پر گرتے ہی سو جاتی تھی اور اگلے دن افنان کے پکارنے پر ہی میری آنکھ کھلتی تھی۔

افنان عادل اور مجھ میں Extreme conditions میں ہی بات ہوا کرتی تھی اور وہ بھی بہت رسمی سی۔ ہم ایک ہی کمرے میں رہتے ضرور تھے مگر رشتہ سمجھ سے باہر تھا۔ اکثر اوقات مجھے یوں لگتا جیسے میں امریکہ میں کوئی ایک کمرے کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر رہ رہی ہوں اور افنان عادل میرا روم پارٹنر ہے۔ روم دراصل لیا تو اسی نے تھا مگر جب سے میں آئی ہوں تو شیئر ہم دونوں کرتے ہیں' آدھا کرایہ وہ دیتا ہے اور آدھا میں...... جب سے میں یہاں رخصت ہو کر آئی تھی۔ تب سے حالات ہی کچھ ایسے آن پڑے تھے کہ میں ابو اور امی کے یہاں جا ہی نہیں سکی تھی البتہ اکثر ان سے میری فون پر بات ہو جاتی تھی۔ نانا نانی اور ماما سے بھی فون پر ہی رابطہ رہتا تھا ابو اور امی افنان کے والد کی بیماری کے دوران ہاسپٹل میں ان کی عیادت کے لیے آتے رہے تھے مگر میرا ان سے وہاں ملنا نہیں ہو سکا تھا البتہ اس دن وہ دونوں افنان کے والد کی عیادت کرنے گھر ہی چلے آئے تھے۔ مقصد مجھ سے ملنا بھی تھا۔ افنان کے ابو سے مل کر آنے کے بعد افنان کی والدہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

"آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا جو ملنے چلے آئے۔ اصل میں عادل صاحب کی خرابی کے باعث ہم پر مشکل ہی آن پڑی تھی۔ سب بھولے رہے ہم اس دوران۔" افنان کی والدہ' ابو اور امی کو وضاحتیں دے رہی تھیں۔ "پھر افنان مصروف ہو گیا۔ ورنہ تو میں خود ہی سوچ رہی تھی کہ بہو کو آپ لوگوں سے ملا لاؤں۔" ابو امی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی افنان کی والدہ اس کا دفاع کر رہی تھیں۔

"ہم سمجھ سکتے ہیں پچھلے دنوں آپ لوگ بہت بڑے شاک سے گزر کر آ رہے ہیں۔" ابو نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "اسی لیے ہم آج خود ہی عادل صاحب کی عیادت کے لیے چلے آئے' ہم نے سوچا ساتھ ہی بیٹی سے ملنا بھی ہو جائے گا۔"

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔" افنان کی والدہ نے جلدی سے کہا۔ "ہماری بہو ہے تو کیا ہوا' ہے گی تو یہ آپ کی بیٹی ہی۔"

پھر ابو اور امی کے سامنے افنان کی والدہ میری تعریفیں کرتی رہیں۔ ابو اور امی

عاجزی انکساری سے سنتے رہے۔ میں اٹھ کر اندر آ گئی۔ بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی سے کہہ کر افنان کی والدہ نے باقاعدہ دعوت کا اہتمام کروایا تھا۔ ابو اور امی شرمندہ سے ہوتے رہے تھے۔ ''خواہ مخواہ تکلف کیا آپ نے۔'' دونوں نے کہا تھا۔ افنان کی والدہ انہیں یقین دلاتی رہی تھیں ''یہ تکلف نہیں ہے۔''

''افنان' تمہارا خیال تو رکھتا ہے ناں؟''

ایک موقع پر امی نے افنان کی والدہ کی نظر بچا کر روایتی ماؤں والا سوال کیا تھا اور میرا دل چاہا تھا زور زور سے ہنسوں۔ میرا دل چاہا ان سے پوچھوں خیال...... وہ کیا ہوتا ہے بھلا؟ اس کے برعکس میں نے کہا تھا۔ ''جی بہت......''

ابو نے ماما اور خالہ کا میسج دیا تھا کہ انہوں نے مجھے بہت پیار کہا ہے اور کہا ہے کہ وہ آئیں گے کبھی مجھ سے ملنے۔

جتنی دیر تک ابو اور امی بیٹھے رہے تھے' اتنی دیر میں بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بھی آ گئے تھے' مجموعی طور سے سب ہی ان لوگوں سے بہت اچھی طرح ملے تھے۔ بس نہیں آیا تھا تب تک تو افنان عادل ہی نہیں آیا تھا۔ بہر حال ابو اور امی نہایت مطمئن ہو کر واپس لوٹے تھے۔

☆======☆======☆

وہ بدقسمتی سے چھٹی کا ہی دن تھا اور اس دن اتفاق سے مجھے گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ ابھی میں نے نکلنے سے پہلے گاڑی صاف اور چیک وغیرہ کرنے کے لیے جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ امی نے مجھے وہیں پکڑ لیا تھا۔

''افنان' ذرا کمرے میں آؤ۔''

کہہ کر وہ چلی گئی تھیں اور میں نے بے اختیار سوچا تھا۔ آج میں پھنس گیا۔

میں طویل سانس لے کر ان کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ ابو بھی وہیں موجود تھے اور ماشاء اللہ خاصے بہتر لگ رہے تھے۔

''بیٹھو۔'' امی بہت سنجیدہ سی تھیں۔ ''تم کہیں جا رہے تھے؟''

''جی۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''سائیٹ پر کام ختم نہیں ہوا تمہارا ابھی تک؟''

''نہیں۔''

''کب تک چلتا رہے گا؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ اور کم سے کم پندرہ دن۔'' میں نے اندازاً بتایا۔

''ارے تو ایسا کیا کام ہے جو چلے چلا جا رہا ہے۔'' امی خفگی سے کہہ رہی تھیں۔ ''اور ایک تم نرالے سرکاری افسر ہو جو اتنی ذمہ داری سے کام کرتے ہو اگر سرکاری افسر اس ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دیتے تو آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔''

میں نے ان کی بات سن کر گہری سانس لی۔ اب میں ان کو کیا بتاتا کہ اس سرکاری افسر پر صرف کام کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ مسئلہ کچھ اور بھی ہے۔

''آپ کہیے جو آپ کو کہنا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں تم سے کیا کہوں۔ آفس اور سائیٹ تمہاری جان ہی نہیں چھوڑتے۔ تم گھر پر ٹکے ہی کب ہو جو میں تم سے کچھ کہوں۔ عام دن تو عام دن چھٹی والے دن بھی تم گھر پر دستیاب نہیں ہوتے۔ رات کو تم تھکے ماندے آتے ہو۔ تم سے کوئی کس طرح اور کب بات کرے۔''

امی پوری طرح سے ڈنڈے لیے تیار کھڑی تھیں۔ میری کلاس لینے کے لیے۔ میں چپ چاپ سن رہا تھا۔

''وہ تو آج بڑا خوش قسمت دن ہے کہ تم سے بات کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ورنہ آج بھی کہیں تم اگر نکل گئے ہوتے تو یہ بھی مشکل تھا۔'' امی کہہ رہی تھیں اور میرے پاس سننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ''تمہیں اتنا بھی خیال نہیں آ رہا کہ اب تم اکیلے نہیں رہو بلکہ وہ ایک لڑکی جو بدقسمتی سے اس گھر میں تمہاری بیوی بن کے آ گئی ہے۔ اس کا بھی تم کو خیال رکھنا ہے۔'' امی نے بطور خاص تم کو پر زور دیا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری شادی کے فوراً بعد تمہارے ابو کی طبیعت کی خرابی نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور تم کو اسے کہیں لے جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا مگر اس کے یہ تو تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ کم از کم اسے اس کے والدین ہی سے ملا لاتے۔ اور تو یہ ہے کہ اس کے ماں باپ اس سے خود ملنے کے لیے آئے تو مجھے نا صرف اس غیر خاندان سے آئی ہوئی بچی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا بلکہ اس کے والدین کے سامنے سو وضاحتیں بھی دینی پڑیں۔ ظاہر ہے اس کے والدین بھی اسی شہر میں رہ رہے ہیں۔ سوچ رہے ہوں گے کیا کہ معاملات کیا چل رہے ہیں۔ بارہا میں نے سوچا اس بچی کو خود ہی اس کے والدین سے ملانے لے جایا کروں مگر تم خود سوچو تمہارے ہوتے ہوئے کیا لگے گا کہ وہ میرے ساتھ اپنے والدین سے ملنے جائے؟ اور وہ بے چاری لڑکی

شادی کے پچھلے دن سے جو ابھی ہے گھریلو مصروفیات میں تو اب مزید الجھ گئی ہے۔ ابھی سے یہ سب کرنا اس کی ذمہ داری تو نہیں تھی۔''

امی تاسف سے کہہ رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ اگلے پچھلے سب وقتوں کا غبار امی ابھی ہی نکال دیں گی میرے اوپر۔

''مگر واقعی شاباش ہے اس لڑکی پر، اس کے والدین پر کہ بیٹی کی اتنی اچھی تربیت کی ہے۔ منہ سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اتنی اچھی طرح سے ہر ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ ایک وہ ہے کہ وہ اپنے لیے منہ سے بھی کچھ نہیں کہتی لیکن اگر کبھی کوئی تم کو کچھ کہہ دیتا ہے تو ہمیشہ تمہاری طرف داری کرتی ہے اور ایک تم ہو۔'' امی کے کہنے پر میں نے بے حد چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

''ارے بھئی' کٹ شارٹ کریں۔'' ابو نے ایک دم بیچ میں مداخلت کی تھی۔ ''اس سے تو صاف اور سیدھی گفتگو کیا کریں۔''

ابو امی سے مخاطب ہونے کے بعد میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ''بھئی' ہم سوچ رہے تھے کہ بہو کو اس کے والدین سے تم خود ملانے لے جایا کرو۔ بے شک اب اس کا اصل گھر اس کے شوہر کا گھر ہی ہے مگر اس کے والدین کا بھی اس پر حق ہے۔ بیٹی بیاہ کے بعد اس سے اس کے والدین کا رشتہ ختم تو نہیں ہو جاتا۔ تم ایسا کیا کرو کہ چھٹی والے دن اسے اس کے والدین کے گھر لے جایا کرو۔''

ابو کہہ رہے تھے اور میں پوری آنکھیں کھول کر ابو کو دیکھ رہا تھا۔ ابو مجھ سے اتنی لمبی چوڑی گفتگو تبھی کرتے تھے جب انہیں مجھے ڈانٹنا ہوتا تھا ورنہ عام حالات میں وہ مجھ سے ہمیشہ ٹو دی پوائنٹ بات کرتے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ جن دنوں میں ابو کو مارننگ واک پر زبردستی لے جا رہا تھا تب بھی ہمارے درمیان زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ میں ہمیشہ ابو کے قریب رہنا چاہوں مگر ابو میرے قریب کبھی تھے نہیں۔ تو کیا یہ سب الماس کی بدولت تھا۔ میں پہلی مرتبہ تفصیلاً غور کر رہا تھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔

''یا پھر ایسا کر لیا کرو کہ رات میں اسے رکنے کی اجازت دے دو۔ اگر تمہیں اس کا رات میں رکنا پسند نہیں ہے تو تم ایسا بھی کر سکتے ہو کہ صبح آفس جاتے ہوئے اسے وہاں چھوڑ دیا کرو۔ آفس سے واپسی پر لے لیا کرو۔'' امی نے پھر کہا۔

''ارے بھئی' آفس آپ لوگ ہمیں جانے نہیں دیتے۔ گھر سے نکلنے نہیں دیا جاتا۔ اتنے لمبے وقت ہم کیا کریں گے۔ اس بچی کے بغیر۔''

ابو کے ایک دم کہنے پر میں نے ابو کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ میرے کبھی بھی عادی نہیں تھے۔ وہ الماس کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے ایک دم الماس سے جلن سی ہونے لگی اور ابو کہہ رہے تھے۔

''چلو جیسی اس کی خوشی جو وہ چاہے۔''

''نہیں۔'' ایک دم میرے منہ سے پھسل گیا تھا۔ ''جو میں چاہوں۔'' میں نے خاصی سختی سے کہا تھا۔ ''اگر آپ کہیں گے تو میں اسے کسی وقت بھی کہیں نہیں رکنے دوں گا۔''

''ارے اس لیے تھوڑا ہی کہا تھا تم سے۔ اب فورس مت کرنا اس پر۔''

ابو نے سختی سے مجھے ٹوک دیا تھا اور میری سختی وقتی جیسے وہیں دم توڑ گئی تھی۔

''اچھا۔'' میں نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا۔

''جاؤ بس یہی کہنا تھا۔'' ابو کے کہنے پر میں اٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

''ارے یہ کیا کیا آپ نے۔ اسے جانے دیا ابھی تو مجھے اور بھی بہت کچھ کہنا تھا۔'' جاتے جاتے میں نے سنا امی ابو سے کہہ رہی تھیں۔ میں ابو کا جواب البتہ سن نہیں سکا تھا۔

ابو اور امی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی مجھے بڑے بھائی مل گئے۔

''افنان' کہیں جانا مت۔'' انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ میں ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

بڑے بھائی کا لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بھی میری کلاس لینے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔

آج کا دن برا تھا۔ آج میری شامت کا دن تھا۔ آج واقعی حساب کتاب کا دن تھا۔ ہر کوئی اس دن کی تلاش میں تھا اور آج سب کو اس کا موقع بھی مل گیا تھا۔ بڑے بھائی مجھے لیے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

''تم کہاں ہوتے ہو آج کل؟'' انہوں نے خود صوفے پر بیٹھتے ہوئے میرے بیٹھنے کا انتظار کیے بغیر پوچھا تھا۔

میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ ان کی شکل تکنے لگا۔

''یہیں ہوتا ہوں۔'' میں نے قدرے حیرانگی سے کہا۔

''اچھا مجھے تم یہاں نظر تو نہیں آتے۔'' بڑے بھائی نے طنز سے کہا۔ ''تم تو ہر وقت مجھے گھر سے باہر ہی نظر آتے ہو حتیٰ کہ چھٹی والے دن بھی تم گھر پر دستیاب نہیں

ہوتے۔ سائٹ پر پائے جاتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ اعلیٰ عہدے پر کام کرنے والے تم پہلے آدمی ہو۔ حالانکہ جاب ابو نے بھی کی ہے میں نے اور سمعان نے بھی۔ ذمہ دار عہدوں پر فائز ہم بھی ہیں۔ ہماری بھی آفیسر لیول کی جاب ہے۔ ہم بھی دیانت داری محنت اور اخلاص سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے عہدے کی وجہ سے گھر کو نظر انداز نہیں کیا۔ ایک تم کیا نرالے اور پہلے آدمی ہو جو محنتی ذمہ دار اور مخلص ہو؟'' بڑے بھائی ناراضگی سے کہہ رہے تھے۔

''میں واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہوں۔'' میں نے ان سے کہیں زیادہ ناراضگی سے کہا۔

''تم گدھے ہو۔'' بڑے بھائی نے جھنجلا کر کہا۔ ''جو یہ نہیں سوچ رہے کہ تمہاری ایک عدد بیوی بھی ہے اور اس کو تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔''

بڑے بھائی کے اس طرح کہنے پر مجھے الماس سے چڑ سی ہونے لگی۔ ''الماس نے کچھ کہا ہے آپ سے؟'' میں نے دبے دبے غصے سے پوچھا۔

''اسے مجھ سے کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔'' انہوں نے مجھے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں اس گھر میں رہتا نہیں ہوں کیا یا میں اندھا ہوں کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا؟'' وہ بہت خفگی سے کہہ رہے تھے۔ ''اور اگر اس نے مجھ سے کہا بھی ہے۔ تو یہ اس کا حق ہے اور خبردار تم نے اس سے کسی قسم کی کوئی پوچھ گچھ کی بھی تو بہت برا ہوگا۔''

انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا اور مجھے اس لمحے الماس پر بہت غصہ آیا تھا۔

''تمہیں تو اور بھی اس بات کا خیال ہونا چاہیے تھا کہ پہلے ہی اتنے عرصے تک ابو کی طبیعت کی خرابی نے سارے گھر کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔ تمہاری شادی کے بعد قدرتی مشکل آن پڑی تھی ہم پر اور اب جبکہ اللہ کے شکر سے ابو کی طبیعت سنبھلی ہے ہم اس مشکل سے نکل آئے ہیں تو تم نے آفس، آفس، سائٹ، سائٹ کھیلنا شروع کر دیا ہے۔''

بڑے بھائی سخت طیش کے عالم میں کہہ رہے تھے اور میں نے اس عالم میں انہیں اپنی پوری زندگی میں صرف چند بار ہی دیکھا تھا۔ وہ بہت دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ انہیں غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب آتا تھا ٹھیک ٹھاک آتا تھا اور اسی میں وہ اگلی پچھلی کسر نکال دیتے تھے۔ اس وقت بھی مجھے کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ ان کے غصے کے مجھے اپنا غصہ بھول گیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ ''تم اپنا مسئلہ بتاؤ مجھے

ان کے کہنے پر میں ایک بار پھر ان کی شکل دیکھنے لگا۔ ''میں سمجھا نہیں۔'' میرا سوال بے اختیار ہی تھا۔

''سمجھا نہیں؟'' انہوں نے درشت لہجے میں دہرایا۔ ''کیا مطلب ہے سمجھا نہیں؟ اب تم اتنے بچے بھی نہیں ہو کہ سمجھ نہ سکو۔ یا تو تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ یا جو ہوا ہے اسے قبول کر لو تم شادی نہیں کرنا چاہتے تھے تو تم کو پہلے ہی منع کر دینا چاہیے تھا۔ کسی نے تم پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسی تھی۔ تمہارے ساتھ کسی نے زبردستی نہیں کی تھی۔ میں نے شادی سے پہلے بھی تم سے بہت بار کہا تھا کہ اس لڑکی کو دیکھ لو جس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ تم نے صاف منع کر دیا تھا لیکن تم نے کچھ بھی نہیں کیا اور پھر جب تمہاری شادی ہوگئی جواہر کے ساتھ تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے تمہاری شادی اسی کے ساتھ ہونی لکھی تھی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تقدیر کا لکھا ٹالا نہیں جاسکتا۔ میں نے ولیمے والی رات تم سے کہا تھا کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ تم کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی؟'' بڑے بھائی بہت جھنجلا کر مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ''اور اب تم مجھے صرف اتنا بتا دو تم کس چیز سے بھاگ رہے ہو آخر؟ تمہاری پرابلم کیا ہے۔ کچھ بتاؤ بھی تو مجھے۔''

مجھ پر ایک دم بے بسی سی طاری ہوگئی تھی۔ میری پرابلم کیا ہے......

''کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' بالآخر میں نے کہا تھا۔

''پھر تم اس قدر غیر ذمہ دار کیوں ہو گئے ہو۔ تم اسے وقت کیوں نہیں دیتے؟ اب کیا مسئلہ ہے میں یہ پوچھتا ہوں۔''

بڑے بھائی کا غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے میری کھنچ کی کلاس لے لی تھی۔ اس قسم کے حساب کتاب کی توقع مجھے امی ابو سے تھی مگر وہاں کی کسر بڑے بھائی نے یہاں نکال دی تھی۔ میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں بڑے بھائی کے سامنے میں بے بس ہو جاتا تھا۔

''تم سے تو یہ تک نہیں ہو سکا کہ اس کو آؤٹنگ پر ہی کہیں لے جاتے۔ کہیں لنچ، ڈنر کروا دیتے۔ تم نے تو کبھی اس کو شاپنگ کے لیے یا بیوٹی سیلون لے جانے کے لیے بھی نہیں پوچھا ہوگا۔''

کتنا صحیح اندازہ تھا بڑے بھائی کا میرے بارے میں...... مجھے اس سے کبھی یہ سب پوچھنے کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ خیال تو مجھے تب آتا جب مجھے اس کا خیال ہوتا۔ میں نے اس سے واقعی کبھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔ میں نے اس سے کبھی کچھ پوچھنے کی ضرورت

محسوس نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ ابو کے کرائسس سے نکل کر آنے کے بعد اس دن جب میں نے امی کو اپنی Pay دینا چاہی تھی تو امی نے لینے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ اب مجھے نہیں بہو کو ہی دیا کرو لیکن میں نے پھر بھی الماس کو ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔ ساری Pay اپنے پاس ہی رکھ لی تھی۔ میں نے تو اس کی مہر کی رقم تک اسے نہیں دی تھی جو اس کی اپنی چیز تھی اور مجھے بہت پہلے اسے دے دینی چاہیے تھی۔ میں سوچ میں گم تھا اور بڑے بھائی اپنی کہے جا رہے تھے۔

''اور کچھ نہیں کر سکتے تھے تم تو کم از کم اتنا ہی کر لیا ہوتا کہ اسے سمندر پر ہی لے جاتے۔''

اب کی بار میں چڑ سا گیا تھا۔ ''کراچی میں رہتے ہوئے کبھی سمندر پر گئی نہیں ہو گی کیا وہ؟'' چڑ کر میں نے پوچھا تھا۔

''ارے میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں اور آگے سے مجھے جواب کیا مل رہا ہے۔'' بڑے بھائی چیخ ہی تو پڑے تھے۔ ''یعنی تم مان ہی نہیں رہے ہو کہ زیادتی تمہاری طرف سے ہو رہی ہے۔''

بڑے بھائی ماتھے پر بل ڈال کر مجھے دیکھ رہے تھے اور میرا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

''ارے، تم سے کہہ رہا ہوں میں۔'' تڑخ کر انہوں نے کہا تھا۔

''سن رہا ہوں میں۔'' میرے لہجے میں خفگی تھی۔

''سن رہے ہو تو مجھے بتاؤ کہ کیا یہ ضروری تھا کہ میں تم کو یہ سب کہتا یا کوئی اور کہتا تب تمہیں خیال آتا اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ تم ہر کام کسی کے کہنے سے ہی کرو۔ تمہارے خود کے اندر عقل نہیں ہے۔'' خاصی ناراضگی سے انہوں نے پوچھا تھا۔

''اچھا آپ اتنا خفا کیوں ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لے جاؤں گا میں اسے۔'' میں نے اب کی بار ناراضگی سے کہا تھا۔

''لے جاؤں گا نہیں لے کر جاؤ...... ابھی......'' انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''اچھا۔'' میں نے ناراضگی کے عالم میں کہہ کر آگے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

''اور ذرا ٹھہرو۔'' بڑے بھائی کے لہجے میں خلاف توقع اب کی بار تھوڑی نرمی تھی۔

''جی۔'' میں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

''تم انڈرسٹلا تھے ناں جواہر میں۔'' وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ ''تم نے [illegible]

بتایا تھا۔''

اور میں انہیں وہ جواب ہرگز نہیں دے سکا جو میں خلدون ابراہیم کو دے کر آیا تھا۔ میری نگاہ خود بخود جھک گئی تھی۔ مجھ سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ میں کہہ نہیں سکا کہ وہ تب کی بات تھی۔ اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بڑے بھائی میری خاموشی کو میرا جواب سمجھے تھے۔

''تو جب بیوی تمہاری پسند کی ہے تو پھر؟''

بڑے بھائی مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں خاصا بے بس سا ہو کر باہر چلا آیا تھا۔ اس ''تو پھر'' کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

میں سوچ رہا تھا کیا عجب بات ہے کہ الماس کو اس گھر میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور گھر بھر اس کا حامی تھا۔ امی ابو بڑے بھائی۔ مجھ سے جواب طلب کر رہے تھے اس کے معاملے میں...... گھر بھر اس زیادتی کو محسوس کر رہا تھا۔ زیادتی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ زیادتی میری طرف ہی سے ہو رہی تھی مگر اس سلسلے میں کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ کیونکہ کوئی بھی میری کیفیت کو سمجھ نہیں سکتا تھا میں کسی کو کچھ سمجھا بھی نہیں سکتا تھا۔

الماس میرے لیے ایک ایسا نوالہ تھی جو میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔ جسے میں اگل نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اسے مجھ سے نگلا جاتا تھا۔ الماس کے سلسلے میں میں ایک دم بے بس تھا۔ لاچار...... مجبور...... کم از کم ماہ تھا ابوانز کے سلسلے میں میں اس قدر بے بس نہیں تھا۔

میں خاموشی سے چلتا کچن میں پہنچا۔ بڑی بھابی کے ساتھ الماس بھی وہیں تھی اور اس وقت وہ برتن دھو رہی تھی۔ بڑی بھابی کے سامنے مجھے اس سے کچھ کہتے حجاب آیا۔

''بھابی، آپ کو بڑے بھائی بلا رہے ہیں۔'' نہ جانے کیسے ایک دم میرے منہ سے پھسل پڑا تھا۔

''اچھا۔''

ان کا لہجہ سادہ ہی تھا مگر مجھے ذو معنی لگا۔ میں خفیف سا ہو گیا۔

''جواہر، میں ابھی آئی۔'' کہہ کر وہ جلدی میں کچن سے نکلی تھیں۔

الماس سر ہلا کر بدستور برتن دھوتی رہی۔ میں نے آگے بڑھ کر نل بند کر دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تیار ہو جاؤ، ہم باہر جا رہے ہیں۔'' مختصراً کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی میرے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔

''کون سے کپڑے پہنوں؟''

''مجھے خواتین کے کپڑوں کا کوئی آئیڈیا نہیں۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''کلر کے متعلق تو ہوگا......؟''

''''میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا...... میں نے تو تم کو ہمیشہ سکول یونیفارم میں دیکھا تھا۔ میرون اور کالے کلر کا کامبی نیشن تم پر سوٹ کرتا تھا۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ گاڑی صاف کرنے کے بعد لاک کھولنے کے لیے ہاتھ جیب کی طرف گیا تو خیال آیا کہ چابی تو میں وہیں کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر بھول آیا ہوں' سو میں چابی لینے کے لیے اپنے کمرے میں واپس آیا۔ الماس میرون رنگ کا سوٹ پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینے میں نظر آنے والے عکس کو میں چند ثانیے تک پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ وہ ایک دم میری طرف مڑی تھی۔ مڑتے وقت اس کی کمر سے بھی خاصی نیچے جاتی لمبی چوٹی میں میری نظر الجھ گئی تھی۔ میں تب بھی اس کے بالوں کی لمبائی کا اندازہ نہ کر پایا۔ ''کیسا لگ رہا ہے؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میں جواب دینے کے بجائے بیڈ پر بکھرے اس کے دوپٹے کو دیکھ رہا تھا جسے اب وہ اپنے شانوں پر برابر کر رہی تھی۔

''چابی! میرے کہنے پر اس نے گاڑی کی چابی اٹھا کر مجھے دی۔ مجھ سے کمرے میں مزید رکا نہیں جا سکا۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔ گاڑی تک تیز تیز قدموں سے آتے آتے میرا سانس پھول گیا تھا۔ پھر گاڑی کے کاغذات وغیرہ چیک کرتے ہوئے مجھے پتا نہیں کیوں ایک دم خیال آیا کہ مجھے نکاح نامہ بھی ساتھ لے لینا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں ایک بار پھر کمرے میں آیا تو اب کی بار الماس گھٹنوں تک کوٹ پہنے ٹھوڑی تک اسکارف پہنے چشمہ لگائے تیار کھڑی تھی۔ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''تم کوٹ پہنتی ہو' اسکارف اوڑھتی ہو' چشمہ لگاتی ہو۔'' میں اپنے لہجے کی حیرت کسی طور نہیں چھپا سکا تھا۔

''ہاں' کیوں تم نے اب دیکھا ہے؟'' اس نے مجھ سے کہیں زیادہ حیرت سے پوچھا تھا۔ ''جب ابو ہاسپٹلائزڈ تھے تو میں جتنی مرتبہ بھی ہاسپٹل آئی تھی یہ پہن کر ہی آئی تھی۔ چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔''

''اچھا......'' مجھے پہلی بار اپنی بے خبری پر شرمندگی ہوئی تھی۔ کتنا لاعلم تھا میں اس

سے...... اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''اگر تمہیں اچھا نہیں لگتا تو نہیں پہنوں گی۔''

''نہیں...... نہیں بہت اچھا ہے۔ بہت ٹھیک ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا تھا۔

وہ چشمہ لگا کر کوٹ اسکارف میں لگ ہی اتنی اچھی رہی تھی۔ سیاہ رنگ کا اسکارف اس کی صاف رنگت پر بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ دیر اسے دیکھا نہ جا سکا۔ ''ایسا کرو چہرہ بھی ڈھک لو۔'' میں نے ڈر کر اس سے کہا تھا۔ اس نے تعمیل میں پانچ سیکنڈ بھی نہیں لگائے تھے۔ نقاب کرنے کے بعد الماس کی آنکھیں کچھ اور دلکش لگنے لگی تھیں اور اچھا تھا کہ ان کے آگے چشمہ آ گیا تھا۔

''چشمہ نظر کا ہے؟''

''ہاں!''

''کیا نمبر ہے؟''

''مائنس ون پوائنٹ ٹو فائیو۔''

''کب سے لگا رہی ہو؟''

''یونیورسٹی کے زمانے سے۔''

''اچھا۔''

میری نظر اس کے چہرے پر سے پھسلتی ہوئی اچانک اس کے پیروں پر پڑی۔ سیاہ دو اسٹریپس والی سینڈلوں میں مقید اس کے سفید پیر کچھ اور سفید لگ رہے تھے۔ میری نظر ادھر جمی تو جمی ہی رہ گئی۔

''یہ...... یہ...... جوتے......'' میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

''میں دوسرے پہن لیتی ہوں۔'' دو سیکنڈ کی بھی دیر کیے بغیر تیسرے سیکنڈ میں وہ اور جوتے پہنے ہوئے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ''یہ ٹھیک ہیں؟''

مجھ سے بمشکل اثبات میں سر ہلایا جا سکا۔ چشمہ ٹھیک کرنے کے لیے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور اس کے سفید بے داغ ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے میرا بے اختیار دل چاہا اس سے کہوں کہ انہیں بھی چھپا لو مگر میں اس سے کچھ کہے بغیر گہری سانس لے کر الماری کی طرف آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی اور میرا دھیان اس کی کسی بات پر نہ تھا۔ اپنی الماری کے نچلے خانے میں سے نکاح نامہ نکالتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ الماس سے اب فرمائشیں کرنے کی ضرورت تو نہ تھی۔ وہ تو خود ان باتوں کا بڑا دھیان رکھتی تھی۔

مجھے ایک دم خیال آیا تھا۔ وہ تو گھر میں بھی ایسے ہی رہتی تھی۔ میرا اس سے سامنا اکثر ناشتے کی ٹیبل پر ہی ہوتا تھا اور اگرچہ میں نے اس کو اتنی توجہ سے دیکھا تو نہیں تھا مگر سرسری سا دیکھنے پر بھی میں نے اس کو ہمیشہ تمیز سے رہتے دیکھا تھا۔ بڑی بڑی چادروں، دوپٹوں سے خود کو لپیٹے دیکھا تھا وہ صرف بے حجاب میرے کمرے میں میرے سامنے ہوتی تھی۔

کیا عجب بات تھی کہ آج میں پہلی بار اس کے بارے میں اس انداز سے سوچ رہا تھا اور سوچے جا رہا تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں نے اس کو بڑے بھائی، چھوٹے بھائی اور ابو کے سامنے نظر جھکا کر لحاظ، ادب اور دھیمے لہجے میں بات کرتے دیکھا تھا۔ یعنی وہ حیا دار بھی تھی اور باکردار بھی...... مگر پھر...... اس رات اس کو کیا ہو گیا تھا...... میں الجھ سا گیا تھا۔

اچھا اس رات تو I was the culprit میں نے گلٹی ہو کر سوچا تھا بڑی بے دلی سے گھر سے باہر نکلنے سے پہلے میں الماس کے ساتھ ابو اور امی کے کمرے میں یہ بتانے گیا تھا کہ ''ہم جا رہے ہیں۔''

''ہاں...... ہاں ضرور جاؤ۔'' ابو نے خوشی خوشی کہا تھا۔ ''ہماری طرف سے پوری اجازت ہے آرام سے آنا۔ جلدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ابو کے لہجے کو میں نے بڑی توجہ سے نوٹ کیا تھا۔

پھر جب میں اور الماس باہر نکلے تو بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی مسکراہٹ شرارت آمیز تھی۔ ڈرائنگ روم سے گزر کر پورچ جاتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے سے بڑی بھابی چھوٹی بھابی جھانک رہی ہیں۔ میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ راستے بھر میں نے الماس سے کوئی بات نہیں کی۔ ''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں؟'' راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ''تم مجھے آپ کب سے کہنے لگی ہو؟''

''تم پسند کرو تو میں تم کو آپ ہی کہا کروں۔''

''رہنے دو۔ آپ تمہارے منہ سے اچھا نہیں ہے...... بہر حال ہم سی سائیڈ جا رہے ہیں۔'' میں نے اسے بتا تو دیا مگر میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیرت انگیز بات جب ہم دونوں میں کوئی رشتہ نہیں تھا تو میرے پاس اس سے کرنے کے ڈھیروں باتیں ہوا کرتی تھیں۔ Sensible بھی اور Insensible بھی

جبکہ ہم دونوں میں ہر قسم کا رشتہ ہے، شرعی بھی قانونی بھی۔ جائز بھی حلال بھی تو میرے پاس اس سے کرنے کے لیے کوئی بات نہیں ہے......

کیا ڈکشنری سے سارے الفاظ ختم ہو گئے ہیں...... یا اگر لفظ ہیں تو گونگے ہو گئے ہیں یا میں بات کرنا بھول گیا ہوں۔ یا مجھے جملوں کی Construction کرنا نہیں آتی...... میں سوچتا رہا کہ جب الماس میرے لیے بالکل غیر تھی نامحرم تھی تو میرے پاس اس کے لیے جذبات ہی جذبات تھے۔ میں اس سے ملتے وقت پُرجوش رہتا تھا۔ میرے احساسات اس سے مل کر آنے کے بعد بھی خوشگوار ہوتے تھے اور آج جب کہ الماس میری اپنی تھی، بالکل محرم تھی تو میرے سارے جذبات دفن ہو گئے تھے۔ ہر احساس مر گیا تھا۔ بس احساس شرمندگی، احساس بے بسی اور احساس گناہ زندہ تھے۔

میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا......

میں بالکل برف کی سل ثابت ہو رہا تھا......

تب میں نے الماس کو اس پر کوئی حق نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی مرتبہ اس کو اس کی نانی کے یہاں چھوڑا تھا کہ مجھے صحیح طرح سے گنتی بھی یاد نہیں ہے۔ اتنی مرتبہ میں اس کے ساتھ جاتا تھا جبکہ اس وقت دھر لیے جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہی تھا مگر تب میں کسی سے ڈرا نہیں کرتا تھا اور آج جب کہ میں الماس کو بحیثیت شوہر پورے حق کے ساتھ لے کر کہیں جا رہا ہوں تو مجھے عجیب سا خوف ہے۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے مجھے اب۔ نکاح نامے کے طور پر تحریری ثبوت ہے میرے پاس پھر بھی مجھے پکڑ لیے جانے کا ڈر ہے۔

اسی عالم میں سمندر پر پہنچنے کے بعد میں ساحل سے ٹکراتی شوریدہ سر موجوں کو دیکھتا رہا۔ سمندر تک میں اضطراب تھا۔ مدوجزر تھا، تلاطم تھا اور میں ٹھس تھا، ساکن تھا، چپ تھا۔ مجھ پر کسی نے زبردستی نہیں کی تھی مگر میرا ہر عمل زبردستی کو Show کر رہا تھا۔ الماس بھی میرے رویئے سے تھک سی گئی تھی۔ مجھے شرمندگی نے آلیا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ خود کو سنبھال سکوں۔ میری ہر کوشش بے کار گئی۔ میں خود بھی تھکنے سا لگا تھا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں۔ الماس واقعی ذہین عورت تھی۔ سمجھ گئی اور عین اس وقت جبکہ وہ مجھ سے سوالات کر رہی تھی۔ ظہر کی اذان ہو گئی۔ میں نے الماس کے سوال جواب سے بچائے جانے پر شکر منایا تھا۔ میں الماس کو لیے قریبی مسجد چلا آیا۔ اس کی شہرت کے

بارے میں' میں نے سن تو بہت رکھا تھا مگر اس میں آنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ الماس کو خواتین والے حصے میں بھیج کر خود حضرات والے حصے میں آیا تو Main enterance پر ہی سنگ مرمر کی دیوار کے کونے میں کھدے الفاظ پر نظر پڑی۔ اگرچہ کھدے ہوئے الفاظ اس قدر بڑے بھی نہیں تھے کہ بالکل نمایاں ہو رہے ہوں مگر پھر بھی صاف اور واضح تھے۔

Designed and Constructed by Khuldoon Ibraheem

اس مسجد کے اندر داخل ہوتے ہوئے میری طبیعت عجیب سی ہو گئی۔ مسجد کے اندر پہنچنے پر اس کی دیواریں بھی چیخ چیخ کر بولنے لگیں کہ انہیں خلدون ابراہیم نے ہی Construct کیا ہوگا۔ ڈیزائن کیا ہوگا۔ خلدون ابراہیم کے ہر کام میں ان کا مخصوص اسٹائل ہر حالت میں جھلکتا تھا۔ کوئی چاہے لاکھ کہتا رہے کہ ان کی Construct' ڈیزائن کی ہوئی ہر پہلی عمارت دوسری سے مختلف نظر آتی ہے مگر میں بھی ایک انجینئر ہوں۔ مجھے فوراً اس بات کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

پھر تو مجھ سے نماز میں بھی Concentrate نہ ہو سکا۔ حالانکہ میں تکبیریں بھی پڑھ رہا تھا۔ ثناء بھی کہہ رہا تھا۔ الحمد بھی پڑھ رہا تھا۔ تلاوت بھی کر رہا تھا۔ رکوع و سجود کسی بھی رکن کی ادائیگی میں مزا نہیں آیا۔ معانی' مطالب' سب میرے سر سے گزر رہے تھے۔ عجیب خالی الذہنی کی سی کیفیت تھی۔ اپنی یہ کیفیت خود میری سمجھ سے باہر تھی۔ اسی عالم میں' میں نے پوری نماز پڑھی تھی اور میں نے الماس کو لنچ کروایا تھا۔ ساحل پر واقع اس مشہور ریسٹورنٹ میں گھستے ہی اس کی دیواریں بھی...... مجھ سے کھانا ڈھنگ سے نہ کھایا جا سکا البتہ الماس کو میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کمال کی عورت تھی۔ نقاب بھی اس کے کھانے میں حارج نہیں ہو رہا تھا۔ کھانا' اس نے بھی کم کھایا تھا۔ بہت جلدی اس نے ہاتھ روک لیا تھا۔

''کیوں کھانا اچھا نہیں ہے؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''نہیں' کھانا بہت اچھا ہے مگر میں انجوائے نہیں کر پا رہی کھانے کو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

انجوائے تو خیر میں نہیں کر پا رہا۔ میں نے دل میں اعتراف کیا تھا۔ شاید جتنی انجوائے منٹ مجھے کرنی تھی' میں نے شادی سے پہلے ہی کر لی تھی۔ میں نے سوچا تھا اور اب کوئی بات مجھے انجوائے منٹ والی لگتی ہی نہیں تھی۔ اب تو صرف بے دلی تھی۔ زندگی

تھی۔ اب تو بس ہر چیز ٹھونس دی گئی تھی' مسلط کر دی گئی تھی۔

''تم کیوں نہیں انجوائے کر پا رہیں؟'' میں نے بالآخر پوچھا تھا۔

''تمہاری وجہ سے۔'' اس نے اطمینان سے مجھ پر الزام عائد کر دیا۔

''میں نے کیا کیا؟'' میں دنگ سا رہ گیا۔

''میں تمہیں دیکھ رہی تھی۔ تم نے بھی بہت جلدی ہاتھ روک لیا تھا۔ جب تم ٹھیک طرح سے نہیں کھا سکے تو میں کیسے کھا سکتی تھی۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ تمہارا پیٹ کیا میرے پیٹ کے ساتھ linked ہے۔'' اب کی بار میں قدرے چڑ گیا۔

''ہم میں کچھ نہ کچھ اور کوئی نہ کوئی link تو ہے ہی۔'' اس نے گہرے لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''چلو یہی سہی۔'' اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔'' میں تو اس کو سب کچھ مانتی ہوں۔''

''اب اتنے ڈھیر سارے کو کیا کریں گے ہم۔'' میں نے بچے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''پیک کروا لو۔ کسی ضرورت مند کو ہی دے دیں گے۔'' اس نے مشورہ دیا۔ ''شاید اس کی دعائیں ہی کچھ کام آ جائیں۔''

''ہاں شاید کسی کی دعائیں ہی مجھے لگ جائیں۔ میرے کام آ جائیں۔ میری اپنی تو کوئی دعا مجھ پر اثر نہیں کر رہی۔''

میں نے گہری سانس لے کر کھانا پیک کروایا اور چوراہے پر بیٹھے ایک فقیر کو دے دیا۔ اس کے بعد میں الماس کو آئس کریم پارلر بھی لے گیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ آئس کریم پارلر بھی...... الماس کے ماما نے کچھ چھوڑا نہیں تھا۔

''تم جانتی ہو...... وہ مسجد جس میں ہم نے نماز پڑھی ہے' وہ ریسٹورنٹ جس میں ہم نے کھانا کھایا ہے...... اور یہ آئس کریم پارلر کس نے بنایا ہے؟'' میں نے دبیز سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں...... ماما نے۔'' سادگی سے جواب آیا۔ ''مگر تینوں کی ڈیزائننگ اور آرکیٹیکچر میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ ہے ناں مزے کی بات!'' وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

اور مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے باوجود بھی

میں الماس کو اس کے والدین کے گھر لے گیا تھا۔

''تم یہ سب کس لیے کر رہے ہو افنان؟'' راستے میں الماس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا۔

''پتا نہیں۔''

''یہ کیا جواب ہوا؟''

''مجھے یہ بھی نہیں پتا۔''

الماس چپ سی ہو گئی۔ ''افنان!'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پکارا تھا۔

''تم کچھ کیوں نہیں دیتے مجھ سے۔ اپنا مسئلہ مجھ سے ڈسکس کیوں نہیں کرتے۔ کچھ شیئر کیوں نہیں کرتے مجھ سے۔ آخر ہم روم بھی تو شیئر کرتے ہی ہیں۔'' اس نے بہت لاچاری سے کہا تھا۔

اور مجھ پر بے بسی طاری ہو گئی تھی۔ نہیں میں کسی سے کچھ شیئر نہیں کر سکتا میں کسی سے کچھ ڈسکس نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو کیا بتاؤں کہ میری پریشانی کیا ہے۔ میں نے بہت لاچاری سے سوچا تھا۔

الماس کے ساتھ اس کے والدین کے گھر پہنچنے پر اس قدر آؤ بھگت ہوئی کہ میں اچھا خاصا شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنی اسی شرمندگی کو کم کرنے کے لیے ہی میں انکل آنٹی کی گفتگو میں حصہ لینے کی بھرپور کوشش کرتا رہا۔ اپنے دونوں سالے صاحبان سے گفتگو کر کے مجھے اپنی برف کی سل جیسی کیفیت کچھ پگھلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ دونوں ساڑھے اٹھارہ انیس سال کے بہت قابل دلچسپ اور ذہین لڑکے تھے۔ ہاں پتا کیسے چلتا کہ ذہین بہن ہی کے بھائی ہیں۔ الماس کے گھر والوں نے ریفریشمنٹ پر ہی خاصا اہتمام کیا تھا اور اس کے باوجود کھانے کے لیے روک رہے تھے۔ میں اس سلوک سے متاثر ہوئے بنا جا رہا تھا۔

''میں کھانا گھر جا کر ہی کھاؤں گا۔'' میں نے انکل کے بے حد اصرار پر شائستگی سے کہا تھا۔ ''اگرچہ اس کی گنجائش تو نہیں ہے۔'' میں نے تھوڑا جھوٹ بولا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میرا کچھ کھانے پینے کا موڈ نہیں تھا۔ ریفریشمنٹ سے بھی میں نے تھوڑا ہی انصاف کیا ہو گا۔ چلتے وقت جب میں نے یہ دیکھا کہ انکل آنٹی اداس ہو گئے ہیں۔ تو میں نے الماس سے کہا بھی تھا کہ ''تم اگر رکنا چاہو تو رک جاؤ۔''

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں رک جاؤں؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

میں اس سے ابو کے کہنے کے مطابق Force نہ کر سکا تھا کہ ابو تمہارے ...

رہیں گے۔ میں نے کہا تھا۔ ''جیسی تمہاری خوشی جو تم چاہو۔''

وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ''میں رک جاتی مگر...... میں اتنا لمبا عرصہ ابو کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ویسے ہی آج دن بھر ہو گیا ابو تو میرے بغیر......'' وہ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

تب میں نے خاصی ممنونیت سے اسے دیکھا تھا۔

راستے میں، میں نے اس کو اس کے ماما سے ملانے کی آفر بھی دی تھی۔ اس نے منع کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس سے جس بات کو بھی کہا تھا اس نے مختلف توجیہات دی تھیں۔ میں خاصا متعجب ہوا تھا۔

''تم کیسی عورت ہو۔ خود مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کرتیں۔ میں پوچھتا ہوں تو منع کر دیتی ہو۔''

''تم اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہو؟'' اس نے میرے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''کیا مطلب ہے؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''تم ہنستے نہیں ہو؟'' اس نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری فرمائش سے میری ہنسی کا کیا تعلق ہے؟'' میں نے چڑ کر پوچھا۔

''میں نے تو تم کو مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔''

''کوئی مسکرانے والی بات ہو تو مسکراؤں۔'' میں نے اب کی بار بہت برا مان کر کہا تھا۔

''میں تم سے اور کیا فرمائش کروں افنان! میرے کہنے پر تم مسکراتے تک تو ہو نہیں۔'' اس کے آزردگی سے کہنے پر میں نے مسکرانے کی بہت کوشش کی تھی۔ وہ میری طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

''پہلے جب تم ہنستے تھے ناں تو مجھے لگتا تھا پوری کائنات خوش ہے۔'' وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔

''اور اب......؟'' میں نے بند ہوتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔

''اور اب ایسا لگتا ہے کہ کائنات بھی خوش رہی ہی نہیں۔'' اس نے آزردگی سے کہا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ بعض باتیں واقعی اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ میری تو ہنسی یا مسکراہٹ تک پر میرا اختیار نہیں تھا۔

گھر پہنچنے پر گاڑی سے اترنے سے پہلے الماس نے لمحے بھر کو مجھے دیکھا اور کہا۔

''آج کا دن میرے ساتھ تم نے گزارا۔ اس کے لیے شکریہ مجھ کو اتنا وقت دینے کا بہت شکریہ مگر افنان! تم خواہ مخواہ خود پہ جبر کرو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آئندہ اگر تم سے کوئی بھی

اس قسم کی کوئی بات کرے تو اس سے کہہ دینا الماس کو گھومنے پھرنے کا شوق نہیں ہے۔''
الماس تو یہ کہہ کر اتر گئی اور میں اچھا خاصا خجل ہو گیا تھا' سو بے اختیار اسے آواز دے ڈالی۔''الماس سنو!''

الماس نے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر گاڑی کی کھڑکی سے کہنیاں ٹکائے کھڑی ہو گئی۔

''میری طرف سے تم پر کوئی Restriction نہیں ہے۔ تمہیں کبھی بھی کہیں بھی جانا ہوا کرے تو اس نمبر پر کال کر دیا کرو۔'' میں نے نمبر اسے بتایا۔''ڈرائیور گاڑی لے کر آجائے گا۔ قابلِ اعتماد اور شریف آدمی ہے۔ تم چلی جایا کرنا۔ میری طرف سے تم پر کوئی بھی پابندی نہیں ہے۔ تم نے ایم فل کیا ہے اگر پی ایچ ڈی بھی کرنے کا ارادہ ہے تو Continue کر سکتی ہو البتہ جاب کرنا خواتین کا مجھے پسند نہیں ہے پھر بھی اگر تم کو تمہارے standard کی سائنٹیفک یا ریسرچ آفیسر لیول کی کوئی جاب ملتی ہے تو میں تم کو منع نہیں کروں گا۔''

الماس نے کچھ کہا نہیں۔ سر ہلا کر اندر چلی گئی اور میرے اندر پہنچنے پر سب سے پہلا سامنا بڑی بھابی سے ہوا تھا۔

''ارے تم لوگ اتنی جلدی آگئے۔'' بڑی بھابی نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

''اب کیا رات بھی باہر گزارتے' بڑی بھابی۔'' جواب دیتے ہوئے خفگی خود بخود میرے لہجے میں آگئی۔

''گزار لیتے' کیا حرج تھا۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''مجھے کل آفس جانا ہے۔'' میں نے قدرے برا مان کر جواب دیا تھا۔

''کوئی بات نہیں' وہ تو تم ہمیشہ جاتے ہو۔'' انہوں نے کندھے اچکا کر کہا۔

''کھانے میں کتنی دیر ہے؟'' میں نے بات بدلنے کو پوچھا اور فی الحال مجھے پوچھنے کو سب سے معقول بات یہی لگی تھی۔ بڑی بھابی نے اسی پر پکڑ لیا تھا۔

''ہائیں' میں تو سمجھ رہی تھی کہ ڈنر بھی کر کے ہی آؤ گے تم لوگ۔''

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' اب کی بار میں نے قدرے بے زاری سے کہا تھا۔ ''میں ایک وقت کا کھانا ہی باہر کھا لوں تو میرے لیے بڑی بات ہے۔''

''اچھا تو اس میں اس قدر ناراضگی والی کیا بات ہے۔ کھانا تقریباً تیار ہے۔''

''اچھا تو بس میں نماز پڑھ کے آکر کھانا کھاؤں گا۔'' میں نے کہہ کر جلدی کھسک جانے میں عافیت سمجھی' کہیں وہ مجھ سے انکوائری نہ شروع کر دیں اور میں سمجھ

تھا کہ یہ انکوائری ذرا خطرناک قسم کی ہی ہوتی۔

میں نماز پڑھ کے آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ حسب معمول کھانا بڑی بھابی یا چھوٹی بھابی نے بنایا تھا۔ اسپیشل ڈش کبھی بنتی ہوتی تھی تو امی بناتی تھی۔ میٹھا بھی امی بناتی تھیں۔ اس وقت بھی میٹھے میں کھیر تھی۔ بڑی بھابی نے ہنس کر کھیر کی ڈش میری طرف بڑھائی۔

''دیور جی' کھیر چکھ کر تو بتاؤ کیسی بنی ہے؟''

میں نے سوالیہ نظروں سے بڑی بھابی کو دیکھا۔''بھابی' شروعات ہیڈ آف دی فیملی سے کی جاتی ہے۔ میں کہاں کا ہیڈ رکھا ہوں۔''

میری بات سن کر گھر بھر مسکرانے لگا۔ بچے کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ الماس البتہ سنجیدہ سی تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔

''چچو' اس میٹھے میں کچھ خاص بات ہے۔'' فاران عادل نے کہا تھا۔

''اُفوہ' فاران' چپ' تم بہت بولتے ہو۔'' بڑی بھابی نے ڈانٹ کر اسے چپ کروایا۔

''اچھا تو کسی کھیر کی Recipie کو پہلی مرتبہ ٹرائی کیا ہو گا۔'' میں نے گویا اندازہ لگانا چاہا تھا۔

''ارے نہیں بھئی!'' امی نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

''یہ کھیر بہو نے بنائی ہے آج۔'' امی کے بجائے ابو نے بہت خوش ہو کر بتایا تھا۔

میں نے اس لمحے بغور ابو کو دیکھا۔ وہ خوشی خوشی صرف بتا ہی نہیں رہے تھے بلکہ خوش لگتے بھی تھے۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا۔ واہ' بہو سے بڑا خوش ہیں ابو...... میں نے رشک سے سوچا تھا۔ مجھ سے تو خفا ہی رہے۔ چلو مجھ سے Related کسی شخص سے سہی' ابو خوش تو ہیں۔ اس لمحے پتا نہیں کیوں مجھے پہلی مرتبہ الماس سے جلن نہیں ہوئی تھی۔

''اور بھئی' اس کھیر کے افتتاح کے ساتھ ہی جواہر نے کچن میں بھی اپنے جوہر دکھانے کا آغاز کر دیا ہے۔'' بڑی بھابی نے ہنس کر کہا۔

''چلو جلدی سے چکھ کر بتاؤ۔'' ابو مجھ سے کہہ رہے تھے۔

''پہلے آپ لے لیں۔'' میں نے ڈش ابو کی طرف بڑھا دی۔

''ارے بھئی' میں تو لے ہی لوں گا اور مجھے پسند بھی آجائے گی کیونکہ یقیناً اچھی ہی بنی ہو گی۔ ساری بات تو تمہاری پسند کی ہے۔ حتمی فیصلہ تو تمہاری رائے ہی دے گی۔'' ابو نے کہتے کہتے کھیر خود ہی میرے پیالے میں ڈال دی تھی۔

اور بعد ازاں گھر بھر نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے تھے۔ اپنے گھر والوں کے ہر فعل سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے گھر میں الماس کی اہمیت کیا ہے اس سے پہلے تک میں صرف سمجھ سکتا تھا' اندازہ کر سکتا تھا۔ آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ابو نے نہ صرف تعریف کی تھی بلکہ اسی وقت کئی کڑکڑاتے نیلے نوٹ الماس کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔ نہ صرف ابو نے بلکہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی نے بھی پھر سب لوگ متوقع نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ امی نے تو مجھ سے پوچھ بھی لیا تھا۔

''تم کیا دے رہے ہو بہو کو افنان؟''

اور میں اس اچانک سوال پر سٹپٹا سا گیا تھا۔

''بھئی سارہ' یہ ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ خود ہی طے کر لیں گے۔'' ابو نے بروقت مجھے بچا لیا تھا۔ میں نے دل میں شکر ادا کیا تھا۔

اس رات پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ میں الماس سے پہلے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میرے کمرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی یہ کمرہ سجا بھی ہو گا۔ آراستہ بھی کیا گیا ہو گا بلکہ اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ ابھی بھی صرف میرے زیر استعمال ہے جیسا کہ میری شادی سے پہلے تھا اور کسی دوسرے کا یہاں پر کبھی کوئی وجود رہا ہی نہیں ہو گا' وہ بھی ایک عورت کا۔

میں حیرانگی سے چاروں طرف دیکھ رہا اور سوچ رہا تھا اور یہ پہلی مرتبہ تھا جو آج میں اپنے کمرے کی ہیئت پر اس قدر غور کر رہا تھا ورنہ الماس کی کمرے میں موجودگی کی صورت میں نہ میں اس پر دھیان دیتا تھا۔ نہ ہی کسی اور چیز پر پھر اس کمرے کو اسی حالت میں Maintain رکھنے کا کمال بھی الماس کو ہی حاصل رہا ہو گا۔ میں نے طویل سانس لی اور بیٹھ کر الماس کے مہر کے لیے چیک لکھنے لگا۔

جب الماس کمرے میں آئی تو میں اس کے آنے پر اس کی ہر ہر Activity کو Observe کرتا رہا تھا۔

''تم مسہری استعمال کیوں نہیں کرتی ہو؟'' اس کو زمین پر بستر بچھاتا دیکھ کر میں نے ایک دم ہی پوچھا تھا۔

''تم زمین استعمال کرتے ہو تو میں مسہری استعمال کیسے کر سکتی ہوں؟''

وہ مجھے اکثر لاجواب کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی ایک لمحے کے لیے تو میں کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم فرش پر سوتی ہو۔'' میں نے آہستگی سے کہا تھا۔

''مجھے بھی بہت برا لگتا ہے جب تم زمین پر سوتے ہو۔'' اس نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا اور پھر وہ اپنے بال کھولنے لگی تو میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

''تم بال کھول کر مت سویا کرو۔''

چوٹی کے بل کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ ''اچھا نہیں کھولوں گی۔'' آہستگی سے کہہ کر چوٹی میں دوبارہ بل دے کر اس نے بال باندھ لیے تھے۔

میری نظر ایک بار پھر اس کے بالوں کی لمبائی میں الجھنے لگی تھی۔ اس نے بال ایک دم پیچھے کیے تو میرا حال رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے چور کی طرح ہو گیا۔ میں گڑبڑا سا گیا تھا۔

''کھیر مزے کی تھی۔'' ایک دم میرے منہ سے نکلا۔

''اچھا میں بھی تم کو پسند نہیں آئی۔ تم نے اس وقت کچھ کہا نہیں تھا ناں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اب گھر بھر کے سامنے کیا کہتا میں......'' میں الٹا اس سے پوچھنے لگا۔ پھر چند لمحے رک کر اس سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے بتایا نہیں۔ تم مجھ سے کیا لینا چاہو گی؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''تم کو پسند آ گئی۔ تم نے تعریف کر دی۔ یہی بڑی بات ہے میرے لیے۔''

اس کے دو ٹوک انداز پر میں کچھ کہہ نہ سکا مگر آگے بڑھ کر اس کے مہر کا چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''یہ تمہاری ہی چیز ہے۔ مجھے تم کو بہت پہلے دے دینی چاہیے تھی مگر میں بہت دیر سے دے رہا ہوں۔'' میرے بتانے پر بھی وہ مجھے کچھ نہ سمجھ میں آ سکنے والے انداز میں دیکھتی رہی۔ ''یہ مہر ہے تمہارا۔'' مجھے اسے بتانا پڑا۔ وہ چند لمحے چیک کو دیکھتی رہی مگر اسے چھوا تک نہیں۔

''بے فکر رہو تم۔ چیک کیش ہو جائے گا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں خاصی رقم ہے۔'' میں نے وضاحت دی تھی۔

''یہ بات نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں چیک کیش ہو جائے گا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں تمہارے بینک اکاؤنٹ میں رقم بھی اچھی خاصی ہو گی۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں' میں اس

کا کروں گی کیا؟"

اس کی لمبی چوڑی بات کے جواب میں، میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ "جو چاہے سو کرو۔ تمہارا حق ہے، تمہارا پیسہ ہے۔"

اس نے خاموشی سے چیک میرے ہاتھ سے لے لیا پھر گویا خود سے کہا تھا۔ "آج کا دن عام دنوں سے ہٹ کر ہے، قدرے بہتر۔ آج ہر طرف سے مجھے بڑی توجہ مل رہی ہے، خیر، تمہارے گھر والوں کی طرف سے تو......"

وہ کہتے کہتے رک گئی تھی اور میں نے بے اختیار پوچھا تھا۔ "کیسے لگے تمہیں میرے گھر والے؟"

"گھر والے تو کسی کے بھی برے نہیں ہوتے۔" اس کا انداز عجیب تھا۔ "تمہارے گھر والے بہت اچھے ہیں۔"

"ہاں بس میں ہی برا ہوں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے فوراً کہا۔ "تم برے ہوتے تو میرے گھر والے میری شادی تم سے کیوں کرتے۔"

میرا ایک دم منہ کڑوا ہو گیا۔ "اپنے گھر والوں کی بات مت کرو۔ اپنے ماما کی کہو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی پھر کہا۔ "یاد ہے، ایک مرتبہ تمہارے شادی کے سوال پر میں نے تم سے کہا تھا، میں ماما سے کہوں گی۔ وہ میری شادی تم سے کروائیں گے، تم کو تب یقین نہیں آیا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "دیکھ لو، میری شادی تم سے ماما نے ہی کروائی ہے۔" پھر چند لمحے بعد مسکرا کر بولی۔ "دیکھو اچھا ہوا ناں۔ محبت سے مصیبت تک کے ہیرو ہیروئن کی طرح ہمیں گھر سے بھاگنے کی نوبت نہیں پیش آئی ورنہ تمہیں تو کسی پہاڑی مقام کے بارے میں بھی پتا نہ ہوتا جہاں ہم پناہ لیتے۔"

میں نے لمحے بھر کو سوچا۔ مجھے پچھلا وقت یاد آ گیا تھا۔ مجھے اپنے جملے یاد تھے۔ ایک ایک لفظ یاد تھا جو کبھی میں نے الماس سے کہا تھا۔ میں نے بے اختیار گہری سانس لی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ، تمہیں صرف کھیر بنانی آتی ہے...... یا......" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں، میں اور بھی بہت کچھ پکا لیتی ہوں۔ بے فکر رہو، میں تم کو بھوکا نہیں ماروں گی۔ میں روٹی بہت اچھی پکاتی ہوں۔" اس نے بہت اعتماد سے کہا۔ میں نے چونک کر

اسے دیکھا۔ "تمہیں نہ مجھے روٹی پکانی سکھانی پڑے گی نہ میرے ہاتھ کی جلی ہوئی روٹی کھانی پڑے گی۔"

اس کے کہنے پر میں چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ کیا، کیا یاد تھا اسے اور وہ مجھے کیا کیا یاد دلا رہی تھی۔

"اب ظاہری بات ہے میرے ہوتے ہوئے تم کو یہ اچھا تو نہ لگتا ناں کہ بڑے بھائی یا چھوٹے بھائی تمہارے لیے روٹی پکاتے۔"

اس کے اس طرح کہنے پر میری مسکراہٹ بے ساختہ تھی اور یہ کتنے ہی سال بعد تھا جو میں اس طرح مسکرایا تھا اور وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"ویسے تمہارے بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کو ابھی تک اچھی روٹی پکانا یاد ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی کے آجانے کے بعد سے۔ وہ دونوں اب کچن میں قدم بھی نہیں رکھتے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تو اب تک بیلن بھی پکڑنا بھول گئے ہوں۔" الماس میری بات سن کر مسکرائے گئی۔ "مگر!" میں اسے دیکھ کر کہے گیا۔

"اب میں روٹی، پانی میں بھگو کر تو کھاؤں گا نہیں۔ پورا کھانا پکانا تو تم کو آتا ہی ہو گا اور سینے سلانے کا بہترین نمونہ تو میں دیکھ ہی چکا ہوں۔"

اب کی بار الماس کی مسکراہٹ بے ساختہ اور بھرپور تھی۔ "اور تمہیں پیسہ کمانا آ گیا ناں؟"

"ہاں، اور میری شیو بھی پوری آ گئی ہے۔" میں نے بچوں جیسے انداز میں اسے بتایا۔ "تم نے مجھ سے پہلی چیز خرید کر دینے کی فرمائش نہیں کی؟"

"تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"پوچھا تو تھا، تم نے کہا ہی نہیں کہ......" میں کہتے کہتے رک گیا۔ جو کبھی الماس نے کہا تھا، وہ میں کہہ نہیں سکتا البتہ وہ قدرے سنجیدہ سی ہو گئی اور میرے کچھ نہ کہنے کے باوجود کہہ رہی تھی۔

"یہ بھی ضروری تھا کہ میں تم سے کہتی؟ یہ مطالبہ تو تم کو میرے کہنے سے پہلے ہی پورا کر دینا چاہیے تھا۔" الماس کا لہجہ ذو معنی تھا اور الفاظ بھی پُرمعنی تھے، میں چپ سا ہو گیا۔ فوراً بات پلٹ دی۔

پھر اس رات ہم نے پہلی مرتبہ پرانے قصے دہرا کر مزے لیے۔ خوب ڈھیر ساری

باتیں کیں۔ اچھے دوستوں کی طرح پرانے شناساؤں کی طرح......

پھر پتا نہیں کیوں...... اچانک میری ذہنی رو بھٹک گئی تھی۔

☆======☆======☆

میری زندگی میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ویسی ہی تھی مصروف اور روکھی پھیکی سی...... البتہ اس دن افنان مجھے پہلی بار اپنے ساتھ کہیں لے کر گیا تھا۔ ساحل سمندر پر پہنچ کر ہم دونوں کناروں پر پڑے پتھروں سے ٹکراتی لہروں کو دیکھتے رہے تھے۔ موسم اس دن بہت خوب صورت تھا مگر موسم کی یہ خوبصورتی بھی افنان کے موڈ پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ وہ پتھر بنا لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں بور ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے یہاں لانے میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔

''تم مجھے یہاں کسی کے کہنے پر لائے ہو؟'' تنگ آ کر میں نے پوچھ لیا تھا لیکن وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے اٹھ کھڑا ہوا تھا پھر لنچ کے بعد وہ مجھے آئس کریم پارلر بھی لے گیا تھا لیکن میں کہیں بھی ایک لمحے کے لیے بھی انجوائے نہیں کر سکی تھی۔ واپسی کے وقت آدھا راستہ طے کر لینے کے بعد اس نے مجھے اطلاع دی تھی۔ ''میں تم کو تمہارے والدین سے ملوانے لے کر جا رہا ہوں۔''

''اور تم نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ کس کے کہنے پر۔''

''یہ بتانا ضروری تو نہیں۔''

''کیا بڑے بھائی کے کہنے پر۔'' میں نے ایک دم سوال کیا۔

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر آہستگی سے کہا۔ ''خواہ کسی کے کہنے پر سہی۔''

''تابعداری تو اچھی بات ہے مگر یہ Phase کتنا لمبا ہے۔'' میرے سوال پر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

بقیہ راستہ خاموشی سے کٹا۔ گھر سے ذرا پہلے مٹھائی کی دکان کے سامنے اس نے گاڑی روکی تو میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''پہلی بار تمہارے ساتھ تمہارے والدین کے گھر جا رہا ہوں' خالی ہاتھ جانا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔

میں نے شکر کیا تھا۔ کم از کم اتنی تمیز اور رواداری تو اس میں تھی۔

ابو امی مجھے اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میرا حال احوال پوچھنے اور مجھ سے دو ایک باتیں کرنے کے بعد ابو امی سارے وقت افنان عادل سے باتیں کرتے رہے اور وہ بڑی تمیز' شائستگی اور سلجھے ہوئے انداز میں ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ عاقب اور ثاقب بھی اس سے یوں گھل مل گئے تھے گویا اسے ازل سے جانتے ہوں۔ ابو اور امی نے افنان عادل کی خوب اچھی طرح سے خاطر داری کی۔ ریفریشمنٹ میں تقریباً ہر قسم کے میٹھے اور نمکین سے ٹیبل بھر دی۔ وہ تو کھانے کے لیے بھی روک رہے تھے مگر افنان نے خود ہی منع کر دیا۔

واپسی پر افنان عادل نے مجھ سے کہا۔ ''اپنے ماما کے گھر کا پتا مجھے بتا دو' تم ملنا چاہتی ہو تو لے چلوں گا۔''

میں اس کی فیاضی پر حیران ہو رہی تھی کہاں تو وہ ان کا ذکر بھی سننا پسند نہیں کرتا تھا اور کہاں نہ صرف آج خود ذکر کر رہا تھا بلکہ ملانے کی آفر بھی کر رہا تھا۔ یہ آدمی سمجھ سے باہر ہی تھا۔

''نہیں۔'' میں نے صاف منع کر دیا تھا۔ اس نے نہ جانے کس دھن میں پوچھ لیا ہو گا۔ میں کہیں ہاں کہہ دیتی تو مزاج ہی نہ خراب ہو جاتا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مجھ سے معذرتی انداز میں کہا تھا۔ ''سوری' آج اسی طرح سارا دن نکل گیا۔ میں تم کو کسی بیوٹی سیلون نہیں لے جا سکا۔''

''بیوٹی سیلون میں اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ گئی ہوں۔ ذاتی طور سے مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ ویسے اگر تم کہو گے تو میں چلی جایا کروں گی۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ ان عنایات کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''تمہیں پسند نہیں ہے تو پھر رہنے دو۔'' اس نے اعتراض کیے بغیر کہا۔ پھر چند لمحے بعد بولا۔ ''میں شاپنگ تم کو پھر کبھی کروا دوں گا۔ چھٹی والے دن تو ویسے بھی بازار بند ہوتا ہے۔''

''مجھے شاپنگ سے کوئی دلچسپی ہے تو نہیں۔ تمہارے ساتھ چلی چلوں گی۔'' میں نے اس کی یہ مشکل بھی آسان کر دی تھی۔

پھر جب ہم گھر پہنچے تو تقریباً سبھی نے حیرت سے پوچھا تھا کہ تم لوگ جلدی نہیں آ گئے؟ اوپر سے بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی کا شریر انداز...... ذومعنی جملے شرارت آمیز مسکراہٹ...... میں بالکل بوکھلا گئی تھی۔ سب کی نظروں کا سامنا کرنا مجھے خاصا مشکل ہو رہا تھا اور افنان عادل حسب معمول فرار ہو چکا تھا۔ میں پھنس گئی تھی۔ بڑی بھابی' چھوٹی بھابی کے سوالات تھے اور میں تھی۔

''دن کیسا گزرا؟''

''اچھا گزرا۔''

''مزا آیا؟''

''بہت۔''

''کہاں کہاں گئے۔ افنان نے لنچ کہاں دیا؟''

میں نے بتا دیا میں حتی المقدور ان کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جائے فرار مجھے نظر نہیں آ رہی تھی اور جب دونوں بھابیاں مل جاتی تھیں تو الامان الحفیظ! ''افنان نے کیا کچھ کہا؟'' چھوٹی بھابی کے سوال پر میں پٹپٹا سی گئی۔

''یہ تو بہت پرسنل ہو جائے گا چھوٹی بھابی!''

میں نے خود پر بمشکل قابو پاتے ہوئے باوقار لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے Directly میری عزت کا سوال تھا اور Indirectly افنان عادل کی عزت کا..... اب کہنے کو تو میں نے کہہ دیا تھا مگر میں کہہ کر بہت پچھتائی کیونکہ بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی نے مجھے خاصا چھیڑا تھا مگر بروقت امی کے آ جانے سے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ میں نے بہت شکر ادا کیا تھا۔

''تم لوگ آ گئے اور پتا بھی نہیں چلا ہمیں۔'' میں اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی۔ انہیں یقیناً برا لگا ہو گا۔

''امی! یہ آپ ہی کی طرف جا رہی تھی۔ ہم نے اسے روک لیا۔'' بڑی بھابی نے جلدی سے کہا۔

میرا سانس بحال ہوا تھا ورنہ آج تو میرا برا بننا لازمی تھا۔

''چھ بہو! اتنی جلدی آنے کی آخر کیا ضرورت تھی۔'' امی نے اچانک مجھ سے کہا۔

ابھی میں کوئی جواب بھی دینے نہیں پائی تھی کہ بڑی بھابی نے کہا۔ ''اور یہ لوگ تو ڈنر بھی کر کے نہیں آئے۔ ابھی افنان کھانا تیار کر کے رکھنے کا کہہ کر گیا ہے۔''

''اچھا چلو تم فریش ہو کر تو آؤ۔ پھر کھانا کھائیں گے۔'' امی نے بڑی بھابی کی بات پر تبصرہ کیے بغیر مجھ سے کہا۔ میں سر ہلاتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ وہ اندر موجود نہ تھا شاید نماز پڑھنے گیا ہو۔ میں کپڑے بدلتے ہوئے سوچے گئی۔ باہر آئی تو ابو کو سامنے پایا۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ ''ارے بھئی بہو! میں تو سوچ رہا تھا۔ رات کا کھانا بھی تم لوگ باہر ہی سے کھا کر آؤ گے۔'' انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا۔

''نہیں ابو ہمارا ایسا تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ویسے اچھا کیا۔'' انہوں نے راز داری سے کہا۔ ''اچھا ہے آج ہی رات کے کھانے پر کھیر کا افتتاح ہو جائے گا۔ جب سے مجھے پتا چلا ہے کہ آج تم نے کچھ بنایا ہے تو انتظار نہیں ہو رہا۔'' ابو نے اتنی معصومیت سے کہا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

''آپ لوگوں نے دوپہر کے کھانے پر ہی افتتاح کر لیا ہوتا' اتنا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ابو سے کہا۔

''ارے واہ' افنان کے بغیر کیسے کر لیتے؟ شوہر کا حق تو پہلے ہے۔'' وہ اسی انداز میں بولے۔ میں فقط ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

پھر رات کے کھانے پر بھی میں نے افنان عادل کو کھاتا کم اور کھیلتا زیادہ پایا۔ جب کھیر کی باری آئی اور ابو کے بتانے پر کہ میں نے بنائی ہے' اس کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ میں اس کو چوری چوری دیکھ رہی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے اردگرد سے بے نیاز ہو کر اپنے پیالے میں موجود کھیر ختم کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں نہ شوق تھا نہ رغبت..... اس نے ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ کھیر لی بھی نہیں تھی جبکہ گھر بھر نے مزے لے کر نا صرف کھائی تھی بلکہ بے حد تعریف بھی کی تھی۔ ابو' بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی نے میرا انعام اسی وقت مجھے دے دیا تھا۔ مجھے اتنی محبتوں پر رونا آنے لگا تھا۔ واقعی افنان عادل کے گھر والے بہت اچھے تھے اور وہ خود بغیر کچھ کہے' کوئی کامپلیمنٹ دیے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ مجھے اس کے انداز پر حیرت نہیں ہوئی تھی پھر بھی مجھے تھوڑی تکلیف ضرور ہوئی تھی لیکن میں سب کے چلے جانے کا انتظار کرتی رہی تھی اور اس کے بعد میں نے ابھی پوری ٹیبل سمیٹی بھی نہیں تھی کہ بڑی بھابی' چھوٹی بھابی نے مجھے فوراً آرام کرنے کا مشورہ دے دیا۔ میں تھک تو گئی تھی مگر اتنا بھی نہیں۔ بہرحال ان دونوں کے اصرار پر جب میں کمرے میں واپس آئی تو خلاف توقع افنان عادل پہلے ہی سے موجود تھا مجھے خوشگوار حیرت سی ہوئی عموماً میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی' پھر دو تین باتوں کے بعد اس نے کھیر کی تعریف کی تو مجھے اچھا لگا تھا پھر جب اس نے مہر کا چیک دیا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ آج واقعی اس کی دماغی حالت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس رات اتنے عرصے بعد میں نے اسے پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو میں نے کبھی اس سے کہے تھے۔ مجھے ایک ایک لفظ یاد تھا اور اس میں بھولنے والی کوئی بات تو نہیں تھی۔ میں مسکرائے جا رہی تھی۔

''الماس' تم ہنستی نہیں ہو؟'' اس نے اچانک مجھ سے پوچھا تھا۔

''کوئی ہنسنے والی بات ہو گی تو ضرور ہنسوں گی۔'' میں نے اس کے جملے اس کو لوٹا

دیے تھے۔

''ہنسنے پر تمہارے گالوں میں ڈمپل پڑتے تھے۔'' اس نے سوچتے ہوئے سے انداز میں کہا۔

''تم نے نوٹ نہیں کیا۔ میرے بولنے پر اور مسکرانے پر بھی میرے گالوں میں ڈمپل پڑتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''تمہارے ڈمپل مجھے پسند تھے۔'' وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔ ''میرا دل چاہتا تھا......'' وہ کہتے کہتے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اور تمہارے پمپلز کہاں گئے؟'' اس کے سوال پر میں نے خاصی حیرانی سے اسے دیکھا۔

''پمپلز تو اب نہیں رہے۔'' میں نے الجھن سے بتایا۔

''وہ تو مجھے نظر ہی آرہا ہے مگر وہ...... وہاں انگلینڈ میں ہم......'' وہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گیا۔

''انگلینڈ میں کیا؟'' میں نے حیرانگی سے سوال کیا۔ عجیب ادھوری سی باتیں کر رہا تھا وہ...... نہ سمجھ میں آنے والی......

''کچھ نہیں' کچھ نہیں۔'' وہ نفی میں سر جھٹکنے لگا۔ تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ تمہارے پمپلز کہاں گئے؟'' وہ ایک بار پھر پوچھ رہا تھا۔

میں نے الجھن سے دہرایا۔

''پمپلز تو شاید اس وقت ایج فیکٹر رہے ہوں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ اس کا یہ سوال مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ''تم مگر کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے الجھن سے کہا۔

پھر مجھے ایک دم یاد آ گیا۔ ''اوہ ڈمپلز اور پمپلز۔'' میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

وہ محویت سے مجھے تکتا رہا۔ میری طرف ہاتھ بڑھایا پھر ایک دم پیچھے کر لیا۔ میں نے کوفت کے عالم میں اسے دیکھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ''عجیب ہستی رہو۔ ابھی لگ رہی ہو۔'' اور اس بار میں خاصی بے دلی سے ہنسی تھی۔ ''تم میری کسی بات کو مانتی نہیں ہو۔'' اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''میری کسی بات سے اختلاف نہیں کرتیں؟''

''اس میں اختلاف کرنے والی بات بھی کیا ہے اور میں تمہاری کسی بات کو کیسے ٹال سکتی ہوں۔ مجھے اپنی عاقبت خراب نہیں کرنی۔'' میں نے اب کی بار سنجیدگی سے کہا۔

''اتنا مانتی ہو تم مجھے؟'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

''ہاں' اس سے بھی زیادہ۔'' میں نے یقین سے کہا۔

''کیوں بھلا؟''

''میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں افنان۔''

''تم میری عزت کرتی ہو۔'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ پھر پوچھا۔

''کیوں......؟''

''افنان......! اب اس سوال کا جواب میں تم کو کیا دوں؟ ہاں اگر تم مجھ کو بتا دو کہ سورج زرد کیوں ہے' سرخ بھی تو ہو سکتا تھا۔ چاند گول کیوں ہے' چوکور یا تکون بھی تو ہو سکتا تھا۔ آسمان کا رنگ نیلا کیوں ہے' ہرا بھی تو ہو سکتا تھا۔ سورج صرف دن میں ہی کیوں نکلتا ہے' ستارے رات ہی میں کیوں نظر آتے ہیں۔ اگر تم مجھے ان سب سوالوں کے جواب دے سکو تو میں تم کو بتا دوں گی کہ کوئی کسی کی عزت کیوں کرتا ہے۔''

افنان عادل نے میری بات سن کر لمبا سکوت اختیار کیا۔

''تمہیں مجھے دیکھ کر کوئی خیال نہیں آتا؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''نہیں' تمہیں دیکھ کر مجھے صرف یہ خیال آتا ہے کہ اب تم میرے شوہر ہو۔ تم جو کہو گے میں سنوں گی مانوں گی۔ تم جو چاہو گے میں کروں گی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

وہ ایک دم مسکرا دیا۔ ''پھر تو اچھا ہوا تم نے مجھے میٹھا کھلایا۔ اب جب تک میں تم سے نہ کہوں مجھے نمک مت کھلانا کیونکہ اگر تم مجھے نمک کھلاتیں تو مجھے نمک کا حق ادا کرنا پڑتا۔''

''اور نمک کا حق تم کیسے ادا کرتے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہ میں پھر کبھی تمہیں بتاؤں گا' ابھی فی الحال کچھ کھانے کے لیے ہو تو لے آؤ۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے بات پلٹ دی ہے۔

''سینڈوچز بنا دوں' چپس کے ساتھ میں کافی؟''

''نہیں۔'' اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسا کرو کھیر ہی لے آؤ' ہے کیا۔''

''ہے ناں' ابھی لائی۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور فریج سے پوری ڈش اٹھا کر لے آئی۔

''ارے اتنی ساری۔'' وہ بھی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''کیا بہت بنائی تھی۔''

''نہیں...... مگر تمہارے لیے امی نے خاص طور سے رکھوا دی تھی۔'' میں نے اسے

کھیر علیحدہ پیالے میں نکال کر دیتے ہوئے کہا۔
''ہاں میری امی بہت اچھی ہیں۔'' اس نے بہت مان سے کہا۔
''تمہارے ابو بھی بہت اچھے ہیں افنان۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ منہ تک چمچ لے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔
''میں جانتا ہوں۔'' چمچ واپس پیالے میں ڈالتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔
''وہ تم سے ناراض نہیں ہیں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ میں اسے بتاتے بتاتے رہ گئی کہ ابو اور میرے درمیان کیا گفتگو ہو چکی ہے ممکن ہے اس کی خودداری اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ اس کی جانب سے کوئی اور بات کرے۔
''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' وہ اب مجھ سے پوچھ رہا تھا۔
''تم نے خود غور کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔
''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' چند لمحے بعد اس نے بے جان سے لہجے میں کہا۔ ''جب تک وہ یہ بات خود مجھ سے نہیں کہیں گے اور جب تک میں خود ان کے منہ سے نہیں سن لوں گا مجھے یقین نہیں آئے گا۔''
''تم ان سے خود بات کیوں نہیں کر لیتے؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔
''کتنی مرتبہ کروں۔'' وہ دبیز سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔
میں خاموش ہو گئی۔ یہ لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انا' خودداری' غیرت ان پر ختم ہے۔ باپ سے کیسی غیرت...... کیسی خودداری' کیسی انا...... میں اس سے کہہ نہ سکی۔ کہیں وہ برا مان جاتا۔ اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ آف ہو جاتا' وہ چیخ پڑتا۔ ''یہ میرا اور میرے باپ کا آپس کا معاملہ ہے تم اس میں مت پڑو۔'' ایسے میں' میں کیا کرتی۔ میں نے اصرار مناسب نہیں سمجھا اور وہ خاصی بے دلی سے اپنے پیالے میں موجود کھیر ختم کر رہا تھا۔ مجھے افسوس سا ہوا۔ ناحق میں نے یہ موضوع چھیڑ دیا۔ کم سے کم اسے ڈھنگ سے کھا تو لینے دیتی' میں اسے دیکھتے ہوئے سوچ گئی۔
وہ ایک دم چونکا۔ ''ارے میں اکیلا ہی کھائے جا رہا ہوں' تم بھی تو لو ناں۔'' اس نے ڈش میری طرف بڑھائی۔
''نہیں' بس تم کھاؤ' مجھے میٹھا کچھ پسند نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔
''تمہیں ابھی بھی نمکین زیادہ پسند ہے۔'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں!'' میں نے مختصراً کہا اور شکر ادا کیا۔ اس کا دھیان اس موضوع سے ہٹ گیا تھا۔
''میں تمہیں ابھی بھی نمکین نمکین سا لگتا ہوں۔'' اب کی بار اس نے قدرے شرارت سے پوچھا تھا۔ یہ شرارت بھی اس کے مزاج کا حصہ تھی اور اب......
میں خاموشی سے اسے تکے گئی پھر آہستگی سے کہا۔ ''ہاں۔''
''حیرت ہے میٹھا پسند نہ ہونے کے باوجود بھی تم کڑوی نہیں ہو۔'' اس نے مزے سے میرے متعلق رائے دی۔
''تم اتنا میٹھا کھانے کے باوجود بھی ایک دم ترش ہو۔ بالکل کھٹے۔''
''اور تمہیں کھٹاس پسند نہیں ہے۔''
''نہیں' اب میں کھٹاس برداشت کر بھی لیتی ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔
''تمہیں ابھی بھی کچی چیزوں کا مزا پسند ہے؟ کچے امرود' کچے آم؟''
''نہیں' اب کچی چیزوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس کا لہجہ بہت گہرا تھا۔ ''چاہے وہ کچے آم ہوں' کچے امرود ہوں' کچے لیموں یا کچی مٹی۔''
میں حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''آم' امرود' لیموں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن کچی مٹی......؟'' اور وہ کہہ رہا تھا۔
''کچے امرود کھا کر پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔''
''اور کچے آم کھا کر؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔
''گلا!'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں بے اختیار آنے والی ہنسی نہیں روک پائی اور وہ سنجیدہ سا تھا۔ میری ہنسی کو بھی ایک دم بریک لگ گئے سو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اچھا کچی مٹی کا کیا معاملہ ہے۔''
اس نے ایک دم ہونٹ بھینچ لیے۔
''کچی مٹی بہت خطرناک ہوتی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے بتایا۔ ''اس سے اٹھنے والی بھینی اور سوندھی مہک آدمی کو پاگل کر سکتی ہے۔''
''چہ...... مجھے تو کبھی نہیں کیا۔'' میں نے اعتراض کیا۔
''میں آدمی کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔
''چہ' عجیب بات کر رہے ہو' کچی مٹی کیسے آدمی کو پاگل کر سکتی ہے۔''
''تم نہیں سمجھ سکو گی اس بات کو۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
''میں نہیں سمجھ سکوں گی تو تم سمجھا دو۔''

''میں تم کو سمجھا نہیں سکتا۔'' اس نے لاچاری سے کہا۔

''اچھا تو پھر تم مجھے یہی سمجھا دو کہ ہماری Relationship کی نوعیت کیا ہے؟''

''میں تم کو یہ بھی نہیں سمجھا سکتا کیونکہ Actual relationship develop نہیں ہو پایا۔'' اس نے نظر جھکا کر آہستگی سے کہا۔

''تو پھر ہمارے درمیان کیا ہے افنان؟''

''آں۔'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''ہمارے درمیان کیا ہے؟ ''ہمارے درمیان...... کوئی Attractive force کیوں نہیں ہے اب؟''

''کیونکہ اب ہمارے درمیان صرف ایک Barrier ہے۔'' اس نے بدستور سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

''کیسا Barrier......'' مجھے ظاہر ہے بالکل سمجھ میں نہ آیا تھا۔

''تم سمجھ نہیں سکو گی۔'' اس نے پھیکے سے انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''اور میں تم کو سمجھا نہیں سکوں گا۔'' کہتے کہتے وہ ایک دم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں جو حیرت میں ڈوبی ابھی اس کے الفاظ کو ہی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے اس طرح اٹھنے پر مزید حیرت زدہ ہو گئی۔ ''کیا ہوا۔'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے اپنی چادر اور کشن اٹھاتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ ''سونے میں بہت دیر ہو گئی۔'' وہ اب فرش پر اپنا بستر بچھا رہا تھا۔ ''اور مجھے کل آفس جانا ہے۔ تم بھی سو جاؤ اب۔'' وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹتے ہوئے مجھے مشورہ دے رہا تھا۔ میں بس اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ شاید سو بھی چکا تھا۔ میں جل بھن سی گئی۔ اس آدمی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر۔ میں جھنجلا کر سوچا اس کو بیٹھے بٹھائے ہو کیا جاتا ہے۔ ذہنی رو بہک کیوں جاتی ہے ایک دم میں خود سوال کرتی رہی مجھے کوئی جواب نہ مل پایا۔

اور اس کا رویہ نہ صرف اس رات بلکہ اگلی کئی راتوں اور دنوں میں ایسا ہی الجھن لیے ہوئے اور الجھن میں مبتلا کر دینے والا...... کچھ نہ سمجھ میں آنے والا ـــــ وہ کبھی تو اتنا مہربان ہو جاتا اور کبھی ایک دم Rude اور Harsh ' کبھی اتنا قریب ہو جاتا کہ ہاتھ بڑھا کر پکڑ لو' کبھی اتنا دور کہ بھاگتے بھاگتے تھک جاؤ اور چھو بھی نہ سکو

جیسا سا لگتا کہ جیسے صدیوں کی جان پہچان ہو اور کبھی اتنا اجنبی کہ پہچان بھی کبھی نہ رہی ہو۔ کبھی موم کی طرح لگتا کہ جیسے چاہوں ڈھال لوں اور کبھی ایسا پتھر جو کھسکایا بھی نہ جا سکے۔ کبھی اتنا بھلا لگتا جیسے چاندنی برساتا چاند اور کبھی اتنا برا لگتا جیسے آگ برساتا سورج......

کبھی واقعی شریک سفر لگتا تو کبھی ایک غیر' پرایا' نامحرم مرد...... میں اس کے رویے سے اب تو تھکنے لگی تھی۔ مجھے اب لگنے لگا تھا جیسے وہ موم نہیں ہے' وہ پتھر ہی ہے۔ میں چاہے جو کچھ کرلوں' کر کر کے مر جاؤں' وہ موم ہو نہیں سکتا' کبھی نہیں اور سچ بات ہے میں نے سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا تھا۔ پاگلوں کی طرح سب کو اپنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے والد' اس کی والدہ' اس کے باقی گھر والے۔ واقعی میں کہاں تھی' میں تو ختم ہو گئی تھی۔ ان سب کے بیچ...... اور اگر اس کے گھر والے میرے گرویدہ تھے تو مجھے اس کے گھر والوں سے کیا کرنا تھا' وہ تو پھر بھی موم نہیں ہوا تھا۔ پگھلا نہیں تھا۔

مجھے سخت مایوسی ہونے لگی تھی۔ میری برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ہر رات میری گھٹ گھٹ کے سسکیاں لیتے ہوئے اور ہر صبح کا آغاز روتے ہوئے ہوتا تھا۔ پہلے بد گمانیاں تھیں اور اب تو میں سنجیدگی سے علیحدگی کے امکانات پر غور کرنے لگی تھی۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ بے شک مجھے اسے دے دیا گیا ہے مگر ہمارا ساتھ زیادہ وقت کا تھا نہیں شاید قسمت میں یہی لکھا ہے میری کہ شادی کے کچھ عرصے بعد مجھے طلاق ہو جائے۔ میں جتنا سوچتی' میرا یقین مضبوط ہوتا جاتا۔ اس کا رویہ پہلے بھی ناقابل فہم ہی لگتا تھا۔ اب تو اس کا کوئی انداز مجھ سے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ وہ کبھی تو اتنا کیئرنگ ہو جاتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی خیال رکھنے والا آدمی پیدا نہیں ہوا اور اگر لاپروائی پر آجاتا تو لگتا اس سے لاپروا آدمی اس کے بعد کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ وہ توجہ دیتا تو اتنی کہ میں دور بھی ہوتی تو تکتا رہتا اور بے توجہی پر آتا تو میں قریب بھی اگر ہوتی تو کمرے کے کسی کونے میں ڈال کر بھول جاتا۔ بولنے پر آتا تو لگتا اس سے زیادہ باتیں کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چپ رہنے پر آتا تو اسی چپ میں کئی دن گزر جاتے۔ ابھی بے فکری سے مسکرا رہا ہوتا تو اگلے ہی لمحے ہونٹ بھینچ لیتا۔ ایسے جیسے کبھی مسکرایا ہی نہ ہو۔ اچھا بھلا سکون سے بیٹھا ہوتا' ایک دم اٹھ کھڑا ہوتا ٹہلنے لگتا' سر پکڑ لیتا۔ موسم کے مزاج کی طرح پل پل بدلتا اس کا رویہ سامنے والے کو حیران کر دینے والا بلکہ مجھے تو پریشان کر دینے والا تھا۔ میں ابھی بھی اس کے رویے کی عادی نہیں ہو پائی تھی۔

میں اس آدمی کو سمجھ نہیں پائی۔ اس دن بڑی بے بسی سے میں نے خود سے اعتراف کیا تھا۔ اتنے دن اس آدمی کے ساتھ رہ لینے کے باوجود بھی اس کا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے یہ مجھے سمجھنے بھی نہیں دیتا اور خود بھی مجھے نہیں سمجھتا۔

میں اس کو دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی بالآخر مسلسل سوچنے' بہت رو دھو لینے کے بعد میں نے افنان عادل سے حتمی بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا اور میں جانتی تھی کہ اس سے بات کرنے کا وقت وہی ہو سکتا ہے جب وہ کل کے لیے تیاری کیا کرتا ہے۔ کیونکہ اس دوران اس کو لازمی طور سے طوعاً کرہاً ہی سہی' کمرے میں موجود رہنا پڑتا ہے حتیٰ کہ جب وہ سونے کے لیے لیٹنے لگتا اور جب میں اس سے کوئی بات بھی کرنا چاہتی تو وہ صاف انداز میں کہہ دیا کرتا تھا۔ ''پلیز' میں سونا چاہتا ہوں۔'' پھر مجھے اتنے قطعی انداز پر کچھ مزید کہنا گوارا نہیں ہوتا تھا اور اس رات جبکہ وہ اپنے کپڑوں پر استری کرنے کے بعد جوتوں پر پالش کر رہا تھا' میں نے اس سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''افنان' تم مجھ سے راضی نہیں ہو' ایسے کیسے کام چلے گا؟''

وہ ہاتھ روک کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''کیا مطلب ہے؟''

اور میں نے بلا تمہید اور بغیر کچھ لگی لپٹی رکھے سیدھا سیدھا اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اپنی بات کہہ کر میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا لگا تھا مجھے۔ اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش دیکھی۔ داہنے ہاتھ میں پکڑا برش زمین پر رکھتے ہوئے برش میں لگی سیاہ پالش اس کے شفاف ہاتھ پر لگ گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا تھا۔ عجیب سی خوشی ملی تھی دل کو کہ سامنے والے کو ہلا کر رکھ دینے والا افنان عادل خود لرز رہا تھا۔

☆=======☆=======☆

اس رات جب میں اپنے جوتوں پر پالش کر رہا تھا تو الماس نہایت خاموشی سے میرے برابر میں آن کر بیٹھ گئی تھی۔ میں اس پر توجہ دیے بغیر خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

''افنان' تم مجھے طلاق دے دو۔''

میں اس کی بات سن کر ساکت سا رہ گیا۔ مجھے ایک دم خیال آیا تھا کہ صرف ایک طلاق دینے کا ارادہ کر لینے پر میرے باپ پر آفت آ گئی تھی۔ میں اسے طلاق دے دوں تو پتا نہیں میرے گھر بھر کے ساتھ کیا کچھ ہو جاتا۔ یہ سوچ کر مجھ پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔

''تمہیں پتا بھی ہے' تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا تھا۔

''ہاں میں تم سے کہہ رہی ہوں' تم مجھے طلاق دے دو۔'' اس کے لہجے کی

کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اب کی بار میرا دماغ گھوم گیا تھا' تاہم میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

''اور میں کیا کہہ کر تم کو طلاق دوں؟''

''تم کچھ بھی کہہ دینا۔ میں بدکردار تھی' بدزبان تھی' پھوہڑ تھی' شوہر کے حقوق کا خیال نہیں رکھتی تھی' تم کوئی بھی جواز بنا لینا' بس تم مجھے آزاد کر دو۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور کچھ نہیں۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''یہ اچھی رہی' میں تم پر الزام تراشی کروں' بہتان باندھوں' ایک تو پہلے ہی برباد ہوں' میں مزید گناہ کروں تم پر الزام تراشی کر کے بہتان باندھ کر اور طلاق دے کر...... اچھی طرح سے سن لو' میں تم کو طلاق تو کسی صورت نہیں دوں گا۔ آئندہ یہ لفظ بھی اپنی زبان پر مت لانا۔'' میں نے نہایت کھردرے لہجے میں کہا تھا۔ ''اور تم مجھ سے طلاق لے کر جاؤ گی کہاں؟ دوبارہ اپنے ماں باپ کے در پر جا پڑنے کا ارادہ ہے۔ تمہارے ساتھ تو پہلے ہی دو بڑے بڑے واقعات ہو چکے ہیں' تیسری مرتبہ تم کو میری صورت ایک......'' میں خود کو اُن کا ڈیش کہنے جا رہا تھا۔ بروقت میں نے اپنی زبان روکی تھی۔ ''آدمی مل گیا تھا۔ طلاق کا ٹیکل لگ جانے کے بعد کون تم کو ملے گا جو تم سے شادی کرے گا؟ جانتی بھی ہو' طلاق یافتہ عورت کو ہمارے معاشرے میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟'' میں تیز لہجے میں کہتا چلا گیا۔

''معاشرہ جائے بھاڑ میں' مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں تم سے طلاق لے کر اپنے ماں باپ کے در پر نہیں جا پڑوں گی۔ میں کسی دارالامان میں رہ لوں گی' کسی ہاسٹل میں رہ لوں گی۔ میں کوالیفائیڈ ہوں' میری کوالیفکیشن کوئی یونہی سی نہیں ہے۔ میں نے ایم فل کیا ہے۔ میں جاب کر لوں گی۔ میں تم سے طلاق لے کر کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے' بس تم مجھے طلاق دے دو۔'' وہ خاصی رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''الماس' تم یہاں سے چلی جاؤ اور میرا دماغ خراب مت کرو۔'' میں نے جھنجلا کر کہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر نہایت فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے' تم مجھے طلاق مت دو' میں تم سے خلع لے لوں گی۔''

''کیا؟'' میں اس کے انداز پر اور اس کی بات پر گرتے گرتے بچا تھا۔ ''تم مجھ سے کیا

لے لوگی؟ ذرا دوبارہ کہنا۔"

"میں تم سے خلع لے لوں گی۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"الماس! تم ابھی فوراً اٹھ جاؤ یہاں سے۔" میں نے اپنے غصے پر بڑی حد تک کنٹرول کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تم چلی جاؤ میرے سامنے سے میں کہتا ہوں' میرا غصہ بہت برا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم کو مار بیٹھوں۔"

"تم مجھے مارو گے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"تم بکواس کرتی رہیں تو یقیناً ماروں گا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم مجھ کو ایسا کوئی موقع مت دو' میں تم کو طلاق نہیں دوں گا اور یہ بات بھول جاؤ کہ تم مجھ سے خلع لے لوگی۔" دو ٹوک لہجے میں جتنی بدتمیزی' بدتہذیبی' درشت کرخت اور کھردرے لہجے میں' میں کہہ سکتا تھا' میں نے کہا تھا۔

"تم مجھے نہ مار رہے ہو نہ مر جانے دے رہے ہو۔"

الماس کے لہجے کی بے بسی نے مجھے بے بسی میں مبتلا کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ میں سلگ کر چیخ کر اسے کچھ اور کہتا وہ خود ہی اٹھ گئی تھی' تب میں نے شکر ادا کیا تھا۔

میں نے اس دن پر بس نہیں کیا تھا بلکہ اب میں کسی بھی بات پر الماس کو بہت بدتمیزی سے ڈانٹ دیا کرتا تھا بالکل ویسے ہی جس طرح مارتھا ایوانز کو جھاڑ دیا کرتا تھا۔ مارتھا ایوانز کی طرح الماس بھی پلٹ کر مجھے جواب نہیں دیتی تھی۔

ان دنوں گھر والوں سے میرا Interaction برائے نام ہی رہ گیا تھا اور میری ذہنی رو کا وہ عالم تھا کہ ایک دم بہک جاتی تھی۔ میں کیا کرتا' میری خود سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے۔ میرا رویہ خود میری سمجھ سے باہر تھا' میں کبھی بھی ایسا نہیں تھا اتنا لاچار' اتنا مجبور' اتنا بے بس...... میرے مزاج پر چڑچڑاہٹ مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی یکایک اداسی حملہ آور ہو جاتی' کبھی مایوسی اپنی لپیٹ میں لے لیتی' کبھی اتنا غصہ آتا کہ دل چاہتا ایک دنیا کو اٹھا کر پھینک دوں۔ کبھی اتنی بے زاری طاری ہو جاتی کہ دل چاہتا کسی جگہ بھاگ جاؤں' چھپ جاؤں' فرار ہو جاؤں' مجھے کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔ اب تو میرا آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا حالانکہ کبھی میں آفس کو فرار کا راستہ سمجھتا تھا اور اب میرا دل چاہتا تھا آفس سے بھی فرار ہو جاؤں۔ میرا دل چاہتا آفس سے طویل چھٹیاں لے لوں۔ میں یقیناً ایسا کر بھی لیتا مگر میرا عہدہ اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ سائیٹ پر کام بھی آخری مراحل میں چل رہا تھا۔ میں طوعاً کرہاً ساتھ [illegible]

آفس جاتا۔ میں آفس میں خود کو کنٹرول کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا پھر بھی کبھی کبھار میرا ٹیمپر بہت بری طرح Loose ہوتا تھا حالانکہ میں اپنے ماتحتوں کا بہت خیال رکھنے والا' ان کی غلطیاں نظر انداز کرنے والا افسر تھا۔ میرے ماتحت مجھ سے بہت خوش بھی رہتے تھے مگر کچھ عرصے سے وہ بھی میرے مزاج سے ڈرے ڈرے رہنے لگے تھے۔ اب تو آفس میں میرے متعلق چہ مگوئیاں بھی ہونے لگی تھیں۔

"شادی سے پہلے تک تو افنان صاحب بالکل ٹھیک ٹھاک رہا کرتے تھے' جب سے شادی ہوئی ہے یہ پریشان رہنے لگے ہیں اگر شادی کے بعد آدمی کا یہی عالم ہو جاتا ہے پھر تو اسے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے۔"

اپنے دو ماتحتوں کو میں نے خود یہ گفتگو کرتے سنا تھا اور مجھے یہ سن کر خاصی شرمندگی بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے میں کوشش کرنے لگا تھا کہ اپنی وجہ سے میں دوسروں کو تکلیف نہ دوں اور یہ کوشش مجھے بھاری پڑنے لگی تھی۔ میں اپنے آپ سے تنگ آ گیا تھا۔ جھنجلانے لگا تھا۔ Idiopathic depression کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

میری کوئی ایک کیفیت نہیں تھی۔ میری کیفیات مختلف تھیں اور مجھے اپنی کسی کیفیت پر اختیار نہیں تھا۔ میں نے خود کو بہت کھوجنے کی کوشش کی تھی' میں نے خود سے بہت پوچھا تھا کہ ایسا کیوں ہے اور میں ابھی تک جواب کی تلاش میں تھا۔

میری زندگی ایک سوال بن کے رہ گئی تھی اور اب ہر سوال مجھے کوفت میں مبتلا کرنے لگا تھا' مجھے تھکانے لگا تھا' مجھے اب ہر سوال اور ہر سوالیہ جملے سے چڑ ہونے لگی تھی۔ خاص طور سے اس "کیوں" سے۔ ایک الماس اور میرا خون جلانے کے لیے سامنے رہتی تھی میرے۔ اس کو دیکھ کر میرا دماغ خراب ہو جاتا تھا۔ کچھ دنوں سے تو الماس کا رویہ عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ کہتی نہیں تھی۔ بس مجھے دیکھتی رہتی تھی' اس کے دیکھنے کے انداز میں عجیب سی کیفیت ہوتی تھی۔ کچھ کھوجتی ہوئی' کچھ پوچھتی ہوئی۔ الزام دیتی ہوئی سی۔ اس کا اس طرح دیکھنا مجھے مزید کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ میں بری طرح جھنجلا جاتا تھا اس کے دیکھنے کے اس انداز پر......

اس رات بھی میں کچھ ملی جلی کیفیات کا شکار ہو کر بہت برے موڈ میں کل کے پہنے جانے والے کپڑوں پر استری کر رہا تھا۔ الماس کچھ کہے بغیر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کا اس طرح دیکھے جانا مجھے اور الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ مجھے سخت جھنجلاہٹ اور چڑچڑاہٹ ہو رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں نے دبے دبے غصے سے پوچھا۔

''میں تو سوچ رہی ہوں۔'' اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے دیکھ کر سوچنا ضروری ہے کیا۔'' میں نے اب کی بار بے حد جھنجلا کر پوچھا تھا۔ ''یا مجھے دیکھے بغیر تم سوچ نہیں سکو گی۔''

''دونوں ہی باتیں ہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر جواب دیا۔ ''لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم کو نہ دیکھوں تو ٹھیک ہے' نہیں دیکھتی۔''

''ہاں' میں یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ٹھیک ہے' مگر میں کچھ باتوں کی وضاحت کر دینا چاہتی ہوں۔ اول تو یہ میں تم کو دیکھ نہیں رہی تھی اور اگر میری نظر تم پر تھی بھی تو دھیان کہیں اور تھا...... اگر میں تم کو دیکھ بھی رہی تھی تو میں' کسی غیر مرد کو نہیں دیکھ رہی تھی' اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''اتنا حق تو دو مجھے کہ میں تم کو دیکھ لیا کروں' تم مجھ سے خود کو دیکھ لینے کا حق بھی کیوں لے لینا چاہتے ہو؟''

''کیوں؟'' لمحے بھر کو تو میں گنگ سا ہو گیا۔ 'یہاں بھی ایک سوال' کیوں آ گیا تھا کیوں میرے اعصاب پر سوار ہو گیا' الماس کا کیوں مجھے چڑاتا ہوا سا لگا خود کو......

"Now hold it!" میں بے اختیار چیخ سا پڑا۔ ''تم اتنے سوالات کیوں کرتی ہو' تمہارا ہر جملہ سوال سے شروع ہو کر سوال پر ختم ہو جاتا ہے' میں تمہارے سوالات سے تھک گیا ہوں۔ تمہاری اس کیوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے' عاجز کر دیا ہے۔'' میں نے بہت بدتمیزی سے کہا تھا۔ ''آئندہ مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔'' میں پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکلا تھا اور لان میں ٹہلتے ہوئے میں شدید کھولن کا شکار تھا۔ مجھے سخت جھنجلاہٹ اور چڑاہٹ ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس غصے پر کیسے قابو پاؤں پھر مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی میں غصہ کم کرنے کے لیے وضو کرنے کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی سر پر گرتے ہی حواس بحال ہو گئے۔ خاصی دیر تک میں ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا رہا حتیٰ کہ اس کے بعد بھی میں واش بیسن کے پاس کھڑے ہو کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھپاکے منہ پر مارتا رہا' گیلا کرتا رہا۔ ایک دم آئینے پر میری نظر پڑی اور خود کو دیکھ کر دھکا سا لگا مجھے۔ آج کئی ہی دنوں کے بعد میں نے خود کو غور سے دیکھا تھا اور میں خود کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ میرے گال پچک گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے' رنگت زرد

پڑ گئی تھی۔ اف یہ میں ہی ہوں؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری صحت اس بری طرح سے گر رہی ہے۔ سارا کچھ جلنے بھنکنے کا نتیجہ ہے' چڑچڑاہٹ اور غصے کا شاخسانہ ہے۔ یہ جلنا بھنکنا کس لیے آخر...... یہ غصہ اور چڑچڑاہٹ کیوں بھلا؟ چلو...... ایک اور کیوں! میرا دماغ خراب ہونے لگا۔ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ یہ اداسی' چڑچڑاہٹ' بدمزاجی Aggression غصہ میرے مزاج کا حصہ تو نہ تھی' میں خود کو دیکھتے ہوئے سوچ گیا۔

اف' کہیں میں پاگل تو نہیں ہو گیا۔ پہلی بار ایسا سوچتے ہوئے مجھے خود سے بہت خوف آیا تھا۔ میں گھبرا کر باہر لان میں آ گیا۔

میں تو سائیکو کیس ہوتا جا رہا ہوں۔ تیز قدموں سے ٹہلتے ہوئے میں سوچ گیا۔ یہ خیال بہت تکلیف دہ تھا میرے لیے۔ اس سوچ سے میرا دم گھٹنے لگا۔

''ایسے کام نہیں چلے گا افنان عادل!'' ہانپتے ہوئے نفی میں سر جھٹک کر میں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

I must know what is my problem.

I must find out the solution for that.

I must consult a psychoanalyst.

میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا تھا اور اسی سوچ کے ساتھ بے اختیار مجھے بلال مرتضیٰ یاد آ گیا تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے مجھے پہلی بار یہ مشورہ دیا تھا۔ بلال مرتضیٰ کا یاد آنا تھا۔ مجھے نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔ اب مجھے بلال مرتضیٰ پر اتنا شدید غصہ آ رہا تھا کہ اگر ابھی وہ میرے سامنے ہوتا تو یقیناً میرے ہاتھ سے قتل ہو جاتا۔ میرا دل چاہ رہا تھا اسے خوب بددعائیں دوں' برا بھلا کہوں' بہت ساری گالیاں دوں مگر غصے کے مارے مجھے ڈھنگ کی کوئی گالی بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔

''تم...... تم...... تم...... بلال مرتضیٰ!'' میں نے دانت کچکچا کر کہا۔ ''تم کم ظرف انسان' گھٹیا شخص...... بزدل آدمی' بھگوڑے کہیں کے۔'' اب کی بار میں باآواز بلند دہاڑا تھا ایسے جیسے وہ سامنے ہی تو موجود ہے میرے...... اور اسے ایسا کہتے ہوئے مجھے اپنے اوپر کیے گئے اس کے سارے احسانات بھول گئے تھے۔ مجھے اپنے الفاظ بالکل بھول گئے تھے کہ میں ایئرپورٹ پر اس سے کیا کہہ کر آیا تھا۔ میرا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں نے بہت ساری پی لی ہو۔ میں جنون کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ''تم اس سے شادی کر لیتے تو آج میں سکون سے ہوتا۔ میری زندگی آرام سے گزر رہی ہوتی۔''

آخری جملہ جیسے میں نے تھک کر بے بسی سے کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے لگا تھا جیسے بہت سارا نمکین پانی میری آنکھوں میں امڈا چلا آ رہا ہو۔ میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اللہ تعالیٰ! مجھے ایک ایسی عورت دے دی گئی ہے جو مجھے نہیں چاہیے تھی، کبھی نہیں چاہیے تھی، کسی طور نہیں چاہیے تھی۔''

بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا اور پھر میں اپنے آنسوؤں پر چاہتے ہوئے بھی کسی طور قابو نہیں پا سکا تھا اور نیچے بیٹھ کر میں سسکیاں لے لے کر رو پڑا تھا۔ کمرے میں جانے کے خیال سے ہی نفرت ہو رہی تھی مجھے۔ میں نے رات لان میں ٹہلتے ہوئے گزاری اور فجر ہونے پر سکون کا سانس لیا تھا۔ روشنی پھیلتے ہی جلد سے جلد گھر سے نکل کر بھاگنے کو دل چاہا تھا میرا..... تیاری تو خیر کیا کرنی تھی مجھے، میں پچھلے دن سے تیار ہی تھا۔ پچھلی رات کی حالت کے پیش نظر ایزی ہونے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور اس وقت بھی میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کپڑے ہی تبدیل کر لوں کیونکہ ایسا کرنے کے لیے لامحالہ کمرے میں جانا پڑتا اور میں کمرے میں کسی قیمت پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں تو فی الوقت ڈائننگ روم سے بھی گزرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت ناشتے کی ٹیبل پر سب موجود ہوتے۔ میں اس وقت کسی کا بھی سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میں نکل ہی رہا تھا کہ میرے ماتحت انجینئر اختر حسین کا فون آ گیا۔

''سر! ہم نے جو سعودی کمپنی کے جوائنٹ وینچر سے Solar Energy سے چلنے والا Desalination پلانٹ لگایا تھا، اسے آج سعودی انجینئرز کی موجودگی میں Functionally test کیا جائے گا۔''

میں نے جب یہ سنا تو پچھلی رات کی ساری کلفتیں، Tragedy اپنی بدترین کیفیات سب بھول بھال گیا۔ ساحل سے قریب کھارے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کے لیے یہ پلانٹ لگانا میری زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا اور آج اس خواب کی تعبیر کا دن تھا۔ میرے پچھلے کچھ دن اتنے برے گزرے تھے کہ اتنی اہم بات میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی اور اب اختر حسین کے یاد دلانے پر میں بے اختیار مسکرایا۔

''اختر! اتنے مہینوں بعد آج کے دن کی یہ پہلی اچھی خبر ہے جو تم نے مجھے سنائی ہے۔ آج سے سمجھو تمہاری پروموشن ہو گئی۔'' میں نے بہت خوش ہو کر اس سے کہا۔

''شکریہ سر!'' دوسری جانب سے جھینپی ہوئی آواز آئی۔ ''آپ کا سائٹ پر انتظار ہو رہا ہے۔ گورنر، وزیراعلیٰ اور صوبائی وفاقی وزراء برائے بجلی اور پانی بھی پہنچا ہی چاہتے ہیں۔''

''بس میں بھی نکل ہی رہا ہوں۔'' میں نے مسرور سے انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

یہی تو وہ اہم پراجیکٹ تھا جس پر میں کام کر رہا تھا اور اس پر میں نے کتنی محنت کی تھی۔ یہ تاریخ میں پہلی مرتبہ تھا جو واٹر مینجمنٹ اتھارٹی نے کسی ایسے پراجیکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا اور اس کا دماغ ظاہر ہے کہ میں تھا۔ اس سلسلے میں درپیش ہونے والی تمام Formalities میں نے بھگتی تھیں۔ Pilot Estimation، پلاننگ، ڈیزائننگ، Execution، گورنمنٹ سے Approval، فنڈز، گرانٹس کی فراہمی، ٹاپ سعودی گورنمنٹ آفیشلز سے رابطے سے لے کر سائٹ پر رہ کر Supervision تک میں ہر مرحلے پر خود انوالو تھا۔ حتیٰ کہ میرے کئی چھٹی والے دن بھی اسی پراجیکٹ کی نذر ہوئے تھے۔ جب شادی نہیں ہوئی تھی تو ذمے داری کے تقاضے کے طور پر اور جب شادی ہو گئی تھی تو فرار کے طور پر...... اور ابھی پچھلے دنوں ہی تو وزیراعظم کو بلا کر سادگی سے اس پراجیکٹ کی اوپننگ سیریمنی بھی کروا دی تھی۔ اخبارات نے بڑے نمایاں انداز میں اس خبر کو جگہ بھی دی تھی البتہ میں نے خود کوشش کی تھی کہ منظر سے غائب ہی رہوں۔ مجھے اپنی پبلسٹی بالکل پسند نہیں تھی اور اس وقت میں خاصا مسرور سا اس جگہ پر پہنچا جہاں یہ پلانٹ لگایا گیا تھا۔ اخباری نمائندوں کو دیکھ کر میرا موڈ سخت خراب ہو گیا۔ ظاہر ہے معروف شخصیات وہاں موجود تھیں، ان کو بھی کوریج دینی لازمی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا پھر خاصے خوشگوار موڈ میں، میں تینوں وزراء اور گورنر کو Description دیتا رہا۔ جلد ہی آگے پیچھے ان لوگوں کی رخصتی عمل میں آ گئی۔ میں نے چلنے سے پہلے اختر حسین کو کچھ ہدایات دیں۔

''سر! آگے شہر کو واٹر سپلائی کرنے والی پائپ لائنز بچھائی جا رہی ہیں۔'' اختر نے مجھے بتایا اور میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ پائپ لائنز کا کام میں تسلی بخش نظر سے دیکھتا ہوا اپنی گاڑی آگے بڑھاتا رہا۔

اب کچھ ہی دنوں میں پائپ لائنز کا کام مکمل ہو جائے گا۔ میں نے سوچا تھا اور شہر کو پانی کی فراہمی شروع ہو جائے گی پھر یہ ہمارا مین واٹر Resource ہو گا اور چھوٹے Resources بھی ہمارے کام آتے رہیں گے پھر اس Cosmopoliton city میں واٹر Shortage کا مسئلہ نہیں رہے گا پھر میں ایک کام اور کروں گا۔ Sewage Treatment یا Waste Water کے پراجیکٹ پر بھی کام کروں گا۔ جب لندن جیسے شہر میں ایسا ہو سکتا ہے تو کراچی میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا پھر

اس Treated Water کو دوسرے مقاصد کے علاوہ آب پاشی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکے گا۔ کیا بات ہوگی آب پاشی کے لیے پانی کراچی شہر سے سپلائی کیا جائے گا......

میں خاصے مغرور انداز میں یہ سوچ رہا تھا اور اس لمحے میرے ذہن سے یہ بات بالکل نکل گئی تھی کہ کل رات میں نے کیا سوچا تھا۔ اجتماعی مسئلے پر سوچتے سوچتے میں اپنا مسئلہ بالکل بھول چکا تھا اور یہ بھی کہ مجھے تو کسی سائیکو اینالسٹ کے پاس جانا تھا۔ اسی وقت مجھے قافلے کی شکل میں کچھ خواتین اپنے روایتی لباس میں اپنے سروں پر مٹکے رکھے مخالف سمت میں جاتی نظر آئیں۔ میں نے گاڑی روک کر خاصی ہمدردی اور ترس بھری نگاہوں سے ان خواتین کو دیکھا۔ "ہاں ان کے علاقے میں پانی نہیں ہے۔ کتنی محنت کرنی پڑتی ہوگی ناں' ان بے چاریوں کو...... دور دراز علاقوں سے پانی بھر بھر کے لانا پڑتا ہوگا۔ کوئی بات نہیں اگلا کام میں پائپ لائن Extention کا ہی کروں گا تاکہ پانی ہر جگہ پہنچے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا پھر اگلے ہی لمحے مجھے اچنبھا سا ہوا مگر یہ لوگ یہاں پر کہاں...... خاصی حیرانگی سے سوچ کر میں نے اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ تب تک وہ لوگ تو نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں مگر میری آنکھیں پوری طرح سے کھل گئی تھیں' میں دم بخود رہ گیا تھا۔ یہ کیا جگہ تھی جہاں پر میں اس وقت کھڑا تھا۔ تاحد نگاہ تک ریت ہی ریت نظر آرہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی صحرا میں آن کھڑا ہوا ہوں حالانکہ اس پراجیکٹ کا نقشہ تو مجھے ازبر تھا اور جہاں تک مجھے یاد آرہا تھا۔ نقشے میں کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ میں اس طرف پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ میرا تو وہاں مستقل آنا جانا رہا تھا۔ وہاں کا ہر راستہ مجھے ایسے ہی یاد تھا جیسے اپنے گھر کا راستہ یاد تھا اور یہ جگہ جہاں میں اس وقت کھڑا تھا' میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ گاڑی جس راستے پر اب تک چلتی رہی تھی' وہاں کسی سڑک کا نام ونشان نہیں تھا اور تب اسی لمحے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔

مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے' سر جھٹک کر اگلے ہی لمحے میں نے گاڑی گیئر میں ڈالی تو گاڑی نے چلنے سے انکار کردیا' پیچھے اڑتی ریت سے مجھے اندازہ ہوا کہ ٹائر ریت میں پھنس گئے ہیں۔ ظاہری بات ہے اس قسم کی زمین کے لیے تو مجھے جیپ لانی چاہیے تھی یا ہائی لکس ٹائپ کی کوئی گاڑی ہوتی۔

مجھے نئی پریشانی نے آلیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد یہی حل سمجھ میں آیا کہ ٹائروں میں سے ہوا کم کر...... میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سورج عین سر پر چمک رہا تھا اور دھوپ

میں خاصی تمازت تھی۔ پانچ منٹ گاڑی سے باہر رہنے پر ہی میری عقل ٹھکانے آگئی۔ پسینے بہنے لگے۔ میں جلدی سے گاڑی میں آبیٹھا۔ ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے نکالنے کی کوشش کی۔ اب کی بار گاڑی با آسانی نکل گئی۔ شدت کی گرمی اور ذرا سی مشقت کرنے پر مجھے ایک دم شدید پیاس کا احساس ہوا۔ تب مجھے ان خواتین کا خیال آیا جو سروں پر مٹکے رکھ کر لے کر جارہی تھیں۔ یقیناً وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔ مجھے انہی کو Trace out کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی سوچ کر میں چلتا رہا۔ ان خواتین کو تو میں کیا ہی Trace کر پاتا خاصی دیر تک ایک ہی جگہ چکراتے رہنے کے بعد مجھے شدت سے اس بات کا یقین ہوگیا کہ میں واقعی راستہ بھٹک گیا ہوں۔ دھوپ کی تیزی میں بتدریج اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا اسی حساب سے گرمی بھی بڑھ رہی تھی اور میری پیاس بھی......! مجھے رہ رہ کر اپنی وہ پانی کی بوتل یاد آرہی تھی جو آج میں جلدی گھر سے نکلنے کے مارے میں بھول آیا تھا اور اب تو اس پر صرف حسرت ہی کی جاسکتی تھی۔ تھوڑا آگے چل کر گاڑی میں سے دھواں نکلنے لگا۔ میں نے فوری طور سے گاڑی روک دی۔ اتر کر چیک کیا۔ گاڑی میں پانی ختم ہوگیا تھا۔ حالانکہ میں ہمیشہ گاڑی کو چیک کر کے چلتا ہوں۔ اپنے ساتھ پانی اور پیٹرول کا اضافی گیلن ہمیشہ رکھتا ہوں۔ آج یہ محض اتفاق تھا کہ میں دونوں میں سے کوئی بھی کام کیے بغیر روانہ ہوا تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے پانچ لیٹر کا وہ سبز گیلن یاد آرہا تھا جو دوسری گاڑی میں رہ گیا تھا۔ جب تک گاڑی چلتی رہی تھی تب تک مجھے یقین تھا کہ مجھے صحیح راستہ مل ہی جائے گا مگر اب جبکہ گاڑی نے بھی ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا تو صحیح معنوں میں' میں پریشان ہوگیا تھا۔ میں تھک کر ایک بار پھر گاڑی میں آبیٹھا۔ جب تک گاڑی چل رہی تھی' پتا نہیں چل رہا تھا مگر اب گاڑی کے اندر اور باہر کا Temperature ایک ہورہا تھا۔ گاڑی بری طرح تپ رہی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا میں کیا کروں کس کو مدد کے لیے بلاؤں۔ مجھے اپنا موبائل بے طرح یاد آرہا تھا۔ جسے صبح میں نے بھاڑ میں بھیج دیا تھا۔ اس وقت اگر میرے پاس موبائل ہوتا تو کم سے کم میں کسی کو کال کر کے اس بری صورت حال کے بارے میں بتا ہی دیتا۔ مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ پیاس اب میری برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔ مجھے ایک دم یاد آگیا تھا کہ میں نے تو پچھلے دن سے پانی نہیں پیا اور صبح تو خیر میں بغیر کچھ کھائے پیے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر ہی میری پیاس کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

ایسے بیٹھنے سے تو کام نہیں چلے گا' افنان عادل...... میں نے تھک کر سوچا اور پھر

گاڑی کے اندر کے درجہ حرارت میں مستقل ہوتے اضافے نے مجھے بے چینی کے عالم میں پانی کی تلاش میں نکلنے پر مجبور کر دیا۔ گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے خاصی بے بسی سے چہار طرف دیکھا تھا مگر اس صحرا میں پانی کی تلاش کرنے میں کہاں جاؤں؟ میں نے خاصی بے بسی سے سوچا تھا پھر اگلے ہی لمحے مجھے خیال آیا تھا کیوں نہیں' سنا ہے ریگستان میں ہی نخلستان ہوتے ہیں' آج دیکھ لیتے ہیں' تاہم میں فیصلہ نہ کر پایا کہ آگے جاؤں یا پیچھے' دائیں جاؤں یا بائیں...... بالآخر میں نے سورج کی مخالف سمت میں چلنے کا فیصلہ کیا مگر جلد ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اس ریتیلی زمین پر چلنا اتنا آسان کام بھی نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا میرے پیر بار بار ریت میں دھنسے جا رہے تھے۔ مجھ سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے اوپر سے مسلسل آگ برساتے سورج' گرم اڑتی ریت' تپتی ہوا اور مستقل بہتے پسینے نے میری حالت غیر کر دی تھی۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق خشک ہو گیا تھا حالانکہ میں Extreme Conditions کا عادی تھا۔ سخت گرمیوں میں روزے تک کی حالت میں' میں نے کئی کئی گھنٹوں کھڑے ہو کر کام کروایا تھا مگر اس طرح کی Stressful Condition سے میرا زندگی میں پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ دوسرے روزے کی حالت میں تو پھر بھی صبر آ جاتا ہے۔ آدمی صبر کر ہی لیتا ہے مگر اس حالت میں مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ برداشت بالکل جواب دیتی جا رہی تھی۔ اب تو مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ آ گئی۔ تپتی ریت پر گرنے سے پہلے بے اختیار میرے منہ سے "اللہ تعالیٰ رحم!" نکلا تھا۔ گرم ریت پر گرتے ہی جسم جھلس کر رہ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ خاصی دیر تک اسی عالم میں لیٹا میں سوچتا رہا۔ کھانا کھائے بغیر آدمی پندرہ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے بغیر پانچ منٹ سے زیادہ اور پانی کے بغیر آدمی کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے......؟ مجھے فوری طور سے یاد نہ آ سکا۔ آنکھیں بند ہونے کے باوجود سورج کی شعاعیں بہت گرم اور تیز لگیں۔ اور آنکھیں کھولنے پر دھوپ میری آنکھوں کو بری لگ رہی تھی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میں نے سامنے دیکھا تو اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر مجھے دیوار سی دکھائی دی۔ اس کی Configuration بتاتی تھی کہ یہ کنوئیں کی منڈیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھے لگا مجھے دھوکا ہوا ہے اب تو ہر جگہ مجھے تصور میں پانی اور خیال میں کنواں' جھیل' دریا' سمندر ہی آئے گا' سو میں نے دوسری بار پوری آنکھیں کھول کر اس طرف دیکھا۔ مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ واقعی وہاں کنوئیں ہی کے آثار تھے۔ مجھے ایک دم

خیال آیا کہ پہلے زمانے میں راہگواروں پر کنوئیں بنے ہوتے تھے۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی ہی یادگار ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اپنے اندر ہمت آتی محسوس ہوئی۔ میں تقریباً خود کو گھسیٹتا ہوا چلنے لگا۔ منڈیر اب مجھ سے زیادہ دور نہ تھی اور جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا مجھ پر واضح ہوتا جا رہا تھا کہ یہ کنوئیں کی ہی منڈیر ہے۔ اپنی تمام ہمتیں مجتمع کر کے بڑی مشکلوں سے میں وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ کنوئیں کی حالت بتاتی تھی کہ یہ قدیم ہی کنواں رہا ہو گا۔ لکڑی کے ڈنڈے سے جڑی چرخی' اس سے لٹکتی بوسیدہ سی رسی اور رسی سے لٹکتا ڈول۔ میں نے ڈول کنوئیں میں ڈالنے سے پہلے اندر جھانک کر دیکھا کہ پانی ہے بھی یا نہیں۔ خاصی وافر مقدار میں پانی دیکھ کر اور مطمئن ہونے کے بعد میں نے بہ عجلت چرخی گھمائی۔ ڈول اندر ڈالا اور پھر چرخی گھما کر بے صبری سے ڈول اوپر کھینچنے لگا۔ ڈول کے اوپر آنے پر رسی ڈھیلی چھوڑ کر میں نے ڈول کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ رسی ٹوٹ گئی۔ ڈول کے کنوئیں میں گرنے سے چھپاکے کی زوردار آواز آئی۔ میں نے خاصی بے یقینی سے یہ منظر دیکھا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے میرے ساتھ۔ رسی بے شک مضبوط نہ تھی لیکن وہ اتنی کمزور نہ تھی کہ ڈول کا بوجھ نہ سہار سکتی...... میں ابھی تک شاک میں تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ میں نے خاصی بے بسی سے اپنے ہاتھ میں رہ جانے والی باقی رسی کو دیکھا تھا۔

اس لمحے میں نے خود کو اتنا ہی بے بس محسوس کیا تھا جتنا اس رات کیا تھا کہ جب الماس کے ماما نے مجھے تیج کی مار دی تھی۔

میں نے اس لمحے خود کو اتنا ہی مجبور محسوس کیا تھا کہ جب مارتھا ایوانز کو اپنے سامنے دیکھا تھا......

میں نے خود کو اتنا ہی لاچار محسوس کیا تھا جتنا شادی والی رات الماس کو اپنے سامنے دیکھ کر محسوس کیا تھا......

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میرا دھاڑیں مار مار کر رونے کو دل چاہا۔ میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ چیز جس کی طلب ہو وہ ہاتھ میں آتے آتے رہ جائے تو کیسا لگتا ہے۔ یہ اس وقت مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا...... کنوئیں کے قریب کھڑا ہو کر پیاسا رہنا کسے کہتے ہیں' کوئی مجھ سے پوچھتا......

مجھ سے ذرا فاصلے پر کھڑا کوئی شخص میری پیاس کی شدت کا اندازہ لگا سکتا تھا...... کبھی نہیں' ستر ہزار بار نہیں۔ میں اس کنوئیں تک کتنی مشکلات طے کر کے آیا تھا' کون جان سکتا

تھا..... کوئی نہیں، مجھے خود پر ترس آنے لگا تھا.....

میں افنان عادل جو ایک بااختیار افسر تھا، اس وقت بالکل بے اختیار تھا۔

میں افنان عادل جو واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہوں، Water resource کے قریب کھڑا ہوں مگر پیاسا ہوں۔

میں افنان عادل جو شہر بھر کو پانی سپلائی کرنے کے پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں، خود پانی کے ایک قطرے کو ترس رہا ہوں۔

میں افنان عادل جو واٹر کرائسس کو ختم کرنا چاہ رہا ہوں، اس وقت شدید واٹر کرائسس کا شکار ہوں......

میں...... افنان عادل کتنا بے بس ہوں، کتنا لاچار ہوں، ترس سکتا ہوں، سسک سکتا ہوں، رو سکتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔

ہر ہر کچھ عرصے بعد میں کسی ایسی مشکل میں پڑتا ہوں کہ مر مر جاتا ہوں۔ گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور...... میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟

میں نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا اور سسک پڑا۔ ہاں، ہاں میں نے کب کہا کہ میں بااختیار ہوں۔ میں تو بندہ ہوں، لاچار ہوں، بے بس ہوں، میں تو کچھ بھی نہیں...... بے شک تیرے ہی اختیار میں سب کچھ ہے۔ میں نے کب انکار کیا اس بات سے، تُو قادر ہے ہر بات پر...... تُو مالک ہے تُو مختارِ کُل ہے۔ مجھ پر رحم کر دے مجھے معاف کر دے......

میں بے اختیار سجدے میں جا گرا، مجھے کسی کے الفاظ یاد آنے لگے تھے۔ کوئی میرے کان میں کہہ رہا تھا اور میں وہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہا تھا۔ ''اے زندہ رہنے والے! اے قائم رہنے والے! تیری رحمت سے استغاثہ چاہتا ہوں۔''

اب میں دہاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''نہیں ہے کوئی معبود سوائے تیرے، پاک ہے تُو بے شک، میں ظالموں میں سے ہوں۔''

مجھے یاد آیا کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ افنان، تقدیر کو کوئی نہیں بدل سکتا، بجز دعا کے..... میں نے حضرت موسیٰؑ کی، کی ہوئی دعا مانگی تھی کہ اے رب! اس وقت تو، تُو مجھ پر جو بھی خیر نازل فرما دے، میں اس کا محتاج ہوں۔ مجھے اس وقت خیر کی بہت ضرورت ہے اللہ تعالیٰ! تیرے رحم کی ضرورت ہے، کرم کی ضرورت ہے۔ تُو مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا پھر؟

تُو میری دعا نہیں قبول کرے گا تو پھر کون کرے گا آخر!

مگر میں ولی نہ تھا، کوئی درویش نہ تھا کہ دعا کرتا اور فوراً قبول کر لی جاتی۔ میں کوئی پہنچا ہوا فقیر بھی نہ تھا کہ سوال کرتا اور سارے سوال پورے ہو جاتے۔

میں سجدے میں گڑگڑاتا رہا، روتا رہا بالآخر تھک سا گیا میری تمام ہمتیں جواب دے چکی تھیں۔

میں بے دم ہو کر گر پڑا۔ بالکل چت ہو گیا تپتی ریت کی وجہ سے میرا جسم جلنے لگا۔ آگ برساتے سورج، تیز دھوپ، شدت کی گرمی، تپتی ریت، سامنے کنواں اور میری پیاس...... ان سب کا آپس میں کیا کنکشن ہے۔

انگلینڈ، مارتھا ایوانز اور میری بے بسی اس سب کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے......

اس رات کا الماس کے ماما اور میرا کیا Link ہے......

میں کھلی آنکھوں سے آسمان کو تکتا رہا۔ میری آنکھوں میں بدستور نمی تھی۔ مجھے ایک بار پھر خود پر رحم آنے لگا۔ مجھے پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا جیسے دم آخر آن پہنچا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو جم سے گئے تھے لیکن موت کے خوف کی وجہ سے نہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے موت سے خوف نہیں آ رہا تھا۔ موت سے خوف تو ان کو آئے جن کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش ہو۔ مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ بلکہ اب تو مجھے یقین آنے لگا تھا کہ جس جگہ میں پڑا ہوں۔ وہ جگہ میرے لیے قبر کا گڑھا بننے والی ہے۔ قبر کی طرح یہاں کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض بھی بکثرت ہوں گے اور میں آج جن کی خوراک بننے والا تھا یہاں سانپ بچھو بھی ہوں تو کچھ عجب نہیں ہے۔ گدھ بھی ہوئے تو ان کو ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا مگر کیا عجب تھا کہ مجھے کسی چیز سے بھی خوف نہیں آ رہا تھا اور نہ میرے دل میں یہ خواہش ہی تھی کہ ان سے بچاؤ کی تدبیر کر لوں۔ میرے دل میں تو یہ خواہش بھی نہیں تھی کہ کم از کم ہاتھ پر رینگتے اس کیڑے کو ہی جھٹک دوں جو آستین کے کف سے اب بازو تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔

اب دھوپ آنکھوں میں چبھنے لگی تھی اور اب آنکھیں کھلی رکھنا میرے لیے مشکل ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ میری موت اس ویرانے میں، اس صحرا میں بہت لاچاری، بے بسی، کسمپرسی کے عالم میں ہو گی اور میرے گھر والوں کو تو پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ مجھ پر کیا گزر گئی۔ گھر والوں کا خیال آنے کے ساتھ ہی مجھے اپنے والدین یاد آئے تھے۔ بڑے بھائی، بڑی بھابی، چھوٹے بھائی، بھابی اور بھتیجے بھتیجی کی شکلیں میری نظر کے

سامنے بکھرنے لگیں۔ پتا نہیں ان سب کے لیے کیسا بھائی' کیسا دیور' کیسا چچا تھا لیکن میں اپنے ماں باپ کا فرمانبردار بیٹا نہ تھا۔ میری ماں الماس کی وجہ سے مجھ سے ناخوش تھی' مجھے دکھ اور افسوس ہونے لگا۔ آخری مرتبہ امی کو دیکھنے کا بڑا دل چاہا میرا۔ میرا باپ اس ایک رات کی وجہ سے اب تک مجھ سے ناراض تھا حالانکہ میں اس کو منانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہتا ہی نہ تھا۔ مجھے صدمہ ہونے لگا۔ آخری مرتبہ ابو سے معافی مانگ لینے کو بڑا دل چاہا میرا...... مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ آخری وقت میں توبہ بھی قبول نہیں ہوتی اور جب میرا باپ مجھ سے ناراض تھا۔ ماں ناخوش تھی تو اللہ تعالیٰ مجھ سے کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ میں نے شل ہوتے ذہن کے ساتھ سوچا تھا۔ قیامت کے دن جب میں اٹھایا جاؤں گا تو حقوق العباد کے سوال پر تو میں یونہی فیل ہو جاؤں گا اور پتا نہیں مزید کتنے گناہ ہیں میرے بائیں کندھے پر اور کوئی نیکی ہے بھی میرے پاس...... میں نے بے اختیار سسکی لی تھی گردن پر شاید کچھ کاٹ کر گیا تھا۔ ایک ٹیس سی اٹھی تھی اور پوری گردن میں سرایت کر گئی تھی۔

میں اپنے ڈوبتے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتا نہیں نیکیاں کتنی تھیں میرے پاس اور پتا نہیں تھیں بھی یا نہیں اور اگر تھیں بھی تو وہ ایک رات مجھے اپنی ہر نیکی پر بھاری لگ رہی تھی۔ شاید جس پراجیکٹ پر میں ان دنوں کام کر رہا تھا' وہ بھی ایک نیکی تھی اور پتا نہیں یہ بھی میری نیکی تھی یا میرا فرض تھا۔ ہاں البتہ ایک نیکی میرے کریڈٹ پر یقیناً ہوتی' مارتھا ایوانز مسلمان ہونا چاہتی تھی' مجھے حسرت سی ہوئی...... ٹانگ کے پاس کوئی نرم سی چیز سرسراتی محسوس ہونے پر سانپ کا تصور میرے ذہن میں آیا تھا۔ مجھے سانپ سے بھی خوف نہیں آیا تھا۔ جس آدمی کے دل سے موت کا ڈر نکل جائے' اسے بھلا ان چیزوں سے کیا ڈر لگے گا...... میں نے غنودگی کے عالم میں سوچا تھا۔

میں آخر کتنوں کے دل توڑوں گا۔ مارتھا ایوانز اور الماس...... ان دونوں میں [illegible] قدر مشترک ہے۔ مارتھا ایوانز تو چاہتی تھی مجھے اور الماس...... آہ...... الماس...... الماس کی سوچ کے ساتھ ہی مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں مر جاؤں گا۔ [illegible] وہ بیوہ ہو جائے گی...... چہ...... بے چاری اپنے آخری وقت میں مجھے الماس سے ہمدردی سی ہو رہی تھی مگر میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد کسی اچھے سے آدمی سے [illegible] کر لینا۔ وہ مجھے ابھی تک اچھا آدمی سمجھتی ہے۔ الماس پاگل ہے۔ میں اچھا آدمی ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ میں اچھا شوہر بھی نہیں ہوں۔ تم خوش [illegible]

مجھ سے الماس' میں بھی خود سے خوش نہیں ہوں۔ میں تم سے شرمندہ ہوں حیف صد حیف...... خود پر نفرین بھیجتے ہوئے کھلتی بند ہوتی آنکھوں کے درمیان میں نے اپنے سے ذرا فاصلے پر بیٹھی چھپکلی کو دیکھا تھا جو گردن اٹھائے مجھے دیکھتی شاید میری آنکھیں بند ہونے کے انتظار میں تھی۔ پرندوں کی آوازیں سن کر میں نے بند ہوتی آنکھوں سے اپنے اردگرد بڑے بڑے پرندوں کو منڈلاتے دیکھا۔ یہ آخری منظر دیکھ کر میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔ اب نہ دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی تھی' نہ تپتی ریت سے جسم جھلس رہا تھا۔ مکمل طور سے تاریکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے پہلے کلمے کے ابتدائی الفاظ دہرانے کی کوشش کی تھی۔

لا الٰہ الا اللہ......

☆=======☆=======☆

پچھلی رات جب افنان عادل چیخ چلا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا تو مجھے اس کے جانے پر نہ رونا آیا تھا اس بار اور نہ ہی مجھے افسوس ہوا تھا جیسے پچھلی بار ہوا تھا۔ اس بار میں نے اس کے جانے کی پروا بھی نہیں کی تھی۔

بے بس آدمی صرف چیخ سکتا ہے...... میں نے بڑی تسلی سے خود کو سمجھایا تھا' بالکل ویسے ہی جیسے زخمی شیر صرف دھاڑ سکتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ آج افنان عادل پوری رات کمرے میں قدم بھی نہیں رکھے گا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ جانا کہاں ہے' ادھر ہی آئے گا...... بڑی لاپروائی سے میں نے سوچا تھا اور اطمینان سے اپنا بستر بچھانے کے بعد لیٹ گئی تھی۔ یہ اور بات کہ نیند آنے میں خاصا ٹائم لگا تھا۔ اگلی صبح میری فجر پر آنکھ نہ کھل سکی اور ظاہر ہے اس کو بھی مجھے جگانا نہیں تھا۔ ایک دم ہی کسی خیال کے تحت میری آنکھ اچانک کھل گئی' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھنے پر مجھے کل کا واقعہ یاد آ گیا اور خیر سے اس میں یاد آنے کی کیا بات تھی۔ واقعہ تو میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تازہ اور محفوظ ہی تھا۔ ممکن ہے' آنکھ کھلنے کی وجہ بھی یہی رہی ہو۔ افنان عادل بہرحال جا چکا تھا۔ مجھے قدرے افسوس ہوا مگر جلد ہی افسوس کا احساس میرے دل سے نکل گیا۔

وہ ایک بے حد مصروفیت والا دن ثابت ہوا تھا۔ صبح سے میں کام میں لگی ہوئی تھی۔ اس دن صبح ہی سے گرمی اپنے عروج پر تھی۔ ساڑھے نو بجے ہی ایسا لگ رہا تھا جیسے عین بارہ بجے کا وقت ہو۔ میں کپڑے پھیلانے کے لیے چھت پر گئی تو دو منٹ میرا دھوپ میں کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ ایکی ہی roast کر دینے والی دھوپ تھی۔ سورج عین سر پر

چمک رہا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر میں نے جلدی جلدی کپڑے رسی پر پھیلائے اور نیچے بھاگ آئی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب آخری کھیپ کپڑوں کی تقریباً دھلنے ہی والی تھی کہ چھوٹی بھابی نے مجھ سے کہا۔

''جواہر، میں ذرا بچوں کو لینے جا رہی ہوں۔ آج سمعان انہیں پک نہیں کر سکیں گے۔ اس کے بعد دونوں بچوں کو امی کے یہاں چھوڑ دوں گی اس کے بعد میرا اور ان کا مارکیٹ تک جانے کا ارادہ ہے ہم دونوں ساتھ ہی نکل رہے ہیں۔ سب کام ایک ساتھ ہی نمٹا لیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے چھوٹی بھابی مگر آج تو غضب کی گرمی ہے پھر آپ لوگ نکل بھی اس وقت رہے ہیں۔ ذرا دھوپ تھوڑی ڈھل جانے دیجیے پھر چلے جایئے گا۔'' میں نے انہیں مشورہ دیا۔

''یار جواہر، دھوپ ڈھلنے کا مطلب ہے، چھ ساڑھے چھ، اس وقت تو سمعان آ جائیں گے، پھر جب وہ آ جاتے ہیں تو مجھے کہیں نکلنے نہیں دیتے۔ وہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے آنے کے بعد میں کہیں جاؤں۔ ان کا کہنا ہوتا ہے کہ اتنا لمبا وقت جب وہ آفس سے گزار کر واپس گھر آئیں تو میں ان کو گھر پر موجود ملوں۔ سچ، کچھ عادتیں تو سمعان کی بہت تنگ کرتی ہیں مگر وہ مجھے چاہتے بھی تو بہت ہیں اس لیے برداشت کر لیتی ہوں۔''

چھوٹی بھابی کے لہجے میں بڑا مان تھا۔ شوہر کی چاہت کا بڑا غرور تھا اور ٹھیک ہے یہ ان کا حق بھی تھا۔ میں ایک دم چپ ہو گئی۔ مجھے افنان عادل کا خیال آ گیا تھا۔ میں غیر ارادی طور سے افنان عادل اور چھوٹے بھائی کا موازنہ کرنے لگی۔ چھوٹی بھابی کی یہ عادتیں مجھے سخت ناپسند تھیں۔ وہ ہر بات بڑی تفصیل سے بتانے کی عادی تھیں جس میں غیر ضروری تفصیل بھی ضرور شامل ہوتی تھی۔ اب یہاں پر بھی چھوٹے بھائی کی عادتوں کا تذکرہ کرنا کچھ اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک دم غصہ آنے لگا تھا۔

''تو آپ چھوٹے بھائی کے ساتھ ہی چلی جاتیں۔'' میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان دھیما اور تلخی سے مبرا رکھنے کی ہی کوشش کی تھی مگر اتنی احتیاط کے باوجود بھی پتا نہیں کیوں تھوڑی تلخی لہجے میں آ ہی گئی تھی۔ شکر ہے، چھوٹی بھابی نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا وہ اپنے میاں میں ہی گم تھیں۔

''نہیں بھئی سمعان بازار میں گھستے ہی اتنی جلدی مچاتے ہیں۔ آدمی کو بوکھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ ڈھنگ سے شاپنگ نہیں کرنے دیتے۔ ان کے ساتھ جانے سے

کہ آدمی اکیلا شاپنگ کر لے۔'' چھوٹی بھابی نے ہنس کر کہا۔

میں نے لاتعلقی سے کندھے اچکا دیئے۔ خواہ مخواہ میں انہیں مشورے دے رہی تھی۔ آخر مجھے پڑی ہی کیا تھی۔ میں نے پھر ایک لفظ مزید نہیں کہا۔

پھر نکلتے وقت چھوٹی بھابی نے مزید کہا تھا۔ ''ہم لوگوں کو واپسی میں دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔''

''تم کو اکیلے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟'' افنان کی امی کے پوچھنے پر میں بے ساختہ مسکرائی تھی۔

''نہیں، بالکل نہیں۔''

دونوں مطمئن ہو کر نکل گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کپڑوں کی آخری کھیپ مشین سے نکالی اور چھت کی سیڑھیاں چڑھتے وقت میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ پانچ منٹ سے زیادہ تو چھت پر رکنا ہی نہیں ہے اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ سوکھ جانے والے کپڑے لے کر نیچے اترتے وقت میں چھوٹی بھابی اور افنان کی والدہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اتنی شدید گرمی جس میں چیل تک اپنا انڈا چھوڑ دے، اس میں شاپنگ کرنا خواتین کا بڑا دل گردہ ہے۔ مجھے سوچ کر مزید گرمی لگنے لگی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے اچھا سا شاور لینے کو بڑی شدت سے دل چاہا۔ جلدی جلدی کپڑوں کو تہہ کر کے ان کے ٹھکانے پر رکھنے کے بعد میں کپڑے نکالنے کی غرض سے افنان کے کمرے میں آ گئی۔ ابھی میں سب سے آرام دہ سوٹ کے بارے میں سوچ کر الماری سے نکالنے ہی لگی تھی کہ مخصوص انداز میں مسلسل بجتی ٹون نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے ایک نظر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف دیکھا اور مجھے پتا چلا کہ آج افنان اپنا موبائل ادھر ہی بھول گیا ہے۔ میں نے اس کی طرف دھیان بھی دیئے بغیر کپڑے نکالے، سکون سے استری کیے۔ اس دوران بھی موبائل پر مستقل بیل بجتی رہی تھی۔ میں نے بہرحال کال ریسیو نہیں کی اور نہ ہی یہ دیکھنے کی زحمت کی کہ کون اتنی مستقل مزاجی سے کال کیے جا رہا ہے بلکہ باتھ روم میں گھس گئی۔ ادھر افنان کے موبائل پر ہر تھوڑی دیر بعد مستقل کال کی جا رہی تھی کہ مجھے کوفت سی ہونے لگی۔ پتا نہیں ایسا کون سا مستقل مزاج آدمی ہے جو تھک نہیں رہا۔ خاصا جھنجلا کر میں نے سوچا تھا، پھر بھی کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسی وقت گھر کے ٹیلی فون پر بیل ہونے لگی اور اس بار مجھے شدید کوفت کے عالم میں باہر نکلنا ہی پڑا۔ ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے میں نے خاصا جھنجلا کر ''ہیلو'' کہا تھا۔

''ہیلو، السلام علیکم!'' دوسری جانب سے نہایت شائستہ مگر اجنبی آواز میں کہا گیا تھا۔
''جی، وعلیکم السلام!'' میں میرا لہجہ سوالیہ تھا۔
''میں اختر حسین بات کر رہا ہوں۔'' بہت شائستگی سے کہا گیا تھا۔ ''افنان صاحب گھر پر موجود ہیں؟''
''جی نہیں، وہ تو موجود نہیں ہیں۔'' میں نے ریسیور کو گھورتے ہوئے جواب دیا پھر سامنے لگی وال کلاک کو دیکھا جو اس وقت سوا دو بجا رہی تھی۔ ''اس وقت تو وہ آفس میں ہوتے ہیں۔''
''جی، میں سیدھا سائٹ سے آفس ہی پہنچا ہوں۔ افنان صاحب آفس میں نہیں تھے۔ پیون نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آج آفس پہنچے ہی نہیں۔ میں سمجھا کہ شاید آج وہ آفس کی بجائے گھر چلے گئے ہوں، یہی سوچ کر میں نے یہاں فون کیا ہے۔''
''نہیں، افنان صاحب اتنی جلدی گھر کبھی نہیں آتے۔'' میرے لہجے میں خود بخود لاتعلقی آ گئی۔
''جی ہاں، میں جانتا ہوں مگر میں نے سوچا کہ شاید صرف آج......''
دوسری طرف سے نہایت پُراعتماد لہجے میں کہا گیا تھا۔ ''میں اتنی دیر سے ان کے موبائل پر بھی ٹرائی کر رہا ہوں، وہاں سے بھی کوئی رسپانس مجھے نہیں مل رہا۔''
''جی ہاں، آج وہ موبائل گھر پر بھول گئے ہیں۔''
''اوہ......!'' اب کی بار آواز میں مایوسی محسوس ہوئی تھی مگر فوراً ہی کہا گیا تھا۔ ''مجھے اصل میں انہیں رپورٹ دینی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔''
''تو آپ ان کا انتظار کر لیجیے، شاید وہ آفس پہنچنے والے ہی ہوں۔'' میں نے سہولت سے کہا۔
''جی بہتر......!'' دوسری جانب سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے بھی ریسیور کریڈل پر ڈال کر ارادہ کیا کہ کھانا کھا لیا جائے مگر پھر نماز پڑھنے کا خیال آیا، سو کھانا کھانے کا ارادہ ملتوی کر کے میں وضو کرنے چلی گئی۔ نماز پڑھ کے میں نے اطمینان سے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہی نیند کے جھونکے آنے لگے، شاید آج مجھے تھکن زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اونگھنے لگی۔ فون کی بیل ہونے پر میں ہڑبڑا سی گئی۔ بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر سستی کے عالم میں کارڈلیس اٹھا لیا۔
''السلام علیکم! اختر حسین بات کر رہا ہوں۔ افنان صاحب آ گئے ہیں؟'' دوسری

طرف سے جلدی جلدی میں کہا گیا تھا۔
''جی نہیں، افنان صاحب تو ابھی تک نہیں آئے۔'' میں نے ایک بار پھر جماہی روک کر جواب دیا۔ ''آفس میں......'' مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا گیا۔ دوسری طرف سے بے صبری سے کہا گیا تھا۔
''وہ آفس بھی ابھی تک نہیں آئے۔ میں نے سائٹ پر رابطہ کیا تھا تو پتا چلا سائٹ سے تو وہ دس بجے ہی روانہ ہو گئے تھے۔''
اب کی بار میں نے بند ہوتی آنکھوں کو پورا کھول کر بے اختیار وال کلاک کو دیکھا جو ساڑھے تین بجا رہی تھی۔
''میڈم، اب تک تو انہیں آفس پہنچ جانا چاہیے تھا۔''
اس کی آواز میں تشویش محسوس کر کے میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہاں، واقعی اگر وہ دس بجے کا سائٹ سے چلا ہوا ہے تو اب تک تو اسے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ مجھے اپنی آنکھوں سے نیند ایک دم غائب ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور اختر حسین کہہ رہا تھا۔
''افنان صاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کبھی ایسا کرتے ہی نہیں۔''
''ممکن ہے، آج افنان صاحب کو یاد نہ رہا ہو، وہ بھول گئے ہوں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔
''میڈم، افنان صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے خاصا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں ان کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ ان ساڑھے تین سال میں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے کچھ کہا ہو اور ویسا کیا نہ ہو۔ وہ جو کہتے ہیں، ہمیشہ کرتے بھی وہی ہیں۔ افنان صاحب کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ جس سے جو کام کہتے ہیں، انہیں یاد بھی رہتا ہے۔ وہ بھولتے کچھ بھی نہیں ہیں۔ سائٹ سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا، آج ایک بجے رپورٹ میری ٹیبل پر ہونی چاہیے اختر حسین، اور تم جانتے ہو ناں، ایک بجے کا مطلب ہے، ایک بجے...... نہ ایک سیکنڈ کم نہ ایک سیکنڈ زیادہ اور اب تین بجنے کو ہو رہے ہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ افنان صاحب کو یاد نہ رہا ہو۔ میں مان نہیں سکتا کہ افنان صاحب بھول گئے ہوں۔'' اختر حسین کے لہجے میں بہت یقین تھا مگر آواز میں فکر زیادہ تھی۔
''دیکھیے افنان صاحب انسان ہی ٹھہرے آخر۔ ہو سکتا ہے راستے میں کچھ unusual

اور unexpected ہو گیا ہو، انہیں ٹھہرنا پڑ گیا ہو، آپ ان کا انتظار کر لیجیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی بہتر......!'' دوسری جانب سے نیم مردہ آواز میں کہا گیا پھر ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں بھی کارڈلیس رکھ چکنے کے بعد تھوڑی دیر تک اس پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ مجھ پر عجیب غائب دماغی سی سوار ہو گئی تھی پھر بالآخر گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈائننگ ٹیبل سے برتن سمیٹ کر باورچی خانے تک لے جاتے ہوئے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ابھی تک میرے کانوں میں اختر حسین کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''سائٹ سے تو وہ ساڑھے دس بجے روانہ ہو چکے ہیں۔''

''اب تک تو انہیں آفس پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''افنان صاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا، وہ کبھی ایسا کرتے ہی نہیں۔''

''افنان صاحب کی یادداشت بہت اچھی ہے۔''

''وہ بھولتے کچھ نہیں ہیں۔ میں مان نہیں سکتا کہ افنان صاحب بھول گئے ہوں۔''

''میں ان کو ساڑھے تین سال سے جانتا ہوں۔''

اور میں بھی افنان عادل کے ساتھ ساڑھے تین مہینے سے رہ رہی تھی اور اس کے متعلق اس حد تک تو جان ہی گئی تھی کہ کم از کم آفس ٹائم میں اس کے آفس سے گھر فون پر فون نہیں چلے آتے۔ اس ٹائم میں افنان آفس میں ہی موجود ہوتا تھا یا پھر سائٹ پر موجود ہو سکتا تھا۔ اگر وہ وہاں سے چل چکا تھا تو پھر کہاں گیا تھا؟ وہ ضرور آفس کے لیے ہی نکلا ہو گا تو آفس پہنچا کیوں نہیں؟

اس نے کبھی ایسا نہیں کیا، تو آج ایسا کیسے ہو گیا تھا پھر......؟

وہ کبھی ایسا نہیں کرتا، تو آج کیا ہو گیا تھا پھر......؟

اختر حسین کی طرح میں بھی یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ افنان کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ اس بات کی تو گواہی میں دے سکتی ہوں کہ اسے بھولتا کچھ نہیں ہے۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آج کی بات اس کو یاد نہ رہی ہو؟

برتن دھونے کے دوران میں مستقل افنان عادل کے متعلق سوچے جا رہی تھی اور بالآخر مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔

''اچھا ناں، تو آخر مجھے پڑی ہی کیا ہے جو میں افنان عادل کے بارے میں سوچوں......'' میں نے جھنجلا کر خود سے کہا۔ ''کون سا ہمارا relationship بہت

خوبصورت تھا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے کے علاوہ تو ہم میں کوئی تعلق نہیں تھا...... کون سا افنان عادل مجھے سکھ بانٹ رہا تھا۔ کون سا اس نے مجھے خوش رکھا تھا جو میں اس کی فکر کرتی پھروں......''

مگر یہ سوچ لینے کے باوجود میں خود کو افنان عادل کو سوچنے سے باز نہیں رکھ پا رہی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں آخر اسے کیوں سوچے جا رہی ہوں؟ مجھے خیال آ رہا تھا کہ پچھلی رات افنان عادل بہت غصے میں کمرے سے باہر نکلا تھا۔ ساری رات کمرے میں قدم نہ رکھنے کا مطلب تھا کہ وہ بدستور غصے میں تھا۔ پتا نہیں آج صبح اس کا موڈ کیسا رہا ہو؟ بہرحال مجھے نہ جگانے کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا، شاید گھر سے نکلتے وقت بھی وہ شدید غصے کے عالم میں رہا ہو، شاید سائٹ پر پہنچنے کے بعد کوئی ایسی بات ہو گئی ہو جس سے اس کا موڈ مزید خراب ہو گیا ہو اور آفس کے لیے نکلتے ہوئے اس کا موڈ ایسا ہی رہا ہو۔ مجھے خیال آیا کہ وہ بہت خطرناک ڈرائیونگ کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ صرف دو مرتبہ گاڑی میں بیٹھی تھی اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈرائیونگ کے معاملے میں کوچز، منی بسز کے ڈرائیورز اور افنان عادل یکساں نامدار ہیں...... اور ان کا آپس میں موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اُف...... یہ سوچ کر مجھے ہول سے اٹھنے لگے۔

'ہائے، کوئی روڈ ایکسیڈنٹ......' اس سے آگے مجھ سے کچھ نہ سوچا جا سکا۔ گھبراہٹ، پریشانی کے مارے میری حالت غیر ہونے لگی۔ پیروں سے جان نکلنے لگی۔ ٹانگوں نے میرا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے ہی اختر حسین سے کہا تھا کہ ممکن ہے، افنان صاحب کے ساتھ کچھ unusual اور unexpected ہو گیا ہو مگر ایسا unusual اور unexpectell......

میری آنکھوں میں نمی بھر بھر کے آنے لگی۔ ساڑھے چار بجے کے قریب فون کی بیل ہوئی اور مجھ میں نہ جانے کہاں سے بجلیاں سی بھر گئیں۔ دوسری بیل پر میں نے بھاگ کر ڈائننگ روم میں رکھے فون کا ریسیور اٹھایا تھا۔ دوسری طرف اختر حسین تھا۔

''افنان صاحب......'' سلام دعا کیے بغیر اس نے شروع ہی کیا تھا کہ میں نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

''وہ گھر نہیں آئے۔ مجھے بتایئے، انہیں کیا ہوا ہے؟ وہ کہاں ہیں؟'' نہایت بے

صبری سے میں نے کہا تھا اور وہ یقیناً اس انداز گفتگو پر ٹھٹک گیا تھا تبھی الجھن سے اس نے پوچھا تھا۔

''آپ کون صاحبہ ہیں؟''

''میں...... میں...... مسز...... افنان...... عادل...... ہوں......'' جواب دیتے ہوئے الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے۔

''اوہ...... آئی...... سی...... میں خود حیران ہوں میڈم، افنان صاحب آخر کہاں چلے گئے ہیں؟'' دوسری طرف سے فکرمندی سے کہا گیا تھا۔ ''آج صبح کے بعد سے میں نے انہیں نہیں دیکھا۔''

میرا دل چاہا اس کی بات پہ زور زور سے ہنس پڑوں مگر آنسو آنکھوں میں امڈے چلے آئے تھے۔ میرا دل چاہا، اس سے کہوں، تم نے تو صبح اسے دیکھ بھی لیا تھا، میں نے تو پچھلی رات کے بعد سے اسے نہیں دیکھا۔

''آپ کے صاحب کا موڈ صبح کیسا تھا......؟'' آنکھوں کی نمی کو بمشکل پیچھے دھکیل کر میں نے ایک دم پوچھنا چاہا تو الفاظ حلق میں پھنسنے لگے۔

''کچھ عرصے سے افنان صاحب کا موڈ خراب ہی رہتا تھا۔'' وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''مگر آج صبح......'' وہ کہتے کہتے ایک دم رک گیا تھا اور جیسے میرے دل کی دھڑکن بھی رک سی گئی تھی۔ میرا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

''اوہ...... ٹھہریے......'' اس نے جلدی جلدی کہا۔ ''میں آپ کو تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتی، دوسری جانب سے فون رکھا جا چکا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح سے ریسیور کو تکتی رہ گئی پھر سی ایل آئی پہ نمبر دیکھ کر میں نے خود ہی آفس میں فون کرنا چاہا۔ ہر بار مجھے نمبر انگیج ملا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد بالآخر میں نے ہار کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ افنان عادل سے متعلق کس [illegible] کروں......؟ مجھے رونا آئے جا رہا تھا۔ آنسو بے آواز آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ۱۰ بجے اختر حسین کا ایک بار پھر فون آیا تھا۔

''افنان صاحب ابھی تک آفس نہیں پہنچے ہیں۔'' اس نے جیسے اطلاع دینے والے انداز میں کہا تھا۔ ''اور میں اتنی دیر سے سائٹ پر موجود لوگوں سے رابطوں کی کوشش [illegible]

تھا۔ سائٹ پر موجود ایک آدمی کا کہنا ہے کہ اس نے لاسٹ ٹائم ساڑھے گیارہ بجے افنان صاحب کو وہاں سے گاڑی لے کر گزرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد کی صورت حال سے ہر کوئی لاعلم ہے۔ میں پانچ ممبرز کی ٹیم لے کر سائٹ پر جا رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے، افنان صاحب کسی مشکل میں ہیں۔ خدانخواستہ انہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔''

اختر حسین ریسیور رکھ چکا تھا اور میں خاصے صدمے کے عالم میں کافی دیر تک ریسیور ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہی۔ اختر حسین کے آخری الفاظ سن کر میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ جو بات میں نے سوچنا بھی نہیں چاہی تھی، وہ اختر حسین نے کتنے آرام سے کہہ دی تھی۔ میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ در و دیوار گھومتے ہوئے سے محسوس ہو رہے تھے۔ ہائے...... پتا نہیں، افنان کس مشکل میں پڑ گیا ہے...... میں نے بے اختیار دیوار کو تھامنا چاہا تھا اور مجھے اس بار کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میں ٹیلی فون سمیت دھڑام سے ماربل کے فرش پر جا پڑی تھی۔ ایک دم جسم کے مختلف حصوں میں لگنے والی چوٹوں کا احساس ہوا تھا اور ذہن کی چوٹ اس کے علاوہ تھی۔ میری کراہیں نکل گئی تھیں۔ آنسو بے آواز بہہ رہے تھے۔

یہ افنان عادل مجھے کتنا تنگ کرتا ہے، کتنا ستاتا ہے۔ پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے؟ پتا نہیں، وہ کن حالوں میں ہے......؟ آفس سے اس کے لیے فون پہ فون چلے آ رہے ہیں، وہ گھر نہیں آیا، سائٹ سے چل چکا ہے، آفس میں نہیں ہے، تو پھر وہ کہاں ہے؟ ہائے...... اسے کیا حادثہ پیش آ گیا ہے......؟ میں ڈوبتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی اور پتا نہیں اس حادثے کی نوعیت کیا ہے اور شدت کیسی ہے؟ روڈ ایکسیڈنٹ زیادہ تر تیز رفتاری کے باعث پیش آتے ہیں اور عموماً fatal ہوا کرتے ہیں۔ مجھے مختلف وہم آ رہے تھے۔ شہر میں اتنا ہیوی ٹریفک سڑکوں پر رواں دواں رہتا ہے۔ ٹرالرز، آئل ٹینکرز، ٹرکس، ہائے...... آئے دن اخبارات میں خبریں آتی رہتی ہیں، خدانخواستہ...... میرا دل دہل گیا۔ شہر کے حالات بھی کتنے خراب ہیں، آئے دن لوگ مرتے رہتے ہیں۔ بم بلاسٹ، ٹارگٹ کلنگ...... اندھا دھند فائرنگ...... دہشت گردی پھیلاتے ہوئے نامعلوم افراد...... اور مدتیں گزر جانے کے باوجود بھی نامعلوم......!

اُف میرا دم حلق میں آ گیا تھا۔ اب میں سسکیوں سے رو رہی تھی۔ مجھے طرح طرح کے خیال ستا رہے تھے۔ بدقسمتی سے میرا شوہر بڑا آدمی بھی ہے...... تو...... اغواء برائے تاوان......؟ ہائے...... کیسی اذیت ناک سوچ ہے اور...... اور...... میرا شوہر ایک

دیانت دار اور ایماندار آدمی بھی تو ہے۔ نہ کسی لینے میں نہ کوئی دینے میں اور...... اور میرا شوہر سب سے بڑی "برائی" ہے دنیا والوں کے نزدیک۔ ایسے لوگوں کی تو دنیا ویسے ہی دشمن ہوتی ہے۔ ہر کوئی راستے سے ہٹانے کی ہی کوشش کرتا ہے، راہ کا کانٹا سمجھ کر۔

اُف......! اس خیال نے مجھے مار ڈالا تھا۔

ساڑھے چھ بج رہے تھے اور میری حالت مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ ہر کیفیت بیان سے باہر تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ان حالات میں کس کو اطلاع دیتے ہیں، کہاں فون کر کے پتا کرتے ہیں، ہسپتال، پولیس اسٹیشن؟ کہاں، کس جگہ؟ ریسیور خاصی دیر تک ہاتھ میں پکڑے میں سوچتی رہی پھر بلا سوچے سمجھے ٹیلی فون میں لگے کارڈ پہ لکھے نمبروں میں سے سب سے پہلا نمبر ڈائل کر دیا اور یہ پہلا نمبر بڑے بھائی کے آفس کا تھا۔ دو تین بیل بجنے کے بعد ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔

"کاشان عادل...... ہیئر......"

"بڑے بھائی......؟" بڑے بھائی کی آواز سن کر میں اپنی سسکیوں پر قابو نہیں رکھ پائی۔

"کون......؟" بڑے بھائی کا انداز الجھن لیے ہوئے تھا۔ "جواہر......!" اب کی بار ان کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

"ہاں......! ہاں......!" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "بڑے بھائی! آپ...... ابھی فوراً...... اسی وقت گھر آئیں......" میں نے ہچکیوں کے درمیان کہا تھا۔

"کیا ہوا......؟" اب کی بار انہوں نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

"کہہ رہی ہوں ناں...... آئیں...... تو آئیں...... بس......!" میں وحشت زدہ ہو کر تقریباً چیخ ہی تو پڑی تھی۔

"اچھا...... آتا ہوں......" انہوں نے نہایت تحمل سے کہا۔ "ذرا امی کو فون دو۔"

"گھر پر میں اکیلی ہوں......" میں نے خاصی بے بسی سے بتایا تھا۔

"کوئی بات نہیں، میں آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے بڑے بھائی نے فون رکھ دیا تھا۔ ریسیور رکھ کر میں ایک بار پھر رو پڑی تھی۔

مجھے ڈر لگ رہا تھا، بہت زیادہ ڈر اور مجھے ڈر کیوں لگ رہا تھا، مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسی وقت گیٹ پر مسلسل بجتی بیل نے مجھے چونکا دیا۔ انٹر کام پر پوچھا تو فاران عادل کی معصوم سی آواز سنائی دی۔

پھر میرے [illegible] دروازہ کھولنے پر بڑی بھابی عجلت [illegible] اندر آئی تھیں۔

"جواہر......! کیا ہوا؟" خاصی حیرانگی سے انہوں نے پوچھا تھا۔ میں کچھ کہے بغیر سسکیاں لیتی رہی۔ بڑے بھائی نے بھی آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ ان کے چہرے سے ہی پریشانی جھلک رہی تھی۔

"کیا ہوا جواہر؟ کچھ کہو تو۔" خاصی پریشانی سے انہوں نے پوچھا تھا۔ میرے آنسو رک نہیں رہے تھے۔

"اف...... ناں......!" میرے منہ سے بمشکل اسی قدر نکل سکا۔

"کیا ہوا افنان کو؟" اب کی بار ان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ میرے حلق میں آنسو اٹکنے لگے۔ مجھ سے تو بولنا بھی دشوار ہی ہو رہا تھا۔

"چپ...... رونا بند کرو بالکل......" انہوں نے کس کر میرا بازو جھنجھوڑتے ہوئے سختی سے ڈانٹ کر کہا۔

اور یک لخت میری آنکھوں میں آنسو جم سے گئے تھے۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان میں نے انہیں ساری بات بتا دی تھی۔ بڑے بھائی اور بڑی بھابی دونوں پریشان نظر آنے لگے۔

"واقعی بات تو تشویش کی ہے۔ ایک آدمی کا مدتوں سے فکسڈ روٹین ہو...... اور ایک دن اچانک وہ اس روٹین سے ہٹ جائے......" بڑی بھابی کے لہجے میں فکر تھی۔

"افنان بے شک گھر دیر سے آتا ہے مگر یہ بات تو میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ گھر، آفس اور سائٹ کے علاوہ کسی چوتھی جگہ پر وہ جاتا نہیں ہے۔"

ان کے لہجے میں بڑا یقین تھا اور مجھے اس بات پر ان سے کہیں زیادہ یقین تھا کہ واقعی وہ کسی چوتھی جگہ پر جا نہیں سکتا۔ جاتا ہی نہیں ہے۔ ان ساڑھے تین مہینوں میں اس حد تک تو اس کو میں بھی جان ہی گئی تھی مگر پچھلی رات وہ جس طرح کمرے سے گیا تھا، اس کے بعد تو یہ صورت حال اور بھی پریشان کن تھی۔ ایک بار پھر میری آنکھوں سے آنسو بے آواز گرنے لگے تھے۔

"نبیلہ......! مجھے لگ رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آ گیا ہے۔ اللہ خیر کرے وہ کہیں پھنس گیا ہے اور بہت برا پھنسا ہے۔" بڑے بھائی، بڑی بھابی سے کہہ کر فون پر بات کرنے لگے۔

اس کے بعد میں انہیں یکے بعد دیگرے مختلف جگہوں پر فون کرتا دیکھتی رہی پھر بڑے بھائی گاڑی کی چابی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تمیلہ! میں کمشنر سٹی راجہ طارق کے پاس جا رہا ہوں۔ سمعان تو خیر آنے ہی والا ہوگا ابو کو خبر کر دو۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ "اور ذرا اس پاگل کو سمجھانے کی کوشش کرو، بے وقوفوں کی طرح سے رو رہی ہے۔"

بڑے بھائی چلے گئے اور میرے آنسوؤں کے گرنے میں تیزی آ گئی۔ بڑی بھابی دونوں بچے مجھے تسلیاں دے رہے تھے مگر میں ان کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکی اور تیزی سے اٹھ کر افنان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ مجھے کسی کی تسلی سے تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ کسی کے دلاسے میرے دل کو لگ نہیں رہے تھے۔ عصر کی نماز کا وقت بھی نکلا جا رہا تھا اور میں نے نماز بھی ابھی تک نہیں پڑھی تھی۔ میں نے وضو کیا اور نماز پر پوری توجہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں ارتکاز کیسے کر پاتی کہ اوہام، وسوسے، برے خیالات مجھے بری طرح تنگ کر رہے تھے۔ میں نے بہت چاہا تھا کہ ان برے خیالات، وسوسوں اور اوہام کو ذہن سے جھٹک دوں مگر مجھے کامیابی نہیں ہو پا رہی تھی۔ چار فرض مجھ سے پڑھنا دوبھر ہو گئے اور اس کے بعد میں بس رو رہی تھی اور دعائیں کر رہی تھی۔

"اللہ تعالیٰ! افنان عادل کو کچھ نہ ہو......!"

میں دعا کر رہی تھی کہ "اے رب! اس وقت تو، تُو مجھ پر جو بھی خیر نازل کر دے، میں اس کی محتاج ہوں اور اس وقت میرے لیے سب سے بڑا خیر یہ تھا کہ افنان عادل جہاں کہیں ہو، خیریت سے ہو۔

میں دعا کر رہی تھی کہ "اے زندہ رہنے والے! اے قائم رہنے والے! تیری رحمت سے استغاثہ چاہتی ہوں۔" اور افنان عادل کا سایہ میرے سر پر سلامت رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک تھا۔

افنان عادل یکایک بہت اہم ہو گیا تھا میرے لیے...... اور مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ زندگی کے کسی حصے میں مجھے افنان عادل جیسی کسی چیز کے لیے بلکہ افنان عادل چیز کب تھا، یہی تو رونا تھا کہ وہ چیز نہیں تھا بلکہ وہ تو ایک جیتا جاگتا، سلامت وجود تھا جس کے لیے مجھے دعائیں کرنی پڑ رہی تھیں اور میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے لیے اچانک اتنا اہم کیسے ہو گیا ہے؟ یکایک مجھے اس کی اتنی پروا کیوں ہونے لگی ہے......؟ آخر مجھ پر ایسی کیا آفت آن پڑی ہے جو میں اس کی فکر کر رہی ہوں؟ اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوں......؟

مجھے پتا نہیں کیوں خوف سا آ رہا تھا۔ مجھے اپنے نصیب سے ڈر ہی لگتا تھا اور

بھی مجھے اپنے نصیب سے ڈر ہی لگ رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے افنان عادل کو مجھ سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ اگر ایسا تھا بھی تو آخر میں خود ہی تو چاہ رہی تھی کہ افنان عادل مجھے طلاق دے دے اور اگر وہ مجھے طلاق نہیں دیتا تو میں خود ہی اس سے خلع لے لوں۔ آخر کو میں خود ہی دعائیں کرتی رہی تھی اس سے علیحدگی کی...... اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ دعائیں بھی آدمی کو سوچ سمجھ کر کرنی چاہئیں۔ پتا نہیں کون سی ایسی دعا جو ہم بھی چاہ رہے ہوں کہ فوراً قبول ہو جائے اور جو وہ بھی قبول ہونے لگے تو ہمیں اندازہ ہو کہ یہ تو ہمارے لیے سراسر نقصان کا سودا ہے۔ ناقابلِ تلافی نقصان......! افنان عادل سے الگ ہو جانے کا تصور بھی میرے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہی تھا جو مجھے ہولائے دے رہا تھا۔ اس سے علیحدہ ہو جانے کا خیال میرے لیے سوہانِ روح تھا۔

مجھے پتا نہیں تھا، بالکل خبر نہیں تھی کہ افنان عادل میرے لیے اتنا قیمتی ہے۔ اس وقت کون سمجھ سکتا تھا کہ کسی قیمتی چیز کے چھن جانے کا احساس کیسا ہوتا ہے، کوئی نہیں...... کبھی نہیں...... کوئی اندازہ کر سکتا تھا اس اذیت کا جو کسی کے علیحدہ ہو جانے پر کسی کو ہوئی ہو گی۔ کوئی مجھ سے ذرا پوچھتا، افنان عادل کے چھن جانے کا خیال میرے لیے اتنا اذیت ناک اور تکلیف دہ تھا کہ مجھے اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تکلیف کے مارے مجھے رونا آئے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کا سراپا میری نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ ایسے چلتا تھا...... ایسے بولتا تھا...... یوں بلا لحاظ مجھے جھاڑ دیتا تھا...... افنان عادل ایسے سوچوں میں مستغرق رہتا تھا...... افنان عادل ایسے مسکراتا تھا...... مگر ایک منٹ، وہ کیسے ہنستا تھا......؟ میں الجھن میں پڑ گئی۔ پاگلوں کی طرح سے یاد کرنے لگی پر مجھے یاد نہ آ سکا کیونکہ وہ تو ہنستا ہی نہیں تھا۔ میں بے وقوفوں کی طرح سے کمرے کی دیواروں کو تکنے لگی، شاید کوئی ایسی تصویر ہی مل جائے جس میں افنان عادل ہنس رہا ہو حالانکہ میں جانتی تھی، افنان کے کمرے کی دیواروں پر کوئی تصویر ہے ہی نہیں۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل سے ملحقہ الماری وحشت کے عالم میں کھولی۔ خوشبو کا خوش گوار سا جھونکا ناک سے ٹکرایا۔ دھندلائی ہوئی نظر سے میں نے اس کے سلیقے سے رکھے کپڑوں کو دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے اس کے کولونز، ہیئر برش اور موبائل کو دیکھا۔ میں ہر چیز کو چھو چھو کر دیکھتی رہی۔ ہر چیز پر اس کا عکس محسوس کرتی رہی۔ ہائے...... خدانخواستہ افنان عادل نہیں ہوا تو یہ سب چیزیں کون استعمال کرے گا؟ مجھے حسرت سی ہونے لگی۔

دیوانگی کے عالم میں، میں ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کو کھنگالنے لگی اور میرے ہاتھ اتفاق سے اپنی شادی کی البم آ گئی۔ شادی کے بعد یہ پہلی مرتبہ تھا جو میں اپنی شادی کی البم دیکھ رہی تھی ورنہ اب سے پہلے کبھی مجھے اس کو دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ بلاشبہ تصویروں میں بہت اچھا اور جاذب نظر لگ رہا تھا مگر چہرے پر ناراضگی کے تاثرات تھے یا پھر بے زاری واضح تھی۔ کوئی ایک بھی تصویر ہنستی ہوئی نہیں تھی۔ میری حسرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس کی تصویر پر انگلی پھیرتے ہوئے آنسو ایک بار پھر رواں ہو گئے۔

کوئی کسی کو نہ ملے، اس پر تو صبر ہے کہ چلو، ملا ہی نہیں مگر کوئی کسی کو مل کر اس سے الگ نہ ہو، اس سے دور نہ ہو، اس سے چھنے نہ...... اللہ تعالیٰ! میں نے بڑی عاجزی سے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تھی۔

افنان عادل مجھ سے چھن جائے گا اور میں یہ بھی نہیں دیکھ سکوں گی کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ تنگ و تاریک راستے پر چلنا کیسا لگتا ہے۔ افنان عادل مجھ سے الگ ہو گیا تو مجھے یہ کیسے پتا چلے گا کہ خوشی کے کہتے ہیں اور اس کے رنگ کتنے ہوتے ہیں...... افنان عادل میرے پاس نہیں ہو گا تو دنیا میں کیا رہ جائے گا اور دنیا کا مقصد کیا رہ جائے گا؟ ابھی تک تو میں نے افنان کو دل بھر کے، نظر بھر کے نہیں دیکھا۔ مجھے تو تک یاد نہیں ہے کہ اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے؟ مجھے تو یہ تک نہیں پتا کہ وہ کب سوتا رہتا ہے......؟ اور...... اور...... آہ......! تکلیف کچھ اور بڑھ گئی۔ کتنا چاہتی ہوں، اس سے کتنی محبت......

ایک دم میری سوچ رک سی گئی۔ میرے آنسو آنکھوں میں جم سے گئے۔ سسکیاں تھم سی گئیں۔ یہ کیسی سوچ ہے اور یہ کیا انکشاف ہے جو ابھی ابھی مجھ پر ہوا ہے۔

میں افنان عادل سے محبت کرتی ہوں؟

میں اسے چاہتی ہوں؟

کیا واقعی ایسا ہی کچھ ہے؟

مگر کیوں، آخر شوہر تو وہ پہلے بھی تھا میرا...... میں اس بات کو مانتی تو شروع سے تھی۔ پروا تو مجھے پہلے بھی تھی اس کی...... اس کا ہر لفظ میرے لیے حکم کا درجہ تو ہمیشہ سے رکھتا تھا۔ شاید میں آج سے پہلے تک ہر کام اپنا فرض سمجھ کر کرتی رہی تھی، شاید یہ ایک طرح کا کمپرومائز ہی تھا مگر اب مجھے لگ رہا تھا کہ یہ صرف کمپرومائز نہیں تھا۔ میں اس سے شاید بہت پہلے سے محبت کرتی رہی تھی مگر اس کا ادراک مجھے دیر سے ہوا ہے۔

یہ آج کے دن کا سب سے بڑا سچ ہے اور یہی وہ اصل آفت ہے جو ابھی مجھ پر آن پڑی ہے اور اب جب مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا تو ایک بار پھر بے اختیار رو پڑی تھی۔ ”اللہ تعالیٰ! میں نے کب مانگا تھا افنان عادل کو تجھ سے......؟“ میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ”میں نے تو اسے کبھی نہیں مانگا تھا، تُو نے خود ہی تو اسے مجھے دیا۔ اب اگر دے ہی دیا ہے تو اسے مجھ سے واپس نہ لے...... اس کو کھو کر تو میرے پاس کچھ بچے گا نہیں اللہ تعالیٰ! میں مر جاؤں گی اس کے بغیر......“ اب میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ”میں...... میں...... اس آدمی سے...... افنان عادل سے بہت محبت کرتی ہوں، بہت چاہتی ہوں اسے، بس اس سے الگ نہیں رہ سکتی۔“ بڑی عاجزی سے میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ ”تقدیر کو کوئی نہیں بدل سکتا سوائے دعا کے...... میں بڑے دل سے دعا کر رہی ہوں۔ میں بڑی آس سے، یقین سے، امید سے، نیت کو بالکل خالص کر کے تجھ سے سوال کر رہی ہوں۔ اس کو مانگ رہی ہوں، میں افنان عادل کو مانگ رہی ہوں۔“

میں اس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی، تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی، ترس رہی تھی، مر رہی تھی، دعائیں کر رہی تھی۔ میرے آنسو رک نہیں رہے تھے۔ سسکیاں تھم نہیں رہی تھیں۔ مغرب کا وقت جا رہا تھا اور میرا دم حلق میں آ رہا تھا تبھی دروازے پر زوردار دستک ہوئی، میں ہڑبڑا سی گئی۔ تیزی سے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے سرعت سے دروازہ کھولا اور سب سے پہلے میری نظر بڑے بھائی پر پڑی۔ ان کے ہمراہ اور لوگ بھی سامنے کھڑے تھے۔

”کچھ......“ میں نے پوچھنا ہی چاہا تھا۔

”نہیں...... پتا چلا۔“ بڑے بھائی نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی، کیسے بھی...... کہیں سے بھی، مجھے اسے ڈھونڈ کر لا کر دیں۔“ میں نے ضدی لہجے میں کہا۔

"All Right, All Right, that's what we are trying to do."

ابو نے فوراً کہا تھا۔ ”بیٹا! تم پریشان مت ہو۔“ ان کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ ”ہم نے شہر بھر کی پولیس کو Activate کر دیا ہے۔ وہ سرگرمی سے افنان کی تلاش میں ہے۔ آرمی اور رینجرز کے اعلیٰ عہدے داروں سے بھی ہم رابطے میں ہیں۔ انہوں نے ہر قسم کی مدد کی یقین دہانی کروائی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہم مستقل اعلانات کروا

رہے ہیں۔ ان شاء اللہ افنان کا جلد ہی پتہ چل جائے گا۔'' ابو نے یقین سے کہا تھا۔

''اور ذرا افنان کا موبائل مجھے دو جواہرا میں اختر حسین سے بھی کہوں کہ ہم سے افنان کے نمبر پر ہی رابطے میں رہے۔'' بڑے بھائی کے کہنے پر افنان کا موبائل میں نے ان کی طرف بڑھا دیا۔

امی اور چھوٹی بھابی بھی اسی وقت پہنچی تھیں۔ انہیں ابھی تک خبر نہیں ہو سکی تھی۔

''ہم نے تو ریڈیو پر بار بار ہونے والا اعلان سنا۔ پریشانی کے عالم میں دوڑے آئے ہیں۔'' امی کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

''یہ اچانک کیا ہوا ہے۔'' چھوٹی بھابی نے پوچھا تھا۔ ابو نے جواباً ساری تفصیل بتائی۔

''اللہ کرے' میرا بچہ خیریت سے ہو۔'' ساری بات سن کر امی نے کہا تھا۔

''وہ جہاں بھی ہو گا' اللہ نے چاہا تو خیریت سے ہو گا۔'' ابو کی اس بات پر میں اپنے بے اختیار چھلک پڑنے والے آنسوؤں کو کسی طور روک نہیں پائی تھی۔

''ارے بیٹا' پریشان ہم بھی ہیں اس کی طرف سے۔'' ابو نے ایک دم میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''تم تو بالکل ہمت ہار رہی ہو۔''

مگر اس لمحے مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں کسی کو دیکھوں بھی' کسی سے بات بھی کروں۔ میں نے خالی خالی نظروں سے افنان عادل کے گھر والوں کو ایک نظر دیکھا۔ اس سے پہلے یہ لوگ مجھے کبھی اتنے اجنبی نہیں لگے جتنے آج لگ رہے تھے' بس ایک صرف افنان عادل کے نہ ہونے سے کتنا فرق پڑا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا' جب تھا تو اسی کے دم سے سب اپنے تھے۔ وہ نہیں تھا تو سب غیر اجنبی تھے۔ میں نے خاموشی سے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا۔ عشاء ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا اور میں نے مغرب کی نماز ابھی تک نہیں پڑھی تھی۔ میں وضو کرنے لگی اور اس بار میں نے بڑا Concentrate کر کے نماز پڑھی۔ اس بار وسوسوں نے کسی قسم کے برے خیالات نے مجھے تنگ نہیں کیا تھا۔ نفل پڑھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ آخر میں ایسی کیا اچھی نیت کروں کہ وہ اللہ تعالیٰ قبول کر لے۔ ایسی کیا منت مانوں کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے...... کیا کیا نذر کروں کہ افنان پر سے ہر بلا ٹل جائے...... میں سوچے سمجھے نیت کرتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ''اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔'' اور نیت کو قبول کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ میری نیت قبول ہو جائے گی تو پوری بھی ہو ہی جائے گی اور صرف نیت کرنا میرا کام ہے۔ قبول کرنے والا اللہ

تعالیٰ کا کام ہے۔ میں افنان عادل کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں' علاوہ جان دینے کے کیونکہ میں افنان عادل کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔ بہت لمبا...... بہت دور تک......

میں نیت کر رہی تھی کہ اگر افنان عادل کو میں بجاگی ہوش و حواس میں زندہ سلامت' بخیر و عافیت دیکھ لوں تو شکرانے کے نفل پڑھوں گی اور ہر رکعت میں سورۃ رحمٰن پڑھوں گی۔ مجھے یاد آیا' اس سے پہلے بھی ایک بار میں نے اسی قسم کی نیت کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ...... یاد کی تھی' جبھی میں نے سورۃ رحمٰن...... اور شاید ابھی بھی وہ مجھے تھوڑی یاد تھی۔ میں نے قرآن شریف کھول لیا۔ سورۃ رحمٰن جتنی یاد تھی' دو تین مرتبہ کے پڑھنے پر رواں ہو گئی۔ ذوالتا افنان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ مجھے یاد آیا کہ تب بھی میں نے سورۃ رحمٰن ادھوری یاد کر کے چھوڑ دی تھی۔ ''ذوالتا افنان'' مجھ سے پڑھا ہی نہیں جاتا تھا حتیٰ کہ جب قرآن شریف ختم کرنے کے لیے بھی مجھے سورۃ رحمٰن پڑھنی ہوتی تھی تو تبھی میں دل ہی دل میں جلدی سے یہ دو حرفی آیت پڑھ کے آگے چل دیتی تھی اور ابھی ''ذوالتا افنان'' کو پڑھ کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اب مجھے ''ذوالتا افنان'' پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح سے دہرائے جا رہی تھی۔ ذوالتا افنان...... ذوالتا افنان...... ذوالتا افنان...... افنان...... افنان...... افنان......

ذوالتا افنان صرف افنان رہ گیا تھا۔ میں زار و قطار رونے لگی تھی۔ گھڑی کا ہر بجتا گھنٹہ میری پریشانی میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔ وقت میں ہر پندرہ منٹ کے اضافے پر شکرانے کے نفلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ افنان عادل کے لیے سب گوارا تھا مجھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری کون سی نیت' کون سی نیکی کس وقت اللہ تعالیٰ قبول کر لے اور افنان عادل میری طرف لوٹا دیا جائے۔ وہ مجھے دے دیا جائے پھر یکایک میں کچھ سوچ کر اٹھی اور اپنے پاس کیش کی صورت میں موجود رقم کا جائزہ لیا اور اچھی خاصی ہونے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے افنان کے بتائے ہوئے نمبر پر فون کیا اور ڈرائیور کو بلوایا پھر خود کوٹ اسکارف پہن کر تیار ہو گئی۔ عشاء میں نے اپنے وقت پر ہی پڑھ لی تھی۔ اتنا رو دھو چکنے کے بعد میں کچھ پُرسکون ہو گئی تھی مگر دعائیں ویسے ہی جاری تھیں۔

اے رب......!

اے زندہ رہنے والے......!

انٹرکام کی بیل بجنے پر میں ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل آئی۔ [illegible]
گھر والے یعنی بڑی بھابی' امی' چھوٹی بھابی۔ ان دونوں کے بچے تو [illegible]
موجود تھے۔

"جواہر ڈرائیور کو تم نے بلوایا ہے۔" چھوٹے بھائی نے قدرے [illegible]
کیا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم کہاں جارہی ہو بہو' اس وقت اکیلی؟" امی نے ذرا تیکھے لہجے میں [illegible]
امی کبھی بہوؤں سے اس لہجے میں بات کیا نہیں کرتی تھیں۔ اس وقت شاید [illegible]
وجہ سے ایسا ہورہا ہو۔ میں نے ایک مشہور خیراتی اور فلاحی ادارے کا نام لیا۔

"دماغ درست ہے تمہارا؟" چھوٹے بھائی بھڑک ہی تو اٹھے۔ "[illegible]
ہے تم نے۔ اتنی رات گئے تک تم جارہی ہو اور وہ بھی اکیلی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی جگہ پر جمی کھڑی رہی۔

"بہو' اندر جاؤ۔" اس بار امی کے لہجے میں نرمی تھی۔

"پلیز' مجھے جانے دیں۔" میں نے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔ "[illegible]

"اچھا۔" چھوٹے بھائی نے دو لمحے کو سوچنے کے بعد کہا۔ "چلو میں [illegible]
چلتا ہوں۔" میں نے پُرتشکر نظر سے انہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد امی [illegible]
نہیں کہا۔

"امی! ذرا فون کا دھیان رکھیے گا۔ ابو نے کہا تھا۔ جیسے ہی افنان [illegible]
چلے گا' فوراً فون کریں گے۔" چھوٹے بھائی نے چلتے چلتے کہا تھا۔ "[illegible]
کہ مجھے موبائل پر بھی کال کردیں۔ پتا نہیں کتنی دیر ہوجائے واپسی میں۔"

"دیکھو جلدی ہی آنے کی کوشش کرنا۔" امی نے ہدایت کی۔

"امی! یہ تو جواہر پر Depend کرتا ہے۔" چھوٹے بھائی [illegible]
لیے۔ راستے بھر وہ بولتے چلے گئے۔ "ایک پاگل وہ ہے' اور دوسری تم ہو۔ [illegible]
ہے' دوسری تم ہو۔"

میرا دھیان ان کی کسی بات پر نہیں تھا۔ میں تو مختلف دعائیں پڑھ [illegible]
بھر کھڑکی سے باہر نظر آنے والے مناظر کو بے دھیانی سے دیکھ رہی [illegible]
خیراتی و فلاحی ادارے پہنچنے پر اپنے پاس موجود ساری رقم افنان عادل [illegible]
کرنے کے بعد جلدی واپسی کے لیے ہم نکل گئے تھے۔ [illegible]

[illegible] گھر کی گلی میں گھستے ہی چھوٹے بھائی کا موبائل بجنے لگا۔ چھوٹے بھائی نے
[illegible] کان سے لگا لیا۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اعصاب جواب دینے
[illegible] ختم سی گئی۔ میں بس ایک ٹک چھوٹے بھائی کو دیکھے گئی۔ دوسری جانب سے
[illegible] کہا گیا کہ چھوٹے بھائی کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ کچھ کہے بغیر چھوٹے
[illegible] دوسری جانب سے ہونے والی بات سنتے رہے پھر "اچھا ٹھیک ہے۔" کہہ کر موبائل
[illegible]

"[illegible] ہو جاؤ جواہر بڑے بھائی کا فون تھا۔" انہوں نے سکون سے بتایا۔ میں
[illegible] سے انہیں دیکھتی رہی۔ "رضیہ طارق کے پاس سے ہی بول رہے تھے۔ انہیں
[illegible] کا پیغام ملا ہے کہ افنان کا پتا چل گیا ہے۔ فی الحال وہ بے ہوش ہے۔ وہ
[illegible] اسپتال لے گئے ہیں۔" چھوٹے بھائی نے اسپتال کا نام لیتے ہوئے بتایا تھا۔
[illegible] بے اختیار "شکر الحمدللہ" نکلا تھا۔ نمی کے باعث میری آنکھیں گیلی ہونے
[illegible] چھوٹے بھائی نے گاڑی ہسپتال کی طرف مڑوا لی تھی اور اسپتال کے ایگزیکٹیو
[illegible] میں نے دور ہی سے افنان عادل کو بستر پر پڑا دیکھا تھا۔ گھر بھر اس کے گرد
[illegible] میری قریب سے جاکر اسے دیکھنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ مجھے دراصل ابھی
[illegible] آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ میں افنان عادل کو ہی دیکھ رہی ہوں' اسے دور
[illegible] ہوئے بھی میری نظر بار بار دھندلا رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ دیر اسے دیکھا نہیں
[illegible] باہر چلی آئی تھی۔ کاریڈور میں ابو' بڑے بھائی' افنان عادل کا ڈرائیور ایک
[illegible] کے ساتھ کھڑے ڈاکٹر سے بات کررہے تھے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔

"[illegible] اصل میں مرکری اسکیل بھی تو خاصا درجے اوپر پہنچا ہوا تھا۔ انٹیریئر سندھ کے
[illegible] بھی شدید گرمی کے باعث مرجانے والوں کی رپورٹس ملی ہیں۔ انہیں
Dehydration ہوگئی ہے۔ Fluid replacement ہم نے شروع کردی ہے۔ ہوش
[illegible] جلد ہی آجائے گا۔"

"[illegible] اس کی جلد پر سرخ اور نیلے دھبے کیسے ہیں۔" ابو نے تفکر سے پوچھا۔
"[illegible] ہے' جس جگہ یہ موجود تھے' وہاں زہریلے کیڑے موجود رہے ہوں جن کے
[illegible] نے ری ایکٹ کیا ہے مگر اس میں بھی کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ وہ
[illegible] بہرحال اتنے زہریلے نہیں تھے کہ زہر جسم میں پھیل جانے کا خدشہ ہوتا اور یہ
[illegible] Exposed body surfaces پر ہی ملے ہوں گے آپ کو۔ تفصیلی

معائنے پر خوش قسمتی سے جسم پر کہیں کسی اور زہریلے جانور کے کاٹنے کے نشانات نہیں ملے ورنہ جیسے یہ بتا رہے تھے۔'' ڈاکٹر نے پاس ہی کھڑے اجنبی شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس جگہ سانپ' بچھو زہریلی چھپکلیاں وغیرہ تو یقیناً ہوں گی۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کے بیٹے حیرت انگیز طور سے محفوظ رہے ہیں۔ اسے معجزے کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ معجزے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہی ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر کے کہنے پر آنسو میرے حلق میں اٹکنے لگے۔ ڈاکٹر تسلیاں دے کر جا چکا تھا۔ ابو' بڑے بھائی کے ساتھ کھڑا اجنبی شخص کچھ کہہ رہا تھا مگر میرا دھیان اس کی بات پر نہیں تھا۔ میں تو کھلے دروازے میں سے افنان عادل کو بستر پر پڑا دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس پر رحم آرہا تھا اور بہت ترس بھی...... میں نے دھیان لگانے کی کوشش کی اس پر جو وہ اجنبی شخص کہہ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ وہ اختر حسین تھا' وہ ابو کو بتا رہا تھا۔

''...... پتا نہیں کیوں تب تک مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ جیسے انہیں کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ میں ان کے لیے پریشان ہوگیا تھا' سو جب میں نے انہیں خود جا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا تو سارا آفس اسٹاف بھی میرے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ بہرحال چند لوگوں کو لے کر میں سائٹ پر پہنچا۔ سائٹ پر موجود آخری آدمی نے جس سمت میں افنان صاحب کو صبح جاتے دیکھا تھا۔ اسی سمت پر گاڑی ڈال دی۔ پائپ لائنز ڈالنے کا کام تقریباً آخری مراحل میں چل رہا ہے اسے بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم نے اپنے شہر کی حدود کو کراس کرلیا۔ کئی سو کلو میٹرز چلتے رہنے کے بعد مجھے افنان صاحب کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں نے تب افنان صاحب کے موبائل پر کال کر کے کاشان صاحب کو Exact location کا بتایا اور پھر افنان صاحب کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس ریتیلی زمین میں گاڑی تو چل نہیں سکے گی' سو ایک بار پھر کاشان صاحب کو مجھے کال کرنا پڑا کہ امدادی ٹیم کو بھجوائیں تب تک مغرب ہو چکی تھی۔ ہم اگرچہ اپنے ساتھ روشنی کا معقول انتظام کر کے چلے تھے پھر بھی میں ڈر رہا تھا اگر مکمل طور سے اندھیرا ہوگیا تو اس ویرانے میں افنان صاحب کو کہاں تلاش کیا جائے گا مگر جب پورے چاند کو چمکتا دیکھا تو یقین کیجیے اس قدر حیرت ہوئی اور تسلی بھی۔ میں نے پھر دو دو کی صورت لوگوں کو تقسیم کیا اور انہیں مختلف سمتوں میں روانہ کردیا۔ چاندنی نے بہت مدد دی تھی پھر پولیس فورس بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس مشکل سے اور کتنی دیر کی تلاش کے بعد افنان صاحب کو ہم نے بالآخر ایک جگہ پر تلاش

ہی کیا تھا۔'' اختر حسین مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہاں بس کرم فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر۔'' ابو نے خاصی دیر بعد کہا تھا۔

''ڈاکٹر نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ یہ معجزہ ہے افنان صاحب بالکل محفوظ رہے تھے۔ آپ انہیں وہاں دیکھ لیتے تو یہی کہتے تھک کر سو گئے ہیں ورنہ اتنی دیر تک آدمی اتنے حشرات الارض اور خطرناک جانوروں کے درمیان رہے تو کیا کچھ نہ ہوجائے خدانخواستہ اسے۔''

اختر حسین کہہ رہا تھا اور میں اس کی بات سن کر کانپ رہی تھی۔

''بے شک۔'' بڑے بھائی نے سر ہلایا۔ ''رحم کرنا اللہ تعالیٰ کی اول صفات میں سے ایک ہے۔'' بڑے بھائی نے گویا میرے دل کی بات کہی تھی۔

''بہرحال اختر صاحب' آپ کو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے۔ ہم بہت پریشان تھے افنان کے لیے۔ آپ نے درحقیقت بہت Effort کی ہے اس کے لیے۔'' ابو نے کہا تھا۔

''آپ مجھے شرمندہ مت کریں جناب!'' اختر حسین متانت سے مسکرایا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا' میری جگہ افنان صاحب کا کوئی بھی ماتحت ہوتا تو ان کے لیے ایسا ہی کرتا۔ وہ تو ابھی باقی اسٹاف کو پتا نہیں ہے کہ افنان صاحب کا سراغ مل گیا ہے۔ دوسرے رات بہت ہو چکی ہے' نہیں تو آپ دیکھتے۔ دراصل افنان صاحب بذات خود......'' ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ بیس پچیس لوگوں پر مشتمل گروہ تیزی سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اختر حسین نے چمکتی آنکھوں سے ابو اور بڑے بھائی کو دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا' اور وہ ان لوگوں کا گروہ یقیناً افنان کا اسٹاف رہا ہوگا۔ اختر حسین ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوگیا تھا اور انہیں جلدی جلدی ساری صورت حال بتا رہا تھا پھر وہ سب لوگ ابو اور بڑے بھائی سے مل کر صبح آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی ابو میری طرف متوجہ ہوگئے۔ ''ہاں بھئی بہو' اب ٹھیک ہے؟'' مسکرا کر انہوں نے پوچھا۔ مجھ سے بمشکل سر ہلایا جاسکا۔ ''ہم بھی چلیں اب' صبح آئیں گے۔'' میں ہونقوں کی طرح سے ابو کو دیکھنے لگی۔

''نہیں' نہیں' ابھی نہیں' وہ ابھی ہوش میں نہیں ہے۔'' میں نے خوف زدہ سا ہو کر کہا۔

''جواہر' وہ انشاء اللہ' جلد ہوش میں آجائے گا۔'' بڑے بھائی نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''پلیز' آپ لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر مت جائیں۔'' میں نے التجا کرنے والے انداز میں کہا۔

''بہو! تم کیسی بات کرتی ہو۔'' ابو نے قدرے استعجاب سے کہا۔ ''وہ اکیلا کب ہے؟ اللہ اس کے ساتھ ہے اور تم اس کے ساتھ ہو گی۔''

''آپ لوگوں کے پیچھے اسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔'' میں وحشت زدہ سی تھی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''بہو! اسے انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا اور پھر یہاں ڈیوٹی ڈاکٹرز موجود ہے۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔'' ابو کہہ رہے تھے اور میں پلکیں جھپک جھپک کر آنسو اندر اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اور پھر اتنے سارے لوگوں کا ادھر رکنا مناسب بھی تو نہیں ہے۔'' ابو نے گویا اپنی مجبوری بتائی تھی۔ ''ٹھیک ہے ناں۔'' ابو مجھ سے پوچھ رہے تھے اور اس بار میں نے نیم دلی سے سر ہلا دیا تھا۔

''میرے خیال میں گھر چلیں۔'' ابو کے اندر داخل ہو کر اعلان کرنے کے سے انداز پر گھر بھر نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ لوگ جائیں' میں ادھر ہی ہوں۔'' امی نے افنان کو فکرمندی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ چلئے میرے ساتھ' بہو ادھر رک رہی ہے۔'' ابو نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ارے' میرا دھیان ادھر ہی لگا رہے گا۔'' امی نے خفگی سے کہا۔

''ارے بھئی' اس کا دھیان رکھنے والی اب آ گئی ہے لہٰذا آپ فکر چھوڑ دیں۔'' ابو نے مسکرا کر کہا۔

''آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ میرا بچہ ہوش میں بھی نہیں ہے ابھی۔ کم سے کم اسے پورے ہوش و حواس میں دیکھ کر اطمینان تو کر لینے دیجئے مجھے۔''

''صبح کر لیجیے گا۔'' ابو نے بے لچک لہجے میں کہا۔

''مگر اس کی حالت تو دیکھیں۔'' امی کہہ رہی تھیں' ابو نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

''الحمدللہ' کچھ نہیں ہوا اسے۔ ابھی ڈاکٹر سے ہی بات کر کے آ رہا ہوں۔''

''مگر......'' امی نے کہنا چاہا۔

''امی! چلی چلئے۔'' بڑے بھائی نے جلدی سے کہا۔ ''زندگی بھر آپ نے ہی ...

اٹھائی ہے اس کے لیے اب کسی اور کو بھی اٹھا لینے دیجیے۔'' وہ مجھے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ان کے اس طرح کہنے پر گھر بھر کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ میں نے دیکھی۔

''چلو...... بھئی...... آپ لوگ مریض کو ڈسٹرب کر رہے ہیں۔'' ابو کے کہنے پر افنان عادل کے گھر والے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں افنان کے پاس چپ چاپ جا کر بیٹھ گئی۔ اتنے قریب سے بھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے چھو کر یقین تو کر لوں کہ افنان عادل میرے سامنے ہی ہے۔ میرے پاس ہی ہے مگر مجھے اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا پھر ایک دم ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے اگر میں اس کو چھو لوں گی تو وہ ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ نظر کے سامنے سے غائب ہو جائے گا۔ ڈرتے ڈرتے آہستگی سے میں نے اس کے گال پر انگلی رکھ دی۔ وہ میری نظروں کے سامنے ہی تھا اور نظروں کے سامنے سے غائب نہیں ہوا تھا۔ میں بے یقینی کے عالم میں چھو چھو کر اسے دیکھتی رہی۔ اس کے خوب صورت بال' اس کی کشادہ پیشانی' اس کی بند آنکھیں' اس کی ایک دم کھڑی ناک' اس کے نیم وا گلابی ہونٹ' اس کے مضبوط چوڑے ہاتھ۔ میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے زندہ سلامت دیکھ رہی تھی مگر اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے آنسو ضبط کرنے مشکل ہوئے جا رہے تھے۔ اس کا حلیہ ابتر تھا۔ آج تک میں نے اس آدمی کو بے شکن' بے داغ لباس میں سلیقے' قرینے سے تیار ہوا ہی دیکھا تھا۔ آج اس کا لباس شکن آلود تھا اور میلا بھی...... اس کے گھنے سیاہ بالوں میں ریت کے ذرات پھنسے ہوئے تھے بلکہ بالوں میں کیا' پینٹ کی بیلٹ میں' قمیص کے کالر میں' بٹن پٹی میں' آستین کے کف میں...... اور...... اور...... بٹنوں میں بلکہ ناتراشیدہ ہلکے سے بڑھے ہوئے گلابی ناخنوں تک میں ریت ہی ریت پھنسی ہوئی تھی۔

افنان عادل کو میں نے اتنی بے بسی' اتنی لاچاری سے کبھی پڑا نہیں دیکھا تھا۔ یہ بے بس ہو جانے والا آدمی نہیں تھا بلکہ دوسروں کو بے بس کر دینے والی چیز تھا اور آج اس کی بے بسی مجھے رلائے دے رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھا دوں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ایسا کچھ کروں کہ یہ ہوش میں آ جائے۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظر سے اس کے ڈرپ لگے بازو کو دیکھا تھا۔ جوتے ہنوز اس کے پیروں میں تھے۔ میں نے

جوتے اتارے تو ان میں بھی ریت بھری ہوئی تھی۔ میں اپنا اسکارف اتار کر دیوانوں کی طرح اس سے اس کے پیر صاف کرنے لگی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح سے اس کے بالوں اور مختلف جگہوں سے ریت صاف کرنے لگی۔ میں پاگلوں کی طرح سے اس کے بالوں سے ریت صاف کرنے لگی' اس کے ہاتھوں پر' چہرے پر' گردن پر پڑے سرخ اور نیلے نشانات بے شک زہریلے کیڑوں کے کاٹنے کے ہوں مگر مجھے تکلیف دے رہے تھے۔ مجھے ڈاکٹر اور اختر حسین کے الفاظ یاد آرہے تھے اور اب میرے آنسو بے آواز گر رہے تھے اور وہ ہنوز میرے آنسوؤں سے بے خبر تھا۔ وہ میری سسکیاں سن نہیں سکتا تھا۔ اسے تو یہ تک نہیں پتا تھا کہ کوئی اس کے لیے تڑپ گیا تھا' ترس گیا تھا' مرنے کے قریب ہو گیا تھا......

اچانک افنان عادل کراہنے لگا تھا۔ میں ایک دم چونک سی گئی پھر آہستگی سے میں نے اس کے پیر چھوڑ دیے اور میرے آنسو بے اختیار تھم سے گئے تھے۔ افنان عادل نا صرف کراہ رہا تھا بلکہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اگرچہ اس کی آواز بہت دھیمی تھی لیکن ایک ایک لفظ بہت واضح تھا۔ ایک ایک جملہ بہت صاف تھا۔ میں با آسانی سن سکتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''اے زندہ رہنے والے......!''

میری دھڑکنیں تھمنے لگی تھیں۔

''اے رب! اس وقت تو مجھ پر......''

میں ساکت و جامد بیٹھی سن رہی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے سسکیاں لے رہا تھا۔

''پانی......پانی......پانی......''

اس کی پکار میں بڑی تکلیف تھی۔ میں جیسے ایک دم ہوش میں آگئی تھی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگایا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ پانی کتنا اس کے اندر گیا ہوگا۔ آدھے سے زیادہ تو باہر ہی بہہ گیا تھا۔ تولیہ اسٹینڈ پر سے تولیہ لاکر میں نے بہہ جانے والا پانی صاف کیا تھا۔ اس کی گردن' قمیص' بستر کی چادر گیلی ہو گئی تھی۔ میں نے اے سی آف کر دیا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ جانے کا رسک میں نہیں لے سکتی تھی۔

افنان عادل نے کراہ کر کروٹ لی تھی مگر وہ بدستور بے ہوش تھا پھر وہ اس کیفیت میں ساری رات کراہتا رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھی جاگتی رہی تھی۔ اس کی ہر ہر کراہ پر تڑپ رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس کی ہر پریشانی اپنے سر لے لوں۔ ا[illegible]

کہوں تم اپنی ہر تکلیف مجھے دے دو۔ ہر فکر مجھے دے دو۔ تم بری ہو جاؤ۔ آزاد ہو جاؤ۔ بے فکر ہو جاؤ۔ میں نہیں جانتی اس عالم میں اس حالت میں رات کب گئی۔ صبح کب ہوئی۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ رات بہت تکلیف میں گئی تھی اور صبح بہت مشکلوں سے ہوئی تھی اور افنان عادل کے گھر والے بھی شاید صبح ہونے کے انتظار میں ہی تھے کیونکہ صبح ہوتے ہی سبھی اسپتال کے ایگزیکیٹو روم میں موجود تھے۔

''کیسا ہے افنان اب؟'' امی نے اندر گھستے ہی بے صبری سے پوچھا تھا۔

''دیکھ لیجیے خود ہی۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''رات خیریت سے گزر گئی؟'' بڑے بھائی نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اف' شکر الحمدللہ' میرے بچے نے آنکھیں تو کھولیں۔'' امی کے کہنے پر بے اختیار میں نے افنان عادل کو دیکھا تھا اور باقی سب تو خیر اس کی طرف متوجہ تھے ہی...... افنان عادل...... آنکھیں پوری کھولے بنا پلکیں جھپکائے بس ایک ہی سمت میں دیکھے جا رہا تھا۔

''افنان میرے بیٹے! میرے چاند! اب ٹھیک تو ہو تم؟'' امی نے بے صبری سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا اور اب وہ آواز کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں بڑی اجنبیت تھی۔

''اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کچھ بولتا کیوں نہیں؟ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے جیسے جانتا نہیں ہم کو؟'' امی نے خاصی وحشت سے پوچھا تھا۔

''محترمہ...... اختر مہ! ذرا دھیرج......'' ابو نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا تھا۔ اور اب افنان عادل کے دیکھنے کا انداز بدل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب الجھن تھی۔

''آپ...... لوگ...... یہاں...... کہاں......؟'' وہ الجھن سے پوچھ بھی رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے اس کے منہ سے یہ الفاظ سنے تھے' میرا اللہ تعالیٰ کو شکر کے سجدے کرنے کو دل چاہا تھا۔ اس کے لیے میں مناسب جگہ کی تلاش میں نکل گئی تھی۔

☆======☆======☆

میرے سامنے کا ماحول بڑا روشن روشن اور ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا اور اس ماحول سے Familiar ہونے میں مجھے خاصا وقت لگ رہا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید مر کر دوبارہ اٹھایا گیا ہوں کیونکہ سر پر آگ برساتا سورج نہیں تھا اور نہ تپتی ریت سے جسم جھلس رہا تھا۔ کسی قسم کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا...... اور...... اور پیاس کا بھی نہیں...... ایسی سیرابی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا پیاس کبھی لگی بھی تھی۔ میرے ارد گرد مختلف آوازیں تھیں۔ ایک مہربان جانی پہچانی سی آواز کے پکارنے پر میں نے بے اختیار گردن گھما کر اس سمت دیکھا تھا۔ میں فوری طور سے اس مہربان سی شخصیت کو پہچان نہیں پایا لیکن آہستہ آہستہ یادداشت کام کرنے لگی۔

”شکر افنان...... !تم کو ہوش تو آیا۔“

”اف افنان !تم نے تو جان ہی نکال دی تھی۔“

”پریشان کر کے رکھ دیا......“

”دل دہلا دیا۔“

مختلف لوگ' مختلف جملے بول رہے تھے اور میں ٹکر ٹکر ہر کسی کو دیکھ رہا تھا۔

”افنان' اتنا تنگ کرتے ہیں امی کو' کہاں چلے گئے تھے؟“ امی رندھی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

میں چپ چاپ امی کو دیکھتا رہا۔ ان کا مہربان انداز' مجھے تو لگا تھا کہ امی کو اب کبھی نہ دیکھ پاؤں گا اور ابھی...... میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا تھک گئے افنان؟“ میں نے بند آنکھوں کے ساتھ بڑے بھائی کی آواز سنی۔

”کچھ کہنے کا موڈ نہیں ہے۔“ یہ چھوٹے بھائی تھے۔ میں سن سکتا تھا۔

”چپ...... آپ لوگوں نے تو اسے پریشان کر کے رکھ دیا۔ تنگ مت کرو“ [illegible]

کو......“

ابو کے کہنے پر بے اختیار میں نے آنکھیں کھول کر ابو کو دیکھا تھا۔ اتنے عرصے بعد...... ابو کے لہجے میں فکر...... میرے لیے......؟ میں حیران تھا۔

”لیجیے ابو! یہ خوب رہی۔“ بڑے بھائی نے مسکرا کر کہا تھا۔ ”اور...... اس نے جو اتنے لوگوں کو تنگ کیا' وہ کچھ نہیں۔“

”اور کیا۔“

امی اپنے اوپر گزرنے والی کیفیات بتا رہی تھیں اور مجھے اپنے ساتھ گزرنے والے واقعات یاد آ رہے تھے۔ اپنی ہر کیفیت مجھے یاد آ رہی تھی۔ وہ دعائیں یاد آ رہی تھیں جو اس وقت میں کر رہا تھا اور یہ بڑے مزے کی بات تھی کہ اس وقت میں نے اپنی زندگی کے لیے تو کوئی دعا نہیں کی تھی کیونکہ اپنی زندگی سے اتنی دلچسپی کب تھی مجھے' میں تو تقریباً زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ کس کی دعائیں مجھے واپس کھینچ لائی تھیں۔ میں تو تقریباً مر گیا تھا۔ یہ کس کی بدولت ہوا تھا کہ مجھے واپس دنیا میں لوٹا دیا گیا تھا۔

اب گھر کے دیگر افراد مجھے میرے پیچھے رونما ہونے والے واقعات بتا رہے تھے۔ میں سوچے جا رہا تھا اور بڑی خاموشی سے نمکین پانی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر کہیں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ بڑے بھائی کچھ بتاتے بتاتے ایک دم چپ ہو گئے تھے اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ گھر بھر میری ہی طرف متوجہ ہے۔

”افنان' اب کیسے ہو تم بیٹا' کیا ہوا تھا؟“ ابو نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

ابو کے لہجے میں اب کی بار صرف فکر ہی نہیں تھی بلکہ پریشانی بھی تھی اور ایک عرصے بعد میں نے ابو کا اپنے لیے یہ احساس دیکھا تھا۔ محسوس کیا تھا تبھی میرا زارو قطار رونے کو دل چاہا تھا...... میں نے بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پایا تھا۔

”میں...... میں...... راستہ بھٹک گیا تھا......“ بڑا ٹھہر ٹھہر کر میں نے کہا تھا پھر بھی گرم نمکین پانی کے مارے میری آواز بھاری ہو گئی تھی۔ ”کہیں کا کہیں جا نکلا تھا۔“

”کوئی بات نہیں' بھٹک تو کوئی بھی کبھی بھی سکتا ہے۔“ ابو نے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔ میری آنکھوں میں پانی ٹھہر سا گیا۔ میں نے ابو کو بڑا حیران ہو کر دیکھا تھا۔ ”اصل بات ہوتی ہے صحیح راستے کا مل جانا......“ ابو کے مزید کہنے پر میرا دانتوں میں انگلیاں داب لینے کا دل چاہا۔ ”تمہیں صحیح راستہ مل تو گیا ناں؟“

میں نے پوری آنکھیں کھول کر ابو کو دیکھا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ الفاظ...... یہ

جملے...... ابو ہی نے کہے ہیں۔ یہ تو تیرہ سال ساڑھے آٹھ مہینے پرانا مسئلہ تھا جو ابو نے تیرہ منٹ ساڑھے آٹھ سیکنڈ میں حل کر دیا تھا۔

''بھئی' یہ آپ لوگ کیا کوڈ ورڈز میں گفتگو کر رہے ہیں۔'' بڑی بھابی نے ہنس کر پوچھا تھا۔

ابو نے میری طرف دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیے۔ میں نے اب کی بار پُرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

''اب دیکھو افنان' سونے کی نہیں ہو رہی۔''

چھوٹے بھائی کے ایک دم ٹوکنے پر میں نے آنکھیں بند کیے کیے ہی کہا۔ ''میں سو نہیں رہا۔ آپ لوگ کہیے' میں سن رہا ہوں۔''

بڑے بھائی پھر میری بازیابی کی ساری تفصیلات بتانے لگے تھے۔

''اف پوچھو نہیں تمہیں اس جگہ کیسے Locate کیا گیا۔''

بڑے بھائی کہہ رہے تھے اور میں حیرت زدہ سا تھا۔ بڑے بھائی کی ساری تفصیلات میں کسی کنویں کا کہیں ذکر بھی نہیں تھا۔

''میں کسی کنویں کے پاس پڑا ملا تھا؟'' میں نے الجھن سے پوچھا تھا۔

''کنواں...... کیسا کنواں......؟'' بڑے بھائی کا انداز حیرت لیے ہوئے تھا۔ ''وہاں کنواں تھا کیا؟''

''میں آپ کو کسی کنویں کے پاس نہیں ملا تھا؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''اختر حسین نے تو کم از کم ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔''

''وہاں کوئی کنواں نہیں تھا؟'' میں نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا تھا۔

''ہوتا تو اختر حسین بتاتا ضرور کہ تم......''

بڑے بھائی نے ابھی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ آفس سے کچھ لوگ ملنے آ گئے تھے۔ ان میں اختر حسین بھی تھا۔

''لیجیے اختر صاحب خود ہی آ گئے۔'' بڑے بھائی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اختر حسین نے بھی یہ بات سن کر حیرت ہی ظاہر کی تھی۔ اس نے بھی میرے کسی کنویں کے پاس ملنے کی تردید ہی کی تھی۔ مجھے جب کہ ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا' ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کنواں' میری نظروں کا دھوکا رہا ہو۔ میں نے کنویں کی ٹوٹی پھوٹی منڈیر کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا تھا...... اور اس چرخی کے ساتھ لٹکتی رسی کا لمس ابھی تک میرے ہاتھوں پر

تھا اور...... اور...... وہ ڈول جو چھپاکے کی آواز کے ساتھ پانی میں جا گرا تھا' اس کو بھی کنویں کے اندر ڈالنے سے پہلے میں نے چھو کر محسوس کیا تھا۔ چھپاکے کی آواز بڑی زوردار تھی۔ میں نے خود سنی تھی۔ کنویں میں موجود پانی کو میں نے خود جھانک کر دیکھا تھا۔ اور یہ سب کچھ کسی کو نہیں نظر آیا تھا وہ...... وہ...... صرف مجھے نظر آیا تھا...... اور...... اور صرف مجھے محسوس ہوا تھا......؟

اس سب کا کیا مطلب تھا؟ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

اس سب کا کچھ تو مطلب تھا۔ میں سمجھ رہا تھا۔

''تمہیں کنواں کہاں سے نظر آ گیا۔ انجینئر صاحب' صحرا میں کنویں ہوتے ہیں بھلا؟'' چھوٹے بھائی نے ہنس کر پوچھا تھا۔

میں چھوٹے بھائی کو کیسے بتاتا کہ مجھے نظر آیا تھا۔

''صحرا میں نخلستان ہوتے ہیں' یہ تو سنا تھا' کنویں بھی ہوتے ہیں' یہ پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' بڑے بھائی نے مسکرا کر کہا۔

''قصہ کیا ہے؟''

ابو پوچھ رہے تھے اور میں چپ تھا۔ میں کس کس کو کیا وضاحتیں دیتا پھرتا۔ میں نے تھک کر ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ تبھی ابو نے الماس کا نام لے کر کچھ کہا تھا۔ میں ایک دم چونک سا گیا تھا۔ بے اختیار آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ الماس عین دروازے میں کھڑی تھی۔ میں اسے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا حتیٰ کہ آنکھوں میں نمی آ گئی۔ الماس کا خاکہ دھندلانے لگا۔ میں تو یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں اور میری ایک عدد بیوی بھی ہے اور یہ کہ ہوش میں آنے کے بعد میں نے اپنے سب گھر والوں کو دیکھا تھا۔ نہیں دیکھا تھا تو صرف اپنی بیوی کو ہی نہیں دیکھا تھا اور اس کے متعلق کسی نے مجھے دھیان بھی نہیں دلایا تھا حالانکہ اس سے پہلے گھر بھر الماس کی اوردی میں میری کلاس لینے کے لیے تل گیا تھا۔ اس کو غیر خاندان سے آئی ہوئی لڑکی کے سامنے شرمندہ ہو جانے کا کتنا خیال تھا اور اب میرے گھر والوں کو اپنی فیلنگز میرے متعلق بتاتے ہوئے غیر خاندان سے آئی ہوئی لڑکی کا ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا؟

مجھے یکایک بہت عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔

''ارے افنان' تم نہیں جانتے' تمہارے پیچھے کیا کیا کہانیاں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔'' بڑے بھائی کا انداز شرارت لیے ہوئے تھا۔ ''اپنی سب سے چھوٹی بھاوج کے تمام قصے کسی

دن تم کو تفصیل سے سناؤں گا۔" بڑے بھائی کی اس بات پر گھر بھر مسکرانے لگا تھا۔ اختر حسین اور میرے دیگر ماتحت آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

"ہاں چچو! آپ کے پیچھے چچی بہت رو......"

معصوم سا عفان مجھے کچھ بتانے جا ہی رہا تھا کہ بڑے بھائی نے ایک دم اس کو اپنی طرف کھینچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "اف...... ننھے فرشتے......! تم تو چپ رہو۔"

اگرچہ بڑے بھائی نے عفان کو اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ اس کے باوجود بھی اس کی آدھی بات سے میں نے مطلب اخذ کر لیا تھا۔ وہ تو اتنی دور سے چشمے کے پار سے بھی الماس کی بھیگی پلکیں' متورم پپوٹے اور آنکھوں میں اتری گلابیت سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاں وہ یقیناً بہت روئی ہو گی۔

مگر کس لیے؟

کیا...... میرے لیے......؟

میں نے نہایت حیرانی سے سوچا تھا۔ آخر الماس کو کیا پڑی ہے کہ وہ میری پروا کرے...... میں نے دیا ہی کیا ہے اسے......

میں اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا تبھی آفس سے مزید کچھ لوگ مجھ سے ملنے آ گئے تھے۔ وہ لوگ ابھی گئے بھی نہیں تھے کہ کچھ اور مزید لوگ آ گئے تھے۔ الماس منظر سے ہی غائب ہو گئی تھی۔ اتنے آنے والوں کی موجودگی میں بھی ایک عجیب سا احساس مجھے تھا کہ جو جا نہیں رہا تھا حالانکہ میرے سب گھر والے اس کمرے میں موجود تھے۔ ابو' بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی نے آج آفس سے چھٹی کی تھی۔ امی' بڑی بھابی' چھوٹی بھابی' میرے بھتیجوں' بھتیجی نے آج اسکول سے چھٹی کی تھی۔ میرے سب اپنے میرے پاس موجود تھے۔ کسی نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا ہو گا۔ سب کو کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی ہو گی مگر پتا نہیں مجھے کیوں آج پہلی بار ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ کم ہے Missing ہے......

میرا اس وقت دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں کسی کو دیکھوں یا کسی سے بات بھی کروں اور ایک دنیا تھی کہ بولنے پر آمادہ تھی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی سے ملوں۔ ہجوم کا سامنا کروں۔ جب کہ ایک دنیا مجھے دیکھنے اور ملنے آئے جا رہی تھی۔ جتنا میں ہجوم سے بچنا چاہ رہا تھا اسی قدر ہجوم بڑھ رہا تھا۔ بیچ میں جب ڈیوٹی ڈاکٹر راؤنڈ کر کے گیا تو......

آنے والوں کا سلسلہ رکا تو نہیں البتہ اچانک اس میں کمی ضرور آ گئی تھی۔

"کمال ہے' ایگزیکیٹو روم ہی سہی' مجھے ایک لمحے کو بھی نہیں لگا کہ میں اسپتال کے کسی کمرے میں موجود ہوں۔" بڑے بھائی نے اسی وقت ہنس کر کہا تھا۔

"ہاں' لگ رہا ہے جیسے ہم کہیں پکنک منانے آئے ہوئے ہیں۔" چھوٹے بھائی کی اس بات پر تمام گھر والوں کا مشترکہ قہقہہ خاصا بلند تھا۔ میں نے خاصی بے زاری سے تمام لوگوں کو دیکھا تھا۔ اس وقت مذاق' خوش مزاجی' مسکراہٹیں مجھے زہر لگ رہی تھیں۔

"یہ بہو کہاں چلی گئی؟" امی کو اچانک الماس کے بارے میں پوچھنے کا خیال آیا تھا اور الماس کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"وہ گھر چلی گئی ہے۔ مجھ سے پوچھ کر گئی ہے۔" ابو نے فوراً جواب دیا تھا۔

"ہاں' رات بھر کی جاگی ہوئی بھی تو تھی۔" بڑی بھابی نے ہمدردی سے سر ہلا کر کہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بڑی بھابی کو دیکھا۔

"وہی تو پچھلی رات تمہارے ساتھ یہاں رکی تھی۔" بڑی بھابی کے بجائے بڑے بھائی نے جواب دیا تھا۔ میں حیران تھا۔ الماس کے لیے میرے احساسات عجیب سے تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ اچھے احساسات تھے یا برے احساسات تھے......

☆======☆======☆

اسپتال سے گھر جاتے ہوئے راستے میں ابو امی کا گھر پڑا تو میں نے انہیں اطلاع دینے کے لیے گاڑی رکوائی۔ ابو آفس اور عاقب' ثاقب کالج گئے ہوئے تھے۔ صرف امی گھر پر تھیں۔ انہیں جب میں نے ساری بات بتائی تو وہ تو سن کر ہی پریشان ہو گئیں۔

"اتنی بڑی بات ہو گئی اور تمہارے سسرال والوں نے ہمیں کوئی اطلاع نہیں دی؟" امی نے قدرے خفگی سے کہا۔

"اصل میں امی! کل کا دن اتنی پریشانی میں گزرا تھا کہ کسی اور طرف دھیان جا ہی نہیں سکا۔"

"اور تم بھی اب بتا رہی ہو مجھے؟ ایک ذرا فون ہی کر دیا ہوتا۔"

"آپ لوگ خوامخواہ پریشان ہو جاتے۔" میں نے آہستگی سے بتایا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ کل مجھے کسی بات کا ہوش ہی کب رہ گیا تھا۔

"اب کیسا ہے افنان؟"

"ہوش میں تو تھا جب میں آئی۔"

''تم بھی کمال کرتی ہو' وہ اسپتال میں داخل ہے اور تم اسے چھوڑ کر ادھر چلی آئیں؟''

''امی! اس کے گھر والے ہیں اس کے پاس۔ ان کی موجودگی میں میری ضرورت بھی وہاں کیا ہے۔'' میں نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔ امی بغور مجھے دیکھے گئیں۔

''تمہارا خیال بھی نہیں آرہا ہے کسی کو؟''

''امی' افنان ان کا بیٹا ہے' میں ان کی بہو ہوں۔ وہ زیادہ خیال افنان کا کریں گے یا میرا؟'' میں نے بے تاثر لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں۔'' امی نے گہری سانس اندر کھینچی۔ ''سسرال بہرحال سسرال ہی ہوتا ہے۔''

''نہیں امی' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ افنان کے گھر والے میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' میں نے انہیں اپنی طرف سے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ امی نے کچھ لمحات کی خاموشی اختیار کی پھر کہا۔

''تم بتا بھی تو اصل میں مجھے ایسے وقت پر رہی ہو جب ہشام بھی گھر پر نہیں اور عاقب' ثاقب بھی گئے ہوئے ہیں۔''

''آپ لوگ شام میں آجایئے گا۔ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے امی......!''

''بات کیوں نہیں ہے' تمہارے سسرال والے یہی کہیں گے داماد اسپتال میں پڑا ہوا تھا' بہو کے گھر والوں نے خبر بھی نہیں لی۔ کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ ہمیں الہام ہونے سے تو رہا۔ ہمیں پتا کیسے چلے گا' جب تک کوئی ہمیں بتائے گا نہیں۔'' امی کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔

''امی! وہ لوگ ایسے نہیں ہیں اور کوئی کچھ نہیں سوچے گا۔'' میں نے ان کو تسلی دی۔

''سوچیں گے بھی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ' ہم پھر شام میں ہی آئیں گے۔'' میں سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ گھر پہنچ کر آرام تو کیا ہی کرنا تھا' مجھے' میں نے افنان عادل کا دیا ہوا مہر کا چیک لیا اور بینک پہنچ گئی' چیک کیش کرانے کے بعد میں نے ہر عمل اپنی نیت کے مطابق کیا تھا۔ افنان کا اپنے ڈرائیور کے متعلق اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ واقعی ایک شریف اور ذمہ دار آدمی تھا۔ ہر مرحلے پر اس نے میری بے حد مدد کی تھی۔ اس کے باوجود بھی کرنے کے لیے بہت کچھ رہتا تھا۔ خیر سے مجھے اس کی کوئی زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جہاں اللہ تعالیٰ کسی کو نیت کرنے کی توفیق دیتا ہے' وہاں وہ عمل بھی کروا دینے پر قادر ہے۔

سب کاموں سے نمٹ جانے کے بعد میں واپس گھر آگئی تھی۔

''دو گھنٹے بعد آپ واپس آجایئے گا۔'' میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

''بہت بہتر۔'' وہ سعادت مندی سے سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

اندر آکر میں سوچنے لگی کہ دو گھنٹے کا ٹائم تو میں نے ڈرائیور کو بہت زیادہ دے دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں دو گھنٹے تک کرتی کیا۔ آرام تو مجھے کرنا نہیں تھا۔ کیونکہ میرا دھیان تو افنان ہی میں لگا ہوا تھا پھر بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے دس پندرہ منٹ لیٹ گئی' پھر اٹھ کر افنان کے لیے یخنی بنائی۔ پھلوں کا جوس نکالا۔ مجھے خود کچھ بھی کھانے کی خواہش نہیں تھی۔

ڈرائیور دیے گئے وقت سے کچھ منٹ پہلے ہی آگیا تھا۔ میں اسپتال پہنچی تو افنان عادل کی عیادت کے لیے آنے والوں کا ہنوز رش لگا ہوا تھا۔ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد امی، ابو، عاقب اور ثاقب بھی افنان کی عیادت کے لیے آگئے تھے۔ وہ تو زیادہ کچھ بول ہی نہیں رہا تھا۔ پورے وقت اس کے گھر والے ہی ان سے بات کرتے رہے تھے۔ ابو اور امی خاصی دیر تک بیٹھ کر گئے تھے۔ اس کے بعد افنان عادل کے گھر والے بھی زیادہ دیر تک رکے نہیں تھے بلکہ جلد ہی چلے گئے تھے جبکہ ملاقاتیوں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ اب تھکن افنان عادل کے چہرے سے صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

☆=======☆=======☆

عیادت کے لیے آنے والے آخری لوگوں کے رخصت ہوتے ہی' میں اور الماس کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ صوفے پر بہت تکلف سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک دم چپ اور خاموش تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اس کی خاموشی بہت بری لگی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ تو بولے۔ اس کی تو آواز سننے کو میرے کان ترس گئے تھے۔ میں ایک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا اور وہ میری ہر کیفیت سے بے خبر ہو کر نظر جھکائے فرش کو دیکھ رہی تھی۔

اتنی طویل اور بے کاری خاموشی سے میرا دم گھٹنے لگا۔

''دروازہ بند کردو۔'' میں نے بالآخر تھک کر کہا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور جا کر دروازہ بند کردیا پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

''اے سی آن کردو۔''

اس نے ایک بار پھر اٹھ کر اے سی آن کیا پھر اپنی اسی حالت میں آگئی۔ ایک بار پھر تکلیف دہ خاموشی کمرے میں مسلط ہو گئی تھی۔

"مجھے خود ہی خاموشی توڑنی پڑی۔"

"تم کوٹ اسکارف نہ اتارنا چاہو تو بے شک نہ اتارو...... نقاب تو ہٹا دو۔"

اس نے خاموشی سے نقاب ہٹایا۔

کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اسکارف گلے میں ڈال لیا۔ میں اسے دیکھے گیا اور وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

وہ تو ایسے چپ تھی جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہو اور بولنا تو در کنار وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

"تمہیں...... مجھ سے کچھ کہنا نہیں ہے؟" ایک بار پھر مجھے خود ہی بولنا پڑا تھا۔

"نہیں...... مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔" اس نے سر جھکائے ہوئے سکون سے کہا۔

اف...... اس کی آواز سن کر سماعتوں میں شہد' شربت' رس سبھی کچھ گھل گیا تھا۔

"تم کچھ پوچھو گی نہیں مجھ سے؟" کچھ دیر اس کی آواز کے سحر میں ڈوبے رہنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"تمہیں سوالیہ جملے اچھے نہیں لگتے۔" اتنی سنجیدگی سے ایسا غیر متوقع جواب آیا تھا کہ دو تین منٹ کے لیے تو میں کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔ میں تو تقریباً ہر بات بھول ہی چکا تھا کہ شدید غصے کے عالم میں' میں اس کو کس کس بات کے لیے منع کر چکا تھا۔

"تو یعنی تم مجھ سے ناراض ہو......" میں نے بے اختیار پوچھا تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر تم میری طرف دیکھ کر بات کیوں نہیں کرتیں؟"

"تم کو میرا دیکھنا پسند نہیں ہے۔"

بڑا سیدھا اور صاف سا جواب ملا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اس کو کسی بات کے لیے منع کر کے اسی بات کے لیے توقع رکھنا...... غلطی میری ہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"اچھا...... یہاں آؤ......" میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ بستر پر میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا چلا تھا۔ میرے پیچھے تم روتی رہی تھیں۔" میں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"نہیں...... تو......"

اس کے جواب دینے کا انداز بتاتا تھا کہ اس نے خود پہ بہت ضبط کیا ہو گا جواب دیتے ہوئے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے گالوں پر پڑتے والا' پلکوں کا سایہ لرزا

تھا۔

"اچھا۔" میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "گھر بھر مجھے بتا رہا تھا۔"

بڑی خاموشی سے پانی کا ایک شفاف قطرہ میرے ہاتھ کی پشت پر پڑا تھا۔

"کس لیے......"

میں نے بے چینی سے پوچھا تھا اور یکے بعد دیگرے کئی شفاف پانی کے قطرے میرے ہاتھ کی پشت پر بے آواز گرنے لگے تھے۔

اس نے میرے بستر کی پٹی سے سر ٹکا دیا تھا۔

☆======☆======☆

"اس لیے...... اس لیے...... کہ مجھے ہر قسم کا احساس کل ہی ہوا تھا اور...... افنان......!" اٹک اٹک کر کہتے ہوئے مجھ سے قابو نہیں ہو پایا خود پر...... میں ضبط نہیں کر سکی اور بلا ارادہ' بے اختیار رو ے گئی۔ "مجھے لگا جیسے میں نے تم کو کھو دیا ہے۔ جیسے تم مجھ سے چھن گئے ہو۔ تمہیں مجھ سے واپس لے لیا گیا ہے۔ میں...... میں ڈر گئی تھی...... افنان...... !میں ڈر گئی تھی......" میں نے سسکیوں کے درمیان کہا تھا۔ "افنان' تم...... سمجھ نہیں سکتے۔ یہ احساس کس قدر تکلیف دہ تھا میرے لیے...... کتنا اذیت ناک تھا...... افنان' تم کو کھو کر میرے پاس بچتا کیا۔ میرے تو ہاتھ پر سے لکیریں بھی مٹ جاتیں۔ میں تو ایک دم خالی ہاتھ رہ جاتی۔"

میں زارو قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مجھے...... زندگی میں...... کبھی...... کہیں...... کوئی کمی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی کل تمہاری محسوس ہوئی تھی...... افنان...... !کل میں نے تمہاری خواہش نہیں کی تھی...... کل مجھے تمہاری ضرورت تھی۔ ضرورت اور خواہش میں بڑا فرق ہوتا ہے اور مجھے کسی بھی چیز کی اتنی فوری اور شدید ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جتنی کل تمہاری پڑی تھی۔ تم...... تم...... نہیں جانتے افنان کہ تم میرے لیے کتنے اہم ہو۔ تم میرے لیے بہت ضروری ہو۔ بالکل ویسے ہی جیسے زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ضروری ہوتی ہے۔ سانس لیے بغیر آدمی پانچ منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ پانچ منٹ بہت بڑی بات ہے۔ میں تو تمہارے بغیر ایک منٹ...... ایک سیکنڈ...... سیکنڈ کے کچھ حصے بھی زندہ نہیں رہ پاتی۔"

میں نے سسکیوں کے درمیان کہا تھا۔

''مجھے کل اندازہ ہوا تھا افنان کہ تم میرے لیے کتنے قیمتی ہو۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ میرا راستہ تم ہو، میری منزل تم ہو، تم ہو تو سب کچھ ہے۔ ساری دنیا ہے۔ تم نہیں ہو تو کچھ بھی نہیں ہے افنان اگر میں کوئی بے دین عورت ہوتی تو میں تم سے کہتی کہ میرا دین، میری مسجد، میرا کعبہ میرا قبلہ تم ہو۔ اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو میں تم کو کرتی۔ افنان......! دنیا میں ہزار لوگوں نے...... ہزار لوگوں سے...... ہزار بار...... یہ بات کہی ہو گی مگر میں آج یہ بات تم سے پہلی مرتبہ کہہ رہی ہوں۔ میں تم کو بہت چاہتی ہوں افنان...... تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

☆=======☆=======☆

وہ جو کچھ بھی مجھ سے کہہ رہی تھی' مجھے اس سے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ میں تو چپ چاپ اسے بس دیکھ رہا تھا اور حیرانی سے سوچ رہا تھا کوئی دنیا میں ایسا بھی ہو گا کہ کسی کے اتنے برے سلوک کے باوجود بھی کسی کو چاہ سکے۔

کسی سے محبت کر سکے؟

کیوں نہیں...... تھا ناں......

مجھے فوراً مارتھا ایوانز کا خیال آیا تھا...... اور...... اب...... یہ الماس...... مارتھا ایوانز جب میرے سامنے روتی تھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ اسے دو چار اور تھپڑ مار کر کہوں۔ ''اب جتنا رونا ہے روؤ'' مگر تب مارتھا ایوانز پر مجھے کوئی اختیار نہ تھا اور الماس پر مجھے سارے اختیارات ہوتے ہوئے بھی میں بے اختیار تھا حالانکہ اس سے پہلے بھی مجھ پر ساری مصیبت الماس کے آنسوؤں کی بدولت ہی آچکی تھی۔ مارتھا ایوانز میرے آگے روتے ہوئے ایک دنیا' آتے جاتے گزرتے لوگوں کا خیال بھی نہیں کرتی تھی۔ اور یہاں اس بند کمرے میں بہت شکر تھا میری قابل رحم پوزیشن کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہاں انگلینڈ میں' میں مارتھا ایوانز کو روتا پا کر اسی طرح چھوڑ کر کہیں فرار ہو جاتا تھا مگر میں یہاں اپنے سامنے بیٹھی اس عورت سے کہیں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا۔

میں دہشت زدہ سا ہو کر سوچ رہا تھا۔ کیا مسئلہ ہے آخر...... ان عورتوں کے پاس آنسوؤں کا ایسا کتنا اور کیسا اسٹاک ہوتا ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ وہاں وہ مارتھا ایوانز یہاں یہ الماس......

اس رات اس نے مجھ سے بہت کچھ کہا تھا۔ وہ سب کچھ جو ایک محبت کرنے والا

کسی سے کہہ سکتا ہے۔ اس رات مجھ پر انکشافات ہوئے تھے۔

''افنان' میں نے زندگی میں اتنی عاجزی سے' اتنا تڑپ کر...... رو کر اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگا ہو گا۔ جتنا کل میں نے تم کو مانگا تھا۔ میں نے بڑی چاہ سے تم کو اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا افنان......! پھر ایسا کیسے ہو جاتا بھلا کہ تم کو مجھے نہ دیا جاتا۔ مجھ سے تم کو واپس لے لیا جاتا۔''

اور میں نے بڑی حیرانی سے سوچا تھا۔ تو کیا یہ الماس تھی جس کی دعائیں مجھے واپس کھینچ لائی تھیں؟ اتنا اثر تھا اس کی دعا میں کہ Then & there اس کی دعا قبول کر لی گئی تھی یا الماس کو کوئی خاص مقام حاصل تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

''افنان' میں بالکل احمق تھی جو سمجھتی تھی تم سے خلع لے لوں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بالکل پاگل تھی جو سوچ رہی تھی کہ تم مجھے طلاق دے دو گے تو میں خوش رہوں گی۔ تم بہت اچھے ہو افنان......! جو میرے مطالبہ کرنے پر تم نے مجھے ڈانٹ دیا۔ میں تم سے خلع لے لیتی تو میں زندہ نہ رہ پاتی۔ تم مجھے طلاق دے...... دے تو میں کہاں جاتی افنان......! تم سے الگ ہو کر تو میں مر جاتی۔''

وہ رو رہی تھی۔ آہوں سے...... آنسوؤں سے...... سسکیوں سے...... اور مجھ سے سانس لینی بھی دشوار ہوئے جا رہی تھی۔ میں ساکت جامد بستر پر پڑا تھا۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی اس صورت حال پر یا شاید رونا آ رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے اپنی کیفیات پتا نہیں چل پا رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''افنان' تمہارا نام میرا حوالہ ہے اور تمہاری ذات میرے لیے چھت ہے۔ تم جس حال میں مجھ کو رکھو گے' میں راضی رہوں گی۔ میں تم کو بہت چاہتی ہوں۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم بھی مجھے چاہو۔ میں تم سے نہیں کہتی کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ میں تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہوں گی۔ کوئی صلہ نہیں مانگوں گی۔ افنان' میں آئندہ تم کو کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔ میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں تم کو کبھی پریشان نہیں کروں گی۔''

اور میں حیرانی کی آخری حدوں پر تھا...... جہاں تک مجھے یاد تھا۔ چاہتی مارتھا ایوانز بھی تھی مجھے مگر آخری بار اس نے بھی مجھ سے کہا تھا۔

"I am all your`s...be mine"

اگر وہ مجھے بے غرض ہو کر چاہ رہی ہوتی تو اس کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا

چاہیے تھا کہ میں اس کا ہوتا نہ ہوتا۔ اور...... یہ الماس...... کیسی عجیب عورت تھی۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں بدلے میں اسے چاہوں۔ نہ چاہوں' محبت کروں نہ کروں...... اور...... اور وہ کہہ رہی تھی۔

''افنان' میں تم سے بس ایک ریکویسٹ کروں گی۔ تم اپنا نام میرے نام کے آگے لگا رہنے دینا۔ اپنی ذات کی صورت ایک چھت میرے سر پر سے کھینچ مت لینا۔ تم مجھے کبھی خود سے الگ نہیں کرنا۔ تم مجھے چھوڑ مت دینا۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بے کار ہوگا۔ میرے لیے سب بے معنی ہوگا۔ فضول ہوگا۔ میں تم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر رہی ہوں۔ میں تم پر کوئی پابندی نہیں لگا رہی ہوں۔ میں تم کو باؤنڈ نہیں کر رہی ہوں۔ تم اگر ایسا کرنا چاہو تو اپنی مرضی کے مالک ہو۔ بے شک مجھے چھوڑ دینا مگر اس سے پہلے تم مجھے زہر دے دینا۔ میں تم سے الگ ہونے سے زیادہ تمہارے ہاتھ سے مرنا پسند کروں گی۔''

اس نے بہت رقت اور عاجزی سے کہا تھا اور میں اس کے یہ جملے سن کر ہی سناٹے میں آ گیا تھا۔ الماس صرف عجیب ہی نہیں تھی بلکہ عجیب کی بھی اگر کوئی Superlative ڈگری ہوتی تھی تو وہ وہ تھی...... اور اس کے آخری چند جملوں نے مجھے ڈرا دیا تھا' سہما دیا تھا' خوف زدہ کر دیا تھا۔ کم از کم...... یہ الفاظ...... یہ جملے...... مارتھا ایوانز نے بھی مجھ سے نہیں کہے تھے۔ میں خوف کے مارے لرزنے لگا تھا۔

''خدارا......! چپ ہو جاؤ...... الماس......!''

☆======☆======☆

''بس کرو کچھ مت کہو......!'' اس نے ایک دم مجھے ٹوک دیا تھا۔

''اوہ سوری۔'' میں نے جلدی سے آنسو پونچھے۔ ''میں نے بہت بکواس کر دی ناں' تم ڈسٹرب ہو رہے ہو گے۔'' میں اس سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تمہیں کچھ بھی چاہیے ہو تو مجھے آواز دے لینا...... میں ادھر ہی ہوں۔''

''نہیں...... مجھے...... کچھ نہیں چاہیے......'' اس نے خود کلامی کی تھی مگر میں نے سن لیا تھا۔

''اچھا تم سو جاؤ۔ تھک گئے ہو گے ناں...... اتنے ڈھیر سارے لوگوں سے ملنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے......''

میں اس سے کہہ کر واش روم چلی آئی۔ میں واپس آئی تو وہ شاید سو چکا تھا اور میں تو ابھی جاگنا ہی تھا۔ شکر کے سجدے کرنے تھے' نفل نماز پڑھنی تھی۔ ہر رکعت میں سورۃ

الرحمٰن پڑھنی تھی اور جب یہ آیت پڑھنی تھی کہ ''اور...... تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟'' تو اس کا جواب دینا تھا۔ ''نہیں' کسی چیز کو تیری نعمتوں میں سے اے رب! ہم جھٹلا سکتے' بے شک تعریف تیرے لیے ہی ہے۔''

اور...... بلاشبہ...... دیگر نعمتوں کی طرح میرے لیے افنان عادل بھی اس کی نعمتوں میں سے تھا۔ اس وقت میں جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ مجھے نہیں ملتا۔ اسے مجھے واپس دے کر مجھ پر احسان ہی تو کیا گیا تھا۔ میں نے جو مانگا تھا' مجھے مل گیا تھا...... دے دیا گیا تھا...... مجھے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہی تھا مگر سچ تو یہ تھا کہ میں مر جاتی' مر کے زندہ ہوتی۔ مسلسل شکر ادا کرتی رہتی اور ایسا ہزار بار لاکھ بار اور کروڑ بار بھی ہوتا تو بھی میں اس کا شکر ادا نہیں کر پاتی...... کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ہاں...... مگر میں اس کی کوشش تو کر سکتی تھی...... اور میں وہی کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

اور وہ اگرچہ مجھے سونے کی تلقین کر کے خود پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی مگر میں سوتا بھلا کہاں سے؟ نیند تو گویا کوسوں دور چلی گئی تھی میری آنکھوں سے۔ میں چند لمحے یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا پھر جب آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے سامنے موجود پایا۔ چہرے' بازوؤں' ہاتھوں سے ٹپکتے پانی سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ضرور وضو کر کے آئی ہو گی۔ اس کے جائے نماز بچھانے پر اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ میں اس کو نیت باندھ کر کھڑا ہوتا دیکھتا رہا پھر میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھے نیند آ بھی کیسے سکتی تھی کہ جب بھی میں آنکھیں کھولتا تھا اور الماس کو دیکھتا تھا تو اسے قیام ہی کی حالت میں پاتا تھا۔ سسکیوں سے' آہوں سے' ہچکیوں سے اور آنسوؤں سے روتا ہی پاتا تھا۔

میں حیران تھا کہ اتنا لمبا قیام! آخر ایسا کیا پڑھ رہی ہے؟ میں نظر جمائے ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس نے سلام پھیر کر ایک بار پھر نیت باندھ لی تھی۔ دوسری بار کا احوال بھی پہلے سے مختلف نہیں تھا اور اب مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اسے ایک ہی عالم میں' ایک ہی حالت میں دیکھ کر میں انتظار کرتا رہا کہ وہ سلام پھیرے تو میں پوچھوں کہ وہ اتنی دیر تک کیا پڑھ رہی ہے اور مجھے بڑا لمبا انتظار کرنا پڑا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ نیت باندھتی' میں نے ایک دم بے صبری سے پوچھا تھا۔ ''اتنی لمبی نماز...... کیا پڑھ رہی ہو آخر......؟''

وہ یوں چونکی جیسے اب تک میرے وجود سے بے خبر رہی ہو پھر دھیمے لہجے اور

ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ میرا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ ہے لیکن اگر تم کہو گے تو تم کو بتا دوں گی۔''

''نہیں۔'' میں یہ سننے کے ساتھ ہی گویا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ ''تمہارا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ ہے تو میں اس کے بیچ میں آنے والا کون ہوتا ہوں۔ مجھے کچھ مت بتاؤ۔'' میں نے تھک کر کہا تھا۔

وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ ''مجھے پتا نہیں تھا کہ تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں تم کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ میں اب سے مزید احتیاط کرنے کی کوشش کروں گی تم آرام سے سو جاؤ۔''

وہ ایک بار پھر مجھے سونے کی تلقین کر کے خود نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ وہ میری ڈسٹربنس کے خیال سے سسکیاں بھی روک روک کر اور گھٹ گھٹ کر لے رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی میں اس کی ہر سسکی صاف اور بالکل واضح طور سے سن سکتا تھا۔ اس کے آنسوؤں کو بے آواز گرتا دیکھ سکتا تھا۔ وہاں انگلینڈ میں مجھے مارتھا ایوانز کے آنسوؤں کی کبھی پروا بھی نہیں ہوتی تھی مگر پتا نہیں کیوں اس عورت کے آنسو مجھے بے بسی میں مبتلا کر رہے تھے۔

پتا نہیں کیوں اس عورت کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔

حالانکہ مارتھا ایوانز تو کئی بار مجھ سے رحم کرنے کے لیے کہہ چکی تھی اور مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے آنسوؤں پر اس کے رونے پر مجھے کبھی ترس نہیں آیا تھا مگر اس عورت پر مجھے ترس آ رہا تھا۔ بے حد رحم آ رہا تھا۔

آج پہلی مرتبہ مجھے مارتھا ایوانز پر بھی افسوس سا ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ غلط ہوا ہے۔ میں کچھ غلط کر کے آیا ہوں اس کے ساتھ۔ حالانکہ میں نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ ہمیشہ اس کی حوصلہ شکنی ہی کی تھی مگر آج میں بہت گلٹی Feel کر رہا تھا۔

پوری رات آنکھوں میں کٹی تھی...... صبح ہونے پر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ تین راتیں اگر مزید اسی طرح کی گزریں گی تو میں یقیناً پاگل ہو جاؤں گا۔ بڑا خوف زدہ سا ہو کر میں نے سوچا تھا۔ لہٰذا مجھے اسپتال کے اس کمرے سے جلد از جلد نجات حاصل کرنی چاہئے...... میری عقل میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ مجھے تو اپنے گھر اور اپنے کمرے میں بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا بہر حال کرنا ہی پڑے گا۔ میں الماس

بات کرنا چاہ رہا تھا۔ شام تک سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے تھا مگر رات آتے آتے میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ اصل میں پچھلی رات ایسی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس رات کے بھی آنسوؤں میں ڈوب جانے کا تصور مجھے ہولائے دے رہا تھا۔ اس قسم کا کوئی بھی تصور مجھے خوف زدہ کیوں نہ کر دیتا جبکہ دن میں ہی میں الماس کی پلکیں گیلی اور آنکھیں سوجی ہوئی دیکھتا رہا تھا۔ پھر جب رات میں سب لوگ چلے گئے اور وہ بھی کوٹ اسکارف اتار کر غالباً وضو کرنے کے لئے جانے لگی تو میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا تھا۔ ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

وہ ٹھٹک کر رکی۔ ''وضو کرنے۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''میرے خیال میں تو میں یہاں بلا جواز بستر توڑ رہا ہوں۔ نہیں تو میں بالکل صحت مند اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' فی الحال تو مجھے کرنے کے لئے سب سے مناسب بات یہی لگی تھی۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولی تھی۔ خاموشی سے کھڑی رہی۔ بالآخر مجھے ہی طویل خاموشی کے بعد پوچھنا پڑا۔ ''یہ لوگ مجھے ڈسچارج کیوں نہیں کر دیتے؟''

الماس اب کی بار بھی کچھ نہ بولی اور اب مجھے اس کی خاموشی سے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

''ارے تو آخر مجھے ہوا کیا ہے۔ کوئی بتائے بھی تو مجھے۔'' میں نے ناراضگی کے عالم میں پوچھا تھا۔ ''ایک ذرا سی Dehydration ہوئی تھی۔ اب تو اس اسٹیٹ سے باہر آ گیا ہوں میں۔''

''افنان کچھ دن آرام کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔'' اب کی بار اس نے نرمی سے کہا تھا۔

''یہاں کا ماحول آرام کرنے والا ہے؟'' میں نے طنز سے پوچھا۔

''اب یہاں گھر جیسی بات تو نہیں آ سکتی ناں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''تو اسی لئے میں گھر جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ''بتاؤ بھلا وہ ایک آدمی جو ایک جگہ بیٹھتا تک نہیں ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر کے رکھ دیا ہے۔ میں کہیں آ جا نہیں سکتا۔ گھوم پھر نہیں سکتا۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''افنان پلیز اس بارے میں مجھ سے کچھ مت کہو۔'' اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''تمہیں جس سے جو شکایت ہو اسی سے کہو تم مجھ سے جو کہو گے میں کرنے کی کوشش کروں گی۔''

''میں ادھر بہت بے آرام ہوں۔''

''اچھا دیکھو مجھ سے جو ہو سکتا ہے میں کر رہی ہوں۔'' وہ مجھ سے کہہ کر چلی گئی تھی واپس آ کر وہ جائے نماز بچھا کر کھڑی ہونے لگی۔ تو میں نے اک دم گھبرا کر اسے پکار لیا۔

''تم...... کم سے کم مجھ سے باتیں ہی کر لو۔''

وہ خاموشی سے میرے برابر میں آن بیٹھی۔ ''تم...... جو کہو گے وہ بات کر لوں گی۔''

''ارے۔'' میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ''اب یہ بھی میں تم کو بتاؤں گا؟ تمہارے خود کے پاس کرنے کے لئے کوئی بات نہیں ہے؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فی الحال تو میرے پاس کرنے کے لئے کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے پاس اگر ہو تو تم کر لو میں سن رہی ہوں۔'' وہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں بھی چپ رہا۔ کیا کرتا' کرنے کے لئے کوئی بات تھی ہی نہیں۔ خاموشی کا لمبا وقفہ ہمارے درمیان آ گیا۔

''جاؤ...... نماز پڑھو۔'' میں نے بالآخر اکتا کر کہا۔

''میں انتظار کر رہی ہوں۔ افنان تم کچھ کہہ رہے تھے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ کل کی طرح آج بھی اتنا لمبا قیام دیکھ کر میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نماز کے دوران ہی وہ زارو قطار رونے لگی تھی۔ میں حیرت کے مارے اپنی جگہ پر جم سا گیا تھا۔ ہچکیوں کے مارے اس کا جسم لرز رہا تھا اور میں ساکت و جامد اسے دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ سسکیاں بھی گھٹ کر لے رہی تھی۔ میرے سامنے نہیں رو رہی تھی۔ جس کے سامنے رو رہی تھی اس کا اور الماس کا خود آپس کا معاملہ تھا۔ مگر آج مجھ پر انکشاف ہی کچھ اور ہو رہا تھا۔ وہ اگر سسکیوں سے رو رہی تھی تو میرے آنسو بھی بے آواز گر رہے تھے۔ کل مجھے اس کے آنسوؤں نے وحشت میں مبتلا کیا تھا۔ آج اس کے آنسو مجھے بے بسی میں مبتلا کر رہے تھے۔ جب اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''الماس اتنی مشقت کس لئے آخر؟''

''مشقت کیسی افنان۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔ ''جب کمٹمنٹ کی جاتی ہے تو اسے پورا بھی کرنا چاہئے نا۔'' اس نے مجھ سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ میں [illegible]

کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر نیت باندھ کر کھڑی ہونے لگی تو میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''مجھے ایک بات بتاؤ' یہ تم اتنا رو دھو کس سلسلے میں رہی ہو؟'' میں اگرچہ جانتا تھا سب کچھ مگر شاید جاننا نہیں چاہتا تھا۔

''اوہ سوری میں اپنی طرف سے تو پوری کوشش کر رہی تھی کہ تم کو ڈسٹرب نہ کروں۔'' وہ پشیمانی سے بولی۔ ''تم ڈسٹرب ہو رہے ہو گے نا' میں کہیں اور چلی جاتی ہوں۔''

''ارے دماغ تو درست ہے تمہارا۔'' چڑ کر میں نے کہا۔ ''کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ اتنی رات گئے کہاں جاؤ گی تم' یہ اسپتال ہے' میرا گھر نہیں ہے۔''

الماس چپ سی ہو گئی۔

''میں پوچھ رہا ہوں آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے۔'' میں نے خفگی سے پوچھا۔ وہ ایک بار پھر چپ رہی۔ پھر آہستگی سے کہا۔

''تم سمجھ نہیں سکتے افنان......''

''ہاں میں سمجھ بھی کیسے سکوں گا۔'' میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''دنیا بھر کا نا سمجھ آدمی تو میں ہوں ساری سمجھ تو تم میں آ گئی ہے۔''

''میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا افنان۔ میں تم کو سمجھا نہیں سکتی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جمے ہوئے تھے اور اس سمیت وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ ''میں ابھی تک بے یقین ہوں۔ میں خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ میں تم کو زندہ سلامت دیکھ رہی ہوں۔''

''اچھا تو بس پھر ٹھیک ہے۔ تم اگر ابھی بھی بے یقین ہو تو میرے مرنے پر رو لینا۔''

''افنان۔'' اس کی آواز احتجاجاً قدرے بلند ہو گئی۔ پھر ایک دم دھیمے لہجے میں اس نے کہا تھا۔ ''تم اکثر بہت زیادتی کر جاتے ہو۔ آئندہ پلیز ایسی کوئی بات مت کرنا۔''

''تم میرے سامنے آئندہ مت رونا۔''

''میں تمہارے سامنے نہیں رو رہی ہوتی۔''

''تم جس کے سامنے بھی رو رہی ہوتی ہو۔ میں آئندہ تم کو روتا ہوا نہ دیکھوں......''

''اچھا۔'' وہ دھیمے سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''جو تم کہو گے میں کروں گی مگر میں تو بس اس مالک برحق کا شکر ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں جس

نے ہر بار مجھے کچھ دیا ہی ہے اور مجھ سے کچھ لیا نہیں۔"

"تو شکر ادا کرتے ہوئے ضروری ہے کہ رویا جائے؟"

"مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا۔"

"اور تمہیں اس عالم میں دیکھ کر میں خود پر اختیار کھونے لگتا ہوں۔" میں ... چڑتے ہوئے کہہ کر ایک بار پھر لیٹ گیا۔ مجھے شدید جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پتا نہیں مجھے نیند آئی بھی تھی یا نہیں۔

اگلی صبح الماس نے مجھ سے پوچھا۔ "افنان ناشتے میں جو کھانا چاہو مجھے بتا دو میں دوں گی۔" میرا موڈ ابھی تک بحال نہیں ہوا تھا۔ سو بڑی رکھائی سے اس سے کہا۔

"میرا ناشتہ کرنے کا موڈ نہیں ہے۔"

وہ لمحے بھر کے لئے خاموش ہو گئی پھر کہا۔ "اچھا کچھ اور کھانا چاہو تو کہو۔"

"کچھ نہیں کھانا۔" میرا انداز دو ٹوک تھا۔

"افنان کھانے سے ناراض نہیں ہوتے۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ "کچھ تو کھا لو تم' اچھا سیب کاٹ دیتی ہوں۔"

میرا ایک ہی جواب تھا۔ "نہیں...... نہیں...... نہیں۔"

"تم نقصان کر رہے ہو افنان۔" اس نے تاسف سے کہا۔

"اپنا ہی کر رہا ہوں۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"تمہارا نقصان Ultimately میرا نقصان ہے۔"

"تو تم سے کس نے کہا ہے۔ میرے لئے نقصان اٹھاؤ۔ میں نے تو نہیں کہا۔"

"ہاں۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔ "یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ میری کمزوری تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

اور میں ہمہ تن سوال بن گیا۔ منتظر ہی رہا کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرے مگر وہ چپ ہو گئی تھی۔

"کیا......؟" مجھے بالآخر پوچھنا پڑا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "مجھے بار بار جتانا' بار بار کہنا اچھا نہیں لگے گا۔"

"مگر مجھے بار بار سننا بہت اچھا لگے گا......" میں اس سے کہنا چاہتا تھا

رک گیا تھا۔ اس نے بات ہی پلٹ دی تھی۔ "اچھا چلو تم چینج ہی کر لو۔"

مجھے ضد ہو گئی تھی۔ "نہیں۔"

"اچھا باہر آ کر تو ذرا دیکھو۔ اس فلور سے نیچے کا منظر کتنا اچھا لگتا ہے۔ فوارہ چل رہا ہے۔ اس کے حوض میں جو بلیک کلر کے ٹائلز لگے ہوئے ہیں کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔ اس کی اسٹار شیپ ہری گھاس کے درمیان کتنی متاثر کن لگ رہی ہے۔ بچے کھیل رہے ہیں۔ اتنا پیارا لگ رہا ہے۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا۔"

الماس بے یقینی سے کہہ رہی تھی۔ "افنان تم اتنے ضدی تو کبھی نہیں تھے۔"

"میں ہمیشہ سے ایسا ہوں۔ تمہیں کیا پتا۔"

وہ تو خیر مجھے نظر آ ہی رہا ہے۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"تم مجھے بچوں کی طرح سے ٹریٹ کرنا بند کر دو سمجھیں۔" میں نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم مجھے بچے ہی لگ رہے ہو۔ ایسی ضدیں تو بچے ہی کرتے ہیں۔"

"میں بچوں سے کہیں زیادہ ضدی ہوں۔"

"ہاں۔" اس نے طویل سانس لی۔ "مجھے حیرت زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ سارے مرد ضدی ہوتے ہیں' ماما بھی تو......" اس نے ایک دم بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ پھر موضوع ہی بدل دیا تھا۔ "یوں تو تم مشکل کر دو گے افنان۔"

"کیا بھلا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"زندگی۔"

"کس کی؟"

"میری۔"

اس نے اطمینان سے کہا تھا۔

"تم خواہ مخواہ میری وجہ سے اپنی زندگی کو مشکل میں ڈال رہی ہو۔"

"مشکلات کو چیلنج سمجھ کر قبول کرنا ہی زندگی ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا تھا۔

"اکثر چیلنج مصیبت بن جایا کرتے ہیں۔"

"میں تمہارے لئے ہر مصیبت اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔"

"یعنی تم جان بوجھ کر آگ میں کودنے کے لئے تیار ہو۔"

"آگ میں بھی کود جاؤں گی' بس تم کو کچھ نہ ہو۔"

"لیکن اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا' تو میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد کسی اچھے سے آدمی سے شادی کر لینا۔"

"افنان۔" اس کی آواز احتجاج کے مارے بلند ہو گئی۔ پھر ایک دم آہستگی سے اس نے کہا۔ "تم سب جانتے ہو۔ پھر بھی ایسا کہہ رہے ہو۔"

"میں سب جانتا ہوں اسی لئے تو ایسا کہہ رہا ہوں۔"

وہ چند لمحے چپ رہی پھر بے یقینی سے کہا۔ "افنان تم بہت ظالم ہو۔ بہت بے درد ہو۔"

"بس دیکھ لو' پھر سوچ لو میں ایسا ہی ہوں۔"

"جیسے بھی ہو' مجھے قبول ہو۔"

"تو بس پھر مجھ سے شکایت کیوں کر رہی ہو۔ تم نے تو کہا تھا مجھ سے کوئی شکایت نہیں کرو گی۔" اس نے بے بسی سے کہا تھا۔

"میں تم سے کوئی شکایت نہیں کر رہی ہوں افنان۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "میں تم سے صرف التجا کر رہی ہوں میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ تم مجھے مزید تنگ مت کرو۔"

"میں تم کو کہاں تنگ کر رہا ہوں۔ تنگ تو تم نے مجھے......"

میں لاچاری سے کہتے کہتے رک گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ ظاہر ہے یادداشت میری بھی بری نہ تھی اور اس کی بھی بہت اچھی تھی۔ تیرہ سال آٹھ مہینے اور [illegible] دن پہلے یہی جملے میں نے الماس سے کہے تھے اور اب اس کا بے یقینی سے مجھے دیکھنا ایک لازمی امر تھا۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی تھی اور میرا موڈ ایک دم غارت ہو گیا تھا۔ [illegible] بدمزا سا ہو کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ الماس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے اندر آنے والی شخصیت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ یہ ڈیوٹی آف کر کے جانے والا ڈاکٹر تھا۔ میرا غصہ جو کافی حد تک اتر گیا تھا۔ ایک دم عود آیا تھا۔

"میں آف کر کے جا رہا تھا۔ سوچا افنان صاحب کو دیکھتا چلوں۔" ڈاکٹر شاہد اکرام خاصا خوش مزاج آدمی تھا مگر اس وقت مجھے اس کی خوش مزاجی ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

"اب کیسے ہیں افنان صاحب آپ؟" وہ اب میری طرف متوجہ تھا۔

"کیسا لگ رہا ہوں؟"

"Better۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"تو پھر آپ لوگ مجھے ڈسچارج کیوں نہیں کر دیتے۔"

"آپ کی کنڈیشن بہتر ہونے تک تو ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"اور میری کنڈیشن گڈ کب تک ہو جائے گی آپ کے حساب سے؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

"کچھ دن تو لگیں گے۔"

"تب تک میں ادھر پڑا رہوں گا؟"

"مجبوری ہے۔" وہ مسکرایا اور مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی تھی۔ "آپ کو آرام کرنے کی ضرورت ہے۔" اس نے اصرار کرنے والے انداز میں کہا۔

"مجھے آرام کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

"آپ کی اسی عادت نے تو آپ کو یہ دن دکھائے ہیں۔"

"جی......؟" مجھے اس کی بات خاصی ناگوار گزری تھی۔ "مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے آپ کو یہاں رہنے میں آخر پریشانی کیا ہے؟" ابھی اس نے یہ بات کہی ہی تھی کہ لیبارٹری سے بلڈ کلیکٹ کرنے کے لئے Phlebotomis آ گیا تھا۔

"یہ پریشانی ہے مجھے۔" میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ تو Parasite ہو گئے ہیں۔ صبح شام خون چوستے ہیں میرا۔"

ڈاکٹر شاہد خوش مزاجی سے مسکرایا۔ "جناب پانچ دس سی سی بلڈ دینے سے انسان کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں بھی یہ لیب ٹیسٹس تو ہماری روٹین Examination کا حصہ ہیں۔"

Phlebotomist خون لے کر چلا گیا تھا۔ "خوب بل بنائیں آپ لوگ۔" میں بڑبڑایا۔

"بل بھی کون سا آپ کو اپنی جیب سے بھرنا پڑ رہا ہے۔ وہ تو حکومت کا مسئلہ ہے۔" ڈاکٹر شاہد نے لاپروائی سے کہا۔

"خواہ مخواہ کے بل کیوں بھرے حکومت؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "یہ اچھی زبردستی ہے۔"

"ارے آپ عجیب آدمی ہیں۔ اتنی پروا کر رہے ہیں حکومت کی۔ ورنہ حکومت کے افسران تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس بہانے ذمہ داریوں سے نجات ملتی ہے سو الگ۔ آرام ملتا ہے سو الگ۔ پھر آپ کا تو کیس بھی Genuine ہے۔"

"دیگر لوگ جو چاہے کرتے پھریں' یہ ان کا مسئلہ ہے۔" میں نے خاصی ناگواری سے کہا۔ "مجھے ایسے کام کرنا نہ پسند ہیں اور نہ میں کرتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں' کبھی کبھار کر لینے چاہیے۔" ڈاکٹر شاہد اکرم نے لاپروائی سے کہا۔ مجھے اس کے لہجے پر بڑا غصہ آیا۔

"تو یعنی آپ لوگ مجھے ڈسچارج نہیں کریں گے؟"

"مشکل ہے۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"تو ٹھیک ہے میں ہائر اتھارٹیز سے رجوع کروں گا۔"

"اوہ...... بصد شوق!" اس نے میری بات سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز چڑانے والا تھا۔ "اللہ حافظ ٹیک کیئر۔" کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

مجھ سے اپنے غصے پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

افنان عادل ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں دہاڑا تھا۔ "ایڈمنسٹریٹر کو ملاؤ۔" اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔ فوراً ہی لائن ملوا دی گئی تھی۔ اس نے ایڈمنسٹریٹر کو بلوایا اور اس کے آنے تک افنان عادل غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہلتا رہا تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے آخر اتنا غصہ کس بات پر آرہا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی اور اس کے آنے پر افنان عادل نے ایک طوفان اٹھا دیا تھا۔ اسے ٹھیک ٹھاک جھاڑا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر بے چارہ ایک شریف آدمی تھا۔ نہایت خاموشی اور تحمل سے اس نے افنان عادل کو ایسے سنا تھا جیسے وہ اسے خوشی کے گیت سنا رہا ہو اور اس کی ہر بات کے جواب میں صرف ایک ہی جملہ کہتا رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا جناب ہم مجبور ہیں۔" ایڈمنسٹریٹر کے چلے جانے کے بعد بھی افنان عادل گرجتا برستا ہی رہا تھا۔

"اونہہ خواہ مخواہ بیمار بنا کر اسپتال میں ڈال دیا ہے۔" وہ دہاڑ رہا تھا۔ "ڈسچارج نہیں کرتے۔ ابھی اپنا Influence استعمال کروں گا ناں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رکا۔ "اور یہ جو ڈاکٹر شاہد اکرام ہے۔ اس کی تو میں ایسی کی تیسی کردوں گا۔"

"تم خواہ مخواہ اس بے چارے آدمی کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"کچھ بھی نہیں کیا؟" افنان عادل نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ "تم نے اس کا لہجہ دیکھا تھا۔ کس انداز میں وہ مجھ سے بات کر رہا تھا؟"

"اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔"

افنان عادل نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں کس حساب میں اس سے اتنی ہمدردی ہو رہی ہے؟"

سک کر اس نے پوچھا تھا اور میں کہہ کر پچھتائی تھی۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو افنان۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہو رہی ہے ڈاکٹر شاہد اکرام بھاڑ میں جائے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ وہ اس وقت صرف تم سے تمہاری بھلائی کے لئے بحیثیت ڈاکٹر بات کر رہا تھا۔"

"ہاں تو میں بھی کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ ہوں میں......"

"افنان' اس وقت تم صرف ایک مریض ہو۔" میں کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ "اور اسپتال کے بستر پر ہو۔ اپنے آفس کی سیٹ پر نہیں ہو۔ لہٰذا ہر قسم کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔"

"تو بس پھر ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "مطمئن رہو' میں جب یہاں ہوں ہر روز اسی طرح کے تماشے کے لئے تیار رہو۔ دیکھنے کے لئے ملتے رہیں گے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

میں نے تھکن زدہ سی ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر تھک کر بیٹھ بھی لی۔ اسے یہاں روک کر رکھنے کا فیصلہ میرا نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں کا تھا۔ میں یہ بات اس کو بھی بتا چکی تھی۔ وہ بے حد چڑا بھی تھا یہ بات سن کر۔ اس کے گھر والے اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ گھر آتے ہی ایک بار پھر ذمہ داریوں میں الجھ جائے گا۔

"یہ اصل میں ہر بات کو خود پر سوار کر لیتا ہے۔" ابو نے کہا۔ "راستہ بھٹک جانا تو صرف ایک واقعہ ہے یہ ٹینس اور اوور برڈن ہو رہا تھا۔"

میں نے ابو کی بات یاد آنے پر گہری سانس لے کر افنان عادل کو دیکھا۔ وہ مجھ سے اپنا Influence استعمال کرنے کا کہہ رہا تھا اور میں اس سے کیا کہتی کہ ابو اس سلسلے میں اس کی ہائر اتھارٹیز سے پہلے ہی کہہ کر سارے بندوبست کروا چکے تھے۔

حالانکہ میں نے ابو سے بہت کہا تھا۔ "ابو! اسپتال اسپتال ہوتا ہے۔ گھر گھر ہوتا ہے۔ یہ کمرہ لاکھ آرام دہ سہی۔ اس کمرے میں لاکھ سہولیات موجود سہی مگر گھر جیسا آرام کہاں مل سکتا ہے۔"

"ہاں بہو۔" امی نے کہا تھا۔ "اس کو چند دن ادھر ہی رہنے دو۔ اس وقت یہ کم از کم نظر کے سامنے تو ہے گھر پہنچ کر گھر میں یہ ٹکے گا تھوڑا ہی۔ ذمہ دار افسر جو ہے۔"

اور وہ یہاں رکنے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی صبح اس نے مجھے ہر معاملے پر زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ میں جو پچھلی تین راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی۔ دن میرا مشقت سے بھرپور گزرتا تھا اور بری طرح تھکی ہوئی تھی۔ اس کے رویے سے عاجز آگئی تھی۔ اس کی ہر بات نہیں سے شروع ہو کر نہیں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ نہایت خفگی اور ناراضگی کے عالم میں بستر پر بیٹھ گیا تھا۔

"افنان پلیز! اس میں خفا ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے خاصی بے بسی سے کہا۔

"تم بات مت کرو مجھ سے۔" اس نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ میں بے اختیار مسکرا پڑی تھی۔ اس کا انداز بالکل بچوں جیسا تھا۔

"اچھا تو تم بات کرلو مجھ سے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"میں تو نہیں کرتا۔" اس نے اسی انداز میں کہا۔

اسی وقت ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے دروازے کی سمت دیکھا۔ "دو منٹ سکون کے ساتھ آدمی بات بھی نہیں کرسکتا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

میں بے اختیار ہنسی۔ "لوگ تم سے ہی ملنے کے لئے آرہے ہیں۔" وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر شدومد سے نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "مجھے کسی سے بھی نہیں ملنا۔"

دستک ایک بار پھر ہوئی۔ میں طویل سانس لے کر دروازہ کھولنے کے لئے اٹھی۔ اس نے ایک دم پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"دروازہ کھولنا ضروری ہے کیا؟" نہایت معصومیت سے اس نے پوچھا۔

"تم کہتے ہو تو نہیں کھولتی۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر گہری سانس لے کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "جاؤ کھول دو۔" بری ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ابو اور بڑے ...

کھڑے نظر آئے۔ اس کے علاوہ دوسرے کئی لوگ بھی پیچھے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا اور ایک طرف ہٹ کر آنے کا راستہ دیا۔

"ہاں بہو، صاحب زادے کا حال کیا ہے؟" سلام کا جواب دینے کے بعد ابو نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور اس وقت افنان عادل آنے والوں کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"حال تو بالکل اچھا نہیں ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" ابو نے چونک کر پوچھا۔

"ابو آپ اسے ہاؤنڈ مت کریں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ یہ صحیح بات بھی ہے۔ کوئی کب تک ایک کمرے میں قید ہو کر رہ سکتا ہے اور وہ بھی اس جیسا آدمی۔ آپ اسے ڈسچارج کروا دیں۔"

ابو چند لمحے مجھے دیکھتے رہے۔ "تم کیا سمجھتی ہو بہو! ہم جانتے نہیں ہیں کیا' ہم کچھ دیکھتے نہیں تھے۔ ہم تو تمہارے خیال سے ایسا کر رہے تھے بہو۔" انہوں نے آزردگی سے کہا تھا۔ "کہ تم اسے مٹھی میں کرلو۔ ورنہ گھر میں یہ تمہارے ہاتھ کہاں آتا بھلا۔"

"ابو یہ یہاں رہا تو خود بھی پاگل ہو جائے گا اور دوسروں کو بھی پاگل کر دے گا۔" میں نے تھک کر کہا۔

"کوئی بات ہوئی ہے؟" انہوں نے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا میں چپ ہو رہی۔ نگاہ چرا لی۔ ابو چند لمحے کے لئے خاموش سے ہو گئے۔ "ٹھیک ہے' جیسی تمہاری خوشی۔" بالآخر انہوں نے کہا۔ "آج شام اسے ڈسچارج کروا دیں گے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ یہاں سوال میری خوشی کا نہیں تھا۔ "یہ بہت اچھا ہو گا۔" میں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا تھا۔ حالانکہ میں یہ بات بھی بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ شام میں اگر یہ ڈسچارج کر دیا گیا تو یہ اگلے دن گھر پر نہیں رکے گا اور آفس چلا جائے گا۔

☆======☆======☆

الماس آج بھی امی اور چھوٹی بھابی کے آتے ہی مخصوص اوقات میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی ہر رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ہر منظر سے میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ لوگوں نے پھولوں سے کارڈز سے بھرا ہوا کمرہ مجھے خالی خالی لگنے لگا تھا۔ الماس جاتے ہوئے کمرے کو ویران اور اجاڑ کر گئی تھی۔ ساری رونق اور دلکشی اپنے ساتھ ہی سمیٹ کے لے گئی تھی۔ اس وقت میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤں۔ پکڑ لاؤں۔ سامنے لا کھڑا کروں یہ خواہش ایسی شدید تھی کہ میں خود بھی اپنی کیفیت سے

پریشان ہو گیا تھا۔ لاحول ولا قوۃ یہ مجھے آخر کیا ہو گیا تھا۔ میں سخت وحشت زدہ سا ہو کر سوچ رہا تھا۔ بے قرار تو میری نظر کل بھی تھی اس کے لئے مگر الماس کے لئے اتنے Strong جذبات میں نے کبھی محسوس نہیں کئے تھے۔ ایسی شدید کیفیات سے تو میرا آج ہی سامنا ہوا تھا۔

پھر جب الماس آئی تھی تو اسے دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ ''تم آخر کہاں......'' میں یہ کہتے کہتے ایک دم خود کو روکا تھا۔ کیونکہ میری نظر اچانک ارد گرد بیٹھے لوگوں پر پڑی تھی۔ میرا ماتحت اسٹاف ابھی ابھی آ کر بیٹھا تھا۔ اتنے لوگوں میں اپنی بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے لحاظ آ گیا۔ سو میں نے برق رفتاری سے اپنی نظروں کا زاویہ برابر میں بیٹھے اختر حسین کی طرف کیا۔ ''غائب تھے' تین دن سے اختر حسین؟'' میں نے ادھورا جملہ جلدی سے مکمل کرتے ہوئے کہا۔

اختر حسین حیرت زدہ سا ہو گیا۔ ''سر...... کل میں بس آپ سے ملنے کے لئے نہیں آ سکا۔'' اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ ''اصل میں آفس میں کچھ معاملات آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔ بلکہ دو فائلز تو میں اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ آپ انہیں ایک نظر دیکھ لیجیے۔'' اس نے فائلز میری طرف بڑھائیں۔ میرا دھیان نہ اختر حسین کی طرف تھا نہ فائلز کی طرف میں تو الماس کی طرف متوجہ تھا۔ میرے بجائے فائلز اسی نے پکڑ لی تھیں۔

''آپ انہیں فی الحال اپنے پاس ہی رکھیں اختر صاحب۔ امید ہے یہ فائلز جہاں سے آئی تھیں وہیں واپس پہنچ جائیں گی۔''

اختر حسین کھسیا گیا تھا۔ ''معافی چاہتا ہوں معزز خاتون' مجھے ہی خیال کر لینا چاہئے تھا۔'' میں ایک لفظ بھی کہے بغیر خاموشی سے اسے تکے گیا۔ میں موقع کی تلاش میں تھا کہ الماس سے اس کے غائب ہونے کا سبب پوچھوں اور وہ مجھے مل ہی گیا تھا۔ اس وقت جبکہ الماس وہاں موجود لوگوں کو تواضع کا سامان سرو کر کے میرے برابر آن بیٹھی تھی۔ تو میں نے سرگوشی کرنے کے سے انداز میں اس سے پوچھا تھا۔ ''تم کہاں چلی جاتی ہو آخر؟'' اور اس نے دھیمے سے جواب دیا تھا۔ ''یہ میرا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ ہے۔ پھر بھی اگر تم پوچھتے ہو تو تم کو بتا دیتی ہوں۔''

''نہیں اگر تمہارا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ ہے تو مجھے کچھ مت بتاؤ۔ بس تم آئندہ کہیں......'' میں کہتے کہتے رک گیا تھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پتا نہیں کیوں میری زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ میں کچھ کہہ نہ پایا۔

اسی شام مجھے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ اتنے دنوں بعد جب رات کا کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر والوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھا تو ابو ہنس کر کہہ رہے تھے۔

''کمال ہے سارہ' مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تمہارا بیٹا شہر کی اتنی اہم شخصیت ہے۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ یہ لوگوں میں اتنا مقبول ہے اور لوگ اتنا چاہتے ہیں اسے۔ اتنی عزت کرتے ہیں۔''

ابو کے کہنے پر بغور میں نے انہیں دیکھا تھا اور اسپتال میں قیام کے تین دن یک لخت میری نگاہوں کے سامنے پھر گئے تھے۔ ان تین دنوں میں کوئی دن ایسا نہیں گیا تھا کہ میری عیادت کے لئے آنے والے لوگوں میں کمی ہوئی ہو۔ شہر کی تقریباً تمام معزز اور نامور شخصیات سے لے کر میرے آفس کے لوئر گریڈ اسٹاف سے لے کر آفیسر گریڈ تک کے اسٹاف تک کون ایسا تھا جو مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اختر حسین کی تو اگر میں مان بھی لوں کہ چلو اس کی غرض تھی مجھ سے میں نے اس کو پروموشن کے لئے کہا تھا اور میرے دیگر آفس اسٹاف کو شاید چھٹیوں' اچھے ریمارکس والی ACR رپورٹ وغیرہ کی غرض ہو مجھ سے مگر باقی لوگوں کی بھلا کیا غرض تھی مجھ سے؟ میرا آفس اسٹاف میرے گھر والوں نے دیکھ لیا تھا کہ میرا بہت خیال کرتا ہے۔ بڑے بھائی نے تو کہہ بھی دیا تھا۔ ''افنان تمہارے Subordinates تو بہت اچھے ہیں بھئی' تمہارا اتنا خیال کرتے ہیں۔''

''یہ لوگ اس لئے اچھے ہیں کہ میں انہیں Subordinates نہیں سمجھتا۔'' میں نے بڑے بھائی سے کہا تھا۔ ''بلکہ انسان سمجھتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ میرا خیال کرتے ہیں۔''

ان تین دنوں میں کوئی دن ایسا نہیں گیا تھا کہ ملنے آنے والوں کی خاطر مدارات کے لئے کبھی میں نے اپنی جیب سے پیسہ خرچ کیا ہو۔ بلکہ روم ریفریجریٹر آنے والوں کی لائی ہوئی سوغات سے بھرا رہتا تھا۔ ان تین دنوں میں اتنے بوکے اور گیٹ ویل سون کے کارڈز مجھے ملے تھے کہ اسپتال کے ایگزیکٹو روم کے اتنے کشادہ ہونے کے باوجود جگہ کم پڑ جاتی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ اب اگر لوگ میری عزت کر رہے تھے تو اس میں میرا کیا کمال تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ یہ ساری عزت اسی کی دی ہوئی تھی۔ میں نے دل میں سوچ کر ابو کو دیکھا۔

''سارہ یہ تمہارا بیٹا ایک ایسا آدمی ہے جو ہر بڑے بڑے کام اکیلے ہی انجام دے

لیتا ہے۔'' ابو ہنس کر کہہ رہے تھے۔ ''یہ دیکھو پرسوں کا اخبار......'' ابو نے اخبار ڈائننگ ٹیبل پر پھیلا دیا۔ ابو نے اخبار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ گھر بھر اخبار پر جھکا ہوا تھا۔

''ساری تفصیلات اس میں نمایاں انداز میں چھپی ہیں۔''

ابو کے کہنے پر میں نے بھی سرخیوں پر ایک نظر ڈالی۔ یہ اخبار والے بھی بس خبر کے انتظار میں رہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے کتنی سختی سے اس پراجیکٹ کی تشہیر کے لئے اس وقت تک کے لئے منع کیا تھا۔ جب تک کہ یہ Desalination plant پوری طرح سے فنکشنل نہیں ہو جاتا۔ یعنی شہر کو پانی کی فراہمی شروع نہیں ہو جاتی۔ میں نے اس پلانٹ کی Inaugural ceremony کے موقع پر ہی یہ بات زور دے کر کہی تھی کہ میں تشہیر پر نہیں کام پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نے تو وزیراعظم تک کے ساتھ Inaugration کے موقع پر تصویریں بنوانے سے گریز ہی کیا تھا مگر اس بار اخبار والوں کو اس کا موقع مل گیا تھا۔

''ارے واہ چچو تو بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔'' ریحان عادل نے معصومیت سے کہا تھا۔

ابو مسکرا کر امی کو دیکھ رہے تھے۔ ''کمال ہے سارہ' تمہارے اس بیٹے کے بارے میں ہر بات ہمیں اتنی دیر میں کیوں پتا چلی ہے۔'' امی' ابو کی اس بات پر مسکرانے لگی تھیں۔ بلکہ امی کیا گھر بھر مسکرا رہا تھا۔

''اور ابو آپ کو یاد ہے۔'' بڑے بھائی نے ابو کو دیکھ کر کہا۔ ''جب افنان نے برٹش گورنمنٹ کو No کہا تھا اور یہاں رہنے کو ترجیح دی تھی تو آپ نے کیا کہا تھا مجھ سے؟''

''ہاں۔'' ابو نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''بالکل اچھی طرح یاد ہے' میں نے کہا تھا۔ یہ یہاں رہ کر دنیا کی عظیم بے وقوفی کر رہا ہے۔ ہماری تاریخ ہے کہ مخلص اور کام کرنے والے لوگوں کی قدر نہیں کی جاتی۔ وہ دنیا کی نظر میں کھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے بڑے اس کو زیادہ عرصے تک ٹکنے نہیں دیں گے۔''

''اور یاد ہے۔ میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔'' بڑے بھائی اب سوالیہ انداز میں ابو کو دیکھ رہے تھے۔ ''میں نے کہا تھا ابو افنان ایسی چیز ہے کہ یہ دوسروں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا اور اپنا کام کئے بغیر چھوڑتا نہیں ہے۔'' بڑے بھائی کے یاد دلانے پر ابو نے سر ہلایا۔

''سارہ دیکھو! ایسے ہوتے ہیں بیٹے ماں باپ کا سر فخر سے بلند کرنے والے۔''

اور مجھے ابو کے آج سے تیرہ سال آٹھ مہینے اور سترہ دن پہلے کہے گئے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ تب میں اور اب میں کتنا فرق تھا۔ تب ابو مجھے لعنت ملامت کر رہے تھے اور آج تعریف کر رہے تھے۔ میں آنکھوں میں نمی لئے ابو کو دیکھ رہا تھا۔

''اور تمہارا یہ بیٹا تو کتنا Unpredictable اور Incredible ہے۔ کون جانے یہ کب کیا کر بیٹھے۔''

ابو کے کہنے پر اپنی آنکھوں کی نمی پر قابو پانا میرے لئے دشوار ہو گیا۔

''بات سنیں۔'' امی نے ہنس کر کہا۔

''یہ آپ اتنی دیر سے تمہارا بیٹا...... تمہارا بیٹا کیا کہے چلے جا رہے ہیں۔ کیا وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے؟''

اب کی بار ابو ہنسے تھے۔ ''چاہے اسے تمہارا بیٹا کہوں یا میرا بیٹا کہوں' دونوں صورتوں میں بات تو ایک ہی ہے۔''

ابو کے فخر سے کہے گئے ان الفاظ پر بڑی خاموشی سے دو پانی کے شفاف قطرے آنکھوں سے نکل کر میرے ہاتھ پر گرے تھے اور میں سب سے ایکسکیوز کر کے کرسی کھسکا کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر خاصی دیر تک تو میں خالی الذہنی کے سے عالم میں صوفے پر بیٹھا رہا تھا۔ یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ آنکھوں کی نمی گالوں پر سے پھسلتی ہوئی شرٹ کا گریبان بھگونے لگی تھی۔ چند لمحے اسی عالم میں بیٹھے رہنے کے بعد واش روم جا کر آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے پھر واپس آ کر اپنی الماری سے کل کے پہننے والے کپڑوں کا انتخاب کرنے کھڑا ہو گیا۔

☆======☆======☆

جب میں کمرے میں واپس آئی تو افنان عادل کل کے پہننے والے کپڑوں پر استری کرنے کھڑا ہی ہوا تھا۔ میں اس کے برابر میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے ایک نظر دیکھ کر استری کرنے میں مصروف رہا۔

''لاؤ میں کر دوں۔'' میرے کہنے پر وہ خاموشی سے استری چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ لمحے بھر کو مجھے حیرت بھی ہوئی کہ افنان عادل اتنا فرمانبردار تو نہیں ہے کہ میرے کہنے پر اتنی آسانی سے مان جائے پھر میں افنان عادل کے کپڑوں پر جما جما کر استری کرنے لگی۔ وہ صوفے پر بیٹھا مجھے خاموشی سے تکے گیا۔

''میری مانتے تو تم کل اور آفس نہ جاتے۔'' میں نے استری کرتے ہوئے کہا۔ ''کل کا دن اور رک جاتے۔''

نہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''کل جانا ضروری ہے۔''

''میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ اچھا تھا۔ ایک دن آرام کا اور مل جاتا۔''

''میں آرام کر کر کے تھک گیا ہوں۔'' اس نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آفس میں کئی معاملات میرے منتظر ہوں گے۔ پھر اگر میں کل آفس نہیں گیا تو لوگ میری مزاج پرسی کو یہاں آ جائیں گے۔''

''اور تم یہ کسی صورت نہیں چاہتے۔'' میں نے مسکرا کر اس سے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔''

''چلو جو تم مناسب سمجھو۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم چوڑیاں نہیں پہنتی ہو۔'' افنان عادل کے اچانک سوال پر مجھے حیرانی ہوئی تھی۔

''چوڑیاں......'' میں نے حیرانی سے دہرایا۔

''ہاں لڑکیوں کی کلائیوں میں چوڑیاں اچھی لگتی ہیں۔ تم پہنو گی تو مجھے اچھا لگے گا۔''

''اچھا پہن لوں گی۔'' میں نے سر ہلا کر کہا اور استری کرتی رہی۔

''تمہارے پاس کوئی ساڑھی نہیں ہے۔'' یہ دوسرا اچانک سوال تھا۔ میں ایک بار پھر حیران ہوئی تھی۔

''ہے تو۔'' میں نے قدرے الجھن سے جواب دیا۔

''پہنو۔''

فرمائش کی گئی۔ تاہم میں نے زیادہ حیران ہونے کے بجائے استری کرنا چھوڑ کر الماری سے ساڑھی نکالی۔ میرے اکثر جوڑے ابھی تک پیکڈ ہی رکھے تھے۔ میں نے پیکنگ کھولے بغیر الماری میں رکھ دیئے تھے۔ ساڑھی بھی پیک ہی تھی۔ یہ امی کی طرف سے دی گئی تھی۔ پنک جارجٹ کی ساڑھی پر میرون اور سبز موتیوں سے نفیس کام کیا ہوا تھا۔ ذاتی طور سے یہ ساڑھی مجھے بے حد پسند تھی اور اس وقت میں نے پیکنگ کھول کر ہاتھ ہی سے اس کی شکنیں ٹھیک کیں اور پہننے کے لئے واش روم چلی گئی۔ بال یونہی لپیٹتی میں باہر نکلی تو افنان عادل کو اپنی سمت ہی دیکھتا پایا۔ ایک دم افنان عادل سے مجھے ڈھیروں حجاب آ گیا۔

''زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے ساڑھی باندھی ہے۔'' میں بوکھلاہٹ میں جلدی کر

وال ٹھیک کرنے لگی۔ ''مجھے آئیڈیا نہیں ہے ٹھیک بھی لگ رہی ہے یا نہیں۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔

''اچھی لگ رہی ہے۔'' اس نے ستائشی انداز میں کہا تو میں ایک بار پھر استری کرنے آ کھڑی ہوئی۔

افنان عادل کے دیکھنے کا انداز مجھے نروس کر رہا تھا۔ میں ہر بار بے اختیار چشمہ ٹھیک کرنے لگتی ہے۔

''تم میرے سامنے چشمہ مت لگایا کرو۔'' بالآخر فرمائش کی گئی۔ ''تمہاری آئی سائٹ اتنی بھی ویک نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے ناچار چشمہ اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

ساڑھی میں نے پہن تو لی تھی اب اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ پلو کندھے پر سے بار بار پھسل رہا تھا۔ بالآخر میں نے پلو کو اسکارف ہی کی طرح گلے میں ڈال لیا تھا۔ افنان عادل کو اس لمحے میں نے بے اختیار مسکراتا دیکھا تھا اور بے اختیار مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے بھی دیکھا تھا۔

''تمہیں مشکل ہو رہی ہے سنبھالنے میں۔'' خاصی معصومیت سے اس نے پوچھا تھا۔ اب کی بار میں بھی بے اختیار مسکرائی۔

''تمہارے لئے یہ مشکل بھی برداشت کر لوں گی۔'' پھر میں نے پینٹ شرٹ اٹھا کر اس کو دکھائی۔ ''دیکھو استری تو ٹھیک ہوئی ہے ناں۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میرا دل برا ہو گیا۔ اتنی محنت سے میں نے استری کی تھی اور...... ''بلکہ اچھی ہوئی ہے۔''

میں ایک دم مسکرا دی۔ ''شکر ہے تم کو پسند آ گئی۔ اصل میں تم اتنی پرفیکشن سے اپنے کام کرتے ہو ناں کہ میں نے سوچا پتا نہیں تم کو میرے ہاتھ کا کیا کام پسند آئے نہ آئے۔''

''تم نے اتنی اچھی استری کرنی کہاں سے سیکھی؟''

''تم سے۔''

مجھ سے۔'' اس نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں میں دیکھتی ہوں۔ تم اتنا جما جما کر اپنے کپڑوں پر استری کرتے ہو۔ چاہے جتنی بھی دیر لگے۔''

''کیا کروں ابھی صرف ایک اس کام کے لئے وقت صرف کرنا مجھے وقت کا ضیاع

نہیں لگتا۔"

"میں جانتی ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔ "ویسے گھر میں اپنے بھائیوں کے کپڑوں پر میں ہی استری کرتی تھی۔"

"اور اب تمہارے بھائی تمہارے بغیر کیا کرتے ہیں۔"

"میرے بھائی ماشاءاللہ اب اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اپنا کام خود کر سکیں۔"

"اور میں......؟"

"تمہارا کام کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔" میں آرام سے کہتے ہوئے ہینگر لیے الماری کی طرف مڑی۔

☆======☆======☆

اور میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی تھی۔ اس کا سانچے میں ڈھلا پیکر بڑا کشش انگیز تھا۔ میری نظر تھی کہ اس کے سراپے پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔ بس کچھ ہی لمحے کی بات تھی کہ پوری گردن کو ڈھک دینے والے جوڑے کی شکل میں لپٹے ہوئے بال پھسل کر گھٹنوں سے ذرا اوپر جھولنے لگے تھے اور یہ منظر پہلے منظر کی طرح ہی دلکش تھا۔ پہلی بار مجھے الماس کے بالوں کی لمبائی کا اندازہ ہوا۔ میری نظر اس کے بالوں میں الجھی تو الجھ ہی گئی۔ جبکہ الماس کہہ رہی تھی۔

"افنان اس کے ساتھ جوتے بھی بتا دو تو پالش کر دوں۔"

"آں...... رہنے دو۔" میں نے اس کا جملہ سنے بغیر بے دھیانی سے کہا۔

"وہ بھی ہو جائیں گے افنان۔" پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولی۔ "میرے خیال میں تو ان کپڑوں کے ساتھ سیاہ جوتے اچھے لگیں گے۔"

میں اب کی بار چونکا تھا۔ "پالش کرنے کو کہہ رہی ہو۔" حیرت سے میں نے سوال کیا۔

"ہاں...... آں......" وہ اس سے کہیں زیادہ حیرت سے بولی تھی۔

"نہیں وہ میں خود کر لوں گا۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

"میں کر دیتی ہوں ناں۔" اس نے نہ صرف کہا بلکہ جوتے اور پالش لے کر بیٹھ بھی گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر نرمی سے جوتا اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ "نہیں یہ تمہارا کام نہیں ہے۔"

"اس میں کوئی بُری بات تو نہیں تھی۔"

"میں کر لوں گا۔" کہہ کر میں نے جوتے ایک طرف رکھ دیے۔ "تم جا کر اپنے بال بنا لو۔" میرا دھیان جو اس کے بالوں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ بے اختیار منہ سے نکلا تھا۔ وہ حیران سی ہوئی تو میں گڑبڑا گیا تھا۔ "میرا کہنے کا مطلب تھا تم اپنے بال کب بناتی ہو۔" میں نے ایک دم بات بنائی۔

"پہلے تو میں دو مرتبہ بناتی تھی۔" قدرے حیران ہو کر اس نے بتایا۔

"اور...... اب......؟"

"اب وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک ہی بار بنا لیتی ہوں۔"

"اچھا میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے حیرانی سے کہا۔ "میرے سامنے تو کبھی نہیں بنائے۔"

"اب بنا لیتی ہیں۔" اس نے کوئی اعتراض کیے بغیر کہا اور جب وہ بال بنانے کے لیے بیٹھی تو گویا میرے سامنے بالوں کا آبشار سا بکھر گیا تھا۔ میں پُرشوق نظروں سے اسے تکنے لگا۔

"تمہارے بال...... بہت...... بہت......" میں Spell bound ہو کر کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ "تم انہیں سنبھالتی کیسے ہو۔" خاصی دیر بعد بالآخر میں نے پوچھا۔

وہ ایک دم مسکرائی۔ "سنبھالنا مشکل نہیں ہیں تمہارے ہوتے تو تم بھی سنبھال لیتے۔"

"کوئی نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا۔ "مجھ سے تو برداشت نہیں ہوتے۔"

"تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ میں تمہارے لیے برداشت کر لیتی ہوں۔"

الماس مجھے لاجواب کر دیتی تھی۔ ابھی بھی میں لاجواب ہو گیا تھا۔

وہ بال بناتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔

"وہ...... مجھے...... نماز پڑھنی تھی۔" اس نے قدرے اٹکتے ہوئے کہا۔ میں جیسے ایک دم جاگ سا گیا تھا۔

"ہاں تم بے شک چینج کر لو۔" میں نے نرمی سے کہا اور جب وہ وضو کر کے آئی تھی تب تک میں بھی پالش کر کے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ جائے نماز بچھانے لگی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری کمٹمنٹ ابھی پوری نہیں ہوئی؟"

وہ رک سی گئی۔ "نہیں۔" آہستگی سے اس نے کہا۔ "تم اگر ڈسٹرب ہوتے ہو تو میں کہیں اور چلی جاتی ہوں' یہ تو تمہارا گھر ہی ہے۔"

"نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اسے دیکھا۔ "میں اب ڈسٹرب نہیں ہوتا۔"

گا۔ آرام سے کرو' جو کرنا چاہو۔"

وہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ میں صوفے پر نیم دراز اسے دیکھتا رہا۔ بغور دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ الماس کے لئے میرے جذبات ابھی بھی بہت اسٹرانگ تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کیوں؟ اگلے دو تین دن ایسے ہی گزر گئے۔ سوچتے ہوئے کہ کیوں؟ اور اس کے بعد مجھ پر ایک تکلیف دہ انکشاف ہوا تھا۔ یہ کہ میں بھی الماس کو چاہنے لگا ہوں اب تک صرف مجھے چاہا گیا تھا اور چاہا جانا کسے اچھا نہیں لگتا۔ چاہے جانے پر کوئی خرچ نہیں آتا۔ کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ ایک طرح کا Honour ہوتا ہے...... زندگی میں یہ Honour مجھے دو مرتبہ دیا گیا تھا...... دو لوگوں سے مجھے یہ Honour ملا تھا...... ایک مارتھا ایوانز اور ایک الماس...... اور اب یہ احساس میرے لئے بہت اذیت ناک تھا کہ مجھے الماس سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے الماس سے محبت تو کبھی بھی نہیں تھی۔ تب بھی نہیں جب میں اپنی ٹین ایج میں تھا اور چھپ چھپ کر میں اس سے ملا کرتا تھا۔ تبھی ایک بار اس سوال کے جواب میں کہ "ہمارے درمیان کیا ہے افنان۔" میں نے اس سے کہا تھا ہمارے درمیان بس ایک Attractive force ہے جیسے Gravitational force' جیسے Magnetic force اور وہاں پر بھی میں نے محبت وحبت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا مگر مجھے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی کو چاہنا' کسی سے محبت کرنا دنیا کا اذیت ناک ترین' تکلیف دہ ترین' دشوار گزار کام ہے۔ کسی کو چاہنے میں ہر قسم کا نقصان ہی نقصان ہے۔ یہ نقصان تب اور بھی زیادہ ہوتا ہے جب کوئی سامنے والے کو بتا نہ سکے کہ وہ اسے کتنا چاہتا ہے۔ سامنے والے کو پتا بھی نہ چل سکے کہ کوئی کسی سے کتنی محبت کرتا ہے۔

میں الماس کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اس کو کتنا چاہتا ہو مگر میں اس کو بتا نہ پاتا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں مگر میں کہہ نہیں پاتا۔ الماس کو چپ چاپ دیکھتا رہتا' دیکھتا رہتا...... بس دیکھتا رہتا اور یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اسے دیکھتے رہنے پر بھی نہ میری نظر بھرتی تھی نہ دل بھرتا تھا۔ نہ طبیعت ہی سیر ہوتی تھی۔ مگر ظاہری بات ہے الماس دن کے چوبیس گھنٹے تو میرے سامنے ہو نہیں سکتی تھی۔ مگر جب وہ میرے سامنے نہیں ہوتی تھی تب بھی میں لاشعوری طور پر سے الماس کو سوچتا رہتا۔ ایسا کرنے میں میرے کسی ارادے کو دخل نہیں تھا۔ میں خود کو الماس کو سوچنے سے کسی طور باز ہی نہیں رکھ پاتا تھا۔ چاہے وہ گھر ہوتا چاہے دفتر یا چاہے کوئی بھی جگہ ہوتی۔ الماس کا خیال ہر خیال کو Supersede کر دیتا تھا۔ الماس کی سوچ ہر سوچ کو

Predominate کر دیتی تھی۔ میں پاگل ہو کر رہ گیا تھا۔

آفس کے معاملات سے میری دلچسپی تقریباً صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ اختر حسین یا میرا کوئی اور ماتحت مجھے کوئی ڈاکومنٹ دکھا رہے ہوتے' کوئی فائل آگے کرتے۔ تو میں غائب دماغی سے کہتا۔ "اس کو ذرا ٹھہر کر آرام سے دیکھوں گا۔" میرے ماتحت کوئی معاملہ ڈسکس کرنا چاہتے تو میں کہتا۔ "اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔" اور اس پھر کبھی کی نوبت کبھی نہیں آپاتی تھی۔ اب میرا آفس آنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

اس دن بھی دل نہ چاہنے کے باوجود میں آفس چلا گیا تھا اور وقت سے کچھ زیادہ ہی پہلے پہنچ گیا تھا۔ میرے ماتحتوں میں سے کوئی اس وقت تک آیا نہیں تھا۔ چپڑاسی اگرچہ میرے کمرے کی صفائی کر چکا تھا پھر بھی میں اس سے تفصیلی صفائی کرنے کا کہہ کر خود کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ روڈ سے گزرتی گاڑیوں اور فٹ پاتھ پر چلتے راہگیروں کو دیکھتے ہوئے مجھے ابھی آفس آتے ہوئے الماس سے ہونے والی گفتگو یاد آ رہی تھی۔

"افنان...... آج کھانے پر کچھ بنوانا چاہو تو بتا دو۔ بنا دوں گی۔"

"آج کھانا تم بناؤ گی؟" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... بشرطیکہ بڑی بھابی بنانے دیں۔"

"مگر میں نے تم سے کہا تھا...... کہ مجھے نمک اس وقت تک......" الماس نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"افنان...... تم بھی کمال کی بات کرتے ہو۔ کما تم رہے ہو۔ پیسہ تمہارا ہے نمک بھی تمہارا ہے۔ پھر اگر میں تمہارے ہی پیسے کا نمک کھلا رہی ہوں تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"سر جی...... دیکھیں...... صفائی کے دوران یہ کارڈ ملا ہے۔ آپ کے کام کا تو نہیں ہے۔"

چپڑاسی کے متوجہ کرنے پر خیالات کا سلسلہ ایک دم ٹوٹ گیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر کہا۔ "ٹیبل کے شیشے کے نیچے لگا دو۔"

"لگا دیا ہے جناب۔" اس نے اطلاع دی میں نے گہری سانس لی۔

"بس ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور ہاں جاتے ہوئے دروازہ بند کرتے جانا۔" میں اسے ہدایات دے کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ خیالات کا سلسلہ دوبارہ وہیں سے جڑ گیا تھا۔

"افنان ایک بات کہنی تھی۔" میں جب گاڑی میں آ بیٹھا تو میری طرف والی کھڑکی پر قدرے آگے کو جھک کر الماس نے کہا تھا۔

"کہو۔" میں گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"امی کافی دن سے کہہ رہی ہیں آنے کے لئے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "میں ابو اور امی کے یہاں جانا چاہ رہی تھی۔"

"تو جاؤ" میں نے تم کو کبھی منع تو نہیں کیا۔ ڈرائیور تو تمہارے ہی Disposal پر ہے۔"

"تم اگر آفس سے جلدی آسکو تو اچھا رہے گا۔" اس قسم کی کوئی بھی فرمائش اس نے مجھ سے پہلی مرتبہ ہی کی تھی۔

"کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں چاہ رہی تھی کہ میں تمہارے ساتھ چلوں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ میں ایک دم چپ سا ہو گیا۔ "تم نہیں جانا چاہتے تو زبردستی نہیں ہے۔" اس نے فوراً ہی مجھے چپ دیکھ کر کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں قدرے شرمندہ ہو گیا۔ "میں دیکھ لوں گا۔"

"چلو رہنے دو میں آج نہیں جاتی۔" اس نے سہولت سے کہا تھا۔

مجھے اب شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ تو مجھ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی۔ آج اگر کچھ کہہ ہی دیا تھا اس نے تو میں اسے رد نہ کرتا۔ میں شرمندگی سے سوچ رہا تھا۔ تبھی اختر حسین دستک دے کر تیسری مرتبہ اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی فائل تھی جو اس دوران وہ دو مرتبہ لا چکا تھا اور دونوں مرتبہ میں نے اس سے کہا تھا۔ "ابھی لے جاؤ تھوڑی دیر بعد دیکھتا ہوں۔" تیسری مرتبہ اس نے وہی فائل میرے آگے رکھی۔ تو میں نے برہمی سے اسے دیکھا۔

"اختر حسین۔" تاہم میں نے نرمی سے کہا۔ "میں کہہ رہا ہوں ناں کہ تھوڑی دیر بعد دیکھتا ہوں۔"

"But sir, this is a matter of great concern and Importance" فائل کھول کر میرے سامنے رکھتے ہوئے اس نے اصرار کیا۔

"اچھا!" میں نے اب کی بار تعجب سے اسے دیکھا۔ "اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس میں Importance اور Concern والی بات کیا ہے؟"

"سر آپ جانتے تو ہیں کہ موجودہ حکومت کے مخالفین کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ ارباب اقتدار کی کرسی خطرے میں ہے۔ یہ پراجیکٹ ابھی اپروو ہو گیا تو ہو گیا۔ کہیں ایک مرتبہ یہ حکومت اتر گئی تو ایک بار پھر دس بارہ سالوں کے لئے یہ پراجیکٹ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میں اس پراجیکٹ کی اہمیت سے بہت پہلے سے واقف تھا۔ "آپ ہی نے تو کہا تھا سر کہ ہم ان دنوں میں جتنے بھی منصوبوں کی منظوری کروا سکیں گے۔ جلد از جلد کروانے کی کوشش کریں گے۔" وہ اب مجھے یاد دلا رہا تھا۔ "سر آئندہ کچھ دنوں میں آپ کا Concerned گورنمنٹ آفیشلز سے ملاقات کرنا نہایت ضروری ہے۔"

"تو ٹھیک ہے وقت لے لو۔" میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر کہا۔ "ملاقات کرلوں گا۔"

"تو سر آپ پیپرز دیکھ لیجئے۔"

"میں سائن کئے دیتا ہوں۔" بے تاثر لہجے میں کہہ کر کاغذات کو ایک نظر بھی دیکھے بغیر پوری تفصیلات پڑھے بغیر۔ میں نے سائن کر دیئے تھے۔ حالانکہ میں کبھی بھی کسی کاغذ کو اچھی طرح سے دیکھے بغیر۔ اس پر کبھی سائن نہیں کرتا تھا مگر اس دن کر دیئے تھے۔ اختر حسین جو میری اس عادت سے خوب واقف تھا۔ تبھی اس نے متعجب نظروں سے دیکھا تھا۔ "سر آپ نے اسے پڑھا نہیں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ "تم نے پڑھ لئے ہوں گے۔"

"جی سر مگر آپ کا چیک کرنا ضروری ہے۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے اختر حسین۔"

اختر حسین نے اب کی بار کچھ نہیں کہا۔ بلکہ خاموشی سے فائل میرے آگے سے اٹھا لی۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "سر کیا آپ پریشان ہیں؟"

"آں....." میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"سر آپ مجھے کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہیں۔"

"ہاں۔" میں اب کی بار چھپا نہیں سکا تھا۔ "ڈسٹرب تو ہوں۔"

"وجہ۔" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ "پوچھ سکتا ہوں سر؟"

"تم پوچھ کر کیا کرو گے اختر حسین۔" میں نے تھک کر کہتے ہوئے ریوالونگ چیئر

کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔ "کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں کئی ہیں۔"

"سر ابھی تو آپ ایک واقعے سے سنبھلے ہیں۔" اختر حسین نے ہمدردی سے کہا۔

"نہیں...... اختر حسین......" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "میں ایک واقعے سے سنبھل نہیں پایا۔"

"سر...... بہتر ہوتا...... آپ چند دن اور آرام کر لیتے۔" اس نے اخلاص سے مشورہ دیا تھا۔

"ہاں آرام......" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اختر حسین جب تھکن ذہنی ہو ناں تو جسمانی آرام فائدہ نہیں پہنچایا کرتا۔"

"سر معذرت کے ساتھ مجھے کہنے دیجئے کہ آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتے ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کی مسز اس دن ٹھیک ہی کر رہی تھیں۔" میں ایک دم کرسی پر ساکت سا ہو کر بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر جا بھی چکا تھا اور میرے لئے سوچ کے مزید دروازے کھول گیا تھا۔

ہاں الماس میرے لئے سب کچھ بہت ٹھیک ہی کرتی رہی تھی۔ وہ میرے لئے بہت اچھی تھی۔ بہت Caring تھی وہ وہ مطیع تھی اور فرمانبردار بھی۔ ہر معاملے میں میری رضا چاہنے والی...... ہر بات میں میرے فیصلے کو مقدم رکھنے والی تھی۔ میں نے اسے سوال کرنے کو منع کر دیا اس دن کے بعد سے اس نے پلٹ کر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے اسے خود کو دیکھنے سے منع کیا۔ وہ مجھ کو دیکھے بغیر مجھ سے بات کرتی ہے ہاں اتفاقاً نظر پڑ گئی ہو تو دوسری بات ہے۔ ارادتاً ایسا نہیں کرتی۔ وہ کسی بات میں مجھ سے بحث نہیں کرتی۔ کسی بھی معاملے پر ضد نہیں کرتی۔ کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتی اگر کرتی بھی ہے تو آسانی سے پس پشت ڈال دیتی ہے اور آج صبح کا واقعہ اس کی تازہ مثال ہے۔ وہ باعفت باعصمت حیادار بھی ہے اس کی وفا خالصتاً میرے لئے ہے۔ وہ خدمت گزار بھی ہے اور وہ صرف میری خدمت پر کمربستہ نہیں رہتی بلکہ میرے گھر والوں کی خدمت بھی کرتی ہے۔ حالانکہ بطور خادمہ تو وہ لائی بھی نہیں گئی۔ وہ قائم اللیل صائم النہار تھی۔ بڑی عبادت گزار ہے اور اس کے علاوہ ایسی کیا خوبی تھی جو کسی عورت میں ہونی چاہئے تھی اور الماس میں نہیں تھی...... اس میں اتنی خوبیاں تھیں کہ میں اگر گننے کے لئے بیٹھتا تو صبح سے شام ہو جاتی اور شام سے صبح ہو جاتی اور مجھے خود پر حیرانی ہوتی تھی کہ آخر مجھ میں ایسی کیا خاص بات تھی جو اسے مجھے دے دیا گیا تھا۔ مگر نہیں اسے مجھے دے کر بھی کب دیا گیا تھا۔ ہاں یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ الماس Accesible ہو کر

بھی میرے لئے Inacecsible تھی۔

الماس آج بھی مجھ سے اتنے ہی فاصلے پر تھی جتنا برسوں پہلے تھی...... اس بات کا ادراک بھی ابھی کچھ دنوں میں ہوا تھا مجھے...... اس دن پانی کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے بڑی بے بسی کے عالم میں میں نے سوچا تھا آگ برساتے سورج' تیز دھوپ' شدت کی گرمی' تپتی ریت' سامنے کنوئیں اور میری پیاس...... ان سب کا آپس میں کیا کامبینیشن ہے اور...... اور...... اب مجھے سمجھ میں آیا تھا کہ کامبینیشن تو بڑا گہرا تھا۔

میں خواہ مخواہ کیوں سے چڑ رہا تھا۔ کیوں کا جواب تلاشتا پھر رہا تھا...... کمال ہے...... جواب تو میرے سامنے ہی تھا۔

اب سے کچھ عرصے پہلے تک جو میں جل بھن رہا تھا چڑ رہا تھا' بے زاری' مایوسی' اداسی' غصے' پریشانی' جھنجلاہٹ' Idiopathic ڈپریشن کا شکار تھا۔ حتیٰ کہ اپنی حالت سے تنگ آ کر کسی نفسیاتی معالج تک کے یہاں جانے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ وجہ جاننے کے لئے...... تو...... وجہ تو صاف اور سیدھی سی تھی۔ اتنی سی بات میری عقل میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اپنی عقل پر ہنسی آ رہی تھی۔ میں تو بڑا ذہین تھا۔ میٹرک میں اے ون اور انٹر میں بہترین اے گریڈ تھا میرا۔ بی ای میں فرسٹ کلاس سیکنڈ پوزیشن لی تھی میں نے، اور ایم ایس میں اسکول آف انجینئرنگ کے تمام ٹاپ اسکورز بریک کرنے والے کو یہ ذرا سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور اب جبکہ مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی تو میں پریشان رہنے لگا تھا۔ سوچوں میں الجھا رہنے لگا تھا۔ میری زندگی مشکل ہو گئی تھی۔ چین اطمینان جیسی ہر چیز جو میری زندگی میں پہلے ہی کم تھی۔ اب یہ احساس ہونے پر مکمل طور سے رخصت ہی ہو گئی تھی۔ مجھے کہیں سکون نہیں ملتا تھا میں گھر سے آفس بھاگتا تھا اور آفس سے بھاگ کر گھر آتا تھا اور نہ سکون آفس میں ملتا تھا نہ گھر میں' میں آفس میں گم صم اور کھویا کھویا رہتا تھا گھر میں مجھے چپ لگی تھی تو پھر ٹوٹتی نہ تھی۔ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں پابندی سے حاضری بھی دیتا تھا۔ مگر کسی بھی چیز پر میری Concentration صفر تھی۔ میں ہر طرح کی نیکی کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر میرا کوئی بھی عمل مجھے کسی بھی قسم کی خوشی نہیں دیتا تھا۔ مجھے لگتا خوشی جیسی کوئی چیز میری زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں اور نہ کبھی آئے گی۔ حالانکہ مجھے نوازنے میں کوئی کمی نہیں کی گئی تھی۔ مجھے بے حد و حساب عزت دی گئی تھی۔ میرے پاس پیسہ بھی تھا۔ جو سراسر میری حلال کی کمائی کا تھا۔ محنت کا تھا کیونکہ مجھے حلال کمانے اور محنت کرنے کی توفیق دی گئی تھی اور...... اور...... میرے پاس

ایسی عورت تھی جو ہر لحاظ سے شاندار تھی۔ ہر لحاظ سے بہترین تھی۔ اپنی عادات میں اپنی خوبیوں میں اپنے نام کا پرتو تھی۔ اس کی ہر خوبی کا میں معترف تھا۔ اس کی ہر عادت مجھے پسند آتی تھی۔ مگر اس کی Inacecesibilty کو کیا کرتا میں؟ کوئی بے بسی سی بے بسی تھی؟

میرے دن اجاڑ......

میری راتیں بے خواب......

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ پچھلی رات خاصی دیر تک کروٹیں بدلنے کی بعد نیند آسکی تھی۔ صبح فجر پر میری آنکھ نہ کھل سکی اور آنکھ کھلی بھی تو الماس کے پکارنے پر۔

''افنان اب تو اٹھ جاؤ' اتنی دیر تک تو تم کبھی بھی نہیں سوتے۔''

''اوہ......'' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''ٹائم کیا ہوا ہے؟'' کہتے ہوئے میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو ساڑھے نو بجا رہی تھی۔ میں چھلانگ مار کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''آج فجر بھی نہیں پڑھی تم نے میں اتنی آوازیں دیتی رہی۔ تم اٹھے ہی نہیں۔'' الماس کہہ رہی تھی۔

دن کا آغاز ہی برا ہوا ہے۔ فجر نہیں پڑھی گئی آج آفس جانے کے لئے تیار ہوتے ہوئے میں نے بہت برے دل سے سوچا تھا۔ اتنے میں الماس ناشتہ لے آئی تھی۔

''الماس تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ میں ناشتہ نہیں کروں گا۔'' میں نے نرمی سے کہا اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ الماس نے سینڈوچز کی پلیٹ میرے آگے کر دی۔

''الماس ناشتہ کرنے کا ٹائم نہیں ہے۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''پلیز۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں مزید پانچ منٹ کی دیر سے کچھ نہیں ہو جائے گا افنان۔''

میں نے اب کی بار خاموشی سے پلیٹ تھام لی اور صوفے پر جا بیٹھا۔ اس نے جوس گلاس میں انڈیلا اور صوفے کے برابر میں رکھی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''میں نے سوچا تم کو آج مزیدار سے سینڈوچز کھلاؤں۔'' الماس کہہ رہی تھی۔

''اچھا۔'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''اچھے بنے ہیں ناں؟'' اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

''ہوں اچھے ہیں۔''

جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے میں نے ایک بار پھر گاڑی کی چابی اٹھائی

سے نکلتے ہی بڑے بھائی نظر آ گئے۔ ''تم آفس جا رہے ہو افنان؟'' انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

''جی۔'' میں نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے گھڑی دیکھی اور پوچھا۔ ''آپ نہیں گئے؟''

''نہیں آج تو کوئی کہیں نہیں گیا۔'' انہوں نے اطمینان سے بتایا۔ ''آج اسٹرائیک ہے ناں۔''

''اوہ۔'' میرے تیزی سے اٹھتے قدم دو لمحے کے لئے تھم سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ آج تو حکومت کے مخالفین نے اسٹرائیک کی کال دی تھی۔ بڑے بھائی مزید کہہ رہے تھے۔

''تم بھی آج مت جاؤ افنان' ایسے حالات میں تو ہنگاموں' تخریب کاریوں کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔''

''جی۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''اپوزیشن کے ارادوں سے لگ رہا ہے کہ ٹھیک ٹھاک اسٹرائیک ہو گی۔'' بڑے بھائی مزید کہہ رہے تھے۔ ''اس شہر میں تو یوں بھی حالات کب اور کیسے بگڑ جاتے ہیں' پتا بھی نہیں چلتا۔ میں تو کہہ رہا ہوں تم بھی خواہ مخواہ جا رہے ہو۔ رسک لینے والی بات ہے۔''

''بڑے میں حکومت کا ملازم ہوں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اور حکومت نے تو نہیں کہا کہ کوئی ہڑتال ہو یا کوئی کرے۔''

''مگر بہرحال حکومت کسی کو ایسا کرنے سے روک بھی نہیں سکتی۔ آخر کو جمہوری حکومت ہے۔ حکومت تو یہ بھی نہیں کر سکے گی کہ شر پسند عناصر کو اس موقع پر شر پھیلانے کا موقع نہ دے۔''

''بڑے بھائی یہ طویل بحث ہے۔'' میں نے اب کی بار قدرے بے زاری سے کہا۔ ''آ کر اس پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ ابھی تو اللہ حافظ۔'' کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

الماس مجھے چھوڑنے میرے پیچھے ہی آ رہی تھی۔ الماس اب روزانہ مجھے چھوڑنے گاڑی تک آتی تھی۔ میرے گھر والوں کے لئے بھی یہ منظر نیا نہیں رہ گیا تھا۔ ورنہ پہلی مرتبہ جب ہم دونوں ساتھ جا رہے تھے تو...... سوچ کا سلسلہ ایک دم ٹوٹ گیا تھا۔ الماس نے بریف کیس میری طرف بڑھایا تھا۔

''اس پر تو کچھ ضروری کاغذات رکھے تھے؟'' میں نے ایک دم یاد آنے پر پوچھا تھا۔

''وہ میں نے اسی کے اندر رکھ دیئے تھے۔ کل تم دیکھتے دیکھتے یونہی چھوڑ کر لیٹ گئے تھے۔ کاغذات پنکھے کی ہوا سے اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے تو میں نے سمیٹ لئے تھے۔''

''اوہ......'' مجھے ندامت ہونے لگی آج کل واقعی میری دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اتنے ضروری کاغذات اور انہیں میں ایسے ہی چھوڑ کر لیٹ گیا تھا۔ میں نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی۔

''اسے واپس لے جاؤ۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا' لے جاتی ہوں۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ تب تک میں گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔ الماس اسی وقت میری طرف والی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''افنان آج سب لوگ گھر پر ہیں۔'' کھڑکی پر قدرے جھک کر کھڑے ہوتے ہوتے اس نے کہا۔

''تو؟'' میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''تو تم بھی رک جاؤ افنان!'' اس نے التجا کرنے والے انداز میں کہا۔

''الماس۔'' میں نے قدرے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے مت روکو جانے دو۔''

''اچھا۔'' وہ گاڑی سے ذرا فاصلے پر ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ''جاؤ...... اللہ حافظ...... مگر دیکھو افنان...... گاڑی ذرا احتیاط سے چلانا' تم بہت خطرناک ڈرائیونگ کرتے ہو۔'' اس نے ہدایات دی تھیں میں نے کچھ کہے بغیر بیک کر کے گاڑی نکال لی۔ الماس مین گیٹ پر آکھڑی ہوئی تھی۔ میں بیک ویو مرر سے تب تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی پھر گہری سانس لے کر سامنے متوجہ ہو گیا۔ گاڑی مین روڈ پر لاتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ بس' ویگنز' رکشہ' ٹیکسی کوئی ٹرانسپورٹ نہیں چل رہی تھی۔ بس اسٹاپس سنسان' ویران پڑے تھے۔ سڑک پر صرف چند کاریں نظر آرہی تھیں۔

اس سے ہڑتال کی شدت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے میں تیز رفتاری ہی سے جارہا تھا تبھی ایک موڑ مڑتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں ہجوم نے روڈ بلاک کر رکھی تھی۔ سڑک کے کنارے ہی ایک بس دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ کچھ مشتعل افراد نے جونہی میری گاڑی کو دیکھا' تیزی سے میری طرف بڑھے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میں حیران سا گاڑی سے باہر نکل آیا۔

آخر ان لوگوں کا مقصد کیا ہے' پھر اس سے قبل کہ میں کوئی مزاحمت کرتا' ان لوگوں نے دیکھتے ہی دیکھتے تیل چھڑک کر میری گاڑی کو آگ لگا دی۔ ہجوم اتنا بپھرا ہوا تھا کہ میری چیخ پکار کا کسی نے نوٹس بھی نہ لیا۔ چند ہی منٹوں میں ہجوم آگے جا چکا تھا اور میں بے بس سا کھڑا اپنی گاڑی کا حشر دیکھ رہا تھا۔ گو کہ یہ سرکاری گاڑی تھی لیکن مجھے اپنی اور چیزوں کی طرح اس سے بہت انسیت ہو چکی تھی۔

مجھے نہیں پتا کتنا وقت گزر چکا تھا۔ جب کھڑے کھڑے میری ٹانگیں سن ہونے لگیں تو میں مردہ قدموں سے چل پڑا۔ میں سوچتا رہا اور چلتا رہا گھر دور تھا' سو میں آفس ہی کی طرف چلتا رہا۔ مین بلڈنگ تک پہنچنے کے لئے پورے پارکنگ ایریا کو کور کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت پارکنگ ایریا میں چند ہی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں گہری سانس لے کر آفس کی مین بلڈنگ تک آیا اور گیٹ پر بیٹھے سیکیورٹی گارڈ کے سلام کا جواب دے کر لفٹ کی طرف آگیا۔ میرا آفس چودھویں فلور پر واقع تھا اور ابھی چھ فلور بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اچانک لفٹ تاریک ہونے کے ساتھ ساتھ جھٹکے سے رک گئی۔

لائٹ چلی گئی تھی۔ میں کچھ دیر تک تو انتظار کرتا رہا کہ ابھی جنریٹر آپریٹ کرنے والے ٹیکنیشنز جنریٹر سے بجلی کی فراہمی بحال کردیں گے مگر کافی دیر ہوگئی۔

''دیکھنا آج تمہارے آفس اسٹاف میں سے بھی کوئی نہیں آئے گا......'' امی کے کہے ہوئے الفاظ میرے آس پاس ہی گونجے تھے جو انہوں نے صبح مجھے آفس جاتا دیکھ کر کہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا واقعی جنریٹر ٹیکنیشنز بھی ہڑتال کے باعث پہنچ نہیں سکے ہیں اور اب تو صرف بجلی کے محکمے کی طرف سے ہی بجلی کی فراہمی بحال ہونے کا انتظار کیا جاسکتا تھا۔

میں گہری سانس لے کر دیوار سے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ انتظار کرتا رہا۔ انتظار طویل ہوتا گیا اور طویل...... کچھ اور طویل...... اب تو کھڑے کھڑے میں تھکنے لگا تھا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔

پتا نہیں اب مزید اور کتنی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے سوچا کسی سے رابطہ کروں پھر مجھے یاد آیا کہ میرا موبائل تو گاڑی کے ڈیش بورڈ ہی میں رکھا تھا حالانکہ موبائل چلتے وقت کتنے خیال سے الماس نے مجھے دیا تھا۔

ہاں الماس...... میں نے طویل سانس لی۔ الماس کا خیال آنے پر مجھے الماس کی تصویر کا خیال آیا تھا۔ میں نے والٹ نکال کر اس کی تصویر نکالی۔ لفٹ میں اتنی تاریکی تھی کہ میں صرف Glossy paper کے اس چوکور ٹکڑے کو محسوس کرسکتا تھا۔

میں تصویر پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ انتظار کا دورانیہ لمبا ہوتا گیا۔ لفٹ میں خنکی کا احساس بھی بتدریج ختم ہو رہا تھا۔

اف...... اچھا...... میں آج آفس آنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ پہلی بار میں نے پریشانی سے سوچا تھا۔ کتنے ہی لوگ مجھے روک رہے تھے۔ امی...... بڑے بھائی...... اور الماس نے بھی تو روکا تھا۔

کاش میں نے کسی کی تو سن لی ہوتی...... کاش میں رک جاتا۔ ابو مجھ سے کہتے تو میں یقیناً رک جاتا......

''دیکھنا یہ کسی دن اپنی اسی عادت کے ہاتھوں کوئی بڑا نقصان اٹھائے گا۔'' امی کے کہے ہوئے الفاظ مستقل میرے آس پاس ہی تھے۔

''نقصان...... کیسا نقصان......'' میں نے حیرت سے دہرایا تھا۔

اب کون سا نقصان رہ گیا ہے اٹھانے کو......؟ میں نے خاصی دہشت سے اپنے چہار اطراف میں دیکھا تھا۔ تاریکی کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا۔ یہ لفٹ نہیں ہے...... اتنی گھٹن' ایسا حبس' ایسا سناٹا' اتنی تاریکی تھی وہاں...... اور اس بار مجھے ایسا لگا جیسے مجھے قبر میں اتار دیا گیا ہے۔ میری سانس رکنے لگی تھی۔

تو یہ ہے وہ نقصان جو ہونے سے رہ گیا تھا اور اب مجھے ہونے والا ہے؟

جان کا نقصان؟

اف مجھے ایک دم بہت ڈر لگنے لگا۔

جدھر آدمی کی موت آتی ہے۔ وہ وہاں کشاں کشاں کھنچا چلا جاتا ہے۔ تو مجھے یہاں میری موت کھینچ کر لائی ہے؟

ہاں...... ہو سکتا ہے...... آخر اتنے لوگوں کے روکنے کے باوجود کیا وجہ تھی جو میں یہاں آ گیا تھا۔ اور وجہ تو صاف نظر آ رہی تھی۔ موت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔

اُف دہشت کے مارے میری حالت غیر ہو گئی تھی۔ اب سے پہلے مجھے مرنے سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا حالانکہ ایک بار انگلینڈ میں بھی تو مرتے مرتے بچا تھا۔ تب میں زندوں میں تھا نہ مُردوں میں' دوسری بار جب میں پانی کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے تقریباً مر چکا تھا مگر ابھی اس وقت زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے مرنے سے خوف آ رہا تھا اور موت سر پر کھڑی لگ رہی تھی۔

موت۔ یعنی زندگی کا خاتمہ......

موت برحق ہے......

ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے......

زندگی موت کی امانت ہے......

موت کو کوئی ٹال نہیں سکتا......

موت کا ایک دن معین ہے......

میرے اردگرد آوازوں کا ہجوم تھا۔ آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے بے اختیار۔ ''ہاں...... ہاں مجھے سب پتا ہے۔'' میں ایک دم چیخ پڑا تھا اور جیسے ایک دم سکوت ہو گیا تھا۔ ''میں نے کب انکار کیا ہے اس بات سے۔'' رندھے ہوئے گلے سے نہایت لاچاری کے عالم میں کہا۔ ''مم...... مگر...... میں ابھی زندہ ہوں۔'' میں اٹھ کر بے تحاشا لفٹ کے دروازے کو پیٹنے لگا اور چیخ رہا تھا۔ ''مجھے یہاں سے نکالو۔''

شدید گرمی' حبس اور گھٹن کے باعث سر سے پیر تک پسینے بہنے لگے۔ آنکھوں سے گرم نمکین پانی بے آواز گرنے لگا۔ آہوں اور کراہوں کے درمیان میں نے بڑی تکلیف کے عالم میں التجا کی تھی۔ ''میں ابھی نہیں مرنا چاہتا۔'' میں اپنی چیخیں کسی طور روک نہیں پا رہا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' سسکیاں اور ہچکیاں لیتے ہوئے میں دروازے کو پیٹتا رہا اور پاگلوں کی طرح سے چیختا رہا۔ چیختے چیختے میرا گلا دکھنے لگا۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ سر پھٹنے لگا۔ دروازے کو مارتے مارتے ہاتھ تھک گئے۔ میں تھکے ہوئے بیل کی طرح ہانپ رہا تھا' بری طرح پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

کیا عجب بات تھی۔ جب زندگی کی آرزو نہیں تھی' تو زندگی مجھے دے دی گئی تھی اور اب جبکہ میں زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا تو مجھے زندگی ہاتھ سے جاتی لگ رہی تھی۔

اور...... قبر کی دیواریں مجھ پر بھینچنے لگی تھیں۔ ''دی گئی مہلت ختم ہوئی۔''

''مہلت ختم ہوئی۔'' میں نے دہشت کے عالم میں دہرایا۔ ''اتنی جلدی۔'' بے یقینی سے کہتے ہوئے میں بے بسی سے بیٹھ گیا۔ سر گھٹنوں میں دے لیا۔ ہاتھ ٹانگوں کے گرد لپیٹ لئے۔ الماس کی تصویر جو بدستور میرے دائیں ہاتھ میں تھی بری طرح گیلی ہو رہی تھی۔ کچھ آنکھوں سے گرنے والے گرم نمکین پانی نے' کچھ پسینے کی نمی سے...... میں نے یہ خیال آنے پر تصویر اٹھا کر بالکل آنکھوں کے سامنے کر لی۔ تاریکی میں آنکھیں اپنی آخری حدوں تک کھول لینے کے باوجود مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں اندھوں کی طرح سے

تصویر کو ٹٹولنے لگا۔ پھر بے اختیار ہونٹوں سے لگا کر پاگلوں کی طرح سے اسے چومنے لگا۔ مجھے زندگی میں کبھی بھی الماس کی کمی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت اپنے گھر والوں میں سے کسی کا بھی خیال نہیں آرہا تھا۔ مجھے یاد تھی تو بس ایک الماس۔

الماس جو میرے پاس تھی۔ الماس جو میرے پاس کبھی نہیں تھی۔

''تم اس وقت میرے پاس کیوں نہیں ہو۔ مجھے تم چاہئے ہو' مجھے تم چاہئے ہو۔'' میں الماس کی تصویر سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ' میں الماس کو صرف ایک مرتبہ دیکھ تو لوں۔'' میں نے اس بار بڑی عاجزی سے التجا کی تھی۔

قبر کی دیواریں مجھ پر ایک بار پھر ہنسی تھیں۔ ''تمہیں اتنا عرصہ ملا تو تھا۔ تم نے کیا کیا؟''

''میں نے کیا کیا؟'' میں پاگلوں کی طرح سے دہرائے گیا۔ واقعی میں نے کیا کیا

''میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے کچھ ہو بھی گیا تو تم کسی اچھے سے آدمی سے شادی کر لینا۔'' میں تو الٹا الماس سے یہ کہتا رہا تھا اور ابھی میرے ہی کہے گئے جملے میرا منہ چڑانے لگے تھے۔ میرے الفاظ کی بازگشت میرے آس پاس تھی۔ جو کسی زناٹے دار تھپڑ کی طرح میرے گال پر پڑے تھے۔ تکلیف سے میں بلبلانے لگا تھا۔

''اچھے سے آدمی سے شادی...... میرے بعد......'' میں نے خوف زدہ ہو کر کہا تھا۔

''تم واقعی میرے بعد کسی اچھے سے آدمی سے شادی کر لو گی؟'' میں بے یقینی سے الماس کی تصویر سے پوچھ رہا تھا اور مجھے یاد آیا الماس نے کبھی مجھ سے کہا تھا۔ ''افنان تم سے اچھا آدمی مجھے بھلا کہاں ملے گا۔''

''مگر میں نہیں رہوں گا اور تمہارے گھر والے تم کو فورس کریں گے تو تم مجبور ہو جاؤ گی۔'' میں نے شکستگی سے کہا۔ ''اور تم تو اتنی اچھی ہو کہ تم جیسی کو کون چھوڑنا پسند کرے گا پھر جب وہ شخص اتنی چاہ سے تم سے شادی کرنا چاہے گا تو تم کیسے رک جاؤ گی۔'' میری آنکھوں میں ایک بار پھر نمی بھر بھر کے آنے لگی۔ ''میرے سوا وہ بھی تم کو دیکھے گا...... اور تمہارے بال کس قدر خوب صورت ہیں' تمہاری ناک میں ایک نگ والی لونگ ایسے چمکتی ہے جیسے آسمان پر سب سے روشن ستارہ چمکتا ہے۔ ساڑھی پہن کر تمہارا مرمریں وجود کس قدر دلکش لگتا ہے اور...... اور...... تمہارے گالوں کے ڈمپل......'' مجھے حسرت سی ہونے لگی۔ ''میرے سوا' وہ بھی تم کو چاہے گا......''

اُف خیال کی اُڑان کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آہ میری آدھی جان نکل گئی...... تم دیکھنے

ان دیکھے آدمی سے حسد سا محسوس ہونے لگا'' اور میں نے تم کو ابھی تک نظر بھر کر کہاں دیکھا۔ میں نے تو تم کو دل بھر کر دیکھا تک نہیں۔ میں نے ابھی تک یہ نہیں دیکھا کہ تمہارے اتنے خوب صورت بال کلائی پر لپیٹنا کیسا لگتا ہے۔

میں نے تو ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا کہ تمہارے ہاتھ کس حد تک ملائم اور نرم ہیں......

میں نے تو ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا کہ تمہارے گالوں میں پڑنے والے ڈمپلز کس قدر گہرے ہیں......

مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ تمہارے اسکارف سے منہ ڈھک لینے پر کتنی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے......

میں نے تو ابھی تک یہ بھی نہیں دیکھا کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر کسی لمبے سے راستے پر چلنا کیسا لگتا ہے......

میں نے تو تم کو ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم میرے لئے کتنی اہم ہو۔ تمہارے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔ میں تمہارے بغیر کتنا اکیلا ہوں...... میں نے تو تم کو ابھی تک دل کی کوئی بات نہیں بتائی۔ میں نے تو تم کو ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ کتنا چاہتا ہوں میں تم کو......''

''اب ہر بات کا وقت گزر چکا ہے۔'' قبر کی دیواریں جیسے ایک دم جلال میں آگئی تھیں۔ ''اب تو صرف حساب کتاب ہونا باقی ہے۔''

''حساب کتاب...... وہ بھی ہو گا؟'' میرا دم حلق میں آگیا تھا اور میری تیاری...... صفر......؟

اُف یہ تو میں بھولا ہوا ہی تھا۔ الماس مجھ سے کوئی سوال نہیں کرتی تھی تو کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا؟ الماس مجھ سے جواب دہی کے لئے نہیں کہتی تھی تو کیا مجھے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہونا۔ کوئی مجھ سے جواب طلبی کر نہیں سکتا۔ جب وہاں مجھ سے دیگر سوالات کے علاوہ یہ سوال بھی ہو گا کہ بندوں کے کتنے حقوق پورے کئے تو میرا کیا منہ ہو گا جواب دینے کا' تب میں کیا کروں گا...... اور جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری بیوی بھی تو تھی۔ اس کا بھی تو تم پر حق تھا۔ تو میں کیا کہوں گا۔ تب وہاں الماس مظلومین میں سے ہو گی۔ اس کا ہاتھ میرے گریبان پر ہو گا...... اُف...... میں وہاں کیسے بچ پاؤں گا...... میں اپنی ہر بار اختیار ہیز کو جواب دینے کے لئے خود کو ہمیشہ تیار رکھتا ہوں۔ ایک

اور بھی تو Supreme Authority ان بالا اتھارٹیز کے اوپر بیٹھی ہے۔ اس کو جواب دینے کے لئے میری کوئی تیاری نہیں ہے۔

اُف...... میں وحشت کے مارے لرزنے لگا۔ بہت سیدھی سی چھوٹی سی بات ہے۔ آدمی جب امتحان کا پرچہ حل کرنے کے لئے بیٹھتا ہے تو سب سے زیادہ اس حصے سے ڈرتا ہے جس کی اس کی کوئی تیاری نہیں ہوتی میں بھی اس وقت باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ یاد اگر کچھ رہ گیا تھا تو یہ کہ حقوق اللہ ایک طرف اور حقوق العباد...... سو جواب دہی کے خیال سے مجھے بہت خوف آ رہا تھا۔

آہ میں نیم جان سا ہو گیا۔ آنکھوں کا نمکین پانی گالوں پر رواں ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ تھوڑی سی مہلت اور...... بڑی رقت بڑی عاجزی سے گڑگڑا کر میں نے التجا کی تھی اور ایک دم مجھے خیال آیا تھا۔ قیامت کے دن جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو منکرین حق بھی اللہ تعالیٰ سے اسی طرح کی حجتیں کریں گے کہ اے اللہ اگر تو اب ہم کو واپس لوٹا دے تو ہم صالح اعمال کریں گے مگر اس دن دی گئی مہلت ختم ہو چکی ہو گی۔

مجھے خود پر رونا آنے لگا۔ میں اپنا حال بھی ان لوگوں سے مختلف نہیں پا رہا تھا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے لئے دنیا میں ہی سامان عیش فراہم کر دیا گیا تھا۔ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ اور میں...... مجھے بھی تو یہاں نام شہرت عزت پیسہ سبھی کچھ دے دیا گیا اور میرے پاس وہاں کے لئے کیا ہے کیا تھا کیا ہو گا؟ صرف دنیا لے کر میں کیا کروں۔ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ٹھہری...... اصل زندگی تو وہاں کی ہو گی ابدی میں نے اس بارے میں کب سوچا...... اس طور میری یہاں سختی سے پکڑ ہوئی ہے تو وہاں کی پکڑ اس کی کیسی ہو گی......

اُف میں لرزنے لگا تھا۔ اپنی سسکیوں پر قابو پانا مجھ سے دشوار ہو گیا اور اب میں رو رہا تھا۔ آہوں سے ہچکیوں سے بے حال سا ہو گیا تھا۔

کشادہ اور وسیع و عریض مقام پر تاحدِ نگاہ صفیں آراستہ تھیں۔ اقامت کہی جا رہی تھی۔ جماعت ہو رہی تھی۔ میں بھی نیت کر کے امام صاحب کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ تکبیر ثنا فاتحہ کے بعد امام صاحب نے بڑی خوش الحانی سے تلاوت شروع کی۔ میں سحر زدہ سا کھڑا بس سنتا رہا۔ کب رکوع سجود ہوئے۔ کب رکعات ختم ہوئیں۔ کب سلام پھیرا گیا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ تسبیح تحمید پڑھنے کے لئے امام صاحب مقتدیوں کی طرف رخ کر کے وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی لئے میری نظر امام صاحب پر پڑی اور وہ میری طرف ا

کر مسکرائے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی کسی شناسا کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ یہ خلدون ابراہیم تھے......

میں تسبیح تحمید پڑھنا بھول گیا۔ اس آدمی کے پیچھے میں نے نماز پڑھی ہے؟ میں حیران سا انہیں دیکھے گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنکھیں مل مل کر خلدون ابراہیم مسکراتے مسکراتے ایک دم آنکھ سے اوجھل ہو گئے تھے۔ میرے سامنے روشن اور چمکیلا دن نکل آیا تھا۔ سورج عین میرے سر پر چمک رہا تھا مگر میرے پیروں کے نیچے سخ ہموار چکنا فرش ٹھنڈا تھا۔ لباس کے نام پر میرے جسم پر صرف دو سفید چادریں تھیں اور میری نظروں کے عین سامنے کعبۃ اللہ تھا۔ اس کا سیاہ غلاف چمکیلے اجالے میں کچھ اور سیاہ لگ رہا تھا اور اس پر سنہری تار سے لکھی چمکدار قرآنی آیات سورج کی روشنی پڑنے پر منعکس ہو رہی تھیں ایسے جیسے شفاف پانی پر چمکیلی دھوپ پڑنے پر عکس جگمگاتے ہیں۔ کعبۃ اللہ کے ایک کونے میں نصب شدہ حجر اسود مجھے دور سے بھی اتنا ہی واضح نظر آیا تھا جتنا بالکل قریب سے دیکھنے پر نظر آتا۔ اس منظر میں ایسی کشش تھی جو مجھے کعبۃ اللہ کی طرف کھینچے جا رہی تھی اور میں کشاں کشاں کھنچا چلا جا رہا تھا۔ کعبۃ اللہ کے گرد طواف کرنے والوں کا بے حد رش تھا مگر جیسے اس رش میں خود بہ خود میرے لئے راستہ بنتا گیا اور میں نے خود کو کعبۃ اللہ کے بے حد قریب پایا تھا۔ باب ملتزم کے بالکل پاس کھڑے ہو کر میں نے بڑے احترام اور تعظیم سے عرش عظیم کے مالک کے اس عظیم الشان گھر کو دیکھا تھا۔ اس کے سیاہ غلاف کو دیکھا تھا جو باب ملتزم کی طرف سے تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور سیاہ غلاف پر سنہری تار سے لکھی گئی صادق آیات کو ہاتھ بڑھا کر چھو کر محسوس کیا تھا اور...... اور...... میرے آس پاس بکھری خوشگوار دھیمی مسحور کن سی خوشبو میرے حواس پر چھانے لگی۔ میں نے بے خودی کے عالم میں باب ملتزم پر ہاتھ ٹکا دیے تھے بے اختیار آنکھوں سے نمکین پانی رواں ہو گیا تھا۔ میں نے خود کو سسک سسک کر بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کر روتے پایا تھا۔ کہتے ہیں کہ باب ملتزم کے پاس کھڑے ہو کر جو دعا کی جاتی ہے وہ قبول ہوتی ہے۔ میں نے خود کو دعائیں کرتا پایا تھا۔ اسی لمحے سیاہ عبا اور سفید اسکارف میں ملبوس ایک خاتون میرے برابر میں آن کھڑی ہوئیں رخ موڑ کر مجھے دیکھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے تھے مگر مجھے اتنا ہوش کب تھا جو میں کسی اور طرف دیکھتا۔ اس وقت غیر متوقع طور سے ایک زور دار دھکے نے میرے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ میں نہ صرف اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا بلکہ قریب تھا کہ میں گر جاتا مجھی برابر کھڑی خاتون نے ایک دم مجھے سنبھال لیا تھا۔ اس

وقت میری نظر ان خاتون پر پڑی تھی اور میرے منہ سے کراہ کی صورت بے اختیار نکلا تھا
''الماس......''

☆=======☆=======☆

''افنان۔'' میں نے خوف کے عالم میں پکارا تھا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ فوری طور سے اٹھ جانے کے باعث سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ پنکھا رکا ہوا تھا۔ جسم پسینے میں شرابور تھا شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ صبح افنان کو آفس کے لئے روانہ کرنے کے بعد کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ تھکی ہوئی تو تھی' کب سوئی' کب نیند گہری ہوئی' پتا بھی نہیں چل سکا مگر ابھی جس خواب کے زیر اثر میری آنکھ کھلی تھی وہ نہایت برا تھا۔ شاید اسی خواب نے اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔ میں نے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے' آنکھیں کھول کر وال کلاک کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا افنان عادل کو آفس گئے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ اب تک تو افنان آفس پہنچ گیا ہو گا ذرا فون کر کے پوچھ تو لوں سب خیریت ہے ناں۔ یہ خیال آتے ہی ہر قسم کی کیفیت زائل ہو گئی۔ گھر میں سب لوگ موجود تھے اور بڑی گہما گہمی تھی' جو بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چلتی ڈائننگ روم میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف آئی۔ وہاں سے ٹی وی لاؤنج کا منظر بالکل صاف نظر آتا تھا۔ ساری آوازیں وہیں سے آ رہی تھیں۔ میں نے افنان کے آفس کا نمبر ملایا بیل جاتی رہی کسی نے اٹھایا نہیں۔ ایک مرتبہ' دو مرتبہ' تین مرتبہ کوئی جواب نہیں۔ پھر میں نے اس کے موبائل کا نمبر ملایا' ملاتی رہی مگر کوئی ریسپانس نہیں ملا تو میں نے بدحواس ہو کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ پانچ منٹ ٹھہرنے کے بعد میں نے دوبارہ آفس کا نمبر ملایا۔ اس بار بھی صورت حال پہلی بار سے مختلف نہیں تھی پھر تو میں بس کوشش ہی کرتی رہی مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں نے تھکن زدہ سی ایک نظر ٹیلی فون سیٹ پر ڈالی اور ڈائننگ چیئر پر بے دم ہو کر گر سی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیسے رابطہ کروں' پھر مجھے خیال آیا کہ چلو میں اس کو میسج ہی کر دوں۔ میں بلا سوچے سمجھے اٹھی اور ٹی وی لاؤنج کے دروازے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ بڑے بھائی اب ابو کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ میری انہیں پکارنے کی ہمت نہیں ہو سکی اسی وقت بڑے بھائی نے ابو کی کسی بات پر ہنستے ہوئے دروازے کی طرف نگاہ کی۔ مجھے کھڑا دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی۔ میں نے انہیں اشارے سے باہر بلایا اور ٹی وی لاؤنج کے

دروازے سے قدرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے جواہر؟'' بالاتخیر اٹھ کر باہر آتے ہوئے بڑے بھائی نے استعجاب سے پوچھا۔

''بڑے بھائی اپنا موبائل مجھے دے دیں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ رکو' لا رہا ہوں۔ اندر رکھا ہے۔'' کہہ کر بڑے بھائی اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو۔''

میں چند لمحے اس کی روشن اسکرین کو دیکھتی رہی۔ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا تھا۔ نہ کبھی اسے اپنے پاس رکھا تھا۔ نہ ہی کبھی ضرورت ہی محسوس کی تھی اور اس وقت مجھے لاچاری کا احساس ہو رہا تھا۔

''مجھے میسج کرنے کا طریقہ بتا دیں۔'' چند لمحے بعد میں نے بے بسی سے کہا۔ بڑے بھائی مجھے میسج کرنے کا طریقہ بتانے لگے۔ انہوں نے پوچھا۔ کس کو کر رہی ہو؟ میں چپ رہی۔ خود ہی کہنے لگے۔ ''افنان کو؟''

''جی......'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''میں کر دوں؟''

''میں کر لوں گی۔'' میں نے محجوب ہو کر کہا اور احتیاط سے Keys دباتی رہی۔ ''افنان کوئی کال تو ریسیو کرو۔'' لکھ کر میں نے Send کر دیا۔ بڑے بھائی دیکھتے رہے۔

''کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟'' بغور مجھے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''اس کو پہنچ گیا ہو گا؟'' میں نے ان کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

''اس کو لکھو کہ میسج پڑھے تو اسی نمبر پر مس کال دے۔'' میں تفہیمی انداز میں سر ہلا کر لکھتی رہی۔

''میں افنان سے کہوں گا کہ تم کو بھی اب ایک موبائل گفٹ کر دے۔ تمہیں پریشانی ہوتی ہے۔'' بڑے بھائی کہہ رہے تھے اور میں میسج Send کر کے خاصی دیر انتظار کرتی رہی۔ ادھر سے کوئی Reply نہیں کیا گیا۔

''کوئی Reply نہیں۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''چ......لاؤ ادھر دو۔'' بڑے بھائی کے کہنے پر میں نے خاموشی سے موبائل ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ افنان کو کال کرنے لگے۔ بار بار نمبر ملانے پر بھی کال ریسیو نہیں کی

گئی تو بڑے بھائی نے اسے میسج کیا۔ اس کے باوجود بھی کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے تھک کر کہا۔ ’’رہنے دیں بڑے بھائی۔‘‘

’’تھوڑی دیر بعد کوشش کرتا ہوں۔‘‘ انہوں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ’’تم کیوں کرنا چاہ رہی ہو؟‘‘

’’یونہی۔‘‘ جواب دیتے ہوئے آنسو میرے حلق میں اٹکنے لگے۔ میں افنان کے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی دیر تک بے چینی سے ٹہلنے کے بعد میں ایک بار پھر گھبرا کر باہر نکل آئی۔ ایک بار پھر میں دلجمعی سے افنان کے آفس کا نمبر ملانے لگی۔ ’’اللہ کے لیے افنان! ریسیو کرلو۔‘‘ بے اختیار میں نے التجا کی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے بے بسی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

’’اس آدمی نے مجھے پریشان کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے......‘‘ نہایت بے چارگی سے خود سے کہہ کر میں نے ایک بار پھر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ چھ سات بیل بجنے کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ دوسری جانب سے ہیلو بھی نہیں کہا گیا تھا کہ میں نے بے صبری سے کہا۔ ’’افنان۔‘‘

’’نہیں جی۔‘‘ لائن کی دوسری جانب سے آنے والی بالکل اجنبی آواز سن کر میری مایوسی کی کوئی حد نہ رہی۔ ’’میں تو پیون ہوں افنان صاحب کا‘ آپ کون صاحبہ؟‘‘

’’میں...... بیگم افنان......‘‘ میں نے اٹک اٹک کر خاصی بے دلی سے کہا۔ ’’افنان صاحب......‘‘ اس بار میں جملہ مکمل نہیں کر سکی۔

’’صاحب تو آج آفس نہیں آئے۔‘‘ دوسری طرف سے کہی جانے والی یہ بات سن کر میں گرتے گرتے بچی تھی۔ میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور میری نظر اس کی سوئیوں پر جم کر رہ گئی۔

’’مم...... مگر...... انہیں گھر سے نکلے ہوئے تو تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔‘‘ میں نے روہانسی ہو کر کہا۔

’’یہاں......!‘‘ حیرت سے کہا گیا۔ ’’ابھی تک تو نہیں پہنچے۔‘‘ پھر چند لمحے بعد کہا۔ ’’ایک منٹ رکیے گا۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔ صاحب کی کھڑکی سے پارکنگ ایریا صاف نظر آتا ہے۔‘‘ مجھے چند لمحے انتظار کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد کہا گیا۔ ’’صاحب کی گاڑی نظر تو نہیں آ رہی۔‘‘

’’گاڑی نظر نہیں آ رہی؟‘‘ میں نے بے یقینی سے دہرایا۔ پھر ایک دم اس سے کہا۔

’’آپ کو پتا ہے ناں ان کے پاس کون سی گاڑی ہے؟‘‘ اگرچہ میرا سوال احمقانہ ہی تھا کیونکہ وہ افنان کا پیون تھا۔ افنان کی گاڑیوں کے متعلق اسے ہی پتا نہیں ہوگا تو پھر کس کو پتا ہوگا۔

’’جی...... جی...... مجھے ان کی ہر گاڑی کا پتا ہے۔ یہاں سے ان کی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے۔‘‘

’’ممکن ہے یہاں سے آپ کو نظر نہ آ رہی ہو۔ آپ پلیز وہاں جا کر دیکھ لیں۔‘‘

’’بیگم صاحبہ نیچے جانا پڑے گا۔‘‘ اس نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

’’پلیز چلے جائیں۔‘‘ میں نے عاجزی سے کہا۔

’’اچھا۔‘‘ اس نے نیم دلی سے کہا۔ ’’تھوڑی دیر لگے گی۔‘‘

’’میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں۔‘‘ میں نے جلدی سے کہا۔

ادھر سے ریسیور رکھے جانے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میں ادھر ریسیور کان سے چپکائے انتظار کرتی رہی۔

’’صاحب کی گاڑی کہیں بھی نہیں ہے۔‘‘ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان آ کر چند منٹوں بعد اس نے بتایا۔ ’’میں نیچے ہر طرف دیکھ آیا۔‘‘

’’نہیں ہے؟‘‘ میری آنکھوں میں نمی بھر بھر کے آنے لگی۔

’’وہ جیسے ہی آئیں گے میں انہیں سب سے پہلے آپ کے فون کے متعلق بتاؤں گا۔‘‘

’’جی۔‘‘ میں نے جلدی جلدی پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارنے کی کوشش کی۔ ’’میں...... میں تھوڑی دیر بعد خود ہی کرتی ہوں۔‘‘ جواب دیتے ہوئے الفاظ میرے حلق میں اٹکنے لگے۔ شکستگی سے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے میرا دل چاہ رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کے رو دوں۔

اس آدمی نے واقعی مجھے پریشان کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ ہڑتال والا دن...... آدمی آفس کے لیے نکلا ہو...... نکلے ہوئے بھی تین گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے ہوں اور ابھی تک وہ آفس نہ پہنچا ہو‘ دس طرح کے وہم آتے ہیں‘ سو طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اس وقت بھی میری پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

اللہ آخر اب یہ کہاں چلا گیا ہے......

اللہ کہاں تلاش کروں میں اسے......

اللہ میں کیسے تلاش کروں اسے......

بلا سوچے سمجھے میں نے ایک بار پھر ریسیور اٹھا کر افنان عادل کے دیے ہوئے نمبر پر کال کر کے ڈرائیور کو بلوانے کا ارادہ کیا۔ وہاں بیل جاتی رہی۔ کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ میں نے تھک کر ریسیور رکھا اور بے جان قدموں سے چلتی افنان عادل کے کمرے میں آ گئی۔ مجھ سے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ یہ جہاں کہیں بھی ہو اسے اپنی امان میں رکھنا۔ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی تھی۔ کچھ دیر یونہی دعائیں کرنے کے بعد میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور بلا مقصد ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکراتی رہی۔ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے برابر میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کو دیکھ کر مجھے بارہا یہ خیال آیا کہ فون کر کے پتا کروں شاید افنان عادل اب آفس پہنچ گیا ہو مگر ہر بار سامنے لگی وال کلاک کو دیکھ کر میں نے خود کو روکا' ابھی تو آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔

وقت بھی تو ایسے مر مر کے گزر رہا تھا۔ سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں ہی موجود تھے۔ میوزک کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ شاید لائٹ آ چکی تھی۔ میں نے ایک نظر لاؤنج کے اندر ڈالی۔ بچے قالین پر بیٹھے پُرشوق نظروں سے اسکرین کی طرف تک رہے تھے۔ بڑے صوفوں پر آرام سے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کسی کو کوئی خیال نہیں تھا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ای تک کو بیٹے کی فکر نہیں تھی۔ ایک میں تھی' جو پاگل تھی' بے وقوف تھی' پریشان تھی' فکر مند تھی اور بے بس بھی تھی۔ میں اپنی پریشانی کا کسی سے اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک بار پہلے بھی افنان عادل کے لاپتا ہونے پر اگرچہ پریشان گھر بھر تھا لیکن ریکارڈ سب سے زیادہ میرا لگا تھا۔ مذاق سب سے زیادہ میرا اُڑا تھا اور آج پھر میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی' سو خود ہی گھبراہٹ کے عالم میں کبھی گھر کے اندر کبھی گھر کے باہر آ جا رہی تھی لمحے بھر کو بھی دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ پھر بالآخر کسی بے چین روح کی طرح میں لان میں ہی ٹہلنے لگی۔ اسی وقت فاران مجھے تلاش کرتا ہوا لان میں چلا آیا۔

''چچی آپ یہاں ہیں' میں کب سے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔''

''کیا ہوا۔'' میں نے غائب دماغی سے پوچھا۔

''اتنی اچھی مووی آ رہی ہے' آپ نہیں دیکھ رہیں۔''

''فاران میرا دل نہیں چاہ رہا اور ویسے بھی میرا روزہ ہے آج۔''

''یہ کون سے روزے رکھ رہی ہیں آپ' رمضان تو ابھی بہت دور ہیں۔''

''فاران تم جاؤ مووی دیکھو۔'' اس وقت مجھے کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگ رہی

تھی' سو نہایت عاجزی سے اس سے کہا۔

''مجھے وہ اتنی اچھی نہیں لگتی اب۔'' فاران نے منہ بنایا۔ ''اتنی مرتبہ کی دیکھی ہوئی ہے کہ اب تو دل بھی نہیں چاہتا اسے دیکھنے کا۔''

میں کچھ کہے بغیر ٹہلتی رہی۔ ''چچی میں آپ کو کمپنی دے دیتا ہوں۔'' کہہ کر فاران میرے ساتھ ہی ٹہلنے لگا۔'' وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک دو منٹ تک مجمد اعصاب کے ساتھ برداشت کرنے کے بعد میں نے بے بسی سے اس سے کہا۔

''فاران بیٹا اس وقت مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔''

فاران ٹہلتے ٹہلتے رک کر خاموش سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے سر ہلایا۔ ''آپ پریشان ہیں آج اسٹرائیک ہے اور چاچو گھر پر نہیں ہیں' اسی لئے۔'' اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور مجھے اس اتنے سے ذہین بچے سے حجاب آنے لگا۔ مجھے اس پر ایک دم بہت پیار بھی آیا۔ کم از کم کوئی تو تھا جس کو میری پریشانی کا احساس تھا۔

''توبہ ہے فاران' کس رفتار سے بولتے ہو تم۔'' جھینپ کر میں اسی قدر کہہ سکی۔ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''ابھی ہم نیوز دیکھ رہے تھے' شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ توڑ پھوڑ ہو رہی ہے اور گاڑیاں جلائی جا رہی ہیں۔'' میں دہل کر اسے دیکھنے لگی۔ ''مگر آپ پریشان مت ہوں چچی' چاچو خیریت سے ہوں گے۔''

اس نے مجھے تسلی دی مگر مجھے تسلی نہیں ہوئی بلکہ پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور ساتھ ہی ٹہلنے کی رفتار میں بھی......

''انشاء اللہ چاچو ابھی آ جائیں گے۔'' اس نے ایک بار پھر کہا۔

''اللہ کرے۔'' میں زیر لب کہہ کر ٹہلتی رہی۔

''اچھا چلیں آپ اندر تو آئیں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ''اتنی دوپہر میں اس شدید گرمی میں آپ لان میں اکیلی ٹہلتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔''

میں اس بار کوئی مزاحمت کیے بغیر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''بیٹھیے۔'' میرے کندھے پکڑ کر اس نے مجھے ڈائننگ چیئر پر بٹھا دیا اور فاران خود ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سامنے ہی رکھے شوکیس پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا۔ وہ ایسے خاموش تھا جیسے Dead پڑا ہو۔

فاران خاموش تھا۔

میں بھی خاموش تھی۔

دل فریاد کر رہا تھا۔

رحم اللہ تعالیٰ...... اللہ...... اللہ......

☆======☆======☆

ایک دم روشنی ہو گئی تھی اور لفٹ جھٹکے سے چل پڑی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ارد گرد خوشگوار اور مانوس سی مہک پھیلی ہوئی تھی مگر مجھے یہ یاد نہ آسکا کہ اس مہک سے میرا واسطہ کہاں پڑا تھا۔ کچھ عجیب ہی سی ذہنی کیفیت میں' میں نے لفٹ کو روکا اور دروازہ کھلتے ہی باہر چھلانگ لگا دی۔ یہ چھٹا فلور تھا۔ چودھویں فلور پر واقع اپنے آفس پہنچنے کے لئے میں بے خودی کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ اپنے فلور پر پہنچ کر میں ہانپنے لگا تھا۔ میرے آفس کے سامنے ہی رکھی کرسی پر میرا پیون بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر لپک کر میرے پاس آ کر سلام کیا۔

''صاحب آپ کے گھر سے بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا۔''

میں نے اس کی بات بے دھیانی سے سنی ابھی تک ذہن حاضر نہیں تھا۔ لمبا سا کاریڈور عبور کر کے آفس میں قدم رکھا تو فون کی بیل بج رہی تھی۔ ابھی میں ٹیبل پر رکھے فون تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ بیل بجنی بند ہو گئی۔ میں ٹیبل کے پاس کھڑا ہو کر سانس ہموار کرنے لگا۔ ابھی تک حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ بیل دوبارہ بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

''افنان۔'' گہری سانس لیتے ہوئے میں بمشکل کہہ سکا۔

''شکر الحمد للہ...... شکر الحمد للہ......'' دوسری طرف سے پتا نہیں ہنسا گیا تھا یا رویا گیا تھا یا شاید ہنسی میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ''اف...... افنان تمہاری آواز تو سننے کو ملی۔''

''کون......؟'' میرا ذہن ابھی تک سو رہا تھا۔

''میں پچھلے کئی گھنٹوں سے یہاں ٹرائی کر رہی ہوں۔ تمہارے پیون نے مجھے بتایا کہ تم ابھی تک پہنچے نہیں ہو۔ اف میں پریشان ہو گئی تھی افنان۔''

''اچھا۔''

''بڑے بھائی نے تمہارے موبائل پر تم کو اتنا کال کیا۔ انہوں نے اور میں نے

کو میسجز کیے۔ تم نے کوئی Reply نہیں کیا۔ تم کہاں چلے گئے تھے افنان؟''

''آں......''

''س...... سوری...... مم...... میں نے...... ارادتاً سوال نہیں...... کیا...... یہ تو...... بلا ارادہ......'' دوسری طرف خاموشی ہو گئی۔ میں اپنی چیئر پر گر کر گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔

''وہ دراصل...... تم کو چھوڑ کر' آ کر میں سو گئی تھی۔'' چند لمحے بعد کہا گیا۔ ''میں نے...... میں نے بہت برا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں روٹیوں سے بھرا طشت ہے۔ میں اسے اٹھا کر سنسان ویران راستوں سے گزر رہی ہوں۔ یکا یک بہت سارے کوؤں نے مجھ پر حملہ کر دیا اور ساری روٹیاں چھین کر لے گئے...... پھر میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ اور الماس کہہ رہی تھی ''پھر......'' پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند ہو گئی ہوں اور دیواریں میرے گرد تنگ ہو رہی ہیں۔''

یکا یک ذہن بیدار ہو گیا تھا۔ میرے حواس پوری طرح سے کام کرنے لگے تھے۔ مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ میں کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ سارے مناظر ایک ایک کر کے نظر کے سامنے تازہ ہو گئے۔

''مجھے ایسا لگا جیسے تم نے مجھے آواز دی ہے۔ مجھے لگا جیسے تم مشکل میں ہو۔ میں...... میں ڈر گئی تھی افنان......'' وہ جیسے سسکی لے کر بولی تھی اور میری آنکھوں میں نمی بھر بھر کے آ رہی تھی۔

''دو منٹ کے لئے بھی۔ مجھے تمہاری خیریت کا پتا نہیں چلتا ناں افنان...... تو...... تو...... مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے ایک منٹ کے لئے بھی تمہاری آواز تک مجھ سے دور نہ ہو۔''

''ہوں......'' آنکھوں کی نمی گلے میں اٹک رہی تھی۔ مجھ سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے۔ تم کو کسی قیمتی کرسٹل Vase کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھوں۔ جیسے سیپ میں موتی بند ہوتا ہے۔ ایسے دل میں چھپا چھپا کر رکھوں۔ تمہاری بچوں کی طرح سے کیئر کروں افنان......''

وہ رندھے ہوئے گلے سے کہہ رہی تھی اور میرے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''تمہاری آواز سن کر اب مجھے تسلی ہوئی ہے۔'' مجھے لگا جیسے اس نے مسکرا کر یہ بات کہی ہے اور میری آنکھوں کا نمکین پانی گالوں پر رواں ہو گیا۔

"اپنا خیال رکھنا۔"

"ہاں۔" میں نے بمشکل اپنی کراہیں ہونٹوں میں دبائی تھیں۔

فون بند ہو گیا تھا اور مجھ سے اپنی آہوں پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔ میں کیا کروں...... یہ عورت میرے لئے بہت اچھی ہے اور میں اس کے لئے...... وہ میرے ساتھ کیا ہے اور میں اس کے ساتھ......

میں گھٹ گھٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے یہ اختیار کس نے دیا تھا کہ میں وصول تو سب اپنا حق سمجھ کر کرتا رہوں اور جب دینے کی باری آئے تو پیچھے ہٹ جاؤں...... گرم نمکین پانی شرٹ کا کالر بھگو رہا تھا اور میں نے بے اختیار ٹیبل سے سر لگا دیا۔ مجھے یہ احساس بالکل نہیں تھا کہ میں اس وقت اپنے آفس میں ہوں اور اگر میرے کسی ماتحت نے مجھے دیکھ لیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔ میں خود کو کسی طرح کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے حواس میرے تابع نہیں رہ گئے تھے۔ جسم جھٹکوں اور لرزشوں کی زد میں تھا۔ نمکین پانی اب روانی سے ٹیبل پر گر رہا تھا۔ جب میں کوئی حق ادا نہیں کر سکتا تو مجھے یہ حق بھی نہیں ہے کہ اس عورت کو اپنے پاس رکھوں...... خود سے باؤنڈ کر کے رکھوں...... تکلیف میں رکھوں...... اُف...... یہ ایسی سوچ تھی کہ اس کے آگے میری باقی ہر سوچ منجمد ہو گئی۔ مجھے اور سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں نے ایک دم ٹیبل سے سر اٹھایا اور میری نظر ٹیبل گلاس کے نیچے سبز مخمل کے اوپر لگے چرمرائے ہوئے ملاقاتی کارڈ پر پڑی۔ سادے سے سفید بیک گراؤنڈ پر سیاہ حروف سے الفاظ ابھرے ہوئے تھے۔

یہ خلدون ابراہیم کا کارڈ تھا۔ یہ وہ کارڈ تھا جو میں نے ایک دن غصے میں توڑ مروڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ پھر صرف اس خیال سے کہ اس پر ابراہیم نام لکھا ہوا تھا۔ جو ہر حوالے سے بڑا محترم ہے۔ میں نے اسے یونہی اٹھا کر ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا تھا۔ شاید یہ وہی کارڈ تھا جو کچھ دنوں پہلے میرے پیون کو تفصیلی صفائی کے دوران ملا تھا اور جسے میں نے دیکھے بغیر ٹیبل گلاس کے نیچے لگانے کو کہا تھا۔ کارڈ پر میری نظر جم سی گئی تھی۔ آنکھوں میں پانی ٹھہر سا گیا تھا۔ کچھ دیر کارڈ کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد میں نے بلا سوچے سمجھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور خلدون ابراہیم کا نمبر ملانے لگا۔ چھ سات بیل ہونے کے بعد دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"السلام علیکم۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ "خلدون ابراہیم ہیئر۔"

مجھے توقع نہیں تھی کہ فون خلدون ابراہیم ہی اٹھائیں گے۔ لہٰذا ان کی آواز سن کر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

"ہیلو؟" انہوں نے ایک بار پھر کہا۔

"میں......" میں نے بولنا چاہا تو الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے۔

"کون؟" ان کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

اور اب کی بار جب میں بولا تو آنسوؤں کے مارے آواز بھاری ہو گئی۔ "افنان...... عادل......"

"اوہ اچھا۔" ان کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "خیریت سے ہو افنان؟"

"نہیں......" میں نے بمشکل کہا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی...... اسی وقت...... فوراً۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

"چلے آؤ۔" انہوں نے بلا توقف کہا۔

میں نے مزید کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ آفس کی گاڑی نکالی۔ تقریباً خالی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے مجھے الماس کی صبح کی نصیحت وغیرہ سب بھول گئی تھی۔ اندھا دھند ڈرائیو کرتا ہوا جب میں خلدون ابراہیم کے آفس پہنچا تو ان کو دروازے پر کھڑا اپنا انتظار کرتا پایا۔ مجھے دیکھ کر وہ گرم جوشی سے آگے بڑھے۔

"یار افنان بڑے موقع سے آئے ہو۔" میرا کندھا پکڑ کر بڑی شگفتگی سے انہوں نے کہا۔ "آج جب میں یہاں پہنچا تو میری جماعت نکل چکی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میرے بعد آفس میں داخل ہونے والا جو بھی پہلا شخص ہو گا میں اس کو جماعت کرنے کی دعوت دوں گا۔ اتفاق سے میرے یہاں آفس میں قدم رکھتے ہی پہلا آنے والا فون تمہارا تھا۔"

وہ کہہ رہے تھے اور میں بغیر پلکیں جھپکائے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ وہ تو ایسے بے تکلفی سے مجھ سے باتیں کر رہے تھے جیسے ہمارے درمیان کبھی کوئی تلخی، بدمزگی رہی ہی نہ ہو۔

"چلو پہلے جماعت کر لیں۔ باتیں ہوتی رہیں گی۔" وہ کہہ رہے تھے اور میں بغیر کچھ کہے ان کے ساتھ ہو لیا۔ وضو کر کے چند رکعات پڑھ کے خلدون ابراہیم نے کہا۔

"چلو...... اقامت کہو۔"

اور اقامت کے الفاظ میرے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔ رندھے ہوئے گلے سے میں نے اقامت کہی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا میں کیسے اس آدمی کی امامت میں نماز پڑھ رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس آدمی کی امامت میں نماز پڑھتا؟ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔

نماز کے دوران بھی ذہن بھٹکتا رہا۔ میں ذہن کو کھینچ کھینچ کر' پکڑ پکڑ کر نماز کی طرف بلاتا۔ جماعت کرا کے تسبیح و تحمید پڑھنے کے لئے خلدون ابراہیم دوزانو ہو کر میری طرف رخ کر کے بیٹھ گئے اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یہ منظر کچھ دیکھا بھالا سا لگا۔

خلدون ابراہیم بغور مجھے دیکھ رہے تھے۔

''کہو افنان کیسے آنا ہوا۔'' مجھے خاموش پا کر انہوں نے پوچھا۔ میں نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ چند لمحے بغور دیکھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں میں پانی امڈا چلا آرہا ہو۔ میں پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں میں آنے والا پانی اندر اتارتا رہا۔ خلدون ابراہیم منتظر نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور چند لمحے بعد میں نے بولنا چاہا تو میرا گلا رندھ گیا تھا۔ بولنا میرے لئے خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

''میں...... میں...... میرا...... تو...... یہ بھی منہ نہیں ہے کہ میں آپ سے...... یہ کہہ سکوں...... کہ...... میں...... آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔'' خاصا اٹک اٹک کر میں نے کہا تھا۔ ''میں...... میں آپ سے ایکسکیوز کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی کی۔''

''تمہیں مجھ سے ایسا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے دھیمے لہجے میں نرمی سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم شرمندہ ہو گے۔ آدمی کا رویہ' آدمی کا چہرہ اس کا ہر فعل بتا دیتا ہے۔''

میں آنکھوں میں نمی لئے انہیں دیکھتا رہا۔ ''جانتے ہو کیوں' کیونکہ اچھے آدمی سے اچھائی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بس وہ برے وقت کے پھیر میں آجاتا ہے۔''

''آپ کو پتا نہیں میرے اندر اچھائی کہاں سے نظر آجاتی ہے۔''

''اگر تم میں کوئی برائی ہوتی تو میں کیوں چاہتا کہ میری بھانجی کی شادی تم سے ہو۔'' انہوں نے سادگی سے کہا۔

''آپ نے اپنی بھانجی کی شادی مجھ سے کر کے اسے پھنسا دیا ہے۔'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''وہ میرے ساتھ بہت اچھی ہے اور میں اس کے ساتھ بہت برا ہوں۔ میں اچھا آدمی نہیں بن سکا۔ میں اچھا شوہر بھی نہیں بن سکا۔ آج چار مہینے ہو گئے میری اس سے شادی کو۔ میں اسے ایک دن بھی خوش نہیں رکھ پایا۔'' میں کہہ رہا تھا اور بس کہے جا رہا تھا۔ ''میں نے اسے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں دیا' تلخ رویے' ترش لہجے سرد انداز کے سوا کچھ نہیں دیا اور بدلے میں اس نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا۔

آپ نے...... آپ نے...... اتنی بھاری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے۔ مجھے سونپ دی ہے۔'' میں نے پانی بھری آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھنا چاہا تو ان کا عکس دھندلانے لگا۔ ''مجھے، آپ...... آپ...... مجھ سے واپس لے لیجئے اسے۔ مجھ سے نہیں اٹھ پا رہی اتنی بھاری ذمہ داری......'' میں نے بے اختیار سسکی لے کر کہا۔ ''میں...... میں...... آپ سے شرمندہ ہوں...... آپ سے معذرت خواہ ہوں...... میں نہیں پوری کر سکتا یہ ذمہ داری......''

اب میں بے آواز رو رہا تھا۔ اس بات سے بالکل بے پروا ہو کر کہ سامنے بیٹھا شخص مجھے کس قدر زہر لگتا ہے۔

''کمال ہے...... کیا...... ایک الماس کی ذمہ داری واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے ہیڈ ہونے سے بھی زیادہ بھاری ہے......؟'' خلدون ابراہیم تعجب سے پوچھ رہے تھے۔

''بحیثیت واٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا ہیڈ مجھے کسی بات کا خوف نہیں ہے۔ میں نے کبھی آج تک کوئی ایسا کام کیا ہی نہیں ہے کہ مجھے اپنی ہائر اتھارٹیز کے آگے جواب دہ ہونا پڑے۔ اس سلسلے میں مجھے اس Supreme authority کے سامنے بھی جواب دہ ہوتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔ جو ان ہائر اتھارٹیز کے اوپر بیٹھی ہے۔ مگر اس معاملے پر......'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''میں برے وقت کے پھیر میں تو ایک ہی مرتبہ آیا تھا اور زندگی بھر کے لئے اس طور پکڑ ہوئی ہے میری......'' ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ خلدون ابراہیم نے مجھے ٹوک دیا تھا۔

''تم جس کو پکڑ کہہ رہے ہو' وہ پکڑ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو مقرب رکھتا ہے ان کی طرف سے کوئی بھی پسند نہیں فرماتا۔''

میں خلدون ابراہیم کی اس بات پر چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ ''کیا بات کرتے ہیں آپ! میں مقربین میں سے ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ میں تو بڑا خطا کار ہوں' قصور وار ہوں' گناہ گار ہوں۔''

''نیکوکار تو میں بھی نہیں ہوں۔'' خلدون ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔ ''اور یہ خطا' قصور' لغزش' گناہ جیسی ساری ٹرمز کا انسان سے ہمیشہ سے تعلق رہا ہے۔ یونہی نہیں کہتے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور خطا تو ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت بی بی حوا سے بھی ہوئی تھی۔ اصل بات ہے قصور کا احساس ہو جانا۔ جس طرح حضرت آدم اور بی بی حوا کو ہو گیا تھا۔ خطا پر شرمندہ ہونا اور شرمندہ ہو کر معافی طلب کرنے کا عمل انسان کو اشرف المخلوقات بناتا ہے۔''

وہ کہہ رہے تھے اور میں ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔

’’اچھا اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے نزدیک گناہ کی Definition کیا ہے؟‘‘

وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں لاجواب تھا۔ مجھے خاموش پاکر انہوں نے کہا۔

’’میری اصطلاح میں ہر وہ عمل جس کے کرنے سے انسان کی فطرت اس کا اندر آمادہ نہ ہو۔ جس کام کا کرنا اسے بے سکونی میں مبتلا کردے۔ وہ گناہ ہے۔ انسان فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی ہے۔ طہارت ہے۔ پاکیزگی ہے۔ انسان خطا کا پتلا ضرور ہے مگر انسان پیدائشی گناہ گار نہیں ہے۔ اس سے گناہ کسی Stimulus کے نتیجے میں ہوتا ہے اور انسان کے لئے سب سے بڑا Stimulant شیطان ہے۔ شیطان کسی بھی صورت میں انسان کے سامنے آسکتا ہے۔ اسے بہکا سکتا ہے' بہکنا انسان کی سرشت میں ہے اگر وہ بہکے نہ تو وہ انسان کیوں کہلائے' فرشتہ نہ ہو جائے۔‘‘

خلدون ابراہیم کہہ رہے تھے اور میں پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

’’انسان بہکتا وہاں ہے۔ جہاں اس کا ایمان کمزور پڑ جائے۔ ایمان آدمی کا ایک ہی صورت میں کمزور پڑتا ہے۔ جب اس کے ذہن سے یہ خیال نکل جاتا ہے کہ میں خواہ کچھ بھی کروں' میرے دائیں بائیں نگران مقرر ہیں۔ وہ میری پوری کتاب مرتب کررہے ہیں اور مجھے دیکھنے کے لئے ایک ذات ہے' جس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اور جس کے دھیان میں یہ بات رہتی ہے' وہ بہک نہیں سکتا اگر بالفرض وہ بہک بھی جاتا ہے تو نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلیتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے باپ حضرت آدم اور بی بی حوا نے رجوع کرلیا تھا۔ کہ ’’اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تُو ہم کو معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

حضرت آدم اور بی بی حوا کو رجوع کرنے کی توفیق دی گئی تھی۔ ابلیس کو یہ توفیق نہیں دی گئی لہٰذا وہ مقرب فرشتے کے درجے سے اتر کر لعنت زدہ ٹھہرا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ رجوع کرنے کی توفیق ہر کسی کو نہیں دیا کرتا اور جن کو یہ توفیق ملی ہوتی ہے وہ خوش نصیب ہوتے ہیں۔‘‘

خلدون ابراہیم کہہ رہے تھے اور میں اپنے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا۔ میں توفیق ملے ہوؤں میں سے تھا......

شاید ہاں......

شاید نہیں......

خلدون ابراہیم کہہ رہے تھے۔ ’’یہ پکڑ نہیں ہوتی افنان' نظرِ خاص ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظرِ خاص کسی کسی پر ہوتی ہے۔‘‘

’’تو...... تو...... میری زندگی پر سزا کیوں مسلط ہو کر رہ گئی ہے۔‘‘ میں نے بے اختیار کراہ کر خود کلامی کی۔

’’تم...... جس کو سزا سمجھ رہے ہو...... وہ سزا نہیں ہے۔‘‘

ان کے کہنے پر میں نے ایک دم نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ تو مسکراتے پایا۔ ’’افنان ہم اپنی آخری سانس تک لرننگ پروسیس میں رہتے ہیں۔ زندگی سے ہمیں ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ یہ موقع کسی نہ کسی سبق کے نتیجے میں ملتا ہے۔ سبق اور سزا میں فرق ہوتا ہے۔ سزا کی صورت میں آدمی کچھ کر نہیں سکتا۔ اس صورت میں Direct implementation ہو جاتا ہے جب کہ سبق میں سیکھنے کا مارجن ہوتا ہے۔ سبق دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو آدمی خود سیکھتا ہے۔ انسان زندگی میں بہت ساری غلطیاں کرتا ہے۔ ہر غلطی اسے کچھ نہ کچھ سکھا کر جاتی ہے اور دوسرا سبق وہ ہوتا ہے جو کوئی ٹیچر انسان کو سکھاتا ہے۔ ٹیچر انسان بھی ہو سکتا ہے' وقت بھی مگر سب سے بڑی ٹیچر Nature ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہوتی ہے۔ اس رات قدرت تمہیں سبق سکھانے کا فیصلہ کرچکی تھی حالانکہ تمہارے بڑے بھائی سے میری تفصیلی بات ہوئی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اس دن تمہیں بہت سمجھایا تھا مگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ ہاں آتا ہے انسان کی زندگی میں ایک ایسا اسٹیج کہ اس کی اپنی عقل صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ تب پھر قدرت اس کو ایسا جھٹکا دیتی ہے کہ وہ منہ کے بل زمین پر چلا آتا ہے۔ انسان کے سنبھلنے کے لئے اسے جھٹکے لگنے ضروری ہوتے ہیں۔ اب یہ لوگوں کی کیٹیگری پر Depend کرتا ہے بعض لوگ پہلا جھٹکا لگنے پر سنبھل جاتے ہیں۔ بعض لوگ یکے بعد دیگرے جھٹکے لگنے پر سنبھلتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر کئی جھٹکے بھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں پہلے جھٹکے پر سنبھلنے والوں کی کیٹیگری سب سے اچھی ہوتی ہے۔ تمہارے سنبھلنے کے لئے بھی اس رات تم کو جھٹکا لگنا بہت ضروری تھا افنان۔ یہ قدرت کی طرف سے تم کو وارننگ ملی تھی۔ میں تو صرف ایک Mediator تھا افنان۔ اگر اس وقت تم کو یہ جھٹکا نہ دیا جاتا تو ممکن تھا کہ تم بھی تیسری کیٹیگری میں

آجاتے۔ مگر تم کو تو پہلے ہی چن لیا گیا تھا پھر یہ کیسے پسند کر لیا جاتا کہ تمہارا شمار بھی تیسری کیٹیگری میں ہو۔"

وہ کہہ رہے تھے اور میں سانس روکے انہیں سن رہا تھا۔ کچھ دن پہلے میں نے سوچا تھا اس رات کا الماس کے ماما کا اور میرا کیا کامبینیشن ہے...... اب مجھے سمجھ میں آ رہا تھا' Combination تو بڑا گہرا تھا۔

"اس رات تم کچھ غلط کرنے ضرور جا رہے تھے مگر تم سے کچھ غلط نہیں ہو سکا کیونکہ تم پہلے ہی روک دیے گئے تھے، تم کو روک لیا گیا تھا اور تم چونکہ فطرتاً نیک ہو' تمہاری فطرت میں برائی نہیں ہے۔ اس لئے یہ تھوڑا بھی تم کو بہت لگ رہا ہے۔ اس لئے تم کو اتنی سی بات ہضم نہیں ہو پا رہی' سبق کو بھی تم سزا کے طور پر لے رہے ہو۔ اصل میں ساری بات احساس کی ہوتی ہے۔ جن کا احساس زندہ ہوتا ہے انہیں چھوٹا قصور بھی بہت لگتا ہے۔"

میں اپنے سامنے بیٹھے شخص کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو مجھے بے حد زہر لگتا تھا جس سے مجھے بے تحاشا نفرت تھی اور اس وقت وہی شخص کتنے آرام سے میرے متعلق تجزیے کر رہا تھا۔ کتنے آرام سے کسی ماہر نفسیات کی طرح مجھے پرت در پرت کھول رہا تھا۔

"ورنہ لوگ بڑے بڑے گناہ کر جاتے ہیں اور انہیں کوئی شرمندگی' کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا احساس مر چکا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کی بدفعلیوں کے نتائج وقتاً فوقتاً ان کے سامنے آتے رہتے ہیں مگر ان سے ان کی سمجھ لے لی جاتی ہے۔ تم ہرگز یہ مت سمجھنا کہ اگر ایسے لوگ ابھی بچ رہے ہیں تو وہ بچے ہی رہیں گے ان پر کوئی چیک اور بیلنس نہیں ہوگا۔ ان کے اعمال پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔"

خلدون ابراہیم کی اس بات پر میرا حیرت کے مارے دانتوں میں انگلیاں داب لینے کو دل چاہا تھا۔ کیا یہ آدمی دوسرے کی سوچ جان لینے پر بھی دسترس رکھتا ہے؟ میں نے بھی ایک دن ایسا ہی تو سوچا تھا۔

"نہیں' بلکہ ان کا تو علیحدہ سے اکاؤنٹ مرتب ہو رہا ہے۔ ان کا حساب تو ایک دن ہو ہی جائے گا۔ وہاں اکٹھا ہر فیصلہ چکا دیا جائے گا۔ بس ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس بڑے دن فیصلے چکنے سے پہلے ہی اپنا بندوبست کر لیں اور خود کو درست کر لیں۔"

میں ملکیں جھپکائے بغیر خلدون ابراہیم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"اس رات تم سے کوئی بڑا قصور نہیں ہوا تھا اور غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ مجھے اگر پتا چل ہی گیا تھا تو مجھے اپنا دماغ ٹھنڈا ہی رکھنا چاہیے تھا اور غلطی تمہارے والد صاحب سے بھی ہوئی ہے' وہ تم سے خفا ہی رہے۔ انہیں تم کو معاف کر دینا چاہیے تھا۔"

اب کی بار میں نے پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ وہ کیسے یہ بات جانتے تھے کہ ابو مجھ سے...... اور...... اور ابھی بھی...... وہ بات جو انہوں نے چند دن پہلے مجھ سے کہی تھی۔ چند سال پہلے بھی تو کہہ سکتے تھے۔ مجھے حسرت سی ہوئی میرا حال کبھی بھی اتنا برا نہ ہوتا۔

خلدون ابراہیم مزید کہہ رہے تھے۔ "یہ تو سارے اس رات کے Consequences تھے۔ اب تھوڑا سا ان سے پہلے کے Events کو ڈسکس کر لیتے ہیں۔"

"مم...... مگر......" میں ہکلانے لگا۔ "میں نے آج تک کسی سے اس بارے میں کچھ ڈسکس نہیں کیا۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"تو...... کوئی بات نہیں۔ اب مجھ سے ڈسکس کر لو۔" انہوں نے اطمینان سے مجھے دعوت دی اور میری زبان پر تالے پڑ گئے۔ بے اختیار میری نگاہ جھک گئی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھ بھی لوں۔ اس کے باوجود بھی مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ میری طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے خاموش پا کر انہوں نے گہری سانس لی۔ تاہم کچھ کہا نہیں۔

"میں...... میں...... آپ سے کیا ڈسکس کروں۔" خاصی دیر بعد میں نے خاصی بے بسی سے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"تم مجھے دھیان سے سوچ کر بتاؤ کہ اس رات اصل میں کیا ہوا تھا۔"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے لاچاری سے دہرایا' خلدون ابراہیم میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سر تھام لیا۔

"اس رات کیا ہوا تھا۔ یہ سوچنا اتنا مشکل کام ہے۔" ان کے لہجے میں بے حد تعجب تھا۔ "ادھر میری طرف دیکھ کر کہو ہاں۔"

ان کے کہنے پر بے اختیار میں نے انہیں دیکھا تو بے حد سنجیدہ ہو کر اپنی طرف دیکھتا پایا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسیت تھی ایسی کشش تھی کہ میں اس بار نگاہ چرا نہ پایا۔ Spell bound ہو گیا۔ سوچنے اور بولنے پر مجبور ہو گیا۔

"میں...... میں...... یوں آیا تھا...... میں نے الماس کو بلایا تھا...... وہ باہر...... آئی

تھی...... اور پھر......'' سحر ایک دم ٹوٹ گیا۔ میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے غیرت سی آئی تھی خلدون ابراہیم کو بتاتے ہوئے۔ میں نے بے اختیار نگاہ نیچی کی اور مجھے اندازہ ہوا وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

''پھر......؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے بہ مشکل کہا۔

''کچھ نہیں کا مطلب؟'' ہنوز ان کا سوالیہ انداز برقرار تھا۔ میں چپ تھا۔ ''میں آ گیا تھا؟'' وہ پوچھ رہے تھے میں اس بار بھی چپ رہا۔ انہوں نے طویل سانس لی۔

''فرض کرو' میں نہ آتا' فرض کرو تم سے گناہ ہو جاتا؟''

میں سر اٹھا کر خاموشی سے انہیں دیکھے گیا۔ ''پتا نہیں اس بارے میں' میں نے کبھی سوچا نہیں۔'' ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے پھنسائے میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں' اب سوچ لو۔'' انہوں نے اطمینان سے ایک بار پھر مجھے دعوت دی۔

''میں...... شاید...... اپنے ضمیر کے ہاتھوں مر جاتا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر......'' انہوں نے دبیز سنجیدگی سے کہا۔ ''تم اس پر تو رو رہے ہو جو گزر گیا ہے۔ اس پر تو پچھتا رہے ہو' جو ہو چکا ہے...... تم اس پر شکر نہیں کرتے کہ کیا ہونے جا رہا تھا اور کیا ہوا نہیں تھا؟''

خلدون ابراہیم کی اس بات پر میں ایک ٹک انہیں دیکھے گیا۔

''تم شکر ادا نہیں کرتے ہو۔ اس رات جس سے تمہارے معاملات خراب ہونے جا رہے تھے' اس کو تم کو دے کر معاملات ٹھیک کروا دیے گئے ہیں۔''

خلدون ابراہیم کی اس بات پر میں دم بخود سا انہیں دیکھے گیا۔ کیا کہہ رہے تھے وہ' کتنے آرام سے کہہ رہے تھے۔ میں نے اس طرح کب سوچا تھا۔ میری زندگی گزر جاتی اور یہ سب تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں کبھی آتا بھی نہیں...... خلدون ابراہیم کہہ رہے تھے۔

''تم میرے پاس تو یہ کہنے کے لئے چلے آئے کہ تم سے یہ ذمہ داری اٹھائی نہیں جا رہی۔ تم نے کیا سمجھ لیا ہے افنان کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یونہی پیدا کر دیا ہے۔ یونہی اس دنیا میں بھیج دیا ہے۔ بلکہ انسان تو یہاں آیا ہی ذمے داریاں اٹھانے کے لئے ہے۔ کبھی اللہ کے حقوق کی ذمے داریاں...... کبھی بندوں کے حقوق کی ذمہ داریاں...... ذمہ داریوں کی ایک لمبی لسٹ ہے۔ انسان کا ان ذمہ داریوں سے فرار ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لکھی تقدیر سے فرار ممکن نہیں ہے۔''

میں بنا پلکیں جھپکائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ کیا غلط کہہ رہے تھے وہ...... ایک ایک لفظ تو سچ تھا۔ میں جلدی جلدی اپنی پچھلی زندگی کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دیکھ لیا تھا کہ میں نے تقدیر سے فرار حاصل کرنے کی جب بھی کوشش کی میں وہیں پھنس گیا تھا۔ پچھلی بار اس کا نتیجہ میں نے انگلینڈ میں بھگتا۔ میں نے جب اللہ تعالیٰ کے وجود پر شک کیا تھا اور میری یہ بات پسند نہیں کی گئی تھی۔ پورے سات دن تک مجھے بستر پر ایسے پھینک دیا گیا تھا کہ میں نہ زندوں میں تھا نہ مُردوں میں...... میں انگلینڈ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں کسی قیمت پر رکنا نہیں چاہتا تھا اور تقدیر میں یہ تھا کہ میں ادھر سے ہلوں بھی نہ...... میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ میری نظر کو جکڑ دیا گیا تھا۔ سامنے کی چیز مجھے نظر نہیں آ سکی تھی۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ میرا پاسپورٹ کھو گیا تھا۔ پھر جب میں نے الماس کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا تھا میرا یہ ارادہ پسند نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے ایسی پریشانی میں مبتلا کر دیا گیا تھا کہ باقی ہر خیال میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اس پریشانی میں' میں دنوں تک مبتلا رہا تھا۔ پہلی غلطی مجھ سے نادانی میں ہوئی اس کے بعد کی ساری غلطیاں بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھیں۔ بوکھلاہٹ میں ہر غلطی کرنے کے بعد میں کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا کر دیا جاتا تھا۔

اور خلدون ابراہیم کہہ رہے تھے۔ ''افنان جب ہم ایمان لاتے ہیں ناں تو یہ بات بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہوتی ہے کہ تقدیر میں ہر اچھائی برائی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس پر Implementation ہو کر رہتا ہے۔ انسان کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم لاکھ سر پٹخ لیتے' پیر پٹخ لیتے' انکار کر دیتے۔ تمہاری تقدیر میں الماس لکھی جا چکی تھی۔ تو وہی تم کو ملتی...... وہی تم کو ملی ہے۔''

خلدون ابراہیم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا میں گنگ تھا۔ ایسے خاموش تھا جیسے بولنا جانتا ہی نہ ہوں۔

''یہ فیصلہ تو پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ چاہے بھلا' چاہے برا۔ اب جبکہ یہ فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو اب تو صرف اسے قبول کرنا ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم قبول نہیں کر پا رہے۔ حالانکہ بندگی کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ اس کی رضا میں راضی رہے۔ مصیبت پر صبر کرے اور نعمت پر شکر......''

خلدون ابراہیم کی اس بات پر میرا سانس رک گیا تھا۔ میں مصیبت پر بے شک صبر کرتا رہا تھا مگر میں نے نعمت پر شکر کب کیا تھا؟ میں نے تو ایک بلال مرتضیٰ کا اللہ کے ایک بندے تک کا شکر نہیں ادا کیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی تصدیق کردی تھی کہ "جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔"

خلدون ابراہیم مزید یہ کہہ رہے تھے۔ ''تمہیں تو نعمت ملی ہے' افنان اور تم مسلسل بھی کہے جا رہے ہو کہ تم کو نہیں چاہئے تھی۔ تمہارے نہ چاہنے کے باوجود اگر تم کو کچھ دے دیا گیا تھا تو کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ تم اس کو غنیمت جان لیتے۔ کیونکہ وہ ذات جو دے دینے پر قادر ہے۔ وہ چھین لینے پر بھی قادر ہے۔''

خلدون ابراہیم کی اس بات پر مجھے اپنے پیروں کے نیچے کی زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خلدون ابراہیم مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ مجھے ان کے دیکھنے کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں تو اپنی سوچ میں گم تھا۔ مجھے الماس پر رشک آ رہا تھا۔ مجھ سے اچھی تو وہ تھی۔ کہتے ہیں مردوں میں عورت سے سات گنا زیادہ عقل ہوتی ہے۔ مجھ سے سات گنا کم عقل اس کے پاس تھی مگر اس کا استعمال اس نے کیا تھا جو بات آج کسی کے بتانے پر میری سمجھ میں آ رہی تھی' الماس پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ میرا دل چاہا الماس سے خوب جھگڑا کروں۔ اس سے لڑوں تمہیں پتا تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ پھر مجھے خیال آیا میں نے اس کو کبھی اس لائق کب سمجھا کہ وہ مجھے کچھ بتاتی۔ میں نے کب اس سے کچھ پوچھنے کی زحمت کی۔

میں نے گہری سانس لی اور آج پہلی بار خود مصافحے کے لئے خلدون ابراہیم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما۔ میں نے بے اختیار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ جب ایک بار خلدون ابراہیم میرا بازو پکڑ کر مجھے کہیں لے جا رہے تھے تو میں نے بے دردی سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے ان سے کہا تھا۔ ''راستے کا مجھے بھی پتا ہے آپ کو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' میں نے ان سے غلط کہا تھا۔ راستہ بتائے جانے کی ضرورت تو مجھے ہمیشہ سے تھی اور آج بھی میں اگر خوفزدہ نہ ہو جاتا تو خلدون ابراہیم کے پاس کبھی نہ آتا۔ میں ان کے پاس آیا ہی خوف زدہ ہو کر تھا۔

''آپ مجھے بڑی دیر میں ملے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ نرمی سے مسکرائے۔ ''میں تو تمہارے ہمیشہ سے قریب تھا بس ہماری ملاقات کا دن آج کا طے تھا اور آج بھی میں نے تمہیں نیا کیا بتایا ہے' یہ ساری باتیں' ہمیں چودہ سو سال پہلے بتائی جا چکی ہیں۔''

وہ کہہ رہے تھے اور اس بار میں نے بغور انہیں دیکھا تھا۔

امام کون ہوتا ہے......

وہ شخص جسے لوگ Follow کرتے ہیں......

اور تمام امام Ultimately ایک ہی امام کو Follow کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو......

میں مزید کچھ کہے بغیر مسجد سے باہر چلا آیا۔ مسجد کے احاطے میں کھڑا ہو کر میں نے ایک نظر تاحدِ نگاہ پھیلے نیلے آسمان کو دیکھا۔ پوری آب و تاب سے چمکتے سورج کو دیکھا۔

آسمان آج سے پہلے اتنا مہربان مجھے کبھی نہیں لگا تھا۔

سورج کی روشنی میں حدت ہونے کے باوجود مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں......اور ہوا آج سے پہلے اتنی تازہ مجھے کبھی نہیں محسوس ہوئی۔

میں نے اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ مجھے یاد آیا۔ ایک مرتبہ بڑے بھائی نے مجھ سے کہا تھا۔ ''افنان' یہ زندگی بہت چھوٹی ہے اور ہمیں جو وقت ملا ہے بہت غنیمت ہے۔ اسے پچھلا کچھ سوچ کر ضائع مت کرو۔'' مجھے آج ہی پتا چلا تھا کہ زندگی کتنی چھوٹی ہے اور ہمیں جو وقت ملا ہے' واقعی بہت غنیمت ہے۔ میں اڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا مگر اس سے بھی پہلے مجھے جلدی جلدی کچھ کام کرنے تھے اور اس کے لئے مجھے بینک جانا تھا۔

خالی سڑکوں پر صبح دی گئی الماس کی ہدایات کے عین مطابق' بڑی احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرتا میں بینک پہنچا۔ منیجر نے خوش دلی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں نے اس سے اپنے اکاؤنٹ میں موجود رقم کے بارے میں پتا کیا۔ اس نے رقم بتانے کے ساتھ بتایا۔

''آپ کی مسز چند دن پہلے یہاں آئی تھیں۔ جناب آپ کا لکھا ہوا پچاس ہزار کا چیک کیش کروانے۔''

''اوہ اچھا۔'' مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے مہر کی رقم نکلوائی ہے مگر یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اس نے اس بارے میں مجھے کچھ بتایا نہیں تھا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی' ہر بات

مجھے بتا دینے والی الماس نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔ چند لمحے بے آرامی سے کرسی پر پہلو بدلنے کے بعد میں نے خود کو تسلی دی۔ کوئی بات نہیں۔ اس کی چیز تھی' اس نے لے لی' اچھا کیا۔

پھر میں نے اپنی ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر رقم نکلوائی دو مہینوں کی تنخواہ کے چیک لکھ کر میں نے اپنے پاس رکھ لئے۔

"بجلت یہ کام نمٹانے کے بعد میں گھر کے لئے روانہ ہوا اور گھر جانے والی لمبی سی مرکزی شاہراہ پر گاڑی خراب ہوگئی۔ اُف یہ سرکاری گاڑی' میں نے کوفت سے سوچا۔ پھر دھکا لگا کر چلاتے ہوئے اسے قریبی ورک شاپ میں دیا' جس کا شٹر خوش قسمتی سے آدھا کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور چلنے پر قریبی مساجد سے اذان کی آواز کانوں میں پہنچی تو اس دعوت کو رد نہ کر پایا اور اس بار میں نے بڑے خشوع و خضوع سے اور دل سے نماز پڑھی۔ وہاں سے نکل کر گھر کے راستے پر جانے والی سڑک پر مڑنے ہی کو تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔ "افنان صاحب!"

میری کوفت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ میں آج جتنی جلدی گھر پہنچنا چاہ رہا تھا اسی قدر دیر ہو رہی تھی۔ جھنجلا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو مین روڈ پر واقع مشہور کیٹرنگ سروس اور ہوٹل کا مالک میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہمارے گھر کی اکثر چھوٹی چھوٹی تقریبات کا انعقاد انہی کے زیر انتظام ہوتا آیا تھا۔ اس کا مالک نہ صرف مجھے بلکہ میرے پورے خاندان کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا اور اس وقت وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے خاصے تعجب سے اسے دیکھا۔ "میں الحمدللہ ٹھیک ہوں۔" میں نے احتیاط سے بتایا۔

"آپ اسپتال میں داخل تھے۔" اس نے کہا اور اب مجھے سمجھ میں آیا تھا کہ وہ میری طبیعت کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اصل میں اس دوران آپ کی مسز باقاعدہ یہاں آتی رہی تھیں۔ وہ ہر روز ایک Random تعداد کے لئے کھانے کا آرڈر دے دیتی تھیں۔"

وہ مجھ سے کہہ رہا تھا اور میں پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے باقاعدہ دن مقرر کر رکھے تھے۔ جن میں مستحقین اور غرباء کے لئے اس کے یہاں کھانے کا اہتمام ہوتا تھا۔ ان مقرر کردہ دنوں میں اس کے ہوٹل کے باہر لوگوں کا

اور اس وقت وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ کی مسز ایک باہمت خاتون ہیں۔ میں ان کو دیکھتا تھا جب تک ان کا آرڈر ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی انتظار کرتی رہتی تھیں' مستقل تین دن تک یہ کام انہوں نے اپنی نگرانی میں کروایا۔ ایک دن آپ کے ڈرائیور نے بتایا۔ "ہمارے افنان صاحب اسپتال میں داخل ہیں۔ آپ بھی ان کے لئے دعا کیجئے۔ میں سمجھا آپ بہت بیمار ہوں گے۔ آپ سے معذرت میں آپ کی عیادت کے لئے چند مصروفیات کی بناء پر نہ آسکا۔ مگر میں آپ کی صحت کے لئے دعا کرتا رہا تھا۔"

اس کی بات سن کر میری نظر خود بخود جھک گئی اور سر بھی۔ "اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔" یہ مشکل کہہ کر مجھ سے وہاں رکا نہیں جا سکا۔

اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ مہر کی رقم کا مصرف کیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ اسپتال میں قیام کے دوران مخصوص اوقات میں الماس کہاں غائب ہو جاتی تھی۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس کا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ کیا تھا اور مجھے یہ بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ الماس آخر چیز کیا ہے۔ مجھے اعتراف تھا کہ میں اسے سمجھ نہیں سکا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں اسے شاید آئندہ بھی نہ سمجھ پاؤں گا۔ میں حیران تھا کہ اس میں ایسا کیا تھا جو نہیں تھا اور ایسا کیا نہیں تھا جو تھا......

نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "دنیا سامانِ زیست ہے اور اس کی بہترین متاع صالح عورت ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سچ فرمایا ہے۔ میں نے چلتے چلتے رک کر جیب تھپ تھپا کر الماس کی تصویر کی موجودگی کو محسوس کرنے پر اطمینان اور سکون کا سانس لیا۔ مجھے اب اس تصویر کی قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

الماس بلاشبہ ایک صالح عورت تھی اور اس بہترین عورت کو میرے لئے رکھا گیا تھا۔

آج پہلی مرتبہ مجھے خود پر رشک آ رہا تھا۔ اس وقت کون سا ایسا جذبہ تھا جو میں الماس کے لئے محسوس نہیں کر رہا تھا۔ عجب سی حدت تھی اس جذبے میں۔ بڑی نرم و لطیف سی آنچ تھی عجیب ٹھنڈی سی آگ تھی۔ اب سے کچھ سالوں پہلے بھی میں اسی کیفیت کا شکار ہوا تھا مگر وہ آگ جلا دینے والی تھی اور یہ آگ جلا دینے والی تھی۔ وہ آگ راکھ کر دینے والی تھی اور اس آگ میں مجھے جلنے میں بھی مزا آ رہا تھا۔

میں نے چلنے کی رفتار تیز کر دی۔ میں پہلے ہی بہت دیر کر چکا تھا میں مزید دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجانے پر فاران نے مین گیٹ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی اس

نے خوشی اور اطمینان سے کہا۔ ''السلام علیکم چاچو' شکر ہے آپ آگئے۔''

''کیوں تم میرا انتظار کر رہے تھے۔'' میں سلام کا جواب دے کر پوچھتا ہوا اندر آگیا۔

''میں تو نہیں کوئی اور آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کو جب پتا تھا کہ آج اسٹرائیک ہے تو آج آپ کیوں گئے؟''

''کیونکہ ضروری تھا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''کچھ پتا بھی ہے آپ کے پیچھے چچی کتنی پریشان تھیں۔'' میں اس کے انداز پر بے ساختہ مسکرایا۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''Good heavens چاچو آپ مسکرا رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہے چچی پورے وقت لان میں اتنی شدید گرمی میں ٹہلتی رہی تھیں۔ وہ تو اتنی پریشان تھیں کہ انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔''

''اب کہاں ہیں تمہاری چچی؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''ثاقب بھائی کا دو مرتبہ فون آیا تھا۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ کہہ تو رہے تھے' چچی کو لینے آنے کے لئے۔''

''کیا وہ چلی گئیں؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''جاتے ہوئے دیکھا تو نہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''آپ خود اندر دیکھ لیجئے۔''

میں نے اندر جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ کچھ دن پہلے وہ مجھ سے جانے کے لئے کہہ تو رہی تھی' ممکن ہے چلی گئی ہو لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے بغیر بتائے چلی گئی ہو۔ میں متلاشی نظروں سے چہار طرف دیکھتا رہا۔ ہر کمرہ جھانک لینے پر بھی وہ نظر نہیں آئی۔ میں بے چین ہو کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اندر جھانکا تو شکر اور اطمینان کی لمبی سانس لی۔ میری نظر ٹھہری تو بس ٹھہر ہی گئی۔ کچن کے دروازے میں کھڑا میں دیکھے گیا...... بس دیکھے گیا۔

☆======☆======☆

میں اس وقت آٹا گوندھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ مسلسل کسی کی نظریں اپنی پشت پر محسوس کرنے پر میں بوکھلا گئی۔ بے اختیار پلٹ کر دیکھا تو افنان عادل کو دروازے میں کھڑا پایا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرے ڈرے انداز میں مسکرائی۔ ''یہ تم ہو۔''

''ہاں۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے پتا بھی نہیں چلا۔''

''ہمیشہ پتا چل جاتا ہے؟''

''ہاں تم جو Fragrance استعمال کرتے ہو۔ وہ بڑی Wild سی ہوتی ہے۔ میں اس سے سمجھ جاتی ہوں۔ آج تم کچھ لگانا بھول گئے۔''

''ہاں میں اب اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔'' اس نے ذو معنی انداز میں کہا۔

''تم آج جلدی آگئے؟''

''نہیں میں نے آنے میں دیر کر دی۔''

''کوئی بات نہیں' اپنے وقت سے تو پہلے ہی آگئے ہو۔''

''ہاں واقعی اپنا وقت گزرنے سے تو بہت پہلے آگیا ہوں۔'' اس نے اعتراف کرنے والے انداز میں کہا۔

میں بہت حیران ہوئی افنان عادل آج کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تاہم بڑے عام سے انداز میں کہا۔ ''اسی لئے میں نے کہا تھا آج مت جاؤ تم نے سنا نہیں۔''

''آئندہ سن لیا کروں گا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

میں اس کی بات پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ افنان عادل جیسا صرف اپنی مرضی کرنے والا آدمی اس وقت مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''آئندہ سن لیا کروں گا۔''

آج سورج مشرق ہی سے نکلا تھا ناں..... میں نے حیرانگی سے سوچتے ہوئے آہ لگے دائیں ہاتھ کی پشت سے نیچے ناک تک پھسل کر آنے والا چشمہ اوپر کیا' گالوں پر آنے والے بالوں کو ہٹایا' میں ابھی ابھی نہا کر آئی تھی اور گیلے بالوں کو میں نے یونہی باندھ لیا تھا اور اب بال نکل گئے تھے جو بار بار اسکارف سے نکل کر گالوں پر آ کر مجھے تنگ کر رہے تھے۔

افنان عادل خاموشی سے مجھے دیکھے جا رہا تھا اور مجھے ایک دم یاد آ گیا تھا کہ اس نے صبح سے صرف ناشتہ ہی کیا ہوا ہے اور کھانا تو اس نے یقیناً کھایا نہیں ہوگا سو اس سے کہا۔ ''افنان کھانا' کھانا چاہو تو بتا دو۔''

''نہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''کچھ نہیں کھانا۔''

''پانی' چائے' کافی۔'' میں نے اب کی بار پیشانی پر چپک جانے والے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر اندر آ گیا۔ ''کچھ نہیں پینا۔''

''کچھ اور.....''

ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے میرے بالکل قریب آ کر مجھے نرمی سے شانوں سے تھاما' میرا چشمہ اتار کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں ساکت سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے میرے بالوں اور پیشانی پر آنے والے بالوں کو اسکارف کے اندر کیا اور مجھے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار لگنے لگا۔ اس نے بڑی احتیاط سے مجھے سنبھالا اور میرا بے اختیار اس کے کندھے سے جا لگا۔

اس لمحے مجھے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ یہ کچن ہے۔ کوئی بھی یہاں کسی وقت بھی آ سکتا ہے..... ہر احساس جیسے مر چکا تھا۔

افنان عادل نے آہستگی سے میری پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔

''آج بھی تمہارا روزہ ہے؟'' وہ اب مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''ہوں۔'' میں نے بھنچی بھنچی سی آواز میں کہا۔

''اچھا۔'' اس نے آہستگی سے کہہ کر میری دونوں کلائیاں نرمی سے پکڑ کر مجھے خود سے علیحدہ کیا تو بے اختیار میری سسکی نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہاں سے جل گیا تھا۔'' میں نے اشارہ کیا۔ بے داغ سفید کلائی پر بڑا سا سرخ دھبہ بڑا واضح تھا۔

''ایک روزے دار سے وہ بھی اس حالت میں' میرے گھر والوں کو کام کرواتے ہوئے ذرا لحاظ نہ آیا۔ کوئی خیال بھی نہ آیا۔'' بہت خفا ہو کر اس نے کہا۔ پھر میرے ہاتھ کو آہستگی سے چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ''ابھی پوچھتا ہوں' جا کر۔''

''تمہارے گھر والوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔'' میں نے جلدی سے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو آستین گرفت میں آ گئی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ''مجھ ہی سے شام نہیں گزر رہی تھی۔ میں نے ہی بڑی بھابی سے کہا تھا۔ مجھے کوئی کام بتا دیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا بس صرف رات کے لئے آٹا گوندھنا ہے۔ میں ویسے بھی فالتو ہی پھر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ میں گوندھ دیتی ہوں۔''

''دیکھو مجھے دوسروں کو Defend کرنے کی تمہاری عادت پتا ہے۔ مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔'' شہادت کی انگلی میرے چہرے کے قریب لاتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی افنان۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''تب پھر ٹھیک ہے۔'' اس نے گہری سانس لے کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے ہاتھ کو دیکھا میں نے ایک دم اس کی قمیض کی آستین چھوڑ دی۔ سارا آٹا اس پر لگ چکا تھا۔ میں شرمندہ سی ہو کر آٹا صاف کرنے لگی۔ وہ ساکت و صامت کھڑا تھا۔ میں نے بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے گڑبڑا کر نگاہ جھکا لی۔

''دیکھ لو جی بھر کر دیکھ لو میں تم کو کسی حق سے محروم نہیں کر رہا۔'' میں نے بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ تو اسے مسکراتے پایا۔

''تم کو کیا' ابھی کچھ دیر لگے گی؟'' اب وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں تھوڑی دیر تو لگے گی۔'' میں طویل سانس لے کر آٹے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا؟''

''ہاں کام تو تھا۔'' اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر مجھے کوئی

جلدی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے فارغ ہو جاؤ۔'' وہ کہہ کر اطمینان سے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

''افنان تم چلو میں آ رہی ہوں۔''

''نہیں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اچھا تم بیٹھ تو جاؤ۔''

''بیٹھ جاؤں گا تو تم کو دیکھ نہیں سکوں گا۔''

''یہاں کہاں گرمی میں کھڑے رہو گے۔''

''تم بھی تو گرمی میں دوہری مشقت کر رہی ہو۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''دنیا تم لوگوں کے لیے کتنی مشکل ہے ناں' میں اس بات کو Realize کرتا ہوں۔ میرے گھر میں اگر تم بغیر اسکارف' دوپٹے کے بھی رہو گی ناں تو کوئی تم کو آنکھ اٹھا کر دیکھے گا بھی نہیں۔ میرے باپ بھائی شریف مردوں میں سے ہیں۔''

''تم اگر یہ بات نہ بھی کہتے تو میں بھی ان کے ساتھ چار مہینے سے رہ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔''

''مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا۔''

''میں یہ بھی جانتی ہوں۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

''میں یہاں اے سی لگوا دوں گا۔''

اس کی اس بات پر میں بے ساختہ مسکرائی۔ ''تمہاری امی بھابیاں کہیں گی' ہم اتنے عرصے سے اسی طرح کام کرتے چلے آئے ہیں تب تو افنان کو کبھی یہ خیال نہیں آیا۔ جب بیوی نے کام کرنا شروع کیا تو خیال آ گیا۔''

''میری امی' بھابیاں بہت Broad minded ہیں۔'' اس نے برا منائے بغیر کہا۔

میں خاموش ہو گئی' آٹا گوندھتی رہی۔ وہ بڑے سکون سے کھڑا میرا انتظار کرتا رہا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں بڑی میٹھی سی کیفیت تھی۔

مجھ سے کوئی کام ہو نہیں پا رہا تھا۔ جیسے تیسے کر کے آٹا گوندھا۔ اسے برتن میں نکال کر فریج میں رکھا اور جب میں مڑی تو پتا چلا وہ قمیض کی آستینیں فولڈ کیے ہوئے۔ پرات دھو رہا تھا۔

''افنان۔'' میں شرمندگی کے مارے اور کچھ بول ہی نہیں سکی۔ میں افنان عادل اور

چھوٹے بھائی کا موازنہ کرنے لگی۔ چھوٹے بھائی کو جلدی تو بے حد ہوتی تھی مگر حرام تھا جو وہ کچن کے کسی کام کو ہاتھ بھی لگا لیتے، چھوٹی بھابی کی ذرا بھی ہیلپ کروا دیتے اور افنان عادل...... اس وقت مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ''کہاں رکھوں؟''

میں نے اس کے ہاتھ سے پرات لے کر مقررہ جگہ پر رکھ دی۔

''کچھ اور تو نہیں کرنا؟'' اس نے مزید پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''چلو۔''

''آؤ۔''

پھر درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے میں اور وہ آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس نے نرمی سے میرا کندھا پکڑ کر مجھے بستر پر بٹھا دیا۔ خود بھی میرے برابر بیٹھنے لگا۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نہیں مجھے تمہیں دیکھنے میں مشکل ہو گی۔'' وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے آن بیٹھا۔ میں نے اسکارف اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ گیلے بال بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ چند لمحے مجھے خاصی محویت سے تکتے رہنے کے بعد افنان عادل نے خاکی رنگ کا خاصا پھولا ہوا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے خوف زدہ سی نظروں سے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور لفافہ اس سے لینے سے گریز کیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ بے اختیار مسکرایا۔ ''ارے تم ڈر کیوں رہی ہو' خود ہی کھول کے دیکھ لو ناں۔'' اطمینان سے اس نے کہا۔

''نہیں تم خود ہی بتا دو۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''ارے لے بھی لو بھئی۔'' اس نے اصرار کیا اب کی بار میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ڈرتے ڈرتے اسے کھولا تو اچھی خاصی رقم تھی۔ میں نے الجھن زدہ سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اتنے سارے پیسے؟''

''یہ تم سے شادی کے بعد پہلی پے ہے میری۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ پھر جیب سے دو چیک نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ ''یہ دوسری...... یہ تیسری...... انشاء اللہ کل کیش کروا لیں گے۔''

میں نے ہچکچاتے ہوئے چیک بھی لے لیے۔ ''میں اتنے کا کیا کروں گی۔''

''جو چاہے سو کرو۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''چاہو تو ساری Save کر لو۔ چاہے تو ساری خرچ کر دو۔''

"مگر یہ تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟" میں نے قدرے الجھن سے پوچھا۔

"کیونکہ تمہیں ہی دینی چاہیے۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر لفافے میں سے بغیر گنے کچھ رقم نکالی' دونوں چیک لفافے میں رکھے اور لفافہ اسے دے دیا۔

"میں نے لے لیا ہے' مجھے جتنا لینا تھا۔ میری طرف سے باقی جمع کروا دینا۔"

اس نے مزید کچھ کہے بغیر لفافہ میرے ہاتھ سے لے کر میرے قریب مسہری پر رکھ دیا۔

میں اس کے بولنے کی منتظر رہی اور وہ بغیر کچھ کہے مجھے یونہی دیکھتا رہا اور مجھے آج اس کا اس طرح دیکھنا الجھن میں مبتلا نہیں کر رہا تھا بلکہ اچھا لگ رہا تھا اس کے دیکھنے کے انداز میں بڑی نرمی تھی۔ بڑی گرمی تھی۔ مجھے اپنا آپ موم کے سانچے میں ڈھلا لگ رہا تھا۔ حدت سے قطرہ قطرہ پگھلتا ہوا۔

خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ "مجھے رشک آتا ہے خود پر کہ میری بیوی کا نام جواہر ہے اور الماس ان میں سب سے قیمتی ہے۔ الماس صرف ایک قیمتی پتھر کو کہتے ہیں اور جواہر بہت سارے قیمتی پتھروں کو الماس کی قیمت کا شاید کوئی اندازہ لگا بھی سکے مگر جواہر کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

اس کی اس بات پر میں مسکرا دی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہ رہا تھا۔ وہ تو مجھے چاہے جس نام سے بھی پکارتا مجھے وہی نام اچھا لگتا۔ ویسے بھی ان چار مہینوں میں' میں اس جواہر نام کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ الماس نام تقریباً مجھے بھول ہی گیا تھا اور اگر اب مجھے کوئی الماس کے نام سے پکارتا بھی تھا تو مجھے اجنبی لگتا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "تم نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا ناں' جواہر کہ ہمارے درمیان کیا ہے تو سنو آج تم کو بتاؤں ہمارے درمیان صرف ایک رات تھی۔"

اس کی یہ بات سن کر میری سانس رک گئی۔

"لیکن گڑبڑ اس رات سے ایک دن پہلے شروع ہوئی تھی۔ جب تم مجھ سے آن لگی تھیں؟"

اف کیا کیا یاد تھا اسے میں مارے حیا کے نگاہ نہیں اٹھا پائی۔

"بس مجھے یوں لگا جیسے دو Opposite چارجز مل گئے ہوں۔ سرکٹ کمپلیٹ ہو گیا ہو۔ میں خود کو کسی طرح اس Flow of current سے بچا نہیں پایا تھا۔"

وہ مجھے اپنی کیفیات بتا رہا تھا اور مجھے اس سے بے تحاشا حجاب آ رہا تھا۔ اس کی کئی منی کا فلسفہ بھی مجھے اب سمجھ میں آ گیا تھا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے حجاب آلود لہجے میں اٹک اٹک کر کہا۔ "مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔"

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ "تم کو ایسا کچھ محسوس ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ تم افنان عادل نہیں تھیں' تم تو الماس تھیں۔ تم افنان عادل ہوتیں تو تم کو پتا چلتا۔ میں اپنی کیفیت سے ڈر گیا اور اتنا ڈرا کہ اگلے دن میں نے ساری کہانی بڑے بھائی کو سنا دی۔ بڑے بھائی نے سن کر سر پکڑ لیا۔ انہوں نے مجھے تم سے ملنے کو بالکل منع کیا۔"

"اس کے باوجود تم اس رات میرے پاس چلے آئے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس وقت مجھے یہ بات پتا نہیں تھی کہ میں کس چیز کے Under influence تمہارے پاس آیا تھا۔ بڑے بھائی نے تم سے شادی سے پہلے تک مجھ سے یہ بات پوچھی تھی۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم نے انہیں بتا دیا تھا؟"

"میں انہیں کیا بتاتا' بتانے والی کوئی بات بھی تو ہوتی۔ ہاں میں تم کو ضرور بتا سکتا ہوں۔"

اور جب وہ واقعہ اس نے مجھے بتایا تو میری آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں۔ میں نے شاک کے عالم میں اسے دیکھا۔ "تم......تم......تم...... یہ سب کچھ دیکھ کر میرے پاس آ رہے تھے؟" میرے منہ سے صحیح طرح سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"جتنا کچھ تم کو بتایا ہے اس سے کہیں زیادہ کچھ دیکھ کر میں تمہارے پاس آ رہا تھا۔" وہ اطمینان سے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"تم......تم...... پاگل ہو گئے تھے افنان؟" مجھ سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

"میں پاگل کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو گیا تھا۔" اس کے اطمینان میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تھا۔" میں نے اب کی بار قدرے ناراضگی سے پوچھا۔

"نہیں میرا وقت خراب ہو گیا تھا۔" اس نے اعتراف کرنے والے انداز میں کہا۔

"تمہاری عقل کہاں تھی افنان؟" میرا سر پیٹ لینے کو دل چاہ رہا تھا۔

''رخصت ہو گئی تھی۔''

''تب تو بچت ہو گئی...... اف...... واقعی...... ماما......'' میں کہتے کہتے ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگی۔

میرے منہ سے ماما کا نام سن کر وہ مسکرا دیا تھا۔

''ہاں...... کیا...... ماما......'' بدستور مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''پپ...... پتا نہیں۔'' میں ہکلانے لگی۔

''ہاں کہو کہ جو ہوا اچھا ہوا۔'' میں نے اس بار اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔

''پتا نہیں اچھا ہوا یا برا ہوا۔'' میں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''شاید ایسا ہی ہونا تھا۔''

''ہاں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''شاید ایسا ہی ہونا تھا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو پورا وجود ایک دکھتا ہوا پھوڑا تھا۔ میرے گھر والے ناراض تھے مجھ سے اور ابو شدید ناراض۔ ابو نے مجھے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ مجھے ابو کے الفاظ کسی وقت بھی بھولتے نہیں ہیں۔''

اس نے مجھے ابو کے اس کے متعلق کہے جانے والے پورے پورے جملے بتائے تھے۔ میں آنکھوں میں نمی لئے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''جواہر، ابو کی ناراضگی کی کوئی حد نہیں تھی' بدگمانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں تو انگلینڈ تک جانے کا پروگرام کینسل کر دیتا اگر بڑے بھائی آڑے نہ آ گئے ہوتے۔'' اس نے طویل سانس لے کر بتایا۔ ''پھر وہاں انگلینڈ میں مجھے مارتھا ایوانز ملی۔ مارتھا ایوانز جو بالکل تمہاری شکل تھی' تم میں اور اس میں اتنی مشابہت تھی کہ پہلی مرتبہ دیکھنے پر میں چکرا گیا کہ یہ تم ہو۔ میری ذہنی کیفیت اتنی بری تھی کہ میں تو بس وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر میری ہر کوشش بے کار گئی۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں ایک ایک بات بتا رہا تھا۔ ''اور اس سارے قصے کے دوران ایک مہربان شخص میرے ساتھ تھا۔'' اس کے لہجے میں احسان مندی کی سی کیفیت تھی۔ ''جو ہر بار مجھے جب ملتا ہے تو ایک احسان کا اضافہ مجھ پر کر دیتا ہے۔ مجھے تو اس کے پہلے ہی احسان کا بدلہ اتارنے کا موقع ابھی تک نہیں مل سکا باقیوں تک تو بات بہت دور کی ہے۔''

''شاید احسانات کا بدلہ چکایا نہ جا سکے۔'' میں نے افنان عادل کو خاموش پا کر خاصی دیر بعد کہا۔ ''مگر کسی کے لیے دعا تو کی جا سکتی ہے۔''

''ہاں بات تو سچ ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ پھر چپ سا ہو گیا۔

میں مارتھا ایوانز کے متعلق سوچنے لگی۔

''تو آخر مجھ میں اور مارتھا ایوانز میں ایسی کیسی مشابہت تھی۔'' میں نے استعجاب سے سوال کیا۔

''جواہر اتنی مشابہت کہ تم اور وہ الگ الگ دیکھنے پر جڑواں لگتیں مگر ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تو آنکھوں کی رنگت سے Differentiate کر لیا جاتا اور دوسرے اس کے گالوں میں مسکراتے وقت ڈمپل نہیں پڑتے تھے۔''

مجھے حیرانی تھی۔ اس نے مارتھا ایوانز کو اتنا نوٹ کیا تھا۔

''وہ اچھی لگتی تھی یا میں اچھی لگتی ہوں۔'' میں نے دھیمے سے لہجے میں جاننا چاہا۔

''وہ تم سے ملتی ہوئی ضرور تھی مگر اچھی تم لگتی ہو۔ کیونکہ تم......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں منتظر نگاہوں سے اسے دیکھے گئی اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''وہ اصل میں میرے بارے میں تھوڑا غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی اور میری بدقسمتی یہ تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔''

یہ سن کر ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے مارتھا ایوانز سے حسد ہونے لگا۔ یہ جان کر کہ میرے سوا کوئی اور بھی افنان کو چاہ سکتا ہے اور کہیں افنان بھی تو اسے...... یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔

''تم بھی اس سے محبت کرنے لگے تھے۔'' خود پر بڑا ضبط کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں۔'' وہ تیزی سے بولا۔ ''مجھے اس سے کبھی محبت نہیں تھی میں تو اس سے بے حد نفرت کرتا تھا۔ اس سے دور بھاگتا تھا۔ زہر لگتی تھی وہ مجھے اور میں آج تمہارے سامنے افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میرا اس کے ساتھ سلوک واقعی اچھا نہیں تھا۔ میں اب بھی کبھی خود کو Guilty محسوس کرتا ہوں مگر جب اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ کوئی سمجھ نہیں سکتا ان دنوں میں کن مشکلات سے دوچار تھا میں' بہت برے تھے وہ دن' مارتھا ایوانز میرے پیچھے تھی اور میں بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑا کر یہاں آ پایا تھا۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرتی رہیں۔

''وہ...... وہ...... بہت چاہتی تھی تم کو......؟'' آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اٹک اٹک کر میں نے پوچھا۔

وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ ''چاہتی ہو گی وہ مجھ کو۔'' نہایت لاپروائی سے اس نے کہا۔

"مگر میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ کو تم سے زیادہ نہیں چاہتی ہو گی۔ چاہ ہی نہیں سکتی۔"

میری آنکھوں میں پانی ٹھہر سا گیا۔ کافی دیر تک تو میں کچھ بھی بولنے کے قابل بھی نہیں ہو سکی۔

"I.....I....am....honoured" میں نے نم آنکھوں کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"No I am the one that`s honoured"

اس نے فوراً کہا۔ "میری تم سے شادی ہو گئی۔ ہاں بس پہلی رات کو تم کو دیکھ کر مجھے ہر قسم کا شاک لگا تھا۔"

"وہ تو خیر مجھے بھی لگا تھا۔" میں نے اب کی بار قدرے سکون سے کہا۔

"اور شادی کے تیسرے دن تم بے خبر سوئی ہوئی مجھے اتنی اچھی لگیں کہ میں بے اختیار تمہاری طرف بڑھا تھا مگر عین وقت پر مجھے کیا کیا کچھ یاد نہیں آ گیا تھا۔" اور مجھے سمجھ میں آیا کہ اس دن اس کا رویہ اس قدر ایبنارمل کیوں تھا۔ "اف...... میں ڈر گیا تھا جواہر! میں بہت بری طرح سے ڈر گیا تھا۔" وہ بچوں کی طرح سے کرسی کی پشت سے ٹکائے آنکھیں بند کئے مجھے بتا رہا تھا اور میں ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "اس اگلے دن تمہارے ماما سے میرا ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا اس سے پہلے بھی ویسے والی رات میرا ان سے جھگڑا ہو چکا تھا مگر اس بار میں تم کو طلاق دینے کا ان سے کہہ کر آیا تھا۔"

یہ بات سن کر مجھے ایک اور دھکا لگا تھا۔ میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔"

"میں تو پیپرز تک بنوا چکا تھا بس ابو کی بیماری کی وجہ سے میرا ارادہ التواء میں پڑ گیا۔" اس کی بند آنکھوں کے کونوں سے گرتے آنسوؤں کو میں نے بے بسی سے دیکھا۔ مجھے بھی رونا آ رہا تھا۔ رونا آئے جا رہا تھا...... خوف کے مارے...... ڈر کے مارے اور...... اور تشکر کے مارے بھی......

"میں تم کو اور کیا بتاؤں جواہر اور تم سے کیا چھپا لوں۔" وہ آنکھیں بند کئے ہی مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "کہنے کو تو یہ صرف۔ ایک رات کی بات ہے مگر میں جانتا ہوں۔ تم جانتی ہو۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ رات تیرہ سال چار ماہ پر محیط تھی۔ اس کے Consequences عظیم تھے اور بھگتنے والے تم تھیں۔ میں .....

دونوں تھے۔ شاید تم نے زیادہ Suffer کیا ہو...... شاید میں نے زیادہ Suffer کیا ہو...... کچھ کہا نہیں جا سکتا کس نے کتنا Suffer کیا مگر بہرحال ہم دونوں Suffer کرتے رہے تھے۔" اس نے جیسے سسکی لے کر کہا اور میں بے چین ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے اٹھی۔

"ٹھہرو میں پانی لاتی ہوں۔" تیزی سے کہہ کر میں جانے لگی اور اسی سرعت سے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں تم کہیں مت جاؤ۔" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آج مجھے کچھ نہیں چاہئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔ آج ابھی اس وقت بس تم چاہئے ہو۔" میں الرٹ ہو کر خاموشی سے دوبارہ بیٹھ گئی اس نے میرا ہاتھ ہونٹوں سے لگایا اس کی آنکھوں سے گرنے والے شفاف پانی کے قطروں کو خاصی بے بسی سے میں نے دیکھا۔

"افنان یہ بہت قیمتی ہیں۔"

اس نے ہولے سے مسکرانے کی کوشش کی۔ "مجھ سے پوچھو یہ کتنے بے مایہ ہیں۔" خاموشی کا لمبا وقفہ ہمارے درمیان آ گیا۔ میں بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتی رہی۔

"جواہر ایک دن تم نے مجھ سے پوچھا تھا ناں کہ ہمارے درمیان Attractive force کیوں نہیں ہے۔" خاصی دیر بعد سر جھکائے جھکائے ہی اس نے کہا۔ "میں تمہیں بتاؤں کیوں نہیں ہے۔ کیونکہ تم زمین نہیں ہو جواہر اور نہ میں تم پر گرنے والا سیب ہوں۔ تم میگنٹ نہیں ہو اور نہ میں لوہے کا ٹکڑا ہوں۔ نیچے گرنے والے سیب کا مقدر صرف پیٹ ہوتا ہے اور لوہے کے ٹکڑے کا مقدر صرف آگ ہوتی ہے۔ میں سیب نہیں ہونا چاہتا' جواہر اور نہ میں لوہے کا ٹکڑا ہونا چاہتا ہوں۔ میں...... میں...... تو جواہر' تمہارا لباس ہونا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میرا لباس ہو جاؤ۔ لباس جو زیب و زینت کا ذریعہ بھی ہے لباس جو موسم کے سرد و گرم سے بھی بچاتا ہے لباس جو ستر پوشی بھی کرتا ہے۔ لباس عیب بھی چھپاتا ہے اور لباس کسی کی حیثیت بھی بتاتا ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر ایک دم مجھے دیکھا میں جو اسے ہی دیکھ رہی تھی زیادہ دیر اسے دیکھ نہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی روشنی تھی۔ میں نے بے اختیار نگاہ جھکا لی۔

"جواہر۔" کچھ دیر بعد اس نے پکارا۔ "دنیا میں سو ہزار لوگوں نے سو ہزار لوگوں سے سو ہزار مرتبہ یہ بات کہی ہو گی مگر میں آج تم سے پہلی مرتبہ کہہ رہا ہوں۔" وہ ایک بار

پھر رک گیا اور میری سانس بھی رک گئی۔ جسم کا رواں رواں کان بن گیا۔ وہ سر جھکائے میرے ہاتھ کی انگلیوں سے کھیل رہا تھا۔ مجھ سے اب اس کی خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی چپ سے مجھے بے حد الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے ایک دم میرا ہاتھ چھوڑ کر سر اٹھایا۔ ''جواہر میں بہت بہت چاہتا ہوں تم کو۔''

''اف......'' میرے دل میں ایک دم ٹھنڈک پڑ گئی۔

''جواہر میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' اس نے بہت بے صبری سے کہا اور میرے اندر ڈھیروں سکون اتر آیا۔ ''میری خوش قسمتی کی کوئی حد نہیں ہے کہ تم میرا نصیب ہو۔ جواہر میری بدقسمتی کی کوئی حد نہ ہوتی اگر تم میرا نصیب نہ ہوتیں۔ اس شخص کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے تمہیں میرے لئے چھوڑ دیا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے تم کو کبھی نہیں مانگا تھا۔ تم مجھے بن مانگے ملی ہو۔ مگر یہ اس کا احسان ہے جو اس نے تم کو مجھے دیا ہے۔ تم...... تم جواہر تم بہت اچھی ہو مجھے بے غرض ہو کر چاہتی ہو۔

مگر...... میری ہر حالت میں تم سے غرض وابستہ ہے۔ تم مجھے یہاں وہاں دونوں جہانوں کے لیے چاہیے ہو۔ جواہر...... میں جانتا ہوں' میرا خدا جانتا ہے۔ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھیں اور تم ہی آخری رہو گی۔ مارتھا ایوانز کا بھی یہ قصہ تھا کہ وہ تم سے ملتی ہوئی تھی۔ ورنہ تمہارے سوا کسی دوسری عورت کو نہ میں نے کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی آئندہ دیکھنا پسند کروں گا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جواہر میں صرف تمہارے لئے بنا تھا اور تمہارے لئے ہی بنا ہوں۔ مجھ پر صرف تمہارا حق ہے۔ میں سر سے لے کر پیر تک تمہارا ہوں۔ اگر میری سانس اللہ تعالیٰ کی امانت نہ ہوتی تو میں تم سے کہتا' میری ہر سانس تمہاری ہے۔ اگر میری زندگی موت کی امانت نہ ہوتی' تو میں تم سے کہتا میری زندگی بھی تمہاری ہے۔''

''بس کرو' افنان۔'' میں نے سسکی لے کر کہا۔ ''خدارا چپ ہو جاؤ۔''

''میں تم جیسا فرمانبردار نہیں ہوں جواہر کہ جس بات کو میں منع کر دوں' تم اس سے رک جاؤ۔ مجھے تو آج وہ سب کچھ تم سے کہہ دینا ہے جو میں اب تک کہہ نہ پایا مگر مجھے آج الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ جن سے میں اپنے جذبات کو بیان کر سکوں۔ کاش

"Feelings could talk them selvcs"

''افنان۔'' میں نے سسکیاں روکنے کی کوشش کی۔ ''یہ...... یہ...... بہت ہے۔

سب تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اتنا تو میں نے مانگا بھی نہیں تھا۔''

''اور مانگا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ سب بن مانگے ملا ہے۔'' اس نے اعتراف کرنے والے لہجے میں کہا۔

''سوچتی ہوں شکر ادا کیسے کر پاؤں گی۔''

''میں تو کر بھی نہیں پاؤں گا۔''

''کوشش تو کر سکتے ہو۔''

''تو چلو مل کر کوشش کر لیتے ہیں۔'' اس نے ایک دم کہا۔ ''ہم عمرہ کریں گے۔'' میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اگلے پندرہ دن کے اندر ہم وہاں جا رہے ہیں۔''

''اتنے سے دن میں کیا یہ ممکن ہے؟'' بے یقینی سے میں نے پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ آہستگی سے مسکرایا۔ ''ٹاپ سعودی گورنمنٹ آفیشلز سے میرے تعلقات ہیں اور پندرہ دن تو میں نے زیادہ کہہ دیئے ہیں۔ انشاء اللہ ہفتے بھر کے اندر میں چاہتا ہوں کہ ہم حرم میں ہوں۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

میں بے اختیار مسکرائی' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری نیت یوں بھی پوری ہو گی۔

''اتنی جلدی افنان۔'' میں نے سرسری ہو کر کہا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ذرا ابو کو بتا دوں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا تفریح کے لئے کہاں جا رہے ہیں۔''

میں اس کے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا پھر کچھ سوچ کر ایک دم پلٹا۔ ''اور جب میں واپس آؤں تو تم مجھ کو تیار ملو۔''

''اچھا۔'' میں نے مزید کوئی سوال کئے بغیر کہا۔

''تم پوچھو گی نہیں' کیوں؟''

''نہیں۔''

وہ ایک دم مسکرایا۔ ''چلو میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ابو امی کے یہاں جانا چاہتی ہو لیکن ایک شرط ہو گی۔'' اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے مسکراتے لب ایک دم بھینچ گئے۔ سوالیہ نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ ''تم وہی ساڑھی پہنو گی جو اس دن پہنی تھی۔''

''اچھا۔'' میری مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

''مگر اب کی بار استری کر کے' پچھلی بار بغیر استری کئے پہن لی تھی۔'' اس نے مجھے

یاد دلایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس میں ذرا دیر لگے گی اور ابھی اذان ہونے والی ہوگی۔"

"ہاں...... ہاں...... تم اطمینان سے فارغ ہو جاؤ۔" اس نے فوراً کہا۔ "مجھے بھی کچھ دیر لگے گی۔"

وہ باہر چلا گیا اور میں اس کے پیچھے کوئی 'کیوں' 'کیا' 'کب' 'کیسے' سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ...... اتنی اچانک...... تبدیلی...... اور...... وجہ......؟

اذانیں ہو رہی تھیں اور سوائے پانی کے ایک گلاس کے میرے حلق سے کچھ اور اتر نہیں سکا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ افنان نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوا۔ دیگر کاموں سے فراغت کے بعد میں تیار ہونے کمرے میں چلی آئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بہت دل لگا کے میں نے تیاری کی اور آج کے دن میری ساری تیاری خالصتاً افنان عادل کے لیے تھی جب میں نے حتمی طور سے تیار ہو کر آئینہ دیکھا تو مجھے خود سے حجاب آنے لگا۔ افنان عادل اندر آیا تو مجھے دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ مجھے اس سے بے تحاشا حجاب آ رہا تھا۔

"یار آج تو تم ضبط آزمانے پر تلی ہو۔" خاصی دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکا۔ "دل چاہتا ہے——" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر مسکرایا۔ "دل کے کہنے پر چلنے لگا تو بہت کچھ رہ جائے گا۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ چوری چوری مجھے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ بے اختیار آنے والی مسکراہٹ کو میں نے رخ موڑ کر گاؤن پہننے کے بہانے چھپایا۔ اسکارف لپیٹا اور جب افنان عادل کولون لگا کر میری طرف پلٹا تو سارا کمرہ مہک گیا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر یہ مہک اپنے اندر اتاری۔ واقعی افنان عادل پاگل کر دینے والی خوشبو لگاتا تھا۔

ہم کمرے سے باہر نکلنے لگے تو وہ ایک دم پلٹا اور مجھے دیکھا۔

"جواہر میں اور تم ساتھ چلنے کے لئے بنے ہیں۔ آگے پیچھے چلنے کے لئے نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔" میں اس کے ساتھ ہو لی ابو اور امی کے کمرے میں پہنچنے پر افنان دونوں کے آگے جھکا اور میں بھی۔

"اچھا بھئی اللہ حافظ۔" ابو نے خوش دلی سے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"واپسی کے کب تک ارادے ہیں؟" امی نے پوچھا۔

ابو نے خشمگیں نگاہوں سے انہیں دیکھا اور بولے۔ "جلدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے جاؤ' آرام سے آنا۔"

"دیر ہونے کی صورت میں فون کر دیں گے۔" افنان نے کہا۔ امی نے سر ہلایا۔

میں اور وہ ساتھ ساتھ چلتے پورچ تک آئے۔ میں نے افنان عادل کی اس اکلوتی کھڑی گاڑی کو حیرت سے دیکھا۔ "افنان دوسری گاڑی تمہاری نظر نہیں آ رہی؟"

"اس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا ہے۔"

"کیسا حادثہ؟"

جواباً اس نے حادثے کی تفصیل بتائی اور اسی وقت مجھے صبح دیکھا جانے والا خواب یاد آ گیا۔

خواب سچے بھی ہوا کرتے ہیں......؟

"خدانخواستہ تم کو کچھ ہو جاتا تو......" میں نے فکر مندی سے کہا۔

وہ ایک دم مسکرایا۔ "مجھے...... کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ تم ڈرنا چھوڑ دو۔ فکر کرنا چھوڑ دو......"

"تمہیں افسوس نہیں ہے اس Loss کا......"

"تھوڑا بہت تو ہے۔ مگر میری سب سے قیمتی چیز میرے پاس ہے۔" اس نے تھ سے قریب ہو کر میرے کندھے پر ہاتھ اٹھایا۔ اس لیے زیادہ افسوس نہیں ہے۔ یوں بھی گاڑی تو مجھے ویسے بھی ملتی ہی...... اب دو مل جائیں گی ان شاء اللہ......"

"اچھا......" میں مسکرائی۔ "یہ تو بہت اچھا Compensaion ہے۔"

ویسے ایک بات بتاؤ۔ ہے تو عجیب مگر سچ ہے۔ تم سے میری بات طے ہوتے ہی سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں حکومت نے خاطر خواہ اضافہ کیا تھا...... "تم میرے لیے Lucky ہو۔ اس بات کو میں تسلیم کرتا ہوں۔"

"بچو...... چچی۔" فاران اندر ہی اندر چلایا۔ افنان نے ایک دم میرے کندھے پر سے ہاتھ ہٹایا اور مجھ سے تھوڑے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کی یہ احتیاط اچھی لگی۔ فاران تیز قدموں سے چلتا قریب آیا۔ اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا...... "چچی۔" وہ جوش میں آ کر چیخا۔ "آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔"

میں نے جھینپ کر ٹھوڑی تک آتا اسکارف قدرے اونچا کر لیا۔ افنان نے ایک دم فاران کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بیٹے! چچی تمہارے لیے اچھی نہیں لگ رہیں۔"

''افوہ چچو...... ہاتھ ہٹائیں۔'' اس نے افنان کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا۔ ''مجھے چچی کو دیکھنے دیں۔''

''کیا خاص بات نظر آ رہی ہے آج چچی میں فاران۔'' میں جھینپ کر پوچھا۔

''آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ ہمیشہ اسی طرح رہا کریں ناں۔''

فاران نے معصومیت سے کہا۔

''آہم فرمائش نوٹ کر لی جائے۔'' افنان نے مسکرا کر کہا۔ میں نے سر ہلایا۔

''آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں جا تو رہے ہیں۔'' افنان نے سر ہلایا۔

''اوہو مجھے تو چچی سے کچھ پوچھنا تھا۔'' اس نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''کیا پوچھنا تھا؟''

''چلیں چھوڑیں آپ کو دیر ہو جائے گی۔''

''بالکل دیر نہیں ہو گی۔ کورس کا کچھ پوچھنا ہے؟''

''نہیں کورس سے ہٹ کر ہے۔ اچھا چلیں آپ ہی سے پوچھ لیتا ہوں۔''

''پوچھو۔'' افنان نے فراخ دلی سے کہا۔

''چاچو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوگ ہم سے کھو جاتے ہیں اور پھر ہمیں مل بھی جاتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ بھی ہمیں مل جاتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں پھر کبھی ملیں گے۔'' افنان مجھے دیکھنے لگا۔

''یہ سوال کیسے آیا تمہارے ذہن میں۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''پرسوں جب ہم لوگ فن لینڈ گئے تھے ناں تو مجھے میرا وہ کلاس فیلو ملا جو فقتھ کلاس میں میرے ساتھ تھا اور جو اپنی فیملی کے ساتھ یو کے شفٹ ہو گیا تھا اور اس دن میں سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک مجھے مل جائے گا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے چاچو۔''

''اس لئے بیٹے کہ زمین گول ہے۔'' افنان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چاچو زمین بھی گول ہے۔ سورج بھی گول ہے' چاند بھی گول ہے' کائنات کی ہر چیز گول ہی کیوں ہے کوئی دوسری Shape بھی تو ہو سکتی تھی۔''

''اس لئے کہ گول چیزوں پر توازن زیادہ اچھی طرح سے قائم رہ سکتا ہے۔''

فاران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''بس یہی پوچھنا تھا۔'' افنان نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''ابھی بس اتنا ہی پوچھنا تھا۔'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''تو اجازت ہے؟''

''اللہ حافظ۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور اندر جانے کے لئے مڑ گیا۔

افنان نے فرنٹ ڈور کا دروازہ میرے لئے کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے سبک خرامی سے روڈ پر لے آیا۔ راستے میں بیشتر دکانیں بند تھیں۔ ایک کھلی ہوئی بیکری سے اس نے کیک پیک کروا لیا۔ گھر پہنچنے پر ثاقب نے دروازہ کھولا۔ ''آپی!''...... حیرت بھرے انداز میں وہ چیخا۔

''اوہ۔'' کہہ کر جلدی سے ایک طرف ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دیا۔

''امی ابو دیکھیں آپی اور افنان بھائی آئے ہیں۔''

ابو امی اور عاقب بھی ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ افنان اس بار بڑی ملنساری سے میرے گھر والوں سے ملا۔

''امی آج کھانا ادھر ہی کھاؤں گا۔'' اس نے بے تکلفی سے اعلان کیا تھا۔

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ چاہے کچھ ہو جائے افنان عادل رات کا کھانا ہمیشہ اپنے گھر ہی میں کھاتا تھا مگر آج......

''کیوں نہیں بیٹا۔'' ابو شفقت سے مسکرائے۔ ''تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔''

''ویسے بھی کھانے کا ہی وقت ہے۔'' امی کہتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔ میں ان کے پیچھے جانے لگی تو عاقب نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ ''اتنے دن بعد تو آئی ہیں آپی۔ سچ ملنے کو اتنا دل چاہ رہا تھا۔''

''لیکن امی سب اکیلی کیسے کریں گی۔''

''کر لیں گی انہیں عادت ہے۔'' ثاقب نے لاپروائی سے کہا۔ ''ویسے بھی ابھی اذان ہونے والی ہے ہم چلے جائیں تو آپ بھی کچن میں چلی جایئے گا۔''

میں نیم رضامندی بیٹھ گئی۔ پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد میں کچن میں چلی آئی۔ ظاہر ہے کرنے کے لئے بہت سارا کام تھا اور امی اکیلی تھیں۔ میں امی کے ساتھ مدد کروانے لگی۔ کام کے دوران امی مجھ سے افنان اور اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ میں ان کو ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیتی رہی۔ ڈرائنگ روم سے آنے والی آوازوں نے بتایا کہ وہ لوگ واپس آ چکے ہیں۔ پھر یکا یک تیز ہونے والی آوازیں سن کر امی تو گھبرا کر ماجرا دیکھنے باہر نکل گئیں۔ میں البتہ کچن کے دروازے میں آن

کھڑی ہوئی۔ یہاں سے ڈرائنگ روم کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ وہ لوگ اسکریبل کھیل رہے تھے اور اس وقت ثاقب اور افنان میں تکرار ہو رہی تھی۔ ''افنان بھائی یہ آپ نے کیا ورڈ بنایا ہے۔'' ثاقب نے اعتراض کیا۔ ''میں نے تو آج تک نہیں سنا۔''

''ارے تم نے نہیں سنا؟'' افنان نے حیرت ظاہر کی۔ ''اتنا عام سا تو لفظ ہے۔''

میں سر جھٹک کر مسکرائی اور ایک بار پھر کچن میں چلی آئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد بے تحاشہ قہقہوں نے مجھے ایک بار پھر کچن کے دروازے میں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ابو اٹھ کر کسی کام سے اندر گئے تھے اور عاقب' ثاقب پاگلوں کی طرح ہنس رہے تھے۔

اور......اور......ہنس تو افنان عادل بھی رہا تھا۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر یہ منظر دیکھا تھا۔ ان چار مہینوں میں پہلی مرتبہ میں نے افنان عادل کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ میری حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

''اف افنان بھائی۔'' ثاقب ہنسی روکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ نیچر وائز اتنے اچھے ہوں گے۔ آپ سے تین مرتبہ ملنا ہوا۔ ویسے والے دن اور جس دن آپ ہمارے گھر آئے تھے اور تیسرا اسپتال میں، آپ اتنے ریزرو تھے کہ میں تو آپی پر افسوس کرتا ہوا واپس آیا تھا کہ اتنے بد دماغ اور بد مزاج آدمی کے ساتھ آپی گزارہ کیسے کر رہی ہیں۔''

ثاقب اتنا منہ پھٹ تھا کہ جو منہ میں آتا تھا کہتا چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے نہایت شرمندگی ہوئی۔ افنان کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''ثاقب۔'' میں نے زوردار آواز میں تنبیہ کی۔ ''اتنی بکواس کیوں کرتے ہو؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

افنان سے ہنسی روکے نہیں رک رہی تھی۔ ''کہنے دو' کہنے دو۔'' بالآخر ہنسی پر کنٹرول کر کے اس نے کہا۔ ''ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ میں کتنا بد مزاج اور بد دماغ ہوں۔'' پھر وہ ثاقب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ہاں...... ہاں تم نے بتایا نہیں ثاقب۔''

اب کی بار ثاقب شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔ ''سوری افنان بھائی' مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔''

''چلو جانے دو میں نے برا نہیں منایا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''آپ...... آپ...... آپی کو کچھ کہیں گے تو نہیں یہاں سے جانے کے بعد؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

افنان ایک دم مسکرایا۔ ''تمہیں یہ پوچھنے کا خیال کیوں آیا؟''

''نہیں وہ ہوتے ہیں ناں کچھ چھوٹی ذہنیت کے مرد حضرات' اپنی بیوی کے خاندان والوں کا غبار بیوی پر نکالتے ہیں۔'' ثاقب نے معصومیت سے کہا۔

افنان پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں مبہوت ہو کر اسے تکے گئی۔ کتنا شاندار لگتا ہے افنان عادل ہنستا ہوا......

اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''تو میں کیا چھوٹی ذہنیت کا مرد بھی لگتا ہوں تم کو؟''

''یہ آپ کی Assumption ہے افنان بھائی۔ قسم لے لیں جو میں نے آپ کو کچھ کہا ہو۔'' ثاقب کے لہجے میں شرارت تھی۔

افنان عادل ایک بار پھر ہنسا۔ ''یار جواہر مان گیا۔ یہ تمہارا بھائی بڑا Diplomat ہے۔''

ابھی میں کوئی جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ امی نے آواز دی۔ ''الماس' عاقب' ثاقب سے کہو۔ باتیں بہت ہو چکیں اٹھ کر ٹیبل سیٹ کریں۔''

''عاقب سن لیا ناں تم نے امی نے کیا کہا۔'' ثاقب اٹھتا ہوا بولا۔ ''اٹھ جاؤ۔'' میں بھی باقی ماندہ کام نمٹانے کچن میں آ گئی۔

''یار تم لوگ تو بڑے اچھے Table setter ہو۔'' افنان نے تعریفی انداز میں کہا۔

''کیا کریں افنان بھائی۔'' ثاقب نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''اکلوتی بہن تو آپ کے یہاں دے دی۔ اب ان کاموں کے لئے۔ ہم ہی بچ گئے ہیں مہارت تو آنی ہی ہے۔''

بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ افنان ایک بار پھر ابو اور دونوں بھائیوں کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔ میں نماز پڑھنے چلی آئی، میری کمٹمنٹ تو کب کی پوری ہو گئی تھی۔ میرے فارغ ہوتے ہی افنان نے چلنے کے لئے کہہ دیا۔ امی نے چلتے وقت کھانا ساتھ بھی کر دیا تھا۔

''یار یہ تو ہٹا دو۔'' افنان نے راستے میں میرے نقاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس اندھیرے میں میرے سوا کون دیکھے گا تم کو۔''

میں نے جھینپ کر نقاب ہٹا دیا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ''آج واقعی مزا آیا۔ ہمارے دونوں سالے صاحبان کی کمپنی خوب رہی۔ عاقب جتنا چپ رہتا ہے۔ ثاقب اسی قدر بولتا ہے۔''

''یہ شروع سے ہی ایسا ہے۔ نیچر وائز بھی دونوں بالکل مختلف ہیں۔''

راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا مگر میں نے محسوس کیا یہ گھر کا راستہ تو نہیں تھا۔

''ہم گھر نہیں جا رہے افنان۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم لانگ ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔''

''رات بہت ہو چکی ہے۔''

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں تم ساتھ ہو تو ڈر کیسا۔ میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ شہر کے حالات......''

''شہر کے حالات آج صبح سے برے اور کیا ہوں گے؟''

میں خاموش ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

''دیکھو میں ڈرائیونگ تیز سے کر رہا ہوں ناں...... تم نے صبح مجھ سے کہا تھا۔'' افنان عادل نے بڑی سعادت بندی سے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''وہ تو مجھے نظر آ ہی رہا ہے۔''

کچھ دیر سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑانے کے بعد اس نے ساحل سمندر پر جانے والی شاہراہ پر گاڑی موڑ لی۔ ساحل اس وقت بڑا روشن نظر آ رہا تھا۔ ہم ٹہلتے ہوئے ساحل کی طرف آ گئے۔ کچھ دیر یونہی ٹہلنے کے بعد میں گیلی ریت پر ہی بیٹھ گئی۔ نیند سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ میرے برابر ہی آ بیٹھا۔

''نیند آ رہی ہے۔'' اس نے میری نیند سے بوجھل پلکوں کو دیکھ کر کہا۔

''آ تو رہی ہے۔''

''ابھی غائب ہو جائے گی۔'' وہ مسکرایا۔ ''مجھے پکڑ کے دکھاؤ۔''

میں بھی جواباً مسکرائی۔ ''میں تو تم کو پکڑ ہی لیتی ہوں۔'' میرا لہجہ ذو معنی تھا۔ ''اب کی بار تم مجھے پکڑ کے دکھاؤ۔''

''یہ بات ہے۔'' وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''تو چلو تم آگے میں پیچھے۔'' اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''اگر تم نہیں پکڑ سکے تو مجھے کیا دو گے؟''

''اس کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ اگر میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ تو تم مجھے کیا دو گی۔''

''میں تمہیں۔'' میں سوچنے لگی۔ ''دینے کے لئے اچھی چیز کیا ہو سکتی ہے......''

''یہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم مجھ کو کیا دو گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں۔'' میں نے ساڑھی کا آنچل سمیٹا اور گیلی ریت پر دوڑتی چلی گئی۔ ابھی تھوڑی دور گئی ہوں گی کہ میں نے افنان عادل کی آواز سنی۔

''اب رک بھی جاؤ یار۔ تم نے تو مجھے تھکا دیا۔'' میں نے ایک دم رک کر گردن گھما کر دیکھا اور افنان عادل نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا۔

''افنان۔'' میں زور سے چیخی اور لہروں کے شور میں میری آواز دب کر رہ گئی۔ ''یہ فاؤل ہے۔''

''کوئی نہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''میں نے تو صرف تم سے رکنے کو کہا تھا۔''

''مجھے اگر پتا ہوتا......'' میری بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک پیچھے ہٹتی ہوئی لہر نے پیروں کے نیچے سے ریت کھسکا دی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ افنان عادل کو پکڑنا چاہا۔ اسے پکڑ نہ سکی۔ خود ہی سنبھل گئی۔ البتہ افنان شڑاپ سے پانی میں جا گرا۔ ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بھی پانی میں کھینچ لیا۔

''افنان۔'' میری چیخ احتجاجی تھی۔ افنان کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

میں محویت سے اسے دیکھتی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے ہنسی روک کر پوچھا۔

''دیکھ رہی ہوں۔ لوگ ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں؟''

''کتنے اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بہت اچھے۔''

''اور لوگ تو ہنسنا بھول ہی گئے ہیں۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔ میں بے اختیار ہنسی۔ وہ محویت سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے میرے گال پر انگلی رکھی۔

''کیا دیکھنا چاہ رہے ہو۔''

''تمہارے گالوں کے ڈمپلز کی گہرائی پتا کرنا چاہتا ہوں۔'' میری مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

''کتنی گہرائی پتا کی۔'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس نے سمندر کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں اس بار کھلکھلا کر ہنسی۔

''اور تم نے بتایا نہیں ابھی تک تم مجھ سے کیا لو گے؟''

''کان قریب لاؤ تو بتاؤں۔'' میں کان اس کے قریب لے گئی۔ جواباً اس نے جو بات مجھ سے کہی تو میں ہونق سی ہو کر اسے دیکھے گئی۔

''افنان تین اور چار سات فی الحال اور تین اور چار سات بعد میں...... یعنی چودہ...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''فکر ہی مت کرو۔ پوری ٹیم تیار کریں گے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''ٹیم بھی گیارہ ممبرز کی ہوتی ہے۔''

''دو تین ایکسٹراز بھی تو ہونے چاہئے۔'' اس کے اطمینان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

''افنان واقعی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس نے پھر ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا لیا۔

''جواہر۔'' افنان نے دھیمے سے پکارا۔ ''یہ میری زندگی کی خوب صورت ترین رات ہے۔''

''میری بھی......''

''میں نے اپنی زندگی کی کوئی بھی رات بھی اتنی اچھی نہیں گزاری۔''

''میں نے بھی......''

''میری دعا ہے کہ میری زندگی کی ہر رات ایسی ہی گزرے۔''

''سمندر کے کنارے۔'' میں مسکرائی۔

''خواہ دنیا کے کسی کنارے۔''

اسی وقت ہم دونوں تیز روشنیوں میں نہا گئے۔ غالباً پولیس کی کسی گشتی گاڑی کا گزر ہوا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں پر؟'' گرج دار آواز سن کر میں سہم سی گئی۔

افنان نے آواز کی سمت دیکھا۔ ''جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہی ہو رہا ہے۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''دیکھ تو ہم بہت کچھ رہے ہیں' بیٹے۔'' دوسری آواز نے طنز سے کہا۔

فلیش لائٹ بدستور چہروں پر پڑ رہی تھی۔ مجھ سے آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہی تھیں۔ اس کے باوجود بھی میں وردی میں ملبوس دو اشخاص کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''چلو تم دونوں ہمارے صاحب بلا رہے ہیں۔''

''چلئے۔'' افنان کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے ڈر کر افنان کو پکڑ لیا۔ افنان نے تسلی دینے والے انداز میں میرا ہاتھ تھپتھپایا۔ ہم دونوں ان لوگوں کے ساتھ گشتی گاڑی تک پہنچے۔

''سر جی لیجئے' دونوں حاضر ہیں۔'' ان میں سے ایک نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے آفیسر

سے کہا۔

''کون ہو تم لوگ اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو۔'' کڑک لہجے میں سوال کیا گیا۔

''میں ان کا شوہر ہوں اور یہ میری بیوی ہیں۔'' افنان نے رعب میں آئے بغیر کہا۔

اس نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا۔ ''ثبوت؟''

''ثبوت ہے میرے پاس۔ گاڑی میں ساتھ چلیے تو دوں۔''

''یہ جو سفید رنگ کی گرین نمبر پلیٹ والی گاڑی ہے تمہاری ہے؟'' آفیسر نے پوچھا۔

''بالکل جناب۔'' افنان نے اس کو اپنا محکمہ اور اپنا عہدہ بھی بتایا۔

آفیسر رعب میں آ گیا بڑی شرافت سے اتر کر گاڑی تک ساتھ آیا۔ افنان نے Glove Compartment سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھایا جو نکاح نامے کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا اور ساتھ ہی اپنا ایمپلائمنٹ کارڈ بھی دکھایا۔ ایمپلائمنٹ کارڈ تو خیر اس کے پاس ہونا ہی چاہئے تھا مگر نکاح نامے کی افنان کے پاس موجودگی پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ آفیسر نے سرسری سی ایک نظر دونوں چیزوں کو دیکھا پھر افنان کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجئے گا جناب' ہم اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہیں۔'' آفیسر نے بڑی شائستگی سے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں جناب پوری کیجئے ڈیوٹی۔''

''تکلیف دہی کے لئے معافی چاہتا ہوں جناب۔''

''کوئی بات نہیں۔'' افنان نے خندہ پیشانی سے کہا۔

آفیسر کے اور پھر پولیس کی گشتی گاڑی چلے جانے کے بعد میں نے شکر کی سانس لی۔ افنان نے میری طرف دیکھا۔ ''کیسی عجیب بات ہے ناں' جب تم میں مجھ میں کوئی رشتہ نہیں تھا اور ہم ساتھ ہوتے تھے۔ تب تو دنیا نے کبھی ہم سے ہماری حیثیت کا ثبوت نہیں مانگا اور اب جبکہ ہم دونوں میں ہر قسم کا رشتہ ہے تو دنیا کو ثبوت دینا پڑتا ہے۔''

''اور یہ ثبوت تمہاری گاڑی میں کیا کر رہا ہے؟''

''یہ......'' وہ مسکرایا۔ ''اس دن جب پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ یہاں آیا تھا تو چلتے وقت میں نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔'' اس نے آرام سے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد رسٹ واچ دیکھی۔ ''اوہو اتنا وقت گزر گیا۔''

میں نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ ''واقعی پتہ بھی نہیں چلا۔''

''سحری کا وقت تو ہو گیا ہو گا۔''

میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ سحری کا خیال اسے کیسے آ گیا۔ ''ہاں۔'' میں نے الجھن سے کہا۔ ''ہو تو گیا ہے' تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تم روزہ نہیں رکھو گی۔'' وہ مسکرا کر پوچھنے لگا۔

''ہاں...... نہیں......'' میری فوری سے سمجھ میں نہ آ سکا کہ کیا جواب دوں۔ نیت تو بہرحال میری تھی۔

''بھئی کمٹمنٹ تو پوری کرنی چاہئے ناں۔'' افنان عادل کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

میں اس بار حیرانی کے مارے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ ''تت...... تم...... کو کیسے پتا چلا۔''

وہ ہنسا۔ ''بس...... یہ میرا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ ہے۔ پھر بھی اگر تم پوچھتی ہو تو تم کو بتا دیتا ہوں۔'' اس نے میرے جملے مجھ ہی کو لوٹا دیے تھے۔

''نہیں مجھے کچھ مت بتاؤ۔'' میں ایک دم مسکرائی۔

''شاید تمہاری امی نے کھانا بھی اسی وقت کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ اب چلو تم کو روزہ تو رکھوا دوں۔ مجھے بھی تو تمہارا ساتھ دینا ہے۔''

مجھے افنان عادل پر بے تحاشہ پیار آیا' کتنا خیال تھا۔ اسے میری کمٹمنٹ کا...... میں نے تو یہی سوچ کر اس سے کچھ نہیں کہا تھا کہ آج تو یہ ممکن نہیں ہو سکے گا اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''چلو تمہارے ماما کی بنائی ہوئی مسجد میں ہی چلتے ہیں۔ امید ہے کھلی ہوئی ہوگی۔''

مسجد اس وقت کھلی ہوئی ہی تھی۔ مسجد کے احاطے میں ہی نہایت بے سروسامانی کے عالم میں سحری کی گئی مگر بہت مزا آیا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' افنان عادل جو مسجد کی بیرونی عمارت کو بغور تک رہا تھا ایک دم بولا۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اس مسجد کی ڈیزائننگ اور کنسٹرکشن بہت خوب صورت ہے۔''

میں نے کوئی کمنٹ دینے سے گریز ہی کیا۔ مجھے پچھلی بار کا اس کا ری ایکشن بہت اچھی طرح سے یاد تھا۔

''آج ماما کی بھانجی کچھ بولے گی نہیں۔'' اس نے شرارت سے پوچھا اور میں ایک بار پھر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ کتنا Unpredictable تھا یہ آدمی...... کب اس

کے دل میں کیا ہوتا تھا۔ مجھے پتا نہیں چل پاتا تھا۔

وہ منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''مم...... میں...... کک...... کیا...... بولوں۔'' میں ہکلانے لگی تھی۔ ''تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔''

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم ایک بار پھر ساحل پر آ گئے۔ بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ کر ساحل تک آنے والی اور پھر پیچھے پلٹ جانے والی لہروں کو دیکھتے رہے۔

''جواہر جانتی ہو لاسٹ ٹائم میں یہاں تمہارے ساتھ آنے سے پہلے کب آیا تھا؟'' افنان عادل نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ میں جواب طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''کئی سال پہلے میں بڑے بھائی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔'' چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''اس دن جس دن میں نے انہیں ساری کہانی سنائی تھی۔ بڑے بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''افنان تم کسی قابل ہو جاؤ پھر مجھے اس لڑکی کا نام پتا بتانا۔ میں خود اس کی شادی تم سے کرواؤں گا۔'' اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ''اور دیکھ لو جس طرح تمہارے ماما نے تمہاری شادی مجھ سے کروائی ہے اسی طرح بڑے بھائی نے میری شادی تم سے کروائی ہے۔ میں تو کبھی شادی نہ کرتا مگر صرف بڑے بھائی کے کہنے پر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی' جیسے الفاظ منتخب کر رہا ہو۔ ''بڑے بھائی کا میری زندگی میں اتنا بڑا Contribution ہے کہ میں ان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ تو اگر مجھ سے یہ بھی کہہ دیتے کہ افنان مر جاؤ تو میں ان سے یہ بھی نہ پوچھتا کہ مرنے کے لئے طریقہ کون سا اختیار کروں بس میں مر جاتا۔''

میں چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''مگر اب جواہر میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ زندگی کے اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنا چاہتا ہوں۔ میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے غم اور بڑی بڑی خوشیاں تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بہت سارے بچے ہوں اور پھر جب میرے بچے ہوں گے تو میں انہیں ان کی غلطیوں پر معاف کر دیا کروں گا۔''

''اتنی بڑی غلطی پر بھی!''

''ہاں۔'' اس نے بلا توقف کہا۔ ''بس میں ان سے صرف ایک بات کہوں گا۔ بیٹے

چاہے تم اچھا کرو یا برا...... اللہ دیکھ رہا ہے۔ تم نے اچھا کیا اس نے دیکھا' تم نے برا کیا اس نے دیکھ لیا ہے۔ میرے والد صاحب کی خفگی بڑی طویل رہی ہے۔ میں اتنے لمبے عرصے تک اپنے بچوں سے خفا نہیں رہوں گا جواہر۔"

"افنان تم ابو کو سمجھ نہیں سکے۔ ابو تم سے کبھی خفا نہیں رہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہاری بہت کیئر کرتے ہیں۔"

"انہوں نے مجھے بتایا تو نہیں۔"

"کچھ باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں۔"

"مگر جتانے والی تو ہوتی ہیں۔"

"افنان' ہمیں جس سے محبت ہوتی ہے ناں اس سے وابستہ ہر چیز ہمیں پیاری ہوتی ہے۔ ابو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

افنان چپ سا ہو گیا۔ میں بھی خاموشی سے مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگی اور زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے طلوع آفتاب کا منظر دیکھا تھا۔ میں مبہوت ہو کر رہ گئی۔

"کیا طلوع آفتاب کا منظر ہمیشہ اتنا حسین ہوتا ہے۔" میں نے سحر زدہ لہجے میں پوچھا۔

افنان عادل نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ "طلوعِ آفتاب کا منظر تو ہمیشہ حسین ہوتا ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔ "مگر اس وقت تمہارے ساتھ اس منظر کی دلکشی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تم کہیں میری ذہنی حالت پر شک تو نہیں کر رہیں؟" وہ ایک دم ہنسا۔

میں وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم سمجھ رہی ہوں گی کہ افنان عادل پاگل ہو گیا ہے۔"

"نہیں میں تو ایسا کچھ نہیں سمجھ رہی۔" میں ایک دم مسکرائی۔

"مگر یہ سچ ہے' افنان عادل' پاگل ہو گیا ہے۔" اس نے اعتراف کرنے والے انداز میں کہا۔ "تمہارے لئے تمہارے پیچھے' تم نے افنان عادل کو پاگل کر دیا ہے۔"

"اور تم' جواہر افنان کو بہت پہلے پاگل کر چکے ہو۔ حساب برابر ہو گیا۔"

اس نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔

"دن بھی ادھر ہی گزارنے کا ارادہ ہے۔" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"گزار لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"آفس جاؤ گے آج؟"

"آفس......" اس نے گھڑی دیکھی۔ "بالکل جاؤں گا' ابھی کچھ دیر میں۔"

پھر ہم مزید کچھ دیر رک کر روانہ ہو گئے۔

"کل سے پہلے میں نے زندگی میں کبھی کوئی رات گھر سے باہر نہیں گزاری۔" راستے میں افنان عادل نے مجھ سے کہا۔ "اور میں نے اپنی زندگی کا کوئی دن اتنا خوب صورت بھی نہیں گزارا۔"

"میں نے بھی......" میں نے دھیمے سے کہا۔

"میں نے زندگی میں اتنا انجوائے کبھی نہیں کیا۔ جتنا ان چند گھنٹوں میں کیا۔ حتیٰ کہ وہاں لندن میں بھی جواہر جب لوگ ویک اینڈ انجوائے کرتے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح سے کام کر رہا ہوتا تھا۔" وہ مسکرایا۔ "میں تو جواہر' انگلینڈ بھی گیا تو لندن دیکھے بغیر واپس آ گیا مگر میرا اب ارادہ ہے کہ میں انشاء اللہ پی ایچ ڈی کرنے انگلینڈ جاؤں گا تو تم میرے ساتھ چلو گی۔ شاید میں نے لندن اکیلے اس لئے نہیں دیکھا کہ مجھے تمہارے ساتھ مل کر دیکھنا تھا۔ اکیلے مجھے مزا نہ آتا اور تمہارے ساتھ مجھے اچھا لگے گا۔"

"تم واقعی مجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے۔"

"ہاں۔"

"تو وہاں مارتھا ایوانز بھی ہو گی۔"

افنان نے لحظے بھر کو خاموشی سے مجھے دیکھا۔ پھر سیدھی صاف سڑک پر نگاہ جما دی۔

"میں ضرور ملنا چاہوں گی اس عورت سے جو حیرت انگیز طور سے مجھ سے اتنی مشابہت رکھتی ہے۔"

"تم صرف یہ دیکھنے کے لئے اس سے ملنا چاہو گی کہ وہ کس حد تک تم سے مشابہت رکھتی ہے؟" افنان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کوئی اور بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں تم مجھے اس سے ملواؤ گے؟"

"نہیں۔" اس نے بلاتوقف کہا۔ "میں قطعی نہیں چاہوں گا کہ تم اس سے ملو اور وجہ میں تم کو نہیں بتاؤں گا۔"

"وجہ میں تم سے پوچھوں گی بھی نہیں۔ تم نے کہا نہیں...... تو مطلب نہیں۔"

راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔

اور پھر ایک ہفتے بعد افنان عادل کے کہنے کے مطابق ہم لوگ روانگی کے لئے تیار تھے۔ یہ ایک ہفتہ کیسے گزر گیا تھا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ مگر اتنا ضرور پتا تھا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کوئی وقت ایسا اچھا نہیں گزارا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں نے افنان عادل کا خود سے سلوک دیکھا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران اس نے مجھے ڈانٹنا تو کجا...... مجھ سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی۔ وہ میرے ساتھ اتنا نرم اور مہربان تھا کہ پچھلے چار مہینوں میں وہ کیسا تھا اور وہ وقت میں نے کیسا گزارا تھا۔ میں بھول ہی گئی تھی...... پچھلے ایک ہفتے کے دوران میں نے اسے سراپا محبت پایا تھا۔ اس نے کسی معاملے میں مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں ایک معاملے پر اس نے مجھ سے میرا فیصلہ چاہا تھا۔

ایک دن وہ مجھے بڑی خاموشی سے چھت پر بنے کمرے پر لے گیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں' تمہارے جہیز کا سارا سامان ادھر ہی رکھا ہے اور میرے منع کرنے کے باوجود واپس نہیں بھجوایا گیا ہے۔'' کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''اس کے متعلق فیصلہ کرلو یا تو اسے فروخت کردو یا کسی کو دے دو۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے ان میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے اور نہ میرے گھر میں گنجائش ہے۔''

تب میں نے اس کے کہنے پر سارا جہیز ایک فلاحی ادارے میں بھجوا دیا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے کے دوران میں نے افنان عادل کو ہر مرحلے اور ہر معاملے پر اپنا ساتھ دینے والوں میں سے پایا تھا اور اس وقت بھی نیت میری تھی اور پوری اس کی بدولت ہونے جارہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری نیت یوں بھی پوری ہوگی۔ یقیناً اس وقت میں نے بڑے خالص دل کے ساتھ نیت کی ہوگی اور اس وقت میں سوٹ کیس بند کررہی تھی' جب افنان عادل کمرے کے اندر آیا۔ ''تیاری ہوگئی؟''

''ہاں۔''

''چلو پھر۔'' اس نے سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑا۔ میں اس کے ساتھ ہولی۔

کبھی میں نے سوچا تھا کہ پتا نہیں افنان عادل میری نیکی کی کمائی کا نتیجہ ہے یا کسی گناہ کی کمائی کا...... اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ افنان عادل میری کسی گناہ کی کمائی کا نتیجہ نہ تھا۔ کی ہوگی زندگی میں' میں نے کوئی نیکی' جس کے بدلے میں مجھے افنان عادل ملا تھا۔

اور اس وقت مجھے اس کے ساتھ چلتے ہوئے خود پر رشک آرہا تھا۔

☆=======☆=======☆

ٹھیک ایک ہفتے بعد اپنے دعوے کے مطابق میں اور جواہر ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ اس بار میرا دعویٰ سچ ثابت کردیا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر دعویٰ کیا تھا۔ پچھلے ہفتے میں نے جواہر سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ ایک ایک بات اسے بتا دی تھی۔ البتہ خلدون ابراہیم سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں' میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا اور میں امید بھی یہی رکھتا تھا کہ یہ بات میرے ان کے اور اللہ تعالیٰ کے بیچ میں رہے گی۔

پچھلے ایک ہفتے کے دوران ہر چھوٹی سے ہر بڑی سے بڑی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مجھے سمجھ میں آگیا تھا کہ جواہر میری ذمہ داری تھی اور اسے مجھے ہی اٹھانا تھا۔ خلدون ابراہیم نے ٹھیک کہا تھا کہ انہوں نے مجھے اس کا اہل پایا تھا۔ پہلے دو اشخاص میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ جواہر کی ذمہ داری اٹھا سکتے۔ اسی لئے ان کو یہ ذمہ داری دی بھی نہیں گئی تھی۔ اسی لئے جواہر کی ذمہ داری مجھے دی گئی تھی۔

مجھے سمجھ میں آگیا تھا کہ بڑے بھائی کی میرے لئے کی جانے والی ہر ہر دعا قبول ہوئی تھی اور رد نہیں کی گئی تھی۔ میں یونہی شک میں تھا......

مجھے سمجھ میں آگیا تھا کہ میری ہر دعا میرے معاملے میں قبول ہوئی تھی۔ میں نے الماس کو کبھی نہیں مانگا تھا۔ الماس مجھے ملی بھی نہیں تھی۔ وہ تو جواہر ہشام تھی......

مجھے سمجھ میں آگیا تھا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا انسان سے وعدہ ہے کہ خوف' بھوک' مال کی کمی' پھلوں کی کمی سے انسان کو آزمائے گا۔ اس کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ میری خوف سے خوب آزمائش ہوتی رہی تھی۔ پچھلے کئی سال میرے خوف میں ہی گزرے تھے۔

پچھلے ایک ہفتے کے دوران مجھے لمحے لمحے جواہر' بڑے بھائی اور خلدون ابراہیم کے جملے یاد آتے رہے تھے اور مجھے اندازہ ہوا تھا۔ انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں چاہے لاکھ انکار کرلیتا جواہر سے شادی کو...... سر پٹخ لیتا' پیر پٹخ لیتا' کچھ بھی پٹخ لیتا۔ میری قسمت میں جواہر سے شادی ہونا لکھی تھی اور وہ ہوکر رہی۔

اس ایک ہفتے کے دوران مجھے خاصا تاسف ہوتا رہا کہ میں نے تھوڑی جلد بازی کردی۔ جواہر مجھے ہی ملنی تھی۔ اسے میرے پاس ہی آنا تھا۔ پھر مجھ سے صبر کیوں نہ ہو

سکا۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ بے شک ایسا ہی ہوتا تھا مگر یہ لنک زندگی بھر کے لئے رہ تو گئی۔

پچھلے ہفتے جب میں جواہر کو مارتھا ایوانز اور اپنے متعلق ساری باتیں بتا رہا تھا تو اس دوران مجھے اپنے تیرے سوال کا جواب بھی مل گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ ''انگلینڈ' مارتھا ایوانز اور میری بے بسی...... اس سب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔''

مجھے پتا چل گیا۔ تھا کہ تعلق تو بڑا واضح تھا۔ میرا سارا غبار' غصہ اور ساری Agression نکال دینے کے لئے مارتھا ایوانز کو میرے سامنے کر دیا گیا تھا۔ تبھی جب جواہر میرے سامنے آئی تو ہر جذبہ' میرے سب احساسات اتنے شدید نہیں رہ گئے تھے۔ ورنہ اگر جواہر میرے سامنے پہلے آجاتی تو یہ بھی ممکن تھا کہ جیسے مارتھا ایوانز کو صرف قتل کرنے کا سوچا تھا جواہر کو قتل کر دیتا۔

پچھلے ہفتے کے دوران مجھے بارہا افسوس ہوتا رہا تھا کہ مارتھا ایوانز کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اس Guitt کا اظہار میں نے جواہر کے سامنے بھی کر دیا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں نے اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' سوتے جاگتے' لمبے لمبے بلال مرتضیٰ کے لئے دعائیں کی تھیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام مسائل حل کر دے۔ وہ جہاں رہے خوش رہے۔ اس کو یہ خوشی ملے جو وہ چاہے اس کو ملے۔ اس نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ میں اس پر اس کا شکر گزار تھا اور احسان مند بھی......

اس ایک ہفتے کے دوران میں نے جواہر کو پہلے سے زیادہ مطیع' فرمانبردار اور محبت کرنے والا پایا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران مجھے لمحہ لمحہ خود پر رشک آتا رہا تھا کہ ایک بہترین عورت میرے پاس ہے اور میں کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے لئے بہترین ثابت ہوں۔ پچھلا ہفتہ میرا اتنا یادگار اور شاندار گزرا تھا کہ اپنی زندگی کا کوئی بھی وقت میں نے اتنا شاندار اور یادگار نہیں گزارا تھا...... اور اس وقت گھر بھر مجھے اور جواہر کو ایئر پورٹ پر چھوڑنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ نہ صرف میرے گھر والے بلکہ جواہر کے گھر والے بھی...... دیگر اقرباء سے ملنے ملانے کا کام ہم نے اسی ہفتے کے دوران کر لیا تھا اور اس وقت میں سب سے فرداً فرداً ملنے کے بعد سب سے آخر میں ابو کے پاس آ گیا۔

''اچھا ابو۔'' میں نے انہیں ایک نظر دیکھ کر نظر جھکا کر اجازت لی۔

''اچھی بات ہے پھر...... اللہ مبارک کرے۔ خیریت سے لے جائے' خیریت سے لائے۔'' انہوں نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اب سے کچھ سال پہلے کا وقت مجھے یاد آ گیا۔ جب میں انگلینڈ جا رہا تھا۔ اس وقت

میں اور اس وقت میں کتنا فرق تھا۔ سوچ کر میری آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ میں نے ایک دم ابو کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ وہ قدرے حیرانگی سے مجھے دیکھنے لگے۔

''آپ مجھ سے خوش ہیں؟ مجھ سے راضی ہیں؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم سے ناخوش یا نہ راضی ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔'' ابو نے ایک لمحے بھی رکے بغیر فوراً کہا تھا۔ ''تم مطیع ہو' صالح ہو' سعد بھی ہو' تم سے ناراض یا ناخوش کس بات پر ہوں میں؟''

ابو مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان کے ہاتھ ہونٹوں سے لگا لئے تھے۔ یہ وہ جملے تھے جو کبھی ابو نے بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کے لئے کہے تھے اور جن کو اپنے لئے سننے کے لئے کتنے ہی سالوں سے میں مر رہا تھا اور آج یہ جملے مجھے سننے کو مل رہے تھے۔ ایک ٹھنڈک تھی جو دل میں اتر رہی تھی۔ ایک بوجھ تھا جو سر سے سرک گیا تھا۔ میں مارے تشکر کے سر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ بولنا چاہ رہا تھا مگر آنسو حلق میں پھنس گئے تھے۔

''آپ...... آپ...... جب بیمار ہوئے تھے ناں تو میں ڈر گیا تھا۔'' میں نے بمشکل کہا تھا۔ ابو بے اختیار ہنسے۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

بے ساختہ انہوں نے کہا تھا۔ ''تب پھر میں باقاعدہ تمہارے لئے وصیت کر کے جاتا۔''

''ایسی بات مت کیجئے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' میں نے گویا تڑپ کر کہا تھا۔

ابو خاموش سے ہو گئے۔ آہستگی سے اپنے ہاتھ چھڑائے پھر میرے ہاتھ پر تھپکی دے کر مسکرا کر کہا۔ ''جاؤ جواہر انتظار کر رہی ہے۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر جواہر کھڑی منتظر نگاہوں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنے گھر والوں کو دیکھا۔ بڑے بھائی مجھے آنکھ مار کر شرارت سے مسکرائے۔ بڑے بھائی جیسے اتنے سنجیدہ آدمی سے اس حرکت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ میں نے خاصی حیرانی سے انہیں دیکھا اور اب کی بار بڑے بھائی کو بے ساختہ ہنستا ہوا پایا۔ میں اس بار بے یقینی سے انہیں دیکھتا ہوا آنکھوں میں نمی لئے سر جھٹکتا ہوا ایک دم مڑا تو پیچھے سے گزرتے شخص سے بری طرح ٹکرایا۔ وہ شخص نہ صرف زمین پر جا پڑا تھا بلکہ Metal کی ٹرالی سامان سمیت اس کے اوپر الٹ پڑی تھی اور اب دو دو گھٹنے[illegible] میں نے جلدی سے اس پر سے ٹرالی ہٹائی۔

جواہر لپک کر میرے پاس آئی۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے تم کو چوٹ تو نہیں آئی؟" فکرمندی سے اس نے میرا بازو پکڑ کر پوچھا۔

"اف...... محترمہ...... چوٹ تو ادھر آئی ہے۔" کراہوں کے درمیان بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا تھا۔

"معاف کیجئے گا۔" کہتے ہوئے میں اس کو اٹھنے میں مدد دینا ہی چاہتا تھا کہ وہ خود برق رفتاری سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں خود اس کی پھرتی پر حیران رہ گیا۔

"افنان۔" حیرت اور مسرت بھرے انداز میں کہا گیا تھا۔

اور میں بھی اپنے سامنے بلال مرتضیٰ کو دیکھ کر ساکت سا ہو گیا تھا۔

"تم...... تم...... تم...... خیریت سے تو ہو۔ تم کو چوٹ تو نہیں آئی۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ مجھ سے گرم جوشی سے گلے مل رہا تھا۔

"میری تو بالکل خیر ہے مگر تم ایک نہایت گھٹیا' بے ہودہ' بے مروت اور بدلحاظ آدمی ہو۔" بلال مرتضیٰ مجھ سے الگ ہو کر شکایتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ میں بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ وہ پوری آنکھیں کھول کر حیرت سے مجھے دیکھے گیا۔

"اوہ ہو افنان عادل مسکراتا بھی ہے۔" استعجاب سے اس نے پوچھا اور اس کے تعجب پر میں اس بار بے اختیار ہنس دیا۔ "ابھی میں بے ہوش ہونے کو ہوں۔ افنان عادل ہنستا بھی ہے۔"

بلال مرتضیٰ اب کی بار بے یقین ہو کر مجھے دیکھے گیا۔ میں ہنستا چلا گیا۔

"خیر...... خیر...... اچھا لگتا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ پھر میری طرف شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ "اب اگر میں تمہاری تعریف کر رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ میری تم سے ناراضی ختم ہو گئی ہے۔ میں تم سے بہت سخت ناراض ہوں۔ تم تو ایسے گئے کہ پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔"

"تم سے تمہارے گھر کا پتا پوچھا تو تھا میں نے۔" میں نے فوراً کہا۔

"اور پتا تمہیں یاد نہ تھا۔" اس کا انداز بدستور شکایتی تھا۔ "تمہیں یہ یاد نہ تھا کہ میں یہاں رہ رہا تھا یا انگلینڈ میں؟"

"معاف کر دو یار' غلطی ہو گئی۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"جاؤ معاف کیا۔ کیا یاد کرو گے۔" اس نے سخاوت سے کہا۔

"تم کیسے آ گئے پاکستان' تم نے تو عہد کیا ہوا تھا۔"

"ارے یار کیا بتاؤں میں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "گھر سے ٹیلی گرام ملا' امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ فوراً چلے آؤ۔ بس میں چلا آیا۔" وہ کہہ رہا تھا اور میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مگر تم نے تو کہا تھا......" میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔

"ہاں ٹیلی گرام میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ تم جو چاہو گے ویسا ہی ہو گا۔"

اب کی بار میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کیا کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری اس کے لئے کی جانے والی دعا اتنی جلدی قبول کر لی جائے گی اور اس وقت بلال مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔

"کمال ہے۔ میں حیران ہوں۔ کہاں تو کوئی کام ہو نہیں رہا تھا اور کہاں ہر کام اتنی جلدی جلدی ہو رہا ہے اس جمعے کو میری شادی ہے۔" وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔

"تم کو بہت مبارک ہو۔" میں نے کھلے دل سے کہا۔

"دیکھو بھئی لڑکے' مجھے مبارک باد دینے شادی والے دن آئے گا تو مبارک باد قبول کروں گا۔ ایسے ہی اس جگہ پر تو مجھے بالکل منظور نہیں ہے مبارک باد۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"میں آ تو نہیں سکوں گا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "اور فی الحال تو میرے پاس نیک خواہشات کے سوا تم کو دینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ اپنا سب کچھ میں نے اپنی بیوی کو دے دیا ہے۔"

بلال مرتضیٰ مجھے حیرت سے زیادہ بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ "تم نے...... تم نے...... شادی کر لی؟"

"ہاں۔"

"تم...... تم افنان' گھٹیا' بے مروت' بے ہودہ اور بدلحاظ ہونے کے ساتھ ساتھ خبیث اور کمینے بھی ہو۔"

"کہہ لو...... کہہ لو میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔"

"افنان تم ڈھیٹ بھی ہو۔" اس نے بے حد برا مان کر کہا۔ "ذرا نہیں بدلے بالکل ویسے ہی ہو۔ تم پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

''تم کیا جانو۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''میں جانتا ہوں ناں تم اب بھی مجھے حیران کر دیتے ہو۔''

''اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ ''میری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا صرف چار مہینے کچھ دن ہوئے ہیں۔''

''خیر...... خیر بہت مبارک ہو۔'' اب کی بار اس نے کھلے دل سے کہا۔

''بہت شکریہ جناب۔''

''اچھا ہاں۔'' وہ جیسے ایک دم یاد آنے پر بولا تھا۔ ''میرے پاس بھی تمہارے لئے ایک خبر ہے۔'' میں اس کو منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ''پچھلے دنوں مارتھا ایوانز ملی تھی مجھے۔''

میں اس کی بات سن کر ساکت و جامد ہو گیا تھا۔

''میں تو پہلی نظر میں اسے دیکھ کر پہچان نہیں پایا۔ اس کا حلیہ ہی ایسا تھا۔ گلے میں اسکارف ڈال کے رکھنے والی مارتھا ایوانز نے اسکارف' حجاب کی طرح سے لیا ہوا تھا۔ میرے حیرت ظاہر کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ وہ مسلم ہو گئی ہے۔ یہ خبر ہوتے ہی اس کے والد اور بہن نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کے بعد وہ جہاں جاتی ہر دروازہ اسے اپنے لئے بند ملتا۔ اسے لندن چھوڑنا پڑا۔ مانچسٹر چلی آئی......'' بلال نے گہری سانس لی اور میری سانس رک گئی تھی۔ ''اس بے چاری نے بڑا Surffer کیا تھا۔ No shelter, No protection, No money ایک موقع پر تو اس کی عزت بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔'' بلال کہہ رہا تھا اور میں شاکڈ تھا۔ میں...... میں اس کی اس حالت کا ذمہ دار نہیں تھا۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی اور بلال مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔

''پھر وہاں اس کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ وہ آدمی تھا تو لندن کا ہی رہنے والا مگر ان دنوں کام کے سلسلے میں مانچسٹر رکا ہوا تھا۔ اس نے مارتھا کو پسند کیا اور اس سے شادی کر لی۔''

''اف۔'' میرا رکا ہوا سانس بحال ہو گیا۔

''میں نے جب پوچھا کہ کیسا ہے تمہارا شوہر تو چپ سی ہو گئی۔ پھر کہا افنان عادل جیسا کوئی ہو نہیں سکتا۔'' وہ بتا رہا تھا اور اب مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ ہم کیا ہوتے ہیں اور ہمارے دعوے کیا ہوتے ہیں۔ کبھی اس نے کہا تھا تو تب میں اسے منع کر کے آیا تھا۔

......اور بلال مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔ ''اس کی قسمت دیکھو کہ وہ شخص بھی پاکستانی

وہیں کی نیشنلٹی رکھتا ہے۔ بڑی ویل اسٹیبلشڈ اور ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ تیرہ سے وہ پچھلے ماہ کی پندرہ تاریخ تک تو Expected بھی تھی۔ خاصی خوش لگ رہی تھی۔''

میں نے طمانیت کے احساس سے آنکھیں بند کر لیں۔ مارتھا ایوانز کو محبت سے زیادہ Protection کی ضرورت تھی۔ جو میں اسے کبھی دے نہ پاتا اور وہ اسے کسی اور سے مل گئی تھی۔

میں ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ آج کے دن کا یہ دوسرا بوجھ تھا جو میرے سر سے اتر گیا تھا۔ میری آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔

''بلال۔'' میں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ ''تمہارا مجھ پر پہلے ہی بہت قرض ہے۔ تم جب مجھے ملتے ہو مجھ پر ایک قرض کا اضافہ کر دیتے ہو۔''

''اور تم ہمیشہ بے کار کی باتیں کرتے ہو۔'' بلال نے بے حد برا مان کر کہا۔

''اچھا چلو ان سب باتوں کو چھوڑو۔'' میں نے بھیگی آنکھوں سمیت مسکرا کر کہا۔ ''تم کو اپنی بیوی سے ملواؤں۔ تم دیکھنا چاہو گے کہ میری بیوی کون ہے؟''

''تم دکھانا چاہو گے تو ضرور دیکھوں گا۔''

میں نے اپنی ہی طرف دیکھتی جواہر کو اشارے سے قریب بلایا۔ ''یار ذرا یہ نقاب تو ہٹاؤ۔'' جواہر نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں مسکرایا۔ ''فکر مت کرو سب اپنے ہی لوگ ہیں۔''

جواہر نے الجھن سے مجھے دیکھتے ہوئے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ابھی بھی بلال مرتضیٰ کی طرف متوجہ نہیں تھی اور اب کی بار بلال مرتضیٰ کے چہرے کے تاثرات مجھے مزا دے گئے تھے۔ جس بات کی توقع نہ ہو آدمی کو اور اچانک وہی ہو جائے تو آدمی کے تاثرات کیا ہوں گے؟ اور اس وقت بھی بلال مرتضیٰ کے چہرے پر کیا تاثر نہیں تھا۔ بے یقینی' حیرت صدمہ' خفگی' ناراضی...... اور بہت کچھ۔

بلال مرتضیٰ خود پر قابو پا چکا تھا اور اب جواہر سے مخاطب تھا۔ ''اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔ کون ہے ہمارے ساتھ یہاں' صرف ایک ہی مارتھا ایوانز اور کون!'' خاصی دیر بعد اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

''تم نے کیا سوچا تھا۔ میں کوئی احمق ہوں؟ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اور میں نے تمہارا یقین کیا؟ تم نے افنان عادل سے شادی کی اور مجھے کبھی نہیں بتایا۔'' اس نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"اور کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ لائٹ براؤن لینز لگانے کے پیچھے وجہ کیا ہے؟ اگر تم اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کر رہی ہو تو میں تم کو بتاؤں' یہ ایک بے کار سی کوشش ہے۔"

ہنسی کے مارے میرے پیٹ میں بل پڑنے لگے تھے۔ جواہر کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں الجھن واضح طور سے پڑھی جا سکتی تھی اور بلال مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔

"And I think you told me you were expected by the Fifteen the of This month so where is your baby?"

بلال مرتضیٰ بلا رکے بولے جا رہا تھا اور میرا پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے کو دل چاہ رہا تھا۔

جواہر نے بے تحاشا سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اب مجھ سے اپنی ہنسی پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔ میں بے تحاشا ہنستے چلا گیا۔ بلال مرتضیٰ اب الجھن سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم سمجھ کیا رہے ہو' آخر؟" بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہا۔ "یہ مارتھا ایوانز نہیں ہے لیکن تم انہیں بھی بہت اچھی طرح سے جانتے ہو۔ یہ جواہر ہیں۔ جن سے تمہاری شادی ہونے جا رہی تھی۔"

بلال مرتضیٰ کا منہ اب کی بار حیرت سے کھل گیا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"اور جواہر یہ ہے بلال مرتضیٰ وہ مہربان شخص جس کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا۔"

جواہر نے اب کی بار خوف زدہ سی ہو کر مجھے دیکھا اور ایک دم کسی نے میرا بایاں بازو پکڑ لیا۔ اس کے ناخن مجھے اپنے گوشت میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے ہولے سے اس کے ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ تسلی دینے کے سے انداز میں رکھا۔

"مم..... معاف کیجئے گا بھابی۔" وہ اب الماس سے مخاطب تھا۔ "میں دھوکا کھا گیا۔" وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

میں نے سر ہلایا۔ مجھے دھوکا ہو سکتا تھا۔ تو کسی کو بھی دھوکا ہو سکتا تھا۔ اب یقیناً جواہر کو بھی یقین آ گیا ہو گا کہ میں نے اس سے غلط نہیں کہا تھا اور اب کبھی بھی وہ مارتھا ایوانز سے صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اس سے کس حد تک مشابہت رکھتی ہے' اس سے ملنے کا اس کو دیکھنے کا خیال دل میں نہیں لائے گی۔ بلال مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔

"جبھی میں اکثر سوچتا تھا یہ مارتھا ایوانز مجھے دیکھی دیکھی سی کیوں لگتی ہے۔" "کمال ہے یار ---- اتنی مشابہت...." وہ بڑبڑا رہا تھا۔ پھر ایک دم مجھے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسا اور

"Oh, Now I Came understand" کہا۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"No you can never understand"

بلال مرتضیٰ یقیناً یہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں ایک ناکام عاشق ہوں۔ جواہر سے بہت محبت کرتا ہوں گا۔ جواہر نے مجھے دھوکا دیا ہو گا اور اپنے گھر والوں کے کہنے پر اس سے شادی کرنے جا رہی ہو گی۔ میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں گا۔ تبھی جب جواہر سے مشابہت رکھنے والی جواہر مجھے ملی تو میں نے اپنی ساری نفرت اس پر الٹ دی اور اب جبکہ جواہر کی مجھ سے شادی ہو گئی تھی تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہو گا۔

"افنان۔" بلال مرتضیٰ نے ایک دم مجھے مخاطب کیا۔ "تم بہت خوش قسمت ہو۔ تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔"

بلال مرتضیٰ کے کہنے پر مجھے اپنی سوچ کی درستگی کا اندازہ ہوا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ میں اب اس کو کیا بتاتا سو بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا بلال' میں واقعی خوش قسمت ہوں۔ یاد ہے ایک دن تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کسی کسی پر اللہ تعالیٰ کی کچھ خاص نظر ہوتی ہے۔ تم نے یہ بھی ٹھیک کہا تھا۔ مجھ پر واقعی کچھ خاص نظر کی گئی ہے۔ مجھے وہ سب ملا جو میں نے اس سے مانگا اور مجھے وہ کچھ بھی ملا جو میں نے اس سے کبھی بھی نہیں مانگا اور جو مجھے نہیں ملا وہ میں اس سے مانگ لوں گا۔"

بلال مرتضیٰ کچھ نہ سمجھ میں آ سکنے والی کیفیت میں مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اسے تفصیل سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فلائٹ کا اناؤنسمنٹ ہونے پر میں نے بلال سے اس کا پتا لے کر اس سے اجازت چاہی اور ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھتے ہوئے پر میں نے بلال سے اس کا پتا لے کر اس سے اجازت چاہی اور ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے مضبوطی سے جواہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد پلین میں بیٹھتے ہی جواہر نیند میں جھولنے لگی۔ ایک موقع پر اس کا سر میرے کندھے سے ٹکرایا۔ میں اسی دم سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس نے بے حد چونک کر آنکھوں میں خوف بھر کے مجھے دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں یہ تاثر کیوں تھا مگر میں نے قدرے ترچھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنا کندھا اس کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے میرے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ چند لمحے بعد نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔ "افنان مجھے حج کرانے بھی اسی سال لے جاؤ گے ناں؟"

''ان شاء اللہ۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔ ''تم نے کیوں پوچھا؟''

''یہ میرا اور اللہ تعالیٰ کا آپس کا معاملہ ہے۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ''پھر بھی اگر تم پوچھتے ہو تو تم کو بتا دیتی ہوں۔''

''مجھے کچھ مت بتاؤ۔'' میں نے ایک دم اسے ٹوکا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں۔'' پھر اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا..... میرے لئے.....''

''نہیں..... اپنے لیے.....'' اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں میں ہوں یا تم ہو، ہر دو صورتوں میں بات تو ایک ہی ہے۔'' بروقت مجھے ابو کے امی کو کہے ہوئے جملے یاد آ گئے تھے۔

''ہوں میں نے دھیمے سے دیا گیا جواہر کا جواب سنا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ پھر جواہر کے اسکارف کے کونے سے چہرہ ڈھک لیا۔

آج میری نیت بہت خالص تھی اور رات بہت روشن تھی۔

☆======ختم شد======☆